مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی

اپنے بچوں ارشد، شروش، رخسانہ اور سیما کے نام

ترتیب

غنودیم، غنودیم (پس و پیش لفظ)

"احسان بھائی! منور حسین بھی رخصت ہو گئے۔ انتقال سے پہلے۔۔"۔

"کس کے انتقال سے پہلے ؟" میاں احسان الٰہی نے اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کے پنکھے کو تکتے اور اپنے فالج زدہ ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے اٹھا کر اپنے دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ انھیں رہ رہ کر این جائنا کے درد شبہ ہو رہا تھا۔ یہ جنوری ۱۹۸۶ء کا ذکر ہے۔ مجھے اپنا مدعا بیان کرنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ میاں احسان الٰہی پانچ سال سے صاحب فراش تھے۔ فالج کے حملے کے بعد وہ امراضِ قلب کے اسپتال میں دس بارہ دن "کوما" میں رہے۔ جب ہوش آیا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کا آدھا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ بینائی جاتی رہی۔ قوت گویائی بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ حافظہ آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ صرف تکلیف دہ باتیں یاد رہ گئیں۔

اگر اب انھیں کوئی پہلی بار دیکھتا تو یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سوا چھ فٹ، دو سو دس پونڈ اور پہلوانی ڈیل ڈول والا شخص ہے جو بہتّر سال کی عمر میں صبح چار بجے ڈیڑھ گھنٹے ڈنڑ بیٹھک لگاتا، پھر ایک گھنٹے ٹینس کھیلتا اور دن میں چار پانچ میل پیدل چلتا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں دل کے پہلے شدید دورے کے بعد انھوں نے بد پرہیزی، بیٹھکوں اور بزم آرائیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ لندن گئے تو ابن حسن برنی کی طرح انھیں بھی کہیں کوئی زینہ نظر آجاتا تو اس پر چڑھتے ضرور تھے۔ کہتے تھے "اس سے دل قوی اور بڑھاپا پسپا ہوتا ہے۔ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے چنیوٹ کے نواح میں کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میں نہ چڑھا ہوں"۔ ڈاکٹروں نے غذا میں سخت پرہیز کی تاکید کی۔ انھوں نے چنیوٹ سے اصلی گھی اور آم کا اچار منگوانا تو چھوڑ دیا لیکن چنیوٹی کنا، سندھی بریانی، برنس روڈ کی تر تراتی تافتان، کوئٹہ کے سجی کباب، بادام کی حیدر آبادی لوازمات، ملتان کے انور رٹول۔۔۔ مختصر یہ کہ دل کے مریض کے لیے خودکشی کے نسخے کے جملہ اجزا۔۔۔ نہیں چھوڑے۔ خود ہی نہیں اپنے معالجوں کو بھی گھر بلا کر بڑے شوق اور اصرار سے کھلاتے۔ کہتے تھے، لذیذ غذا سے مرض کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور طاقت پیدا ہوتی ہے! وہ بدستور اپنے خلافِ وضع طبی معمولات پر قائم رہے۔ روزے بھی نہیں چھوڑے کہ بچپن سے رکھتے چلے

آئے تھے۔ اس طرح پنج وقتہ نماز اب بھی باقاعدگی سے قضا کرتے تھے۔ تاویل یہ پیش کرتے کہ اب شروع کروں تو لوگ کہیں گے، میاں صاحب ایک ہی ہارٹ اٹیک میں اُٹھک بیٹھک کرنے لگے! ذیابیطس بھی ہو گئی۔ لیکن سونے سے پہلے ایک پاؤ فُل کریم والی آئس کریم ضرور کھاتے۔ جتنے ذہین تھے، اس سے زیادہ خود رائے۔ ہر مسئلے پر۔۔۔۔خواہ طبّی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔ وہ الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ کہتے تھے "آئس کریم قلب کو ٹھنڈک پہنچاتی اور بلڈ پریشر کو قابو میں رکھتی ہے بشرطیکہ مقدار قلیل نہ ہو۔ سرگودھا یا ساہیوال اپنے سمدھیانے جاتا ہوں تو تکلّف میں رات آئس کریم کا ناغہ ہو جاتا ہے۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ جس رات آئس کریم نہ کھاؤں اس رات مچھر بہت کاٹتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں آپ کو معلوم ہے یورپ کی سیاحت پر گیا تھا۔ کئی دن بریانی نہیں ملی چناچہ ویانا میں ہرنیا کا آپریشن کرانا پڑا۔ آپ میرے چٹورپن اور بدپرہیزی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ غالب کو دیکھیے۔ ساری عمر ناقدری اور عسرت و تنگ دستی کا رونا روتے رہے، خصوصاً آخری دنوں میں۔ لیکن ذرا مرض الموت میں ان کی آخری غذا تو ملاحظہ فرمایئے، صاحب کو سات بادام کا شیرہ، قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کی یخنی۔ تین شامی کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شرابِ خانہ ساز اور سری قدر عرق شیر۔ بھائی میرے!

یہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، سوائے ستم پیشہ ڈومنی کے۔ لیکن مجھے تو مرض الموت کے بغیر بھی اتنی کیلوریز میسر نہیں۔ اور ہاں، شراب کے ضمن میں بادہ پُرتگالی کے بجائے خانہ ساز کی شراب توجہ طلب ہے۔ علاوہ ازیں، صرف پانچ روپے بھر شراب غالباً اس لیے پیتے تھے کہ اگر اس کی مقدار بڑھا دیتے تو پھر اتنا ہی عرقِ شیر بھی زہر مار کرنا پڑتا۔ بھائی میرے، میں تو دودھ کی آئس کریم صبر وشکر سے کھاتا ہوں۔ کبھی تولہ ماشہ کی قید نہیں لگائی"۔

ڈاکٹروں سے ایکس رے اور مرض کی تشخیص کرانے کے بعد اکثر بایو کیمسٹری سے خود اپنا علاج کرتے۔ ایسی قوتِ ارادی کے مالک اور ایسے بقراط مریض پر ڈاکٹر کو بھی غصہ نہیں آتا، ترس اور پیار آتا ہے۔ حلقہء یاراں میں جب وہ خوش گفتاری پر آتے تو ڈمپل اُن کے رخسار ہی میں نہیں، فقروں میں بھی پڑتا تھا۔ بالآخر ان کی بدپرہیزی اور لاجواب کر دینے والی منطق کا نتیجہ شدید فالج کی شکل میں رونما ہوا۔

میں ڈرائنگ روم اور برآمدے سے ہوتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچا تو دیکھا کہ ان کے میوزک روم میں (جس میں نو دس لاوڈ اسپیکر اس خوبی سے لگائے گئے تھے کہ ایک بھی نظر نہیں آتا تھا) تالا پڑا ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری جس کی

سیکڑوں کتابوں کی قیمتی جلدیں انھوں نے نظام دکن کے شاہی جلد ساز سے بطور خاص بنوائی تھیں، چار سال سے بند پڑی تھی۔ اسی لائبریری میں انھوں نے میرا تعارف نیاز فتح پوری، مولانا محمد ایوب دہلوی، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد سے کرایا تھا۔ اور یہیں سے انھوں نے ایک دفعہ آدھ گھنٹے تک مجھے فون پر استاد بندو خان کی سارنگی سنوائی تھی کہ وہ اپنے ہر شوق اور لطف میں دوستوں کو شریک کر کے خوشی دوبالا کرنے کے رمز سے واقف تھے۔

فون پر سارنگی سنوانے کا قصّہ یہ ہے کہ ان کے والد مرحوم حاجی محمد یعقوب صاحب اپنے گھر میں تاش، پرائی عورتوں کے فوٹو (مراد ایکٹرسوں سے تھی) اور پاندان رکھنے کے تو خلاف تھے ہی، گانے کی محفل کے بھی روادار نہ تھے۔ ”بیٹا جی! موسیقی حرام تو ہے ہی، منحوس بھی ہوتی ہے۔ جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا گھنگھرو بج گئے، اس گھر کے سامنے ایک نہ ایک دن دِوالے اور قرقی کا ڈھول بجنا لازمی ہے۔ وہ گھر اجڑے ہی اجڑے۔ اسے میری وصیت جانو“۔ وصیت کے احترام میں میاں احسان الٰہی اس مترنّم نحوست کا اہتمام عاجز کے گھر کرواتے تھے۔ لیکن الحمد للہ مرحوم کی پیشن گوئی کے مطابق ہمارے گھر کے سامنے کبھی قرقی کا ڈھول نہیں بجا۔ کسی کے گھر بھی نہیں بجا جب کہ اس عرصے میں ہم نے (کرائے کے) نو گھر تبدیل کیے۔ میاں احسان الٰہی اپنے گھر میں

موسیقی صرف تین صورتوں میں جائز و مباح سمجھتے تھے۔ اوّل، گانے والی زندہ حالت میں نہ ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے گانے کا صرف ریکارڈ یا ٹیپ ہو۔ دوم، ان کے گھر میں گانے والا بالکل تنہا گائے۔ یعنی نہ طبلے کی سنگت ہو اور نہ ان کے علاوہ کوئی اور سننے والا موجود ہو۔ نیز یہ اندیشہ نہ ہو کہ گانے کے بول سمجھ آجائیں گے۔ یعنی راگنی پکی ہو۔ سوم، گانے والے کو داد کے سوا کچھ اور نہ دینا پڑے۔ مطلب یہ کہ گانے والا فی سبیل اللہ گلوکاری کرے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان پاکیزہ شرائط و قیود کے ساتھ جو شے ظہور میں آئے گی وہ والد مرحوم کی وصیت تو ہو سکتی ہے، موسیقی ہرگز نہیں۔

میاں احسان الٰہی اس کمرے کے وسط میں ایک اونچے اسپتالی بیڈ پر نئی ریشمی دلائی اوڑھے نیم غنودگی کے عالم میں لیٹے تھے۔ دائیں دیوار پر عالم جوانی کی دو تصویریں ٹنگی تھیں۔ ایک میں وہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کھڑے تھے دوسری میں وہ بندوق کا بٹ (کندہ) مردہ نیل گائے کی تھوتھنی پر رکھے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دونوں تصویروں کے نیچے ان کی نئی ان ویلڈ چیئر (معذروں کی کرسئ رواں) رکھی تھی۔ ان کے سرہانے ایک اونچے اسٹول پر وہ قیمتی دوائیں سجی تھیں جن کے ناکارہ و بے اثر ہونے کا وہ نیم زندہ اشتہار تھے۔ اس وقت تو ان کے حافظے کا قائل ہونا پڑا اس لیے کہ انھوں نے میری تواضع کے لیئے فریسکو

سے میری پسندیدہ گرم جلیبیاں اور ناظم آباد کے مُلّا حلوائی کے گلاب جامن منگوائے تھے۔ دائیں طرف دیوار سے لگے ساگوان کے کنگ سائز بیڈ پر تکیے نہیں تھے۔ ان کی بیگم کے انتقال کو دو مہینے ہوئے تھے۔ دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے کارنس پر ایک چھوٹا سا کیسٹ پلئیر اور ان مشاعروں کے ٹیپ رکھے تھے جو گزشتہ پینتیس برسوں میں اس لان پر ہوئے تھے جس کے لیے گھاس ڈھاکا سے، گلاب اور پام کے درخت پنڈی اور سری لنکا سے منگوئے تھے۔ فالج کے پیش نظر پنکھا، ایئر کنڈیشنر، کھڑکیاں، بُری خبروں کی اطلاع، بچّوں کا داخلہ ۔۔۔۔سب بند تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ ان کی سماعت بھی متاثر ہو چلی ہے۔ میں نے ذرااونچی آواز میں دہرایا۔

"ہمارے یار جانی منوّر حسین مر گئے"۔

"ہاں، مجھے کسی نے بتایا تھا"۔ انھوں نے بڑی لکنت سے کچھ کہا جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔ میری بات پہ وہ اپنی توجہ بیس پچیس سیکنڈ سے زیادہ فوکس نہیں کر پارہے تھے اور حاضر دماغی کے اس مختصر سے کوندے میں اپنا مدعا بیان کرنے میں مجھے خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بات یہ تھی کہ اٹھائیس سال کراچی میں رہنے کے بعد میں نے جنوری ۱۹۷۹ء میں لندن جانے کے لیے رختِ سفر باندھا تو پہلے اپنے دونوں دوستوں (جن کے نام رسمی خانہ پُری کی خاطر میاں احسان الٰہی اور منوّر حسین فرض کر لیجیے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ دوست کو کسی بھی نام سے پکاریں، گُلوں ہی کی خوشبو آئے گی) کی تین باتیں اور یادیں انھیں کی زبانی ٹیپ پر محفوظ کیں۔ مفصّل نوٹ بھی لیے۔ ان یاداشتوں پر مبنی و مشتمل دس خاکے اور مضامین لندن میں بڑی تیز قلمی سے لکھ ڈالے اور حسبِ عادت پال میں لگا دیئے کہ ڈیڑھ دو سال بعد نکال کر دیکھیں گے کہ کچھ دم ہے بھی یا نِرے سوختنی ہیں۔ میاں احسان الٰہی اور منوّر حسین سے دوبارہ ان کی اشاعت کی اجازت چاہی جو انھوں نے بخوشی اور غیر مشروط طور پر دے دی۔ میں نے صاف کرنے کے لیے مسودہ نکال کر دیکھا تو ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب کچھ کسی اور نے لکھا ہے۔ یہ بھی بالکل عیاں تھا کہ یہ دو کتابوں کا مواد ہے۔ میں ایک مسودے سے دو کتابیں برآمد کرنے کا جتن کر رہا تھا کہ منوّر حسین کا ایک مختصر سا خط موصول ہوا، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مجھے تو ذاتی طور پر کوئی تامل یا اعتراض نہیں، لیکن ممکن ہے اس کی اشاعت میرے اعزہ و اقربا کو اچھی نہ لگے۔ لہٰذا ان باتوں اور یادوں کو میرے نام سے منسوب نہ کیا جائے۔ قبل اس کے کہ

میں کراچی جا کر ان سے اس موضوع پر مفصّل گفتگو کروں، دو تین مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میری روداد سُن کر میاں احسان الٰہی نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ پھر کہنے لگے، بہت دن ہو گئے ۔ اب پاکستان آ بھی جایئے۔ ہمارے بعد آئے تو کیا آئے ۔ بینائی بالکل جاتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے آپ کا چہرہ یاد نہیں آتا۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ سینتیس سال میں، میں نے انھیں دوسری بار روتے دیکھا۔

اب میں عجیب پَس و پیش میں مبتلا ہو گیا۔ دونوں کی یادیں اور باتیں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح گتھی اور گُندھی ہوئی تھیں کہ ان جڑواں سیامی تحریروں کو بے ضرر عملِ جراحی سے علیحدہ کرنا میرے بس کا کام نہ تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ ایک کے نام ، مقام اور شناختی کوائف کا تو انکشاف کر دوں اور دوسرے کی تلبیسِ لباس کر کے افسانوی لبادہ پہنا دوں۔ ان حالات میں میرے لیے اِس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ سارے مسودے کو یک قلم مسترد کر کے نہ صرف نام اور مقام بدل دوں، بلکہ اوّل تا آخر سب کچھ fictionalise کر دوں، جس کا ان دونوں سے کوئی تعلّق نہ ہو۔ اور میں نے یہی کیا۔

چناچہ ”آبِ گم“ کے پانچ کہانی نما خاکوں میں آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے، اس کا ان دوستوں کے واقعاتِ زندگی یا ان کے احباب، بزرگوں اور لواحقین سے قطعاً کوئی تعلق یا مماثلت نہیں ہے۔ مؤدبانہ گزارش ہے کہ فکشن کو فکشن ہی سمجھ کر پڑھا جائے۔ اگر کوئی واقعہ سچ یا کردار ”اصلی“ نظر آئے تو اسے محض سوءِ اتفاق تصور فرمایئے۔ تمام تر واقعات و کردار فرضی ہیں۔ البتہ جن مشاہیر کا ذکر جہاں کہیں ”بہ بدی“ یا بَر بنائے تنقیص آیا ہے، اسے جھوٹ نہ سمجھا جائے۔ اتنا ضرور ہے کہ میں نے حتّیٰ الامکان منوّر حسین اور میاں احسان الٰہی کے مخصوص پیرایہ بیان اور اندازِ گفتگو کی لٹک ــــــ اور کہیں کہیں آپس کی نوک جُھونک کے دوران شرارِ جستہ و فقرہ برجستہ ــــــ کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

یوں بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ فکشن ہے یا سچی واردات یا ان دونوں کا ملغوبہ جسے آج کل (Fact + Fiction Faction) کہا جاتا ہے۔ ایک چینی دانا کا قول ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بلی سیاہ ہے یا سفید۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ چوہے پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔

اس پس منظر کا ذکر و وضاحت مجھ پر اس لیے بھی واجب ہے کہ اس کتاب کا اصل محور، محرک اور باعثِ تصنیف ہر دو یارانِ رفتہ کی صحبت اور مطائبات تھے جو میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ صحبتِ یاراں میں ہر لمحے کو ایک جشن سمجھ کر گزارتے۔ اس قرض اور نعمتِ عظمیٰ کا اخفا بد دیانتی ہو گی۔

جس اُکھڑی اُکھڑی گفتگو کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد میاں احسان الٰہی بھی اپنے رب سے جا ملے اور دیس سونا کر گئے۔ اور اب میں ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کی زیرِ زر پرستی گیارہ سال لندن میں گزارنے کے بعد وطن کو مراجعت کی تیاری کر رہا ہوں۔ ان کا گلہ اور خدشہ صحیح ثابت ہو۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ذاتی، ادبی، پیشہ ورانہ، سیاسی اور قومی اعتبار سے اس عشرہ رائگاں میں زیاں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ پایا۔ البتہ ملکوں ملکوں گھومنے اور وطن سے دور رہنے کا ایک بین فائدہ یہ دیکھا کہ وطن اور اہل وطن سے محبت نہ صرف بڑھ جاتی ہے بلکہ بے طلب اور غیر مشروط بھی ہو جاتی ہے:

سفر کردم بہر شہری دویدم

بہ لطف و حسن تو کس راندیدم

نقصان یہ کہ ہر خبر اور افواہ جو ادھر سے آتی ہے، دل دہلانے اور خون جلانے والی ہوتی ہے۔ پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔ یہ عمل دس گیارہ سال تک جاری رہے تو حساس آدمی کی کیفیت سیسموگراف کی سی ہو جاتی ہے جس کا کام ہی زلزلوں کے جھٹکے ریکارڈ کرنا اور ہمہ وقت لرزتے رہنا ہے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ہماری سیاست کا قوام ہی آتش فشاں لاوے سے اٹھتا ہے:

دن رات اک زلزلہ تعمیر میں میری

لیڈر خود غرض، علما مصلحت بیں، عوام خوف زدہ اور راضی برضائے حاکم، دانش ور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ہو جائیں (رہے ہم جیسے لوگ جو تجارت سے وابستہ ہیں تو: کامل اس فرقہ تجار سے نکلا نہ کوئی) تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے۔ پھر کوئی طالع آزما آمر ملک کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیے: ڈکٹیٹر خود نہیں آتا، لایا اور بلایا جاتا ہے۔ اور جب آجاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے۔ پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے۔ باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بدوٴ ایک دوسرے کا منہ نوچنے

لگتے ہیں۔ پھر ایک نایاب بلکہ عنقا شے کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے سے زیادہ غبی اور تابع دار اونٹ تلاش کر کے اسے دعوت دینے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں تاکہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے خیمے میں رہ سکیں اور آقائے سابق الانعام یعنی پچھلے اونٹ پر تبرّا بھیج سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈکٹیٹر سے زیادہ مخلص اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس معنی میں کہ وہ خلوصِ دل سے یہ سمجھتا ہے کہ ملک و ملّت سے جس طرح ٹوٹ کر وہ محبت کرتا ہے اور جیسی اور جتنی خدمت وہ تنِ تنہا کر سکتا ہے، وہ پوری قوم کے بوتے کا کام نہیں۔ نیز اسی کی ذاتِ واحد خلاصہ کائنات اور بلا شرکتِ غیرے سرچشمہ ہدایت ہے، لہٰذا اس کا ہر فرمان بمنزلہ صحیفہ سماوی ہے:

آتے ہی غیب سے یہ فرامیں خیال میں

اس میں شک نہیں کہ اس کے پاس ان مسائل اور فرضی قضیوں کا نہایت اطمینان بخش حل ہوتا ہے جو وہ خود اپنی جودتِ طبع سے کھڑے کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اخباری معمّے (کراس ورڈ) بنانے والوں کی طرح پہلے وہ بہت سے حل اکھٹے کر لیتا ہے اور پھر اپنے ذہنِ معماساز کی مدد سے ان سے آڑے ترچھے مسائل گھڑتا چلا جاتا ہے۔

رائے کی قطعیت اور اقتدار کی مطلقیت کا لازمی شاخسانہ یہ کہ وہ بندگانِ خدا سے
اس طرح خطاب کرتا ہے جیسے وہ سب پتھر کے عہد کے وحشی ہوں اور وہ انھیں
ظلمت سے نکال کر اپنے دورِ ناخدائی میں لانے اور بن مانس سے آدمی اور آدمی
سے انسان بنانے پر مامور مِن اللہ ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار
سے خطاب کرتا رہتا ہے مگر قدِ آدم حروف میں اس پر لکھا ہوا نوشتہ اسے نظر
نہیں آتا۔ مطلق العنانیت کی جڑیں دراصل مطلق الانانیت سے پیوست ہوتی
ہیں۔ چنانچہ اوامر و نواہی کا انحصار اس کی جنبشِ ابرو پر ہوتا ہے۔ انصاف کی خود
ساختہ ترازو کے اونچے اونچے پلڑوں کو، اپنی تلوار کا پاسنگ، کبھی اس پلڑے اور
کبھی اس پلڑے میں ڈال کر برابر کر دیتا ہے:

ہر کہ آمد عدالتِ نو ساخت

ایسی سرکارِ دولت مدار کو مابدولت مدار کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ نقلِ کفر، کفر نہ
باشد، مرزا عبدالودود بیگ تو (جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور شور سے حمایت اور
آخر میں اتنی ہی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں) ایک زمانے اپنے کان پکڑتے
ہوئے یہاں تک کہتے تھے کہ اللہ معاف کرے میں تو جب اعوذ باللہ من

الشیطان الرجیم کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رجیم سے یہی regime مراد ہے! نعوذ باللہ۔ ثم نعوذ باللہ۔

پھر جیسے جیسے امورِ سلطنت پر وفورِ تمکنت اور ہوسِ حمکرانی غالب آتی ہے۔ آمر اپنے ذاتی مخالفین کو خدا کا منکر اور اپنے چاکر ٹولے کے نکتہ چینوں کو وطن کا غدار اور دین سے منحرف قرار دیتا ہے۔ اور جو اس کے دستِ آہن پوش پر بیعت میں عجلت سے کام نہیں لیتے ان پر اللہ کی زمین کا رزق، اس کی چھاؤں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت دیتا ہے۔ ادیبوں اور تلامیذ الرحمٰن کو شاہی مطبخ کی بریانی کھلا کر یہ بتلاتا ہے کہ لکھنے والے کے کیا فرائض ہیں اور نمک حرامی کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ادب اور صحافت میں ضمیر فروش سے بھی زیادہ مفیدِ مطلب ایک اور قبیلہ ہوتا ہے جسے مافی الضمیر فروش کہنا چاہیے۔ اس سے وہ تصدیق کراتا ہے کہ میرے عہد میں اظہار و ابلاغ پر کوئی قدغن نہیں، مطلب یہ کہ جس کا جی چاہے جس زمین اور جس بحر میں قصیدہ کہے۔ قطعاً کوئی روک ٹوک نہیں۔ بلکہ وزن، بحر اور عقل سے خارج ہو تب بھی ہم خارج نہیں ہوں گے۔ بامتثالِ امر قصائدِ نو کے انبار لگ جاتے ہیں:

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ

جیسے اور دور گزر جاتے ہیں، یہ دور بھی گزر گیا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے خوف زدہ اور چڑھتے سورج کی پرستش کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں پڑے رہے کہ نہ جانے پھر کب اور کدھر سے نکل آئے۔ کبھی کسی نے کولی بھر کے زبردستی کھڑا کرنا چاہا بھی تو معلوم ہوا کہ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جوڑ بند سب اکڑ کر رہ گئے ہیں۔ اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائضِ منصبی حالتِ سجود میں ادا کرنے کے عادی و خوگر ہو گئے ہیں۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا۔

ارجنٹائن ہو یا الجزائر، ترکی ہو یا بنگلہ دیش یا عراق و مصر و شام، اس دور میں تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہی ڈراما کھیلا جا رہا ہے ۔۔۔ سیٹ، مکالمے اور ماسک کی وقتی اور مقامی تبدیلیوں کے ساتھ۔ متذکرہ صدر دس تحریریں جو اپنی ساخت، ترکیب اور دانستہ و آراستہ بے ترتیبی کے اعتبار سے مونتاژ، اور پھیلاؤ کے لحاظ سے ناول سے زیادہ قریب ہیں، اسی دورِ ضیاع کا تلخاب ہیں۔

ان میں سے صرف پانچ اس کتاب میں شامل ہیں۔ کہتے ہیں کسی نے امینول جوزف سائیز سے پوچھا کہ آپ نے انقلابِ فرانس میں کون سا شاندار کارنامہ انجام دیا تو اس نے جو سہ لفظی جواب دیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا ”(I)

survived" یعنی میں اپنے آپ کو بچالے گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں میں خود کو اپنے آپ سے بھی بچا پایا کہ نہیں۔ وطن اور احباب سے گیارہ سال دوری اور مہجوری کا جو اثر طبیعت پر مرتب ہوتا ہے اس کی پرچھائیاں آپ کو جہاں تہاں ان تحریروں میں نظر آئیں گی۔ یوں لندن بہت دلچسپ جگہ ہے اور اس کے علاوہ بظاہر اور کوئی خرابی نظر آتی کہ غلط جگہ واقع ہوا ہے۔ تھوڑی سی بے آرامی ضرور ہے، مثلاً مطلع ہمہ وقت ابر و کہر آلود رہتا ہے۔ صبح اور شام میں تمیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے لوگ A.M اور .P.M بتانے والی ڈائل کی گھڑیاں پہنتے ہیں۔ موسم ایسا جیسے کسی کے دل میں بُغض بھرا ہو۔ گھر اتنے چھوٹے اور گرم کہ محسوس ہوتا ہے کمرہ اوڑھے پڑے ہیں۔ پھر بقول ملک الشعرا فلپ لارکن یہ کیسی مجبوری کہ

"Nowhere to go but indoors"

روشن پہلو یہ کہ شائستگی، رواداری اور بردباری میں انگریزوں کا جواب نہیں۔ مذہب، سیاست اور سیکس پر کسی اور کیسی بھی محفل میں گفتگو کرنا خلافِ تہذیب اور انتہائی معیوب سمجھتے ہیں۔۔۔۔ سوائے پب (شراب خانہ) اور بار کے! گھمبیر اور نازک مسائل پر صرف نشے کی حالت میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ بے حد

خوش اطوار اور ہمدرد۔ کار والے اتنے خوش اخلاق کہ اِکلوتے پیدل چلنے والے کو راستہ دینے کے لیے اپنی اور دوسروں کی راہ کھوٹی کرکے سارا ٹریفک روک دیتے ہیں۔ مرزا عبدالودود بیگ کہ سدا کے جذباتی ٹھہرے، سرِ راہے اپنی اس توقیر سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ بے تحاشا جی چاہتا ہے زیبرا لائن پر ہی کھڑے ہو کر پہلے سب کو جھک جھک کر فرداً فرداً کورنش بجا لائیں، پھر سڑک کراس کریں۔ مختصراً یہ کہ کنجِ قفس میں اچھی گزرتی ہے:

قفس میں کوئی اذیت نہیں مجھے، صیاد!

بس ایک حشر بپا بال و پر میں رہتا ہے

کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں، ہم عصر ادیبوں، ملکی ماحول و مسائل، لوک روایت اور کلچر سے کٹ کر کبھی کوئی زندہ اور تجربے کہ دہکتی کٹھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ برطانیہ میں رہنے والے ایشائیوں میں سو میں سے ننانوے ان

خوبصورت درختوں کے نام نہیں بتا سکتے جو ان کے مکانوں کے سامنے جانے کب سے کھڑے ہیں۔ (رہا سواں آدمی، سو اس نے درختوں کو کبھی نوٹس ہی نہیں کیا) نہ ان رنگ برنگے پرندوں کے نام جو منھ اندھیرے اور شام ڈھلے چہچہاتے

ہیں۔ اور نہ اس گرل فرینڈ کے بالوں کا شیڈ بتا سکتے ہیں جس سے رات بھر بڑی روانی سے غلط انگریزی بولی۔۔۔ گولڈن آبرن، کاپر آبرن، ایش بلانڈ، چیسٹ نٹ براؤن، ہیزل براؤن، برگنڈی براؤن۔۔۔؟ کچھ معلوم نہیں۔ ان کی خیرہ نگاہیں تو "جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو" کے فلمی مقام پر آ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ غیر ملک کی زندگی اور معاشرے کا مشاہدہ اور اس کے مسائل کی تفہیم اور گرفت اتنی سرسری اور سطحی ہوتی ہے کہ کبھی میوزیم، آرٹ گیلری، تھیٹر، نائٹ کلب، سوہو کی شب تاب گلیوں کے طواف، ایسٹ اینڈ میں ذلت آمیز "مگنگ" یا چیئرنگ کراس پر گاہک کی منتظر شب زادیوں کی عنایاتِ عاجلہ سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ بہت تیر مارا تو برطانیہ شہریت حاصل کر کے وہ رہی سہی عزت بھی گنوا دی جو ٹورسٹ یا مہمان مزدور کی حیثیت سے حاصل تھی، یا بیک وقت برٹش پاسپورٹ اور "اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام" لینے کی غرض سے کسی انگریز عورت سے شادی کر لی اور اپنے حسابوں سارے انگلستان کی ازار بندی رشتے سے مشکیں کس دیں۔ نک سک اور نسلی اعتبار سے انگریزوں کا "اسٹاک" بہت اچھا ہے۔ قد کاٹھ، رنگ روپ اور تیکھے ترشے نقوش کے لحاظ سے ان کا شمار خوب صورتوں میں ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بد صورت انگریز عورت rarity (نایاب) ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے۔ یعنی ہزار میں

ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی عورت سے شادی کرتا ہے! لیکن انگریز عورت کو حبالہ نکاح میں لانے سے نہ تو انگلستاں فتح ہوتا ہے، نہ سمجھ میں آتا ہے۔

بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، خود عورت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ چناچہ جلا وطن ادیب (خواہ اس نے بہتر تنخواہ اور بدتر سلوک کی خاطر خود کو ملک بدر کیا ہو یا ذاتی اور سیاسی مجبوری کے تحت آسودہ حال جلاوطنی اختیار کی ہو) ہر پھر کر اسی چھوڑی ہوئی منزل اور گزری ہوئی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے جسے مرورِ ایام، غربت اور فاصلے نے اب آؤٹ آف فوکس کرکے گلیمرائز بھی کر دیا ہے۔ جلاوطن وہائٹ روسی ادیب اس کی بہترین مثال ہیں۔ لندن میں مقیم یا آباد اُردُو ادیبوں کا بھی کچھ ایسا ہی احوال ہوا:

کوئی ان کی بزم جمال سے کب اٹھا، خوشی سے کہاں اٹھا

جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

لندن میں اس راندہ زرگاہ پر کیا گزری اور کیسے کیسے باب ہائے خرد افروز وا ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے جس میں کچھ ایسے پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں جو: صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اسے ان شاءاللہ جلد ایک علیحدہ کتاب کی شکل میں پیش کروں گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ "زرگزشت" کی

اشاعت کے بعد ارادہ تھا کہ کوچہ ٔ سود خواراں میں اپنی خواری کی داستان، آخری باب میں باب میں جہاں ختم ہوئی ہے، وہیں سے دوسری جلد کا آغاز کروں گا۔ لیکن درمیان میں لندن، ایک اور بینک، ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف اور ''آب گم'' آ پڑے۔ کچھ اندیشہ ہائے دور دراز بھی ستانے لگے۔ مثلاً یہی کہ میرے ہم پیشہ و ہم مشرّب و ہم راز یہ نہ سمجھیں کہ بینکینگ کیریر تو محض کیموفلاژ اور بہانہ تھا۔ دراصل یکم جنوری ۱۹۵۰ء یعنی ملازمت کے روزِ اوّل ہی سے میری نیّت میں فتور تھا۔ محض مزاح نگاری اور خود نوشت کے لیے سوانح اکھٹے کرنے کی غرض سے فقیر اس حرام پیشے سے وابستہ ہوا (وہ بھی کیا زمانہ تھا جب حرام پیسے کی صرف ایک ہی شکل ہوا کرتی تھی۔۔۔ سود!) دوسری حوصلہ شکن الجھن جو ''زرگزشت'' حصّہ دوم کی تصنیف میں مانع ہوئی، یہ تھی کہ یہ اُردُو فکشن کا سنہری دور ہے۔ آج کل اُردُو میں بہترین فکشن لکھی جارہی ہے۔۔۔۔ خود نوشت اور سفر ناموں کی شکل میں! افسانے اور ناول ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ افسوس، میرے یہاں سوانح کا اتنا فقدان ہے کہ تادمِ تحریر، زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پیدائش ہے (بچپن کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ یہ تھا کہ بڑا ہو گیا) اور غالباً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس پر میں کوئی تین ایکٹ کا سنسنی خیز ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ تیسرا سبب خامہ خود بین و خود آرا کو روکے رکھنے کا یہ کہ اس

اثنا میں لارڈ کونٹن کے تاثرات نظر سے گزرے۔ وہ ٹرینٹی کالج، آکسفورڈ کا پریسیڈنٹ اور بورڈ آف برٹش لائبریری کا چیئر مین ہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں عزّت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں بیس ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں خود نوشت سوانح عمری کو سوانح عمری کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا۔ مزاح کی الماری میں رکھتا ہوں! عاجز اس کی ذہانت پر ہفتوں عش عش کرتا رہا کہ اس کی خود نوشت سوانح نو عمری زر گزشت پڑھے بغیر وہ زیرک اس نتیجے پر کیسے پہنچ گیا۔ ابھی اگلی ظرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناسٹل جیا ہے۔۔۔۔۔۔ زمانی اور مکانی، انفرادی اور اجتماعی۔ جب انسان کو ماضی، حال سے زیادہ پر کشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جوانی لیوا حملہ کسی بھی عمر میں بالخصوص بھری جوانی میں ہو سکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروئن دستیاب نہ ہو تو پھر اسے یادِ ماضی اور فینٹسی میں، جو تھکے ہاروں کی آخری پناہگاہ ہے، ایک گونہ سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کچھ حوصلہ اور جفاکش لوگ اپنے زورِ بازو سے اپنا مستقبل بناتے ہیں، اسی طرح وہ زورِ تخیل سے اپنا

ماضی آپ بنالیتا ہے۔ پھر اندر ہی اندر کہیں ابھرتی، گم ہوتی سوت ندیوں اور کہیں کاریزوں کی صورت، خیال بگولوں میں بوئی ہوئی کھیتی کو سینچتا رہتا ہے اور کہیں اچانک کسی چٹان سے چشمہ آبِ زندگانی بن کے پھوٹ نکلتا ہے۔

کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے۔ جو قوم جتنی پسماندہ، درماندہ اور پست حوصلہ ہو، اس کو اپنا ماض، معکوس اقلیدسی تناسب (inverse geometrical ratio) میں اتناہی درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار و ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے۔ اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتاً تھا، بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سرِ نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے۔۔۔۔۔ماضی تمنائی۔ اس پاستان طرازی کے پس منظر میں مجروح ان کا طاؤسی رقص دیدنی ہوتا ہے کہ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ناسٹل جیا اسی لمحہ منجمد کی داستان ہے۔

شکست خوردہ انا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں تراشتی ہے، یہ اپنے اپنے ذوق، ظرف، تابِ ہزیمت اور طاقتِ فرار پر منحصر ہے۔۔۔ تصوف، تقشف، مراقبہ، شراب، مزاح، سیکس، ہیروئن، ویلیم، ماضی تمنائی، فینٹسی (خوابِ نیم روز)۔۔۔۔۔ جس کو جو نشہ راس آجائے۔ آرنلڈ نے ہار جانے والے مگر نہ ماننے والے، دھیان دھول میں لت پت مشرق کی ہار سہار کے بارے میں لکھا تھا:

The East bow'd low before the blast

In patient, deep disdain

She let the legions thunder past

And plunged in thought again

اس مغرور مراقبے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ خواب آور اور گہرا نشہ جو انسان کو حاضر و موجود سے بے نیاز کر دیتا ہے، خود اپنے لہو میں کسی خواب یا خیال کے فشار و آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بے خودی میسر آجائے تو پھر سب گوارا، سب کچھ پذیرا۔

ہزار آشفتگی مجموعہ یک خواب ہو جائے

صاحب مراۃ الخیال سے روایت ہے کہ جب کفر و برہنگی کے الزام میں سرمد کو پابجولاں شہادت گاہ لے جایا گیا تو وہ تیغ بکف جلّاد کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور گویا ہوا ”فدائے تو شوم! بیا بیا کہ تو بہر صورت می آئی من ترا خوب می شناسی“ پھر یہ شعر پڑھا اور سر تلوار کے نیچے رکھ کر ابدی نیند سو گیا۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

قدیم زمانے میں چین میں دستور تھا کہ جس شخص کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا، اس کی ناک پر سفیدی پوت دیتے تھے۔ پھر وہ دکھیا کتنی بھی گھمبیر بات کہتا، کلاؤن ہی لگتا تھا۔ کم و بیش یہی حشر مزاح نگار کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی فولس کیپ اتار کر چھینک بھی دے تو لوگ اسے جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہنا دیتے ہیں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ کوچہء سود خوراں میں سر پر دستار رہی یا نہیں، تاہم آپ اس کتاب کا موضوع، مزاج اور ذائقہ مختلف پائیں گے۔ موضوع اور تجربہ خود اپنا پیرایہ اور لہجہ متعیّن کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال خدا کے حضور مسلمانوں کا شکوہ اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی نخرے چونچلے کرتی زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے۔

رسوا کی امراؤ جان ادا اور طوائفوں سے متعلق منٹو کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی جنّاتی زبان میں کر کے انہیں (طوائفوں کو) بالجبر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی صفحہ سن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔ وہ تو وہ، خود ہم اپنے طرزِ نگارش و معاش سے توبہ کر لیں کہ آج وہ، کل ہماری باری ہے۔ بہر کیف، اس بار موضوع، مواد اور مشاہدات سب قدرے مختلف تھے۔ سو وہی لکھا جو دیکھا۔ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

قصّہ گو قلندر کو اپنی عیاری یا راست گفتاری کا کتنا ہی زعم ہو، اور اس نے اپنا سر کتنا ہی باریک کیوں نہ ترشوار کھا ہو، بافنگانِ حرف و حکایت کی پرانی عادت ہے کہ کہانی کا تانا بانا بنتے بنتے اچانک اس کا رنگ، رخ اور ذائقہ بدل دیتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی کہتے کہتے خود کہنے والے کو کُچھ ہو جاتا ہے۔ وہ پھر وہ نہیں رہتا کہ جو تھا۔ سو کچھ ایسی ہی واردات اس نامہ سیاہ راقمِ سطور کے ساتھ ہوئی۔ وَاَنّہٗ ھوَاَضحکَ وَابکیٰ[1]

چنگ را گیرید از ستم کہ کار از دست رفت

[1] اور یہ کہ وہی ہنستا ہے اور وہی رلاتا ہے۔ قرآن مجید-۲۷ قال فما خطبکم-النجم ۵۳

نغمہ ام خوں گشت و از رگہائے ساز آید بروں ا

یہ نہ ادّعا ہے، نہ اعتذار، فقط گزارشِ احوالِ واقعی ہے۔

بحمد للہ! میں اپنی طبعی اور ادبی عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں انسان تحسین اور تنقیض دونوں سے اس درجہ مستغنی ہو جاتا ہے کہ ناکردہ خطاؤں تک کا اعتراف کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتا؟ چنانچہ اب مجھے "کسے کہ خنداں نہ شد از قبیلہ مانیست" پر اصرار کے باوجود یہ اقرار کرنے میں خجالت محسوس نہیں ہوتی کہ میں طبعاً، اصولاً اور عادتاً یاس پسند اور بہت جلد شکست مان لینے والا آدمی ہوں۔ قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدّر ہے۔ مزاح نگاری کے باوا آدم ڈین سوفٹ پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور اس کی یاس پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی پیدائش کو ایک المیہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اپنی سالگرہ کے دن بڑے التزام سے سیاہ ماتمی لباس پہنتا اور فاقہ کرتا تھا۔

مارک ٹوین پر بھی اخیر عمر میں کلبیت طاری ہو گئی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان مشاہیر محتشم سے تمہاری مماثلت بس اسی حد تک ہے۔ بہر حال، قبل از وقت مایوس ہو جانے میں ایک فائدہ یہ دیکھا کہ ناکامی اور صدمے کا ڈنک اور ڈر پہلے ہی

ا میرے ہاتھ سے ساز لے لو کہ میرا کام تمام ہو چکا۔ میرا نغمہ خون ہو کر ساز کے تاروں سے نہ نکلا ہے۔

نکل جاتا ہے۔ بعض نامور پہلوانوں کے گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ ہونہار لڑکے کے بزرگ اس کے کان بچپن میں ہی توڑ دیتے ہیں، تاکہ آگے چل کر کوئی ناہنجار پہلوان توڑنے کی کوشش کرے تو ذرا تکلیف نہ ہو۔ مزاح کو میں دفاعی میکے نزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں، اس شخص کا زرہ بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔ زین بدھ ازم میں ہنسی کو گیان کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اونچ نیچ کا سچا گیان اس سمے پیدا ہوتا ہے جب کھمبے پر چڑھنے کے بعد کوئی نیچے سے سیڑھی ہٹا لے۔ مگر ایک کہاوت یہ بھی سُنی کہ بندر پیڑ کی پھننگ پر سے زمین پر گر پڑے تب بھی بندر ہی رہتا ہے۔

"حویلی" کی کہانی ایک متروکہ ڈھنڈورا حویلی اور اس کے مغلوب الغضب مالک کے گرد گھومتی ہے۔ "اسکول ماسٹر کا خواب" ایک دُکھی گھوڑے، حجّام اور مُنشی سے متعلق ہے۔ "شہر دو قصّہ" ایک چھوٹے سے کمرے اور اس میں پچھتر سال گزار دینے والے سنکی آدمی کی کہانی ہے "دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ" میں ایک قدیم قصباتی اسکول اور اس کے ایک ٹیچر اور بانی کے کیری کیچرا[1] پیش کیے گئے ہیں۔ اور "کار، کابلی والا اور الہ دین بے چراغ" ایک کھٹارا کار، ناخواندہ

---

[1] کیری کیچور؛ مسخاکے (مسخ خاکے)

پٹھان آڑھتی اور شیخی خورے اور لپاڑی ڈرائیور کا حکایتی طرز میں ایک طویل خاکہ ہے۔ ان میں جو کردار مرکزی، ثانوی یا محض ضمنی حیثیت سے ابھرتے ہیں، وہ سب کے سب اصطلاحاً بہت "عام" اور سماجی رتبے کے لحاظ سے بالکل "معمولی" ہیں۔ اسی لیے خاص التفات اور تامّل چاہتے ہیں۔ میں نے زندگی کو ایسے ہی لوگوں کے حوالے سے دیکھا، سمجھا، پرکھا اور چاہا ہے۔ اسے اپنی بد نصیبی ہی کہنا چاہیے کہ جن "بڑے" اور "کامیاب" لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، انہیں بحیثیت انسان بالکل ادھورا، گرہ دار اور یک رُخا پایا۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جس کثیر تعداد میں قادرِ مطلق نے عام آدمی بنائے ہیں، اسے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بنانے میں اسے خاص لطف آتا ہے، وگرنہ اتنے سارے کیوں بناتا۔ اور قرن با قرن سے کیوں بناتا چلا جاتا۔ جب ہمیں بھی یہ اتنے ہی اچھے اور پیارے لگنے لگیں تو جاننا چاہیے کہ ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اس ایسے ہی عام انسانوں کا تذکرہ ہے۔ ان کی الف لیلیٰ ایک ہزار ایک راتوں میں بھی ختم نہیں ہو سکتی کہ

ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

ممکن ہے بعض طبائع پر جزئیات کی کثرت اور پلاٹ کا فقدان گراں گزرے۔ میں نے پہلے کسی اور ضمن میں عرض کیا ہے کہ پلاٹ تو فلموں، ڈراموں، ناولوں اور سازشوں میں ہوتا ہے۔ ہمیں تو روزمرہ کی زندگی میں دُور دُور اس کا نشان نہیں ملا۔ رہی جزئیات نگاری اور باریک بینی تو اس میں فی نفسہ کوئی عیب نہیں۔ اور نہ خوبی۔ جزئیات اگر محض خوردہ گیری پر مبنی نہیں، اور سچی اور جان دار ہیں تو اپنی کہانی اپنی زبانی کہتی چلی جاتی ہیں۔ انھیں توڑ مروڑ کر افسانوی سانچے میں ڈھالنے یا کسی آدرشی شکنجے میں کسنے کی ضرورت نہیں۔ گکول، چخیف اور کلاڈ سیمون زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اپنے کینوس پر بظاہر بڑی لاپروائی سے بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ پروست نے ایک پورا ناول ایک ڈنر پارٹی کی تفصیل بیان کرنے میں لکھ دیا جو یادوں کے total recall (مکمل بازآفرینی) کی بہترین مثال ہے[1]۔ انگریزی کے عظیم ترین (بغیر پلاٹ کے) ناول Ulysses کی کہانی ۱۶ جون ۱۹۱۶ء کو صبح آٹھ بجے شروع ہو کر اسی دن ختم ہو

---

[1] ہم نے "یادوں کی برات" کا قصداً ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس میں دولہا براتیوں کے کاندھے پر سوار انھیں چھوہاروں سے مارتا اپنی شہنائی آپ بجاتا جاتا ہے۔ آرسی مصحف کے دوران آئینے میں اپنی ہی صورت دیکھ کر ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ دلہن کا چہرہ اسے نظر ہی نہیں آتا۔ اس کے بعض کرداروں کے نام اور کارنامے آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔

جاتی ہے۔ یوجین اونیل کے ڈرامے Long Day's Journey Into Night کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ ان شاہکاروں کا حوالہ دینے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر میری کچھ بات نہیں بنی تو یہ تکنیک کا قصور نہیں، سراسر میری کم سوادی اور بے ہنری ہے پیڑ گنتا رہ گیا، جنگل کا سماں نہ دکھلا سکا۔ آبشار نیاگرا کی ہیبت اور بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنا ضروری ہے۔ میں جتنی بار اوپر دیکھتا ہوں، کلاہِ پندار قدموں پر آن پڑتی ہے۔

یہاں ایک ادبی بدعت اور بد مذاقی کی وضاحت اور معذرت ضروری سمجھتا ہوں۔ فارسی مصرعوں اور اشعار کے معنی فٹ نوٹ یا قوسین میں دینے کی دو وجہیں ہیں۔ اولاً، نئی نسل کے پڑھنے والوں کو اُن کے معنی معلوم نہیں۔ دوم، خود مجھے بھی معلوم نہیں تھے۔ تفصیل اس اجمالِ پُرملال کی یہ کہ عاجز نے باقاعدہ فارسی صرف چار دن چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور آمد نامہ کی گردان سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ ڈرائنگ لے لی۔ ہر چند کہ اس میں گردان نہیں تھی، لیکن مقاماتِ آہ وفغاں کہیں زیادہ نکلے۔ اس میں میٹرک تک میری مہارت صراحی اور طوطا بنانے سے آگے نہ بڑھ پائی۔ اور میں ہر دو اشیاء ڈرائنگ میں اسپیشلائز کرنے سے پہلے بھی بالکل ویسے ہی بنا سکتا تھا۔ ڈرائنگ ماسٹر

کہتا تھا کہ تم اپنا نام اتنی محبّت اور محنت سے لکھتے ہو اور تمہاری lettering (حرف کشی) اتنی خوبصورت ہے کہ تمھیں فیل کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر تم اسکیچ کے نیچے یہ نہ لکھو کہ یہ انگور کی بیل ہے تو تمہیں سو میں سے سو نمبر ملیں۔

تین کرم فرما ایسے ہیں جو بخوبی جانتے ہیں کہ میں فارسی سے نابلد ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے خطوط اور گفتگو میں صرف فارسی اشعار سے میری چاند ماری کرتے ہیں۔ دس بارہ برس تو میں ستائشی حیرت، دوستانہ درگزر اور مؤدبانہ نافہمی کے عالم میں یہ سب جھیلتا رہا۔ پھر اوسان درست ہوئے تو یہ وتیرہ اختیار کیا کہ اپنے جن احباب کے بارے میں مجھے بخوبی علم تھا کہ فارسی میں ان کی دست گاہ میرے برابر (یعنی صفر) ہے، انھیں ان اشعار سے ڈھیر کرنے لگا۔ اس عمل سے میری توقیر اور رعبِ فارسی دانی میں دس گنا اضافہ ہوا اور لطفِ صحبت و مراسلت میں اسی قدر کمی واقع ہو گئی۔ اس کتاب میں فارسی کے جو اشعار یا مصرعے جہاں تہاں نظر آئیں وہ ان ہی تین کرم فرماؤں کے بے طلب عطایا میں سے ہیں۔ یہ ہیں درویش بے ریا و ریش برادرم منظور الٰہی بخش (مصنّف دردل کشا اور سلسلۂ روز وشب) جو پُرسشِ حال کے لیے بصرفِ کثیر لاہور سے لندن انٹرنیشنل کال بھی کریں تو پہلے علالت و عیادت سے متعلق فارسی اشعار سناتے ہیں۔ پھر میری فرمائش پر ان کا اُردُو ترجمہ و تشریح۔ اتنے میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور آپریٹر

لائن کاٹ دیتا ہے۔ دوسرے دن وہ مجھے محبّت، معذرت اور فارسی اشعار سے لبریز خط لکھتے ہیں کہ معاف کیجیے، آپ کا آپریشن کِس چیز کا ہوا تھا اور اب طبیعت کیسی ہے۔ جب سے سنا ہے بہت تردّد ہے۔ وقت ضائع کرنے پر سعدی نے کیا خوب کہا ہے۔۔۔ مگر بیدل نے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا واہ واہ!

دوسرے کرم فرما ہیں ڈاکٹر ضیاءالدین شکیب کہ جب بھی برٹش لائبریری جاتے ہیں، بک اسٹال سے ایک خوب صورت اور سمجھ میں آنے والا تصویری پوسٹ کارڈ خریدتے ہیں۔ پھر اس پر فیضی، بیدل یا طالب آملی کے شعر سے پانی پھیر کر مجھے پوسٹ کر دیتے ہیں۔ اور تیسرے ہیں حبیب لبیب و صاحبِ طرز ادیب مجی مختار مسعود جو عاجز کے وسیع و عمیق علمی خلا کو پُر کرنے میں رُبع صدی سے جٹے ہوئے ہیں۔ اپنے دل پسند موضوعات پر گھنٹوں ہمارے آگے بین بجاتے ہیں اور مجبوراً خود ہی جھومتے رہتے ہیں۔ کئی بار ان سے پوچھا، حضورِ والا! آپ کو کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں؟ مگر وہ کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں۔ خود ذرا کریڈٹ نہیں لیتے۔ بس آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اور اسی انگلی سے اپنا کان پکڑ کر اگر بیٹھے ہوں تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہوں تو بیٹھ جاتے ہیں۔ انکسار واستغفار کے مخلوط

اظہار کے لیے یہ ان کی ادائے خاص ہے، جس کے دوست و دشمن سب قتیل ہیں۔

فارسی اشعار کے جو معنی آپ حواشی میں ملاحظہ فرمائیں گے، وہ اِن ہی کرم فرماؤں سے پوچھ کر لکھ دیے ہیں تاکہ سند رہے اور بھول جاؤں تو دوبارہ ان سے رجوع نہ کرنا پڑے۔ خصوصاً مختار مسعود صاحب سے کہ جب سے وہ آر۔ سی۔ ڈی کے سلسلے میں ترکی کے سرکاری پھیرے لگا آئے ہیں اور مزارِ پیر رومی کے گردونواح میں درویشوں کا والہانہ رقص بچشمِ حیراں دیکھ آئے ہیں، فارسی اشعار کا مطلب ہمیں ترکی کے حوالے سے سمجھانے لگے ہیں۔ یوں تو ہم اپنے ایک اور دیرینہ کرم فرما، پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ آسان شعر کو بھی اپنے علم کے زور اور وفور سے ناقابلِ فہم بنا دیتے ہیں۔

آساں زِ توجّہ تو مشکل

مشکل زِ تجاہل تو آساں [1]

---

[1] معذرت کے ساتھ "آسان" اور "مشکل" کی ترتیب اُلٹی کر دی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ فارسی شعر کی مار آج کل کے قاری سے سہی نہیں جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب وہ بے محل بھی ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم صرف اپنے پسندیدہ فارسی اشعار ٹانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بے محل نہیں ہوتے ملحقہ نثر بے محل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نثر کا تمام ریشمی کوکون (کویا) اپنے گاڑھے گاڑھے لعابِ ذہن سے فارسی کے گرد بُنتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ریشم حاصل کرنے کا زمانہ قدیم سے ایک ہی طریقہ چلا آتا ہے_ کوئے کو ریشم کے زندہ کیڑے سمیت کھولتے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب تک کہ وہ مر نہ جائے، ریشم ہاتھ نہیں لگتا۔

مرزا کہتے ہیں کہ کلامِ غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں۔ وہ نہ ہوں تو غالب کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دُگنا مزہ دیتا ہے۔ خدا ان تین عالموں کے درمیان اس فقیر پُر تقصیر کو سلامت بے کرامت رکھے۔ جب سے میری صحت

تحریف کے بعد مطلب یہ کہ تیری توجّہ سے تو آسان بات بھی مشکل بن جاتی ہے اور تجھ سے رجوع نہیں کریں تو مشکل بات بھی آسان ہو جاتی ہے۔

خراب ہوئی ہے، ان کی طرف سے متردد رہتا ہوں، کس کے گھر جائے گا سیلابِ روان میرے بعد۔

ایک دفعہ میں نے منظور الٰہی صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے اپنی دونوں کتابوں میں فارسی کے نہایت خوب صورت اشعار نقل کیے ہیں۔ لیکن میری طرح، قارئین کی نئی نسل بھی فارسی سے نابلد ہے۔ یوں ہی شُد بُد اور اٹکل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اگر اگلے ایڈیشن میں بریکٹ میں ان کا مطلب اُردُو میں بیان کر دیں تو سمجھنے میں آسانی ہو گی ۔

سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے، بند ہونٹوں سے اپنے دل آویز انداز میں مسکرائے۔ فرمایا، مگر بھائی صاحب! پھر مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس پر مرزا کہنے لگے "تم نے اس کتاب میں جو ڈھیر سارے انگریزی الفاظ بے دھڑنگ (مرزا بے درنگ کا یہی تلفّظ کرتے ہیں جو اُن کے منہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے) استعمال کیے ہیں، ان پر بھی یہی فقرہ چست کیا جا سکتا ہے۔ انگریز تو دوسری زبانوں کے الفاظ خاص خاص موقعوں پر دانستہ اور مصلحتاً استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے کھانے پھیکے سیٹھے اور بد مزہ ہوتے ہیں، لہٰذا اعلیٰ ریستورانوں میں ان کے نام ہمیشہ فرنچ میں دیے جاتے ہیں۔ فرنچ آج بھی شائستگی اور سوفسٹی

کیشن کی زبان تصوّر کی جاتی ہے۔ لہٰذا انگریزوں کو کوئی آرٹسٹک یا ناشائستہ بات کہنی ہو تو جھٹ فرنچ فقرے کا گھونگھٹ نکال لیتے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہو گا کہ سیمسول پیپس (۱۷۰۳۔۱۶۳۳) نے اپنی شہرہ آفاق ڈائری (جس میں اس نے اپنی آوارگیوں اور شبینہ فتوحات کا حاصل بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے) شارٹ ہینڈ میں لکھی تھی تاکہ اس کے ملازم نہ پڑھ سکیں۔ جہاں کوئی ایسا نازک مقام آتا جسے انگریز اپنی روایتی کسرِ بیانی سے (understatement) کام لیتے ہوئے، naughty کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، تو وہ اس واردات کا اندراج فرنچ میں کرتا تھا۔ لیکن جہاں بات اتنی ناگفتنی ہو۔۔۔جو کہ اکثر ہوتی تھی۔۔۔کہ فرنچ زبان بھی سُلگ اٹھے تو اس رات کی بات کو بلا کم و کاست ہسپانوی زبان میں قلم بند کرتا تھا۔ گویا یہ ہوئی لسانی درجہ بندی باعتبارِ مدارجِ بوالہوسی۔ اب ذرا علوم کی طرف نگاہ کیجیے۔ انگریزوں نے درختوں اور پودوں کے نام اور بیشتر قانونی اصطلاحیں جوں کی توں لاطینی سے مستعار لی ہیں۔ دانائی کی باتیں وہ بالعموم یونانی زبان میں الٹے واوین کے اندر نقل کرتے ہیں تاکہ کوئی انگریز نہ سمجھ پائے۔ اوپیرا کے پکے گانوں کے لیے اٹالین اور فلسفے کی ادق اصطلاحات کے لیے جرمن زبان کو ترجیح دے کر نا قابلِ فہم کو نا قابلِ برداشت بنا دیتے ہیں"۔

اس طولانی تمہید کے بعد فرمایا ''لیکن ہم انگریزی کے الفاظ صرف ان موقعوں پر استعمال کرتے ہیں جہاں ہمیں یقین ہو کہ اس مفہوم کو اُردُو میں کہیں بہتر طریقے سے ادا کیا جا سکتا ہے''۔

اس بروقت تنبیہ کے باوجود آپ کو انگریزی کے الفاظ جا بجا نظر آئیں گے۔ سبب یہ کہ یا تو مجھے ان کے اُردُو مترادفات معلوم نہیں۔ یا وہ کسی رواں دواں مکالمے کی بُنت میں پیوست ہیں۔ بصورتِ دیگر، بہت مانوس اور عام فہم ہونے کے علاوہ اتنے غلط تلفّظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں کہ اب انھیں اُردُو ہی سمجھنا چاہیے۔ کوئی انگریز انھیں پہچاننے یا اپنانے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

''اسکول ماسٹر کا خواب'' اور ''دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ'' پر محب و مشفقِ دیرینہ محمد عبدالجمیل صاحب نے بکمالِ لطف و توجہ نظر ثانی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ جیسے نفاست پسند اور منکسر مزاج وہ خود تھے ویسے ہی دھیمے ان کے اعتراضات تھے جو انھوں نے میرے مسودے کے حاشیے پر اتنی ہلکی پینسل سے نوٹ کیے تھے کہ انگلی بھی پھیر دیں تو مٹ جائیں کچھ ایسی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی جن کی اصلاح پر خامہ ہذیاں رقم کسی طور آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مثلاً میں نے ایک ترش مکالمے کے دوران گجراتی سیٹھ سے کہلوایا تھا ''ہم اس سالے

لنگڑے گھوڑے کو لے کے کیا کریں گا؟" جمیل بھائی کی لکھنوی شائستگی اس کی متحمل نہ ہوئی۔ تا دیباً پورا جملہ تو نہیں کاٹا، صرف سالے کو قلم زد کر کے اس کے اوپر برادر نسبتی لکھا پھر فرمایا کہ "حضرت، یہ ہک دک کیا ہوتا ہے؟ ہکا بکا لکھیئے۔ ہمارے یہاں ہک دک نہیں بولا جاتا"۔ عرض کیا "ہکا بکا میں صرف پھٹی پھٹی آنکھیں اور کھلا ہوا منھ نظر آتا ہے، جب کہ ہک دک میں ایسا لگتا جیسے دل بھی دھک سے رہ گیا ہو"۔ فرمایا "تو پھر سیدھے سبھاؤ دھک دھک کرنے لگا کیوں نہیں لکھتے؟ اور ہاں! مجھے حیرت ہے کہ ایک جگہ آپ نے لُوطی لکھا ہے ذلتِ قلم ہی کہوں گا۔ معاف کیجیے! یہ لفظ آپ کے قلم کو زیب نہیں دیتا"۔

پوچھا "تو پھر آپ کے ہاں لُوطی کو کیا کہتے ہیں؟"

فرمایا "کچھ نہیں کہتے"۔

میں زور سے ہنس دیا تو چونکے۔ دوسرے پہلو پر خیال گیا تو خود بھی دیر تک ہنستے رہے۔

رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے "ایسا ہی ہے تو اس کی جگہ "بدتمیز" لکھ دیجیے۔ تہذیب کا تقاضہ یہی ہے"۔ یہ سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس لیے کہ میں نے یہ لفظ (بدتمیز) دوسرے ابواب میں تین چار جگہ ایسے لوگوں کے بارے

میں استعمال کیا تھا جو صرف لغوی معنی میں بد تمیزی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس نئے مہذب مفہوم کے ساتھ تو وہ مجھ پر بہتان طرازی اور ازالہ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ چلا سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد کلف لگے کرتے کی آستین الٹ کر مسودے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے دواب خانہ، سنگوٹیاں، آر اور جو جھنا شرفائے لکھنو نہیں بولتے"۔ عرض کیا "میں نے اِسی لیے لکھے ہیں"۔ پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے "بہت دیر بعد آپ نے ایک سمجھ داری کی بات کہی"۔ پھر اس خوشی میں سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے مگر مشتاق صاحب، یہ بوک کیا ہوتا ہے؟ ہم نے نہیں سنا"۔ عرض کیا جوان اور مست بکرا جس سے نسل کشی کے سلسلے میں رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی داڑھی ہے اور جسم سے سخت بدبو آتی ہے۔ گوشت بھی بساندہ اور ریشے دار"۔ فرمایا "واللہ! ہم نے یہ لفظ ہی نہیں ایسا بکرا بھی نہیں دیکھا۔ لفظ، مفہوم اور اس کے گوشت تینوں سے کراہت آتی ہے۔ مقئی ہے۔ آپ اس کی جگہ کوئی اور کم بدبودار جانور استعمال نہیں کر سکتے؟ کراچی میں کون اس لفظ کو سمجھے گا"۔ عرض کیا وہی جو مقئی (قے آور) کو سمجھے گا۔ آپ تو غالب کے حافظ ہیں۔ آپ کو تو یہ لفظ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ضد کا غالب نے عجیب سیاق وسباق میں ذکر کیا ہے۔ علائی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ تم خصی بکروں کے

گوشت کے قلیے اڑا رہے ہو گے۔ لیکن بخدا میں تمہارے پلاؤ قلیے پر رشک نہیں کرتا۔ خدا کرے تمھیں بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا میسر نہ آیا ہو۔ جب یہ تصوّر کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری ٹکڑے کو چبا رہے ہوں گے تو رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔ تحقیق طلب امر یہ ہے کہ اس مصری کی ڈلی سے دراصل غالب کی کیا مراد تھی۔ محض مصری؟ سو وہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی، دلّی میں منوں دستیاب تھی۔ حیرت ہے محققین و شارحین کی طبعِ بدگماں ادھر نہیں گئی، حالاں کہ غالب نے مصری کے تلازمے عشق عاشقی کے ضمن میں ایک دوسرے خط میں بھی استعمال کیا ہے"۔

فرمایا "جا چھوڑ دیا حافظِ دیوان سمجھ کر۔ لیکن حضرت، یہ روہڑ کس زبان کا لفظ ہے؟ کریہہ الصّورت۔ بالکل گنوار لگتا ہے۔ کیا راجھستانی ہے؟" عرض کیا "خود ہمیں بھی یہی شبہ ہوا تھا۔ لہٰذا ہم نے ماجد بھائی سے پوچھا"۔

"کون ماجد بھائی؟"

"ماجد علی صاحب۔ سابق سی ایس پی۔ لندن منتقل ہو گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے، اپنے بیگانے، باس اور ماتحت، سب انھیں ماجد بھائی کہتے ہیں، سوائے ان کی بیگم، زہرا نگاہ کے۔ وہ انھیں ماجد چچا کہتی ہیں۔ ان سے رجوع کیا تو انھوں نے

تصدیق کر دی کہ لحاف کی پرانی روئی کو، جسے غریب غربا ہاتھوں سے تُوم کے دوبارہ استعمال کرتے ہیں، رُوہڑ کہتے ہیں"۔

یوں تو وہ عاجز کے لیے پیر و مرشد کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند ہی ہوتا ہے، تاہم میں نے مزید تشفی کے لیے پوچھا "کیا بداؤں میں بھی بولا جاتا ہے؟" چہرے پر ایک بناوٹی اور لہجے میں خفیف سی مصنوعی لکنت پیدا کرتے ہوئے، جو بحثا بحثی میں عصائے موسوی کا کام کرتی ہے، بولے "دیکھیے، ذاتی بے تکلفی اپنی جگہ، علمی مباحث اپنی جگہ، بدایوں کو بداؤں کہنے کا حق صرف بدایوں والوں کو پہنچتا ہے۔ مثلاً یوں سمجھیے کہ کل کلاں کو آپ مجھے ماجد بھائی کی بجائے ماجد چچا کہنے لگیں تو لندن پولیس پولی گیمی (تعددِ ازواج) میں دھر لے گی۔ آپ کا تو مزید کچھ نہیں بگڑے گا۔ بہر کیف رُوہڑ صحیح ہے۔ بداؤں میں تو پھیری والے گھر گھر صدا لگا کے رُوہڑ خریدتے تھے اور اس کے بدلے ریوڑیاں دیتے تھے جنھیں اندھے آپس میں بانٹ لیتے تھے"۔ علمی تحقیق و تدقیق کا جذبہ اب مجھے اس مقام پر لے آیا تھا جہاں مزید سوال کرنا گویا اپنی دستارِ فضیلت سے سے خود فٹ بال کھیلنے کے مترادف تھا۔ ماجد بھائی کی بذلہ سنجی کے آگے اچھے اچھے نہیں ٹھہر پاتے۔ راویِ غیبت بیاں کہتا ہے کہ ایک دفعہ ان کے باس (وزیر) کے دفتر کے سامنے کچھ دور پر لوگ عزتِ مآب کے خلاف ایوب خان کا چمچہ! ایوب

خان کا چمچہ !" کے نعرے لگا رہے تھے۔ وزیر موصوف نے ماجد بھائی سے پوچھا یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا سر، کٹلری کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں"۔

جمیل صاحب اس طویل تشریح اور معتبر سند سے کچھ پسیجے۔ ناک سے سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے بولے "اگر آپ کو صاف روئی سے الرجی ہے تو رُوہڑ بھی چلے گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ متروکات کو آپ بہت فیسی نیٹ، کرتے ہیں۔ خیر، مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔ کس واسطے کہ مجھے انٹیک جمع کرنے کا شوق ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو اتنے اچھے نہ لگیں۔ بریکٹ میں معنی لکھ دیجیے گا "۔

عرض کیا مرزا اکثر طعنہ دیتے ہیں کہ تم ان معدودے چند لوگوں میں سے ہو، جنھوں نے متروکہ جائداد کا کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ چلتے وقت تم اپنے ساتھ متروکات کا دفینہ کھود کر، سمو چا ڈھو کر پاکستان لے آئے! تفنن بر طرف، اگر ان میں سے ایک لفظ، جی ہاں، صرف ایک لفظ بھی دوبارہ رائج ہو گیا تو سمجھوں گا کہ عمر بھر کی محنت سوارت ہوئی"۔

بولے "پھر وہی!"

افسوس، جمیل صاحب صرف دو ابواب دیکھ پائے تھے کہ ان کا بلاوا آ گیا۔ اب ایسا نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس کہاں سے لاؤں جس کا اعتراض بھی نکتہ پروری، استعداد آفرینی اور دل آسائی سے خالی نہ تھا۔

آخر میں اپنی شریک (سوانح) حیات ادریس فاطمہ کا شکریہ بھی لازم ہے کہ انھوں نے اپنے تبسم سقم شناس سے بہت سی خامیوں کی نشان دہی کی۔ تاہم بے شمار سخن ہائے سوختنی اور غلطی ہائے مضامین بوجوہ باقی رہ گئی ہوں گی۔ وہ سارا مسودہ دیکھ چکیں تو میں نے کہا "راجھستانی لہجہ اور محاورہ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہت دھوتا ہوں پر چنری کے رنگ چھٹائے نہیں چھوٹتے۔

Out, damned spot! I say!

حیرت ہے اس دفعہ تم نے زبان کی ایک بھی غلطی نہیں نکالی!"

کہنے لگیں پڑھائی ختم ہوتے ہی علی گڑھ سے اس گھر، گڑھی میں آ گئی۔ تینتالیس برس ہو گئے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری زبان کیا تھی اور تمہاری بولی کیا۔ اب تو جو سنتی ہوں سبھی درست معلوم ہوتا ہے"۔

ایک دوسرے کی چھاپ، تِلک سب چھین کر اپنا لینے کے اور دریائے سندھ اور راوی کا پانی پینے کے بعد تو یہی کچھ ہونا تھا۔ اور جو کچھ ہوا بہت خوب ہوا۔ فالحمدللہ ربِ العالمین۔

حویلی

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یادش بخیر! میں نے ۱۹۴۵ میں جب قبلہ کو پہلے پہل دیکھا تو ان کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے۔ لیکن ذکر ہمارے یار طرح دار بشارت علی فاروقی کے خُسر کا ہے، لہٰذا تعارف کچھ انہی کی زباں سے اچھا معلوم ہو گا۔ ہم نے بارہا سنا آپ بھی سنئے۔

"وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ جس زمانے میں میرے خُسر نہیں بنے تھے تو پھوپا ہوا کرتے تھے اور پھوپا بننے سے پہلے میں انہیں چچا حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے، مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں مراد آباد اور کانپور میں رشتے ناتے ابلی ہوئی سویوں کی طرح الجھے اور پیچ در پیچ گتھے ہوتے ہیں۔ ایسا جلالی، ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ بارے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدھی اِدھر، آدھی اُدھر، چالیس کے لگ بھگ تو ہو گی۔ لیکن صاحب! جیسی دہشت

ان کی آنکھیں دیکھ کر چھٹپٹن میں ہوئی تھی، ویسے ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی، بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں۔ لال سرخ۔ ایسی ویسی؟ بالکل خونِ کبوتر! لگتا تھا بڑی بڑی پُتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خونم خون ہو جائے گا۔ ہر وقت غصّے میں بھرے رہتے تھے۔ جانے کیوں۔ گالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ اور جو رنگ تقریر کا تھا وہی تحریر کا۔ رُکھ ہاتھ نکلتا ہے دھواں مغز قلم سے۔ ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا، جنہیں بوجوہ گالی نہیں دے سکتے۔ ایسے موقعوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے لیکن چہرے پر ایسا ایکسپریشن لاتے کہ قد آدم گالی نظر آتے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا۔ اختلاف تو درکنار، اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی رائے سے اتفاق کرلیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کر کے الٹے اس کے سر ہو جاتے۔

ارے صاحب! بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے، بعض اوقات محض سلام سے مشتعل ہو جاتے تھے، آپ کچھ بھی کہیں، کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں وہ اس کی تردید ضرور کریں گے۔ کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی سبکی سمجھتے تھے۔ ان کا ہر جملہ نہیں سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑاکے کی

سردی پڑ رہی تھی۔ میرے منھ سے نکل گیا کہ ، آج بڑی سردی ہے، بولے ، نہیں۔ کل اس سے زیادہ پڑے گی۔

وہ چچاؔ سے پھوپا بنے اور پھوپا سے خسر الحذر، لیکن مجھے آخر وقت تک نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ نکاح کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ قاضی نے مجھ سے پوچھا قبول ہے؟ ان کے سامنے منھ سے ہاں کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ بس اپنی ٹھوڑی سے دو مؤدبانہ ٹھونگیں ماردیں جنہیں قاضی اور قبلہ نے رشتہ مناکحت کیلئے ناکافی سمجھا قبلہ کڑک کر بولے ،لونڈے بولتا کیوں نہیں ؟، ڈانٹ سے میں نروس ہوگیا۔ ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے ”جی ہاں قبول ہے“ کہہ دیا۔ آواز یکلخت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا قاضی اچھل کر سہرے میں گھس گیا۔ حاضرین کھکھلا کے ہنسنے لگے۔ اب قبلہ اس پر بھُنّارہے ہیں کہ اتنے زور کی ہاں سے بیٹی والوں کی ہیٹی ہوتی ہے۔ بس تمام عمر اُن کا یہی حال رہا۔ اور تمام عمر میں کربِ قرابت داری و قربتِ قہری دونوں میں مبتلا رہا۔

حالانکہ اکلوتی بیٹی، بلکہ اکلوتی اولاد تھی اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے، لیکن قبلہ نے مائیوں کے دن عین اس وقت جب میرا رنگ نکھارنے کیلئے

ابٹن ملا جارہا تھا، کہلا بھیجا کہ دولہا میری موجودگی میں اپنا منہ سہرے سے باہر نہیں نکالے گا۔ دو سو قدم پہلے سواری سے اتر جائے گا اور پیدل چل کر عقد گاہ تک آئے گا۔ عقد گاہ انہوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے فیض صاحب قتل گاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ مجھے تو عروسی چھپر کھٹ بھی پھانسی گھاٹ لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ براتی پلاؤ زردہ ٹھونسنے کے بعد ہر گز یہ نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیوڑھی نہیں پڑی۔ خوب سمجھ لو، میری حویلی کے سامنے بینڈ باجا ہر گز نہیں بجے گا۔ اور تمہیں رنڈی نچوانی ہے تو Over my dead body ، اپنے کوٹھے پر نچواؤ۔

کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہرِ الٰہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ ان کی غیرت یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ ان کے گھر برات چڑھے۔ داماد کے خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گاڑ آتے تھے۔ قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے۔ وہ داماد کو زندہ گاڑ دینے کے حق میں تھے۔

چہرے، چال اور تیور سے کوتوالِ شہر لگتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بانس منڈی میں ان کی عمارتی لکڑی کی ایک معمولی سی دکان ہے۔ نکلتا ہوا قد۔ چلتے تو قد سینہ

اور آنکھیں، تینوں بیک وقت نکال کر چلتے۔ ارے صاحب! کیا پوچھتے ہیں؟ اوّل تو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اور کبھی جی کڑا کر کے دیکھ بھی لیا تو بس لال بھبوکا آنکھیں نظر آتی تھیں۔ نگہِ کرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد۔ رنگ گندمی آپ جیسا، جسے آپ اس گندم جیسا بتاتے ہیں جسے کھاتے ہی حضرت آدم، بیک بیوی و دو گوش جنت سے نکال دیے گئے۔ جب دیکھو جِھلّا تے تنتناتے رہتے ہیں۔ مزاج، زبان اور ہاتھ کسی پر قابو نہ تھا۔ دائمی طیش سی لرزہ براندام رہنے کے سبب اینٹ، پتھر، لاٹھی، گولی، گالی، کسی کا بھی نشانہ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ گچھی گچھی مونچھیں جنہیں گالی دینے سے پہلے اور بعد میں تاؤ دیتے۔ آخری زمانے میں بھوؤں کو بھی بل دینے لگے۔ گھٹا ہوا کسرتی بدن ململ کے کرتے سے جھلکتا تھا۔ چنی ہوئی آستین اور اس سے بھی مہین چنی ہوئی دوپلی ٹوپی۔ گرمیوں میں خس کا عطر لگاتے۔ کیکری کی سِلائی کا چوڑی دار پاجامہ، چوڑیوں کی یہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا۔ دھوبی الگنی پر نہیں سکھاتا تھا۔ علیحدہ بانس پر دستانے کی طرح چڑھا دیتا تھا۔ آپ رات کے دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوں گے۔

واللہ! میں تو یہ تصور کرنے کی بھی جرات نہیں کر سکتا کہ دائی نے انہیں چوڑی دار کے بغیر دیکھا ہوگا۔ بھری بھری پنڈلیوں پر خوب کھبتا تھا۔ ہاتھ کے

بنے ریشمی ازار بند میں چابیوں کا گچھا چھنچھناتا رہتا۔ جو تالے برسوں پہلے بے کار ہو گئے تھے ان کی چابیاں بھی اس گچھے میں محفوظ تھیں۔ حد یہ کہ اس تالے کی بھی چابی تھی جو پانچ سال پہلے چوری ہو گیا تھا۔ محلے میں اس چوری کا برسوں چرچا رہا۔ اس لئے کہ چور صرف تالا، پہرہ دینے والا کتا اور ان کا شجرۂ نصب چرا کر لے گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ اتنی ذلیل چوری صرف کوئی عزیز رشتے دار ہی کر سکتا ہے۔ آخری زمانے میں یہ ازار بندی گچھا بہت وزنی ہو گیا تھا اور موقع بے موقع فلمی گیت کے بازو بند کی طرح کُھل کُھل جاتا۔ کبھی جھک کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے تو دوسرے ہاتھ سے ازار بند تھامتے، مئی جون میں ٹمپریچر ۱۱۰ ہو جاتا اور منہ پر لو کے تھپڑ سے پڑنے لگتے تو پاجامے سے ائیر کنڈیشننگ کر لیتے۔ مطلب یہ کہ چوڑیوں کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بگھو کر سر پر انگوچھا ڈالے، تربوز کھاتے۔ خس خانہ و برفاب کہاں سے لاتے۔ اس کے محتاج بھی نہ تھے۔ کتنی ہی گرمی پڑے۔ دکان بند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے، میاں! یہ تو بزنس، پیٹ کا دھندا ہے۔ جب چمڑے کی جھونپڑی (پیٹ) میں آگ لگ رہی ہو تو کیا گرمی کیا سردی۔ لیکن ایسے میں کوئی شامت کا مارا گاہک آ نکلے تو برا بھلا کہہ کے بھگا دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کھنچا کھنچا دوبارہ انہی کے پاس آتا تھا۔ اس لئے کہ جیسی عمدہ لکڑی وہ بیچتے تھے۔ ویسی سارے کانپور میں کہیں نہیں ملتی

تھی۔ فرماتے تھے، داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی، لکڑی اور داغ دار؟ داغ تو دو ہی چیزوں پر سجتا ہے۔ دل اور جوانی۔

لفظ کے لچھّن اور بازاری پان

تمباکو، قوام، خربوزے اور کڑ ہے ہوئے کُرتے لکھنؤ سے حقّہ مراد آباد اور تالے علی گڑھ سے منگواتے تھے۔ حلوہ سوہن اور ڈپٹی نذیر احمد والے محاورے دلّی سے۔ دانت گرنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارا تھا۔ گالیاں البتہ مقامی بلکہ خانہ ساز دیتے جن میں سلامت وروانی پائی جاتی تھی۔ طبع زاد لیکن بلاغت سے خالی۔ بس جغرافیہ سا کھینچ دیتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں اور چنری آپ کے جے پور سے منگواتے تھے۔ صاحب آپ کا راجھستان بھی خوب تھا۔ کیا کیا سوغاتیں گنوائیں تھیں اس دن آپ نے۔۔۔۔؟ کھانڈ، سانڈ، بھانڈ اور رانڈ۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا ہے اس کے نام میں ٹھ، ڈ، اور ڑ لگا دیتے ہیں۔ مگر یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ راجستھان میں رانڈ سے مراد خوب صورت عورت ہوتی ہے۔ مارواڑی زبان میں سچ مچ کی بیوہ کے لئے بھی کوئی لفظ ہے کہ نہیں؟ یا سبھی خوب صورت نورُ علیٰ نور بلکہ حورُ علیٰ حور ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ سو سوا سو سال قبل تک رنڈی سے بھی

مراد صرف عورت ہی ہوتی تھی۔ جب سے مردوں کی نیتیں خراب ہوئیں، اس لفظ کے لچھن بھی بگڑ گئے۔ صاحب! راجستھان کے تین طرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گھائل ہیں۔ میرا بائی، مہندی حسن اور ریشماں۔

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ باہر نکلتے تو ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور بٹوہ رہتا۔ بازار کا پان ہرگز نہیں کھاتے تھے۔ کہتے تھے بازاری پَن صرف رنڈوے، تماش بین اور بمبئی والے کھاتے ہیں۔ صاحب، یہ نفاست اور پرہیز میں نے انھی سے سیکھا۔ ڈبیا چاندی کی۔ نقشین۔ بھاری۔ ٹھوس۔ اس میں جگہ جگہ ڈینٹ نظر آتے تھے جو انسانی سروں سے تصادم کے باعث پڑے تھے۔ طیش میں اکثر پانوں بھری ڈبیا پھینک مارتے۔ بڑی دیر تک تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ مضروب کے سر اور چہرے سے خون نکل رہا ہے یا بکھرے پانوں کی لالی نے غلط جگہ رنگ جمایا ہے۔ بٹوے خاص طور سے آپ کی جائے پیدائش ریاست ٹونک سے منگواتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہاں کے بٹوے ایسے ڈورے ڈالتے ہیں کہ اک ذرا گھنڈی کو جھوٹوں ہاتھ لگادو تو بٹوہ آپی آپ مصاحبوں کی باچھوں کی طرح کھلتا چلا جاتا ہے۔ گٹکا بھوپال سے آتا تھا لیکن خود نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے میٹھا پان، ٹھمری، گٹکا اور ناول۔ یہ سب نابالغوں کے شغل ہیں۔ شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ردیف قافیے سے آزاد شاعری سے بطور خاص چڑتے تھے۔ یوں بھی،

بقول شخصے، آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اُردُو فارسی کے جتنے بھی اشعار لکڑی، آگ، دھویں، ہیکڑی، لڑ مرنے، ناکامی اور خودداری سے متعلق ہیں سب یاد کر رکھے تھے۔ صورت حال کبھی قابو سے باہر ہو جاتی تو شعر سے اس کا دفعیہ فرماتے۔ آخری زمانے میں عزلت گزیں اور مردم بیزار ہو گئے تھے اور صرف دشمنوں کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے باہر نکلتے تھے۔ خود کو کاسنی اور بیوی کو موتیا رنگ پسند تھا۔ شیروانی ہمیشہ موتیا رنگ کے ٹسر کی پہنی۔

واہ کیا بات کورے برتن کی!

بشارت کی زبانی تعارف ختم ہوا۔ اب کچھ میری کچھ ان کی زبانی سنئیے اور رہی سہی زبان خلق سے جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

کانپور میں پہلے بانس منڈی اور پھر کوپر گنج میں قبلہ کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ اسی کو آپ ان کا حیلہء معاش اور وسیلہ مردم آزاری کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت جلانے کی لکڑی بھی رکھتے تھے مگر اسے کبھی بھی لکڑی نہیں کہا۔ سوختہ یا ہیزم سوختنی کہتے تھے۔ ان کی دکان کو کبھی کوئی ناآشنائے مزاج ٹال کہہ دیتا تو

دو سیری لے کر دوڑتے تھے۔ جوانی میں پنسیری لے کر دوڑتے تھے۔ تمام عمر پتّھر کے باٹ استعمال کئے فرماتے تھے۔ لوہے کے فرنگی باٹ بھاری اور بے برکت ہوتے ہیں۔ پتّھر کے باٹ کو بازوؤں میں بھر کے، سینے سے لگا کر اٹھانا پڑتا ہے۔ اعمال تو دور رہے، کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ ان پتھروں کا وزن ہی کروالے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی دی ہوئی رقم یا لوٹائی ہوئی ریز گاری گِن لے۔ اس زمانے میں، یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں عمارتی لکڑی کی کھپت بہت کم تھی۔ ،سال، اور چیڑ کا رواج عام تھا۔ بہت ہوا تو چوکھٹ اور دروازے شیشم کے بنوالیے۔ ساگوان تو صرف امراروٴسا کی ڈائننگ ٹیبل اور گوروں کے تابوت میں استعمال ہوتی تھی۔ فرنیچر ہوتا ہی کہاں تھا۔ بھلے گھروں میں فرنیچر کے ذیل میں صرف چارپائی آتی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے۔ ان دنوں کرسی صرف دو موقعوں پر نکالی جاتی تھی۔ اوّل، جب حکیم، وید، ہومیوپیتھ، پیر، فقیر اور سیانوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے۔ اس پر بیٹھ کے وہ جگہ جگہ اسٹیتھوسکوپ لگا کر دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسے ان حضرات نے اپنی دواؤں اور تعویز گنڈوں سے کس حد تک پُر کیا ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جس گھر میں موسمبی یا مہین لکڑی کی پٹاری میں روئی میں رکھے ہوئے پانچ انگور آئیں یا سولا ہیٹ پہنے

ڈاکٹر آئے (اور اس کے آگے آگے ہٹو بچو کرتا ہوا تیماردار خصوصی اس کا چمڑے کا بیگ اٹھائے) تو اڑوس پڑوس والے جلدی جلدی کھانا کھا کر خود کو تعزیت اور کاندھا دینے کے لئے تیار کر لیتے تھے۔ در حقیقت ڈاکٹر کو صرف اس مرحلے پر بلا کر اس کرسی پر بیٹھا دیا جاتا تھا جب وہ صورت حال پیدا ہو جائے جس میں دو ہزار سال پہلے لوگ حضرت عیسیٰ کو آزماتے تھے۔ کرسی کے استعمال کا دوسرا اور آخری موقع ہمارے یہاں ختنوں پر آتا تھا جب لڑکے کو دولہا کی طرح سجا بنا کر اور مٹّی کا کھلونا ہاتھ میں دے کر اس کرسی پر بیٹھا دیا جاتا تھا۔ اس جلاّدی کرسی کو دیکھ اچھّے اچھّوں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ غریبوں میں اس مقصد کے لیے نئے ماٹ یا لمبی وضع کے کورے مٹکے[1] کو الٹا کر کے سرخ کپڑا ڈال دیتے تھے۔

---

[1] کورے مٹکے کا ذکر آیا تو نوکِ قلم پر بے اختیار نظیر اکبر آبادی جسے نقل کیے بغیر رہا نہیں جاتا:

تازگی دل کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی

نظیر اکبر آبادی کی کیا بات ہے۔ کوئی سی نظم اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ انھیں جہاں کہیں قدرت کی کاریگری یا خدا کی شان نظر آجاتی ہے، وہیں پائے بتاں پہ سر بسجود ہو کر ثنائے سراپا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پنہاری کے سر پر کورا مٹکا دیکھا تو ردیف کا فیے کی کانی اوٹ لیکر سارے سراپا کو نظروں سے کھوند

چارپائی

سچ تو یہ ہے کہ جہاں چارپائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت، نہ گنجائش، نہ تُک،
انگلستان کا موسم اگر اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چارپائی ایجاد کرلی
ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھیڑ سے بچ جاتے، بلکہ پھر آرام دہ
چارپائی چھوڑ کر، کالونیز بنانے کی خاطر، گھر سے باہر نکلنے کو بھی ان کا دل نہ چاہتا،
اوورورکڈ سورج ان کی سلطنت پر ایک صدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی
سے بچ جاتا۔ اور کم از کم آج کل کے حالات میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑا

ڈالا۔ پھر تو،، اس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا،، اس میں وہ اپنے دل اور قافیے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جہاں
جہاں وہ لے جائیں، چاؤ سے جاتے ہیں۔ حد یہ کہ گھڑونچی اور لوٹا دیکھ کر صبر و قافیہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا
ہے۔ دل میں خیالاتِ فاسد پیدا ہونے لگتے ہیں:

کوری ٹھلیا پہ دیکھ کر لوٹا

دل لگا ہونے کچھ کھرا کھوٹا

اس میں بیچارے (ٹونٹی دار؟) لوٹے کا بظاہر صرف اتنا قصور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے معشوق سے
مشابہت رکھتا ہے۔

رہنے کے لئے ان کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی چیز تو ہوتی۔ ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے کہا کہ بقول آپ کے، انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں۔ آسائش پسند، بے حد پریکٹکل لوگ ہیں۔ حیرت ہے چارپائی استعمال نہیں کرتے! بولے ادوان کسنے سے جان چراتے ہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہئیے۔ وہ یہ کہ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے۔ جب کہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری، گدیلے، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچہ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی، جسے صرف بیٹھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے حکمرانوں کا تخت کہتے ہیں۔ لیکن جب انہیں اس پر لٹاکر اور پھر لٹاکر نہلا دیا جاتا ہے تو یہ تختہ کہلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ اُلٹنا کہتے تھے۔

اسٹیشن، لکڑی مَنڈی اور بازارِ حُسن میں بجوگ

مقصد اس تمہید غیر دل پزیر کا یہ کہ جہاں چارپائی کا چلن ہو وہاں فرنیچر کی بزنس پنپ نہیں سکتی۔ اب اسے چوب عمارتی کہیے یا ہیزم غیر سوختنی، دھندا اس کا بھی ہمیشہ مندا ہی رہتا تھا کہ دکانوں کی تعداد گاہکوں سے زیادہ تھی۔ لہٰذا کوئی

شخص ایسا نظر آجائے جو حلیے اور چال ڈھال سے ذرا بھی گاہک معلوم ہو تو لکڑ منڈی کے دکان دار اس پر ٹوٹ پڑتے۔ بیشتر گاہک گرد نواح کے دیہاتی ہوتے جو زندگی میں پہلی اور آخری بار لکڑی خریدنے کانپور آتے تھے۔ ان بیچاروں کا لکڑی سے دو ہی مرتبہ سابقہ پڑتا تھا۔ ایک، اپنا گھر بناتے وقت۔ دوسرے اپنا کریا کرم کرواتے سمے۔ قیام پاکستان سے پہلے جن پڑھنے والوں نے دلّی یا لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ دیکھا ہے، وہ اس چھینا جھپٹی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۵ میں ہم نے دیکھا کہ دلّی سے لاہور آنے والی ٹرین کے رکتے ہی جیسے مسافر نے اپنے جسم کا کوئی حصہ دروازے یا کھڑکی سے باہر نکالا، قلی نے اسی کو مضبوطی سے پکڑ کے سالم مسافر کو ہتھیلی پر رکھا اور ہوا میں اَدھر اٹھالیا۔ اور اٹھا کر پلیٹ فارم پر کسی صراحی یا حقّے کی چلم پر بٹھا دیا۔ لیکن جو مسافر دوسرے مسافروں کے دھکے سے خود بخود ڈبّے سے باہر نکل پڑے، ان کا حشر ویسا ہی ہوتا جیسا اُردُو کی کسی نئی نویلی کتاب کا نقّادوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ جو چیز جتنی بھی جس کے ہاتھ لگی، سر پر رکھ کر ہوا ہو گیا۔ دوسرے مرحلے میں مسافر پر ہوٹلوں کے دلال اور ایجنٹ ٹوٹ پڑتے۔ سفید ڈرل کا کوٹ پتلون، سفید قمیض، سفید رومال، سفید کینوس کے جوتے، سفید موزے، سفید دانت۔ اس کے باوجود ہم محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ ان کی ہر

چیز سفید اور اجلی ہوتی۔ سوائے چہرے کے، ہنستے تو معلوم ہوتا تو اہنس رہا ہے۔ یہ مسافر پر اس طرح گرتے جیسے انگلستان میں رگبی کی گیند اور ایک دوسرے پر کھلاڑی گرتے ہیں۔ ان کی ساری تگ ودو کا مقصد خود کچھ حاصل کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو حاصل کرنے سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ مسلمان دلال ترکی ٹوپی سے پہچانے جاتے۔ وہ دلّی اور یو پی سے آنے والے مسلمان مسافروں کو ٹونٹی دار لوٹے، مستورات، اطفال اور قیمے پر اٹھے کے بھبکے سے فورا پہچان لیتے اور "اسلام علیکم Brother in Islam "کہہ کر لپٹ جاتے۔ مسلمان مسافروں کے ساتھ صرف مسلمان دلال ہی دھینگا مشتی کر سکتے تھے۔ جس دلال کا ہاتھ مسافر کے کپڑوں کے مضبوط ترین حصّے پر پڑتا وہی اسے گھسٹیتا ہوا باہر لے آتا۔ جن کا ہاتھ لباس کے کمزور یا بوسیدہ حصّوں پر پڑتا وہ بعد میں ان کو بطور دستی رومال استعمال کرتے۔ نیم ملبوس مسافر قدم قدم پر اپنی ستر کشائی کرواتا۔ اسٹیشن کے باہر قدم رکھتا تو لا تعداد پہلوان جنھوں نے اکھاڑے کو ناکافی محسوس کرتے ہوئے تانگہ چلانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ خود کو اس پر چھوڑ دیتے تھے۔ اگر مسافر کے تن پر کوئی چیتھڑا اتفاقاً بچ رہا تو اسے بھی نوچ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر رام چندر جی کی کھڑاؤں کی طرح سجا دیتے۔ اگر کسی کے چوڑی دار کمر بند کا سرا تانگے والے کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ غریب گرہ پر ہاتھ رکھے اسی میں بندھا

چلا آتا۔ کوئی مسافر کا دامن آگے سے کھینچتا، کوئی پیچھے سے زلیخائی کرتا۔ آخری راونڈ میں ایک تگڑا سا تانگے والا سواری کا دایاں ہاتھ اور دوسرا مسٹنڈا اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کے tug of war کھیلنے لگتے۔ لیکن قبل اس کے ہر دو فریقین اپنے اپنے حصّے کی ران اور دست اکھیڑ کر لے جائیں، ایک تیسرا پھرتیلا تانگے والا ٹانگوں کے چرے ہوئے چمٹے کے نیچے بیٹھ کر مسافر کو یکلخت اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا اور تانگے میں جوت کر ہوا ہو جاتا۔

کم و بیش یہی نقشہ کوپر گنج کی لکڑ منڈی کا ہوا کرتا تھا۔ جس کے قلب میں قبلہ کی دکان تھی۔ گودام بالعموم دکان سے ملحق، عقب میں ہوتے تھے۔ گاہک پکڑنے کے لیے قبلہ اور تین چڑی مار دکان داروں نے یہ کیا کہ دکانوں کے باہر سڑک پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کیبن بنا لیے۔ قبلہ کا کیبن مسند تکیے، حقے، اُگال دان اور اسپرنگ سے کھلنے والے چاقو سے آراستہ تھا۔ کیبن گویا ایک نوع کا مچان تھا جہاں سے گاہک کو مار گراتے تھے۔ پھر اسے چمکار پچکار کر اندر لے جایا جاتا جہاں کوشش یہ ہوتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بھری جیب واپس نہ جانے پائے۔ جیسے ہی کوئی شخص جو قیافے سے گاہک لگتا، سامنے سے گزرتا تو دور و نزدیک کے دکان دار اسے ہاتھ کے اشارے سے یا آواز دے کر بلاتے "مہاراج مہاراج" ان مہاراجوں کو دوسرے دکان داروں کے پنجے سے چھڑانے کیلیے اور خود گھسیٹ کر

اپنے کچھار میں لے جانے کے دوران اکثر ان کی پگڑیاں کھل کر پیروں میں الجھ جاتیں۔ اس سلسلے میں آپس میں اتنے جھگڑے اور ہاتھا پائی ہو چکی تھی کہ منڈی کے تمام بیوپاریوں نے پنچایتی فیصلہ کیا کہ گاہک کو صرف وہی دکان دار آواز دے کر بلائے گا جس کی دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی وہ کسی دوسرے دکان دار کے حلقہ تشدد میں داخل ہو گا تو اسے کوئی اور دکان دار ہرگز آواز نہ دے گا۔ اس کے باوجود چھینا جھپٹی اور کشتم پچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو ہر دکان دار کے آگے چونے سے حد بندی لائین کھینچ دی گئی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ کشتی بند ہو گئی۔ کبڈی ہونے لگی۔ بعض دکان داروں نے مار پیٹ، گاہکوں کا ہانکا کرنے اور انہیں ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لانے کے لئے بگڑے پہلوان اور شہر کے چھٹے ہوئے شُہدے اور مسٹنڈے پارٹ ٹائم ملازم رکھ لئے تھے۔ کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ لوگ دن میں لکڑ منڈی میں گاہکوں کو ڈرا دھمکا کر ناقص اور کنڈم مال خریدواتے اور رات کو یہی فریضہ بازار حسن میں بھی انجام دیتے۔ بہت سے طوائفوں نے اپنی آبرو کو ہر شب زیادہ سے زیادہ غیر محفوظ رکھنے کی غرض سے ان کو بطور ''پِمپ'' ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ قبلہ نے اس قسم کا کوئی غنڈا یا بد کردار پہلوان ملازم نہیں رکھا کہ انہیں اپنے زورِ بازو پر پورا بھروسہ

تھا۔ لیکن اوروں کی طرح مال کی چِرائی کٹائی میں مار کٹائی کا خرچہ بھی شامل کر لیتے تھے۔

آلات اخراجِ خون: جونک، سینگی، لاٹھی

ہمہ وقت طیش کا عالم طاری رہتا تھا۔ سونے سے پہلے ایسا موڈ بنا کر لیٹتے کہ آنکھ کھلتے ہی غصّہ کرنے میں آسانی ہو۔ پیشانی کے تین بَل سوتے میں بھی نہیں مٹتے تھے۔ غصّے کی سب سے خالص قسم وہ ہوتی ہے جو کسی اشتعال کی محتاج نہ ہو یا کسی بہت معمولی سے بات پر آجائے۔ غصّے کے آخر ہوتے ہوتے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ آیا کس بات پر تھا۔ بیوی ان کو روزہ نہیں رکھنے دیتی تھیں۔ غالباً ۱۹۳۵ کا واقعہ ہے۔ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی دیرینہ پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ ایک تازہ پریشانی کا خیال آتے ہی ایک دم جلال آگیا۔ دعا ہی میں کہنے لگے کہ تو نے میری پرانی پریشانی ہی کون سی رفع کر دیں جو اَب یہ نئی پریشانی دور کرے گا اس رات مصلّا تہہ کرنے کے بعد پھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ان کے غصّے پر یاد آیا کہ اس زمانے میں کن میلیے محلّوں بازاروں میں پھیری لگاتے تھے۔ کان کا میل نکالنے پر ہی کیا موقوف، دنیا جہان کے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے۔ سبزی، گوشت اور سودا سلف کی خریداری، حجامت، تعلیم، زچگی، پیڑہی، کھاٹ، کھٹولے کی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ خود اپنی مرمت بھی، سب گھر بیٹھے ہو جاتی۔ بیبیوں کے ناخن نہرنی سے کاٹنے اور پیٹھ ملنے کے لئے نائنین گھر آتی تھیں۔ کپڑے بھی مغلانیاں گھر آکر سیتیں تھیں تاکہ نامحرموں کو ناپ تک کی ہوا نہ لگے۔ حالانکہ اس زمانے کی زنانہ پوشاک کے جو نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ ایسے ہوتے تھے کہ کسی بھی لیٹر بکس کا ناپ لیکر سیئے جاسکتے تھے۔ غرض کہ سب کام گھر میں ہی ہو جاتے۔ حد یہ کہ موت تک گھر میں واقع ہوتی تھی۔ اس کے لئے باہر جا کر کسی ٹرک سے اپنی روح قبض کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ فسادِ خون سے کسی کے بار بار پھوڑے پھنسی نکلیں، یا دماغ میں خیالاتِ فاسدہ کا ہجوم دن دہاڑے بھی رہنے لگے، تو گھر پر ہی فصد کھول دی جاتی تھی۔ فاضل و فاسد خون نکلوانے کی غرض سے اپنا سر پھڑوانے یا پھوڑنے کے لئے کسی سیاسی جلسے میں جانے یا حکومت کے خلاف مظاہرے کرکے لاٹھی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس زمانے میں لاٹھی کو آلۂ اخراجِ خون کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ جونک اور سینگی

لگانے[1] والی کنجریاں روز پھیری لگاتی تھیں۔ اگر اس زمانے کے کسی حکیم کا ہاتھ آج کل کے نوجوانوں کی نبض پر پڑ جائے تو کوئی نوجوان ایسا نہ بچّے جس کے جہاں تہاں سینگی لگی نظر نہ آئے۔ رہے ہم جیسے آج کل کے بزرگ کہ

کی جس سے بات اس کو ہدایت ضرور کی

تو کوئی بزرگ ایسا نہ بچّے گا جس کی زباں پر حکیم صاحبان جونک نہ لگوا دیں۔

ہم واقعہ یہ بیان کرنے چلے تھے کہ گرمیوں کے دن تھے قبلہ ادلے کا قورمہ اور خربوزہ تناول فرما کر کیبن میں قیلولہ کر رہے تھے کہ اچانک کن ملیے نے کیبن کے دروازے پر بڑے زور سے آواز لگائی "کان کا میل" خدا جانے میٹھی نیند سو رہے تھے یا کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھ رہے تھے جس میں گاہک ان سے تگنے داموں دَھڑا دَھڑ لکڑی خرید رہے تھے۔ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ایک دفعہ تو دہل گئے۔ چِق کے پاس پڑی ہوئی لکڑی اُٹھا کر اس کے پیچھے ہو لیے۔ کمینے کی یہ جرات کہ ان کے کان سے فقط ایک گز دور بلکہ پاس ایسے گستاخانہ طریقے سے

---

[1] سینگی: درد یا فسادِ خون ے مقام پر ہلکا سا شگاف لگایا جاتا تھا۔ پھر سوراخ کیے ہوئے سینگ کے بڑے دہانے کو اس پر رکھ کر اور سوراخ والے سرے کو منھ سے لگا کر سارا فاسد خون کھینچ لیا جاتا تھا۔ اس عمل کو یونانی طب کی اصطلاح میں سینگی لگانا اور اُردو شاعری میں قافیہ کہتے ہیں۔

پیچھے۔ یہ کہنا تو درست نہ ہو گا کہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے یہ، اس لئے قبلہ غصّے میں ایسے بھرے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی اس سے آگے بھی نکل جاتے۔ سڑک پر کچھ دور بھاگنے کے بعد کن میلیا گلیوں میں نکل گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر قبلہ محض اپنی چھٹی حس کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑتے رہے اور یہ وہ سمت تھی جس طرف کوئی شخص جس کے پانچوں حواس سلامت ہوں، جارحانہ انداز میں لکڑی لاٹھی گھماتا ہرگز نہ جاتا کہ یہ تھانے کی طرف جاتی تھی۔ اس وحشیانہ دوڑ میں قبلہ کی لکڑی اور کن میلیے کا پگڑ جس کے ہر پیچ میں اس نے میل نکالنے کے اوزار اڑس رکھے تھے، زمین پر گر گیا۔ اس میں سے ایک ڈبیا بھی نکلی جس میں اس نے کان کا میل جمع کر رکھا تھا۔ نظر بچا کر اسی میں سے تولہ بھر میل نکال کر دکھا دیتا کہ دیکھو یہ تمہارے کان سے نکلا ہے۔ کسی کے کان سے گولر کے بھنگے بر آمد کر کے کہتا کہ تمھارے کان میں جو بھن بھن تن تن کی آوازیں آ رہی تھیں وہ انھیں کی تھیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ کان کی بھول بھلیوں میں اتنی دور تک سہج سہج سلائی ڈالتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا ابھی کان کے راستے آنتیں بھی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ قبلہ نے اس پگڑ کو بَلّی پر چڑھا کر بَلّی اپنی کیبن کے سامنے اس طرح گاڑ دی جس طرح اگلے وقتوں میں کوئی بے صبر اولی عہد، یا وہ نہ ہو تو پھر کوئی دشمن، بادشاہ سلامت کا سر کاٹ کر نیزے پر ہر خاص و

عام کی اطلاع کیلئے بلند کر دیتا تھا۔ اس کی دہشت ایسی بیٹھی کہ دکان کے سامنے سے بڑھئی، کھٹ بُنے، سینگی لگانے والیوں اور سحری کیلئے جگانے والوں نے بھی نکلنا چھوڑ دیا۔ ملحقہ مسجد کا کریہہ الصوت موذّن بھی عقب والی گلی سے آنے جانے لگا۔

کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی

قبلہ اپنا مال بڑی توجہ، محنت اور محبّت سے دکھاتے تھے۔ ،محبّت، کا اضافہ ہم نے اس لیے کیا کہ وہ گاہک کو تو شیر کی نظر سے دیکھتے، مگر اپنی لکڑی پر محبت سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ کوئی ساگوان کا تختہ ایسا نہیں تھا۔ جس کے ریشوں کے ابر اور رگوں (veins) کا طغریٰ، اگر وہ چاہیں تو، یادداشت سے کاغذ پر نہ بنا سکتے ہوں۔ لکڑ منڈی میں وہ واحد دکان دار تھے جو گاہک کو اپنا اور ہر شہتیر اور بَلّی کا شجرہ نسب ازبر کرا دیتے تھے۔ ان کا اپنا شجرہ نسب بَلّی سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ اس پر اپنے جدِّ اعلیٰ کو ٹانگ رکھا تھا۔ ایک بَلّی کی قامَتِ زیبا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے "سوا انتالیس فٹ لمبی ہے! گونڈہ کی ہے۔ افسوس! اصغر گونڈوی کے غوغائے شاعری نے گونڈہ کی بَلّیوں کی شہرت کا بیڑا غرق کر دیا۔ لاکھ کہو، اب کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ گونڈے کی اصل وجہِ شہرت خوب

صورت بَلّیاں تھیں۔ اصغر گونڈوی سے پہلے ایسی سیدھی، بے گانٹھ بَلّی ملتی تھی کہ چالیس فٹ اونچے سرے پر سے چھلاّ چھوڑ دو تو بے روک، سیدھا نیچے جھَن سے آگے ٹھہرتا ہے"۔ ان کے ہاں کا ہر شہتیر اصیل اور خاندانی تھا۔ بیش تر تو خالص مغل یا روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے کہ ہر آئے گئے کے کپڑے پھاڑتے اور خود مشکل سے چِرتے تھے۔ کبھی قبلہ کونے میں پڑے ہوئے گرم و سرد سیلاب چشیدہ seasoned تختے کی طرف اتنے ادب و احترام سے اشارہ کرتے گویا ابھی ابھی جودی پہاڑ کی ترائی سے کشتی نوح میں سے اکھاڑ کر بطور خاص ایک دانہ، آپ کے approval کے لئے لے آئے ہیں۔ کبھی برمی ساگوان کے لٹھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے، میاں! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے! بچہ ہے۔ بہت سے بہت اسّی سال کا ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کا ساگوان اراودی کے جنگلوں میں آندھی طوفان میں بالکل کھڑی کمر استادہ رہتا ہے۔ لیکن صاحب ہے بلا کا سیز نڈ۔ سیکڑوں بارشوں اور سات دریاؤں کا پانی پی کر یہاں پہنچا ہے۔ اور اس لٹھے پر تو مگرمچھ نے پیشاب بھی کیا ہے۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ جو کنول نین گرہ نظر آرہی ہے، اس پر۔ مگرمچھ جس لکڑی پر مُوت دے اس کو حشر تک نہ دیمک لگ سکتی ہے، نہ آگ! اس پر خواجہ عبدالمجید جو منشیانہ ڈیسک کے لیے لکڑی خریدنے آئے تھے، پوچھ بیٹھے "کیا مگرمچھ کھمبے کے

بجائے درخت پر۔۔۔۔۔" وہ جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ قبلہ تنک کر بولے "جی نہیں! مگر مچھ تو سبیلِ اہلِ اسلام میں زنجیر سے بندھے ہوئے ٹین کے گلاس سے پانی پی کے، سڑک پر ٹہل ٹہل کر استنجا سکھاتے ہیں۔ آپ کے والدِ ماجد کی طرح، آیا خیال شریف میں؟"

بس چوبیس گھنٹے مزاج کی کچھ ایسی ہی جو الامکھّی کیفیت رہتی تھی۔ ایک دفعہ حاجی محمد اسحاق چمڑے والے کچھ شیشم خریدنے آئے۔ قبلہ یوں تو ہر قسم کی لکڑی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے۔ لیکن شیشم پر سچ مچ فریفتہ تھے۔ اکثر فرماتے "تخت طاؤس میں شاہجہاں نے شیشم ہی لگوائی تھی۔ شیشم کے گن گاہک اور قدر دان تو قبر میں جا سوئے۔ مگر کیا بات ہے شیشم کو جتنا استعمال کرو اتنے ہی جوہر کھلتے ہیں۔ شیشم کی جس چارپائی پر میں پیدا ہوا، اسی پر دادا میاں کی ولادت ہوئی تھی"۔ اپنے حسنِ تولد و توارد کو قبلہ چارپائی اور دادا جان دونوں کے لئے باعث سعادت و افتخار سمجھتے ہیں۔ حاجی محمد اسحاق بولے "یہ لکڑی تو صاف معلوم نہیں ہوتی" قبلہ نہ جانے کتنے برسوں بعد مسکرائے۔ حاجی صاحب کی داڑھی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا "یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنی ہی چمکتی ہے۔ اعلیٰ ذات کی شیشم کی پہچان یہ ہے کہ آرا، رندہ، برما

سب کھُنڈے (کند) اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ یہ چیڑھ تھوڑا ہی ہے کہ ایک ذرا کیل ٹھونکو تو الف سے لے کرے تک چِر جائے۔ پر ایک بات ہے۔ تازہ کٹی ہوئی چیڑھ سے بَن مہکار کا ایک آبشار پھوٹ پڑتا ہے لگتا ہے اس میں نہایا جا رہا ہوں۔ جس دن کارخانے میں چیڑ کی کٹائی ہونے والی ہو۔ اس دن میں عطر لگا کر نہیں آتا"۔

قبلہ کا موڈ بدلا تو حاجی محمد اسحاق کی ہمت بندھی۔ کہنے لگے "یہ شیشم تو واقعی اعلیٰ درجے کی معلوم ہوتی ہے مگر سیزنڈ نہیں لگتی"۔ قبلہ کے آگ ہی تو لگ گئی۔ فرمایا "سیزنڈ! کتنے فاقوں میں سیکھا ہے یہ لفظ؟ اگر فقط سیزنڈ ہی چاہیے تو سب سے زیادہ سیزنڈ سامنے والی مسجد کے غسلِ میت کا تختہ ہے۔ بڑا پانی پیا ہے اس نے! لاؤں؟ اسی پہ لٹال دوں گا"۔

سائی کے ساتھ عزتِ سادات بھی گئی

یوں تو ان کی زندگی ڈیل کارنیگی کے ہر اصول کی اوّل تا آخر نہایت کامیاب خلاف ورزی تھی۔ لیکن بزنس میں انہوں نے اپنے ہتھکنڈے الگ ایجاد کئے تھے۔ گاہک سے جب تک یہ نہ کہلوالیں کہ لکڑی پسند ہے۔ اس کی قمیت

اشارتاً بھی نہیں بتاتے تھے۔ وہ پوچھتا بھی تو صاف ٹال جاتے"۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کو لکڑی پسند ہے۔ لے جایئے۔ گھر کی بات ہے"۔ گاہک جب قطعی طور پر لکڑی پسند کرلیتا تو قبلہ قیمت بتائے بغیر، ہاتھ پھیلا کر بیعانہ طلب کرتے۔

سستا سماں تھا۔ وہ دونّی یا چونّی کی سائی پیش کرتا جو اس سودے کیلئے کافی ہوتی۔ اشارے سے دھتکارتے ہوئے کہتے، چاندی دکھاؤ(یعنی کم از کم ایک کلدار روپیہ نکالو)وہ بے چارہ شرماحضوری ایک روپیہ نکالتا جو اس زمانے میں پندرہ سیر گیہوں یا سیر بھر اصلی گھی کے برابر ہوتا تھا۔ قبلہ روپیہ لے کر اپنی ہتھیلی پر اس طرح رکھے رہتے کہ اسے تسلی کے لئے نظر تو آتا رہے، مگر جھپٹا نہ مار سکے۔ ہتھیلی کو اپنے زیادہ قریب بھی نہ لاتے۔ مبادا سودا پٹنے سے پہلے گاہک بدک جائے۔ کچھ دیر بعد خود بخود کہتے "مبارک ہو! سودا پکا ہو گیا"۔ پھر قیمت بتاتے جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ جاتا۔ وہ قیمت پر حجّت کرتا تو کہتے "عجیب گھن چکر آدمی ہو۔ سائی دے کر پھرتے ہو۔ ابھی روپیہ دے کر سودا پکا کیا ہے۔ ابھی تو اس میں سے تمہارے ہاتھ کی گرمائی بھی نہیں گئی اور ابھی پھر گئے۔ اچھا کہہ دو کہ یہ روپیہ تمہارا نہیں ہے۔ کہو، کہو" قیمت ناپ تول کر ایسی بتاتے کہ کائیاں سے کائیاں گاہک دُبدھا

میں پڑ جاتا اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ پیشگی ڈوبنے میں زیادہ نقصان ہے یا اس بھاؤ لکڑی خریدنے میں۔

دورانِ حجت کتنی ہی گرما گرمی بلکہ ہاتھا پائی ہو جائے وہ اپنی ہتھیلی کو چت ہی رکھتے۔ مٹھی کبھی بند نہیں کرتے تھے تاکہ بے آبرو ہوتے ہوئے گاہک کو اطمینان رہے کہ کم از کم سائی تو محفوظ ہے۔ ان کے بارے میں ایک قصّہ مشہور تھا کہ ایک سر پھرے گاہک سے جھگڑا ہوا تو دھوبی پاٹ کا داؤ لگا کر زمین پر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ کے بیٹھ گئے۔ لیکن اس پوز میں بھی اپنی ہتھیلی جس پر روپیہ رکھا تھا، چت ہی رکھی تاکہ اسے یہ بدگمانی نہ ہو کہ روپیہ ہتھیانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جیسی بے داغ اور اعلیٰ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی بقول ان کے "تمہیں باغِ بہشت میں شاخِ طوبیٰ سے بھی دستیاب نہ ہو گی۔ داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ سو سال بعد بھی دیمک لگ جائے تو پورے دام واپس کر دوں گا"۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ اپنے اصولوں کے پکّے تھے۔ مطلب یہ کہ تمام عمر "اونچی دکان، صحیح مال، غلط دام" پر سختی سے کاربند رہے۔ سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے فیشن ایبل اسٹور "ہیرڈز" کا دعویٰ ہے کہ ہمارے پاس سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ

قیمت بھی دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے! ہیرڈز اگر لکڑی بیچتا تو باخدا ایسی ہی اور ان ہی داموں بیچتا۔

یہ چھوڑ کر آئے ہیں

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول، بے روزگاری، بے گھری، اس پر مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھنچوا کر لائے تھے "۔ ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے۔ اور یہ شارٹ تو کمال کا ہے "۔ ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں "۔ جن دفتروں میں مکان کے الاٹ منٹ کی درخواستیں دیں تھیں، ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوتِ استحقاق دکھاتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں "۔ واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں کچھ ہو یا نہ ہو، حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ درحقیقت ان کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیا، کبھی ڈربے، کبھی کابُک کہتے۔ لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھُلیں۔ احباب نے سمجھایا "فلیٹ ایک گھنٹے میں مل سکتا ہے۔ کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو "۔ مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے، وہ کہاں

مانتے۔ مہینوں فلیٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے پیاسے، پریشان حال سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے ہاں مہمان نہ رہے اب بیٹی داماد کے ہاں مہمان رہنے کا عذاب بھی سہا۔

اب کیا ہوئے گا؟

انسان جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے کھڑے ایک گلاس بھی پانی پیتے تو ہاتھ پر پانچ دس روپے رکھ دیتے۔ لیکن اب؟ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے۔ کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ جوتے انہوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز سے بنوائے۔ اس لیے کہ اس کے بنائے جوتے چرچراتے بہت تھے۔ ان جوتوں کے تلے اب اتنے گھس گئے تھے، کہ چرچرانے کے لائق نہ رہے۔ پیروں میں

ٹھیکیں پڑ گئیں۔ شیر وانیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمدھیانے والوں کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ ململ کے کرتوں کی لکھنوی کڑھائی میل میں چھپ گئی۔ چنٹیں نکلنے کے بعد آستینیں انگلیوں سے ایک ایک بالشت نیچے لٹکی رہتیں۔ خضابی مونچھوں کا بل تو نہیں گیا، لیکن صرف بل کھائی ہوئی نوکیں سیاہ رہ گئیں۔ چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملتا۔ موتیا کا عطر لگائے تین مہینے ہو گئے۔

بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے مضافاتی لہجے میں کہتیں "اب کیا ہوئے گا؟" ہو گا کے بجائے، ہوئے گا، ان کے منھ سے بہت پیارا لگتا تھا۔ اس ایک فقرے میں وہ اپنی ساری سراسیمگی، معصومیت، بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کی بے طلب مدد پر بھروسا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سبھی کچھ سمو دیتی تھیں۔ قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور تمکنت سے "دیکھتے ہیں" کہہ کر ان کی تشفی کر دیتے تھے۔

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھرل تپسیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہہ میں بے نور ہوئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈورل اٹکل رہ گئی، تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی دُکھ بھوگتا ہے، ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے، اور جو دنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

سو گلی گلی خاک پھانکنے اور دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلبِ حزیں پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون، داناؤں اور جابروں نے کمزور دل والوں کو قابو میں رکھنے کیلئے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے، وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اٹھالے۔ بالفاظ دیگر، جو بڑھ کر تالے توڑ ڈالے۔ مکان اسی کا ہو گیا۔ کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، اختری بائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، مراد آبادی حقّے اور صراحی کے سبز کیریئر اسٹینڈ کے علاوہ اپنی

دکان کا تالا بھی ڈھو کر لے آئے تھے۔ علی گڑھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوایا تھا۔ تین سیر سے کم کا نہ ہو گا۔ مذکورہ بالا القا کے بعد برنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجے کا فلیٹ اپنے لیے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائلز، سمندری ہوا کی رخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے تھے۔ دروازے کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی ضرب سے فلیٹ میں اپنی آباد کاری بلامنتِ سرکار کر لی۔ گویا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں، اوّل الذّکر کو ثانی الذّکر پر مار کر آخر الذّکر کا قبضہ لے لیا۔ تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگا دی۔ اس سے پہلے اس پر کسٹوڈین متروکہ املاک کا نام لکھا تھا۔ قبلہ عالمِ جلال میں اسے وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے "مضطر کانپوری" بھی لکھوا دیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا کہ آپ شاعر کب سے ہو گئے؟ فرمایا "میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا، نہ ڈگری، قُرقی ہوتے دیکھی"۔

فلیٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ چوڑی دار کا گھُٹنا رفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا۔ جیسے ہی انہوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا۔ آنے والے نے خود کا تعارف اس طرح کروایا کہ گویا اپنے عہدے کی چپڑاس ان کے منھ پر اُٹھا کر

دے ماری ہو۔ ”افسر، محکمہ کسٹوڈین، ایویکوی پراپرٹی“ پھر ڈپٹ کر کہا ”بڑے میاں! فلیٹ کا الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ“ قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دکھایا۔ ”یہ چھوڑ کر آئے ہیں“ اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا ”بڑے میاں سنا نہیں کیا؟ الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ“۔ قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اتارا۔ اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے ہیں۔ اس کے منھ پر مارتے ہوئے بولے ”یہ ہے یاروں کا الاٹ منٹ آرڈر، کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمایئے گا“ ۔اس نے اب تک یعنی تا دمِ تذلیل، رشوت پہ رشوت کھائی تھی، جوتے نہیں کھائے تھے۔ پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سے لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی کے جہیز کے زیور اور ویبلی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی۔ کچھ مال ادھار خریدا۔ ابھی دکان ٹھیک سے جمی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آنکلا۔ کھاتے، رجسٹریشن، روکڑ بہی، اور رسید بک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے ”مشتاق میاں! سنا آپ نے؟ مہینوں جوتیاں چٹخاتا، دفتروں

میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا۔ کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو! اب دل لگی دیکھیے، کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خان دندناتا ہوا آیا۔ لقہ کبوتر کی طرح سینہ پھُلائے۔ میں نے سالے کو یہ دکھادی ''یہ چھوڑ کر آئے ہیں'' چندرا کر پوچھنے لگا ''یہ کیا ہے؟'' ہم نے کہا ''ہمارے ہاں اسے محل سرا کہتے ہیں''۔

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انھیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آکر درخواست کی کہ ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں۔ دروازے زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمک سے اس زنگیائی کیل پر ساری محل سرا پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی۔ گھر میں ڈاکیا یا نئی دھوبن بھی آتی تو اسے بھی دکھاتے ''یہ چھوڑ کر آئے ہیں''۔

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بار بار دیکھا۔ اس سے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کیمرے کو موتیا نظر آنے لگا ہے۔ لیکن کیمرے کے ضعفِ بصارت کو قبلہ اپنے زورِ بیان سے دور کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ

دیتا ہے۔ گزرا ہوا درد بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی کا جب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔

نہ ہو گر یہ فریب پیہم تو دَم نکل جائے آدمی کا

شجرہ اور حویلی بھی ایک ایسی ہی جائے اماں تھی۔ ممکن ہے بے ادب نگاہوں کو یہ تصویر میں ڈھنڈار دکھلائی دے، لیکن جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے آگے تاج محل بھی بالکل سپاٹ گنوارو گھروندا معلوم ہوتا۔ مثلاً دوسری منزل پر ایک دروازہ نظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کواڑ جھڑ چکے تھے۔ قبلہ اسے فرانسیسی دریچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں واقعی کوئی ولائتی دریچہ تھا تو یقیناً یہ وہی دریچہ ہو گا جس میں جڑے ہوئے آئینہ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی آنکھوں میں اپنے جوتوں کی دھول جھونکتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جو بے کواڑ پھاٹک تھا وہ دراصل شاہ جہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ٹوٹا ہوا ایک چھجّا تھا جس پر سرِ دست ایک چیل قیلولہ کر رہی تھی۔ یہ راجپوتی جھروکے کی باقیات بتائی جاتی تھیں، جن کے عقب میں ان کے دادا کے وقتوں میں ایرانی قالینوں پر آذربائیجانی طرز کی قوّالی ہوتی تھی۔ پچھلے پہر جب نیند کے غلبے سے غلافی آنکھیں مندنے لگتیں تو وقفے وقفے سے

نقرئی گلاب پاشوں سے حِضّار محفل پر عرقِ گلاب مقطر چھڑکا جاتا۔ فرش اور دیواریں قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ "جتے پھول غلیچے پہ تھے وتے ہی باہر بغیچے میں تھے"۔ یہاں اطالوی مخمل کے کارچوبی زیر انداز پر گنگا جمنی منقّش اگال دان رکھے رہتے تھے، جن میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی گلوریوں کی پیک جب تھوکی جاتی تو بلوریں گلے میں اترتی چڑھتی صاف نظر آتی، جیسے تھرمامیٹر میں پارا۔

وہ اژدحام کہ عقل دھرنے کی جگہ نہیں

حویلی کے چند اندرونی کلوز اپ بھی تھے۔ کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشمِ تصوّر کے رہینِ منّت۔ ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں بازنطینی اینٹوں پر کانپوری چڑیوں کے گھونسلے نظر آرہے تھے۔ ان پر Moorish arches کی تہمت تھی۔ چراغ رکھنے کا ایک آلہ (طاقچہ) ایسے آرٹسٹک زاویے سے ڈہا تھا کہ پرتگالی آرچ کے آثار دکھائی پڑتے تھے۔ فوٹو میں اس کے پہلو میں ایک چوبی گھڑونچی نظر آرہی تھی جس کا شاہ جہانی ڈیزائن ان کے جدنے آب دار خانہ خاص سے بدست خود چرایا تھا۔ شاہ جہانی ہو یا نہ ہو، اس کے مغل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے کہ اس کی ایک ٹانگ تیموری تھی۔ حویلی کی غلام

گردشیں فوٹو میں نظر نہیں آتی تھیں، لیکن ایک ہمسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے رُلے پھرتے تھے۔ شمالی حصّے میں ایک ستون جو مدّتیں ہوئیں چھت کا بوجھ اپنے اوپر سے اُوچھے کے احسان کی طرح اتار چکا تھا، Roman Pillars کا نادر نمونہ بتایا جاتا تھا۔ حیرت تھی کہ یہ چھت سے پہلے کیوں نہ گرا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملبے میں دبے ہونے کے باعث، اس کے گرنے کے لیے کوئی خالی جگہ نہ تھی۔ ایک شکستہ دیوار کے ساتھ لکڑی کی بوسیدہ نسینی (سیڑھی) اس طرح کھڑی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کے سہارے کھڑا ہے۔ ان کی بیان کے مطابق جب دوسری منزل منہدم نہیں ہوئی تھی تو یہاں وکٹورین اسٹائل کا Grand staircase ہوا کرتا تھا۔ اس غیر موجود چھت پر جہاں اب چمگادڑیں بھی لٹک نہیں سکتی تھیں، قبلہ ان آہنی کڑیوں کی نشان دہی کرتے جن میں دادا کے زمانے میں المانوی فانوس لٹکے رہتے تھے، جن کی چمپئی روشنی میں وہ گھنگرالی خنجریاں بجتیں جو کبھی دو کوہان والے باختری اونٹوں کی مخمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اگر یہ فوٹو ان کی رننگ کمنڑی کے ساتھ نہ دیکھے ہوتے تو کسی طرح یہ قیاس و ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ پانچ سو مربع گز کی ایک لڑکھڑاتی حویلی میں اتنے فنون تعمیر اور ڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا گھمسان کا اژدحام ہو گا کہ عقل

دھرنے کی جگہ نہ رہے گی۔ پہلی مرتبہ فوٹو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا کہ کیمرا ہل گیا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے کھڑی ہے۔ مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

وہ تِرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حویلی کے صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر جہاں فوٹو میں گھوڑے پر ایک کالا مرغا گردن پھیلائے اذان دے رہا تھا، وہاں ایک شکستہ چبوترے کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے پتھروں کے جوڑ اور درزوں میں سے پودے روشنی کی تلاش میں گھبرا کے باہر نکل پڑے تھے۔ ایک دن اس چبوترے کی طرف اشارہ کرکے فرمانے لگے کہ یہاں آبِ مصفّا سے لبریز سنگِ سرخ کا ہشت پہلو حوض ہوا کرتا تھا جس میں ولایتی گولڈ فش تیرتی رہتی تھیں۔ عارف میاں اس میں پایونیر اخبار کی کشتیاں تیرایا کرتے تھے۔ یہ کہتے کہتے قبلہ جوشِ بیان میں اپنی چھڑی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پھٹی ہوئی دری پر ہشت پہلو حوض کا نقشہ کھینچنے لگے۔ ایک جگہ فرضی لکیر قدرے ٹیڑھی کھنچی تو اسے پیر سے رگڑ کر مٹایا۔ چھڑی کی نوک سے اس بدذات مچھلی کی طرف اشارہ کیا جو سب سے لڑتی پھرتی تھی۔ پھر ایک کونے میں اس مچھلی کی بھی نشان دہی کی جس کا جی

ماندہ تھا۔ انھوں نے کھل کر تو نہیں کہا کہ آخر ہم ان کے خورد تھے، لیکن ہم سمجھ گئے کہ مچھلی کا جی کھٹی چیزیں اور سوندھی مٹّی کھانے کو بھی چاہ رہا ہو گا۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست رئیس احمد قدوائی سے فرماتے کہ جوانی میں مئی جون کی ٹِیک دوپہریا میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں کوٹھوں ننگے پیر اُن کی حویلی کی تپتی چھت پر آنا، اب تک (مع ڈائیلاگ) یاد ہے۔ یہ بات مرزا کی سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔ اس لیے کہ ان کی حویلی سہ منزلہ تھی، جب دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر ہو اور زیورِ حیا اتارنے کیلیئے اتاولی بھی ہو رہی ہو، تب بھی یہ کرتب ممکن نہیں، تاوقتے کہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دولخت بھی نہ ہو جائے۔

پِلکھن

فوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چھتنار پِلکھن[1] اداس کھڑی تھی۔ اس کا تخم ان کے جدّ اعلیٰ سمندِ سیاہ زانو پر سوار، کارچوبی کام کے چغے میں چھپا کر قحط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق، ان کے پر دادا کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ "بے سروسامانی کے عالم میں یہ ننگِ خلائق، ننگِ اسلاف، ننگِ وطن ۔۔۔۔۔۔ ننگے سر، ننگے پیر، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر، ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ۔۔۔۔۔ خیبر کے سنگلاخ ننگے پہاڑوں کو پھلانگتا، واردِ ہندوستان ہوا"۔ جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لیے گھوڑے کی دُم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جائداد، محل سرا، خدام، مال و متاع ۔۔۔۔۔۔ سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصّہ یعنی شجرہ نسب اور پِلکھن کا تخم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا جو انہی

---

[1] پِلکھن: جن پڑھنے والوں نے یہ درخت نہیں دیکھا، وہ اس کی تصویر قراۃ العین حیدر کے "کارِ جہاں دراز ہے" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اس درخت کا فوٹو ہی دیکھا ہے۔ یہاں ہمارے پاس جتنے لغّات ہیں ان میں یہ لفظ نہیں ہے۔ تذکیر و تانیث کا بھی علم نہیں۔ لیکن جس پیار اور للک سے اس کا ذکر کیا گیا اس پر ہم نے قیاس کیا کہ مونّث ہی ہو گا۔

کی طرح نجیب الطرفین اور وطنِ مالوف سے بیزار تھا، تخم اور شجرے کے بوجھ سے رانوں تلے سے نکلا پڑ رہا تھا۔

شجرے کی ہر شاخ پہ نابغہ بیٹھا تھا

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی اور پیروں تلے زمین جائداد نکل گئی تو آئندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرے کے سائے تلے بسرام کیا۔ قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادرہ روزگار تھا اور ان کے شجرے کی ہر شاخ پر ایک نابغہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

قبلہ نے ایک فوٹو اس پلکھن کے نیچے اس جگہ کھڑے ہو کر کھینچوایا تھا جہاں ان کی نال گڑی تھی۔ فرماتے تھے، اگر کسی تخم ناتحقیق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہو تو نال نکال کر دیکھ لے۔ جب آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی نال کہاں گڑی ہے اور پرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں، تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ اپنی نال، پرکھوں اور پِلکھن کا ذکر اتنے فخر، غلو اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پِلکھن کی جڑیں شجرے میں اتر آئیں، جیسے گھٹنوں میں پانی اُتر آتا ہے۔

امپورٹڈ بزرگ اور یونانی ناک

وہ زمانے اور تھے۔ شرافت اور نجابت کے معیار بھی مختلف تھے۔ جب تک بزرگ اصلی امپورٹڈ یعنی ماورا النہری اور خیبر کے اس پار سے آئے ہوئے نہ ہوں، کوئی ہندوستانی مسلمان خود کو عزت دار اور نجیب نہیں گردانتا تھا۔ غالب کو تو شیخی بگھارنے کے لئے اپنا (فرضی) استاد ملاّ عبدالصمد تک ایران سے امپورٹ کرنا پڑا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب بے روزگاری اور عسرت سے تنگ آ کر وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداز تھے۔ بار بار اپنا دستِ افسوس زانوئے اسپ پر مارتے اور ایک راوِی شیوہ بیان کے بقول ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر استغفر اللہ! استغفر اللہ! کہتے۔ تازہ ولایت جس سے ملے، اپنے حسنِ اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔

پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں ہو گئے

پھر یہی پیارے لوگ بتدریج

پہلے خاں، پھر خانِ خاں، پھر خانِ خاناں ہو گئے

حویلی کے آرکی ٹیکچر کی طرح قبلہ کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے۔ بچپن میں دائیں رخسار پر غالباً آموں کی فصل میں پھنسی نکلی تھی جس کا داغ ہنوز باقی تھا۔ فرماتے تھے، جس سال میرے یہ اورنگ زیبی پھوڑا نکلا، اسی سال بلکہ اسی ہفتے میں ملکہ وکٹوریہ رانڈ ہوئی۔ ساٹھ کے پیٹے میں آئے تو شاہجہانی حبسِ بول میں مبتلا ہوگئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی کو اپنے زہرِ عشق سے مار ڈالا، مگر خود اسی، گویا کہ میرے والے عارضے میں مرا۔ ایک خط میں مرقوم ہے کہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں اور قطرہ قطرہ خارج کرتا ہوں۔ دمے کا دورہ ذرا تھمتا تو قبلہ بڑے فخر سے فرماتے کہ فیضی کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ اس نے ایک قطعے میں کہا ہے، کہ دو عالم میرے سینے میں سما گئے، مگر آدھا سانس کسی طور پر نہیں سما رہا! اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ راج روگ یعنی اکبری سنگرہنی میں انتقال فرمایا۔ مراد اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض قبلہ کی ناک تک اپنی نہیں تھی۔ یونانی بتاتے تھے۔

"مُردہ" از غیب بروں آید و کارے بکند

قبلہ کو دو غم تھے۔ پہلے غم کا ذکر بعد میں آئے گا۔ کہ وہ جاں گُسل تھا۔ دوسرا غم دراصل اتنا ان کا اپنا نہیں جتنا بیوی کا تھا جو بیٹے کی تمنّا میں گھل رہی تھی۔ اس

غریب نے بڑی منتیں مانیں۔ قبلہ کو شربت میں نقش گھول گھول کر پلائے۔ ان کے تکئے کے نیچے تعویز رکھے۔ چھپ چھپ کر مزاروں پر چادریں چڑھائیں۔ ہمارے ہاں لوگ جب زندوں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو ایک ہی آس باقی رہ جاتی ہے۔

مُردہ از غیب بروں آید و کارے بکند

پچاس میل کے دائرے میں کوئی مزار ایسا نہ بچا جس کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہ روئی ہوں کہ اہلِ قبر کے پسماندگان بھی تدفین کے وقت یوں نہ روئے ہوں گے۔ اس زمانے کے اہلِ القبور، صاحب کرامات ہوں یا نہ ہوں کم از کم قبر کے اندر ضرور ہوتے تھے۔ آج کل جیسا حال نہیں تھا کہ مزار اگر خالی از میت ہے تو غنیمت جانیے، ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے، جس کا اس دُھوم سے عرس شریف منایا جارہا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہارات نہ ہوں کہ آج فلاں آستانہ عالیہ پر چادر شریف چڑھائی جارہی ہے، پانچ بجے گاگر شریف، جلوس کی شکل میں لے جائی جائے گی۔ پھر اس سے مزار شریف کو غسل دیا جائے گا۔ بعد نماز مغرب لنگر شریف تقسیم ہو گا۔ ہم نے بعض نو دریافت بزرگوں کے نو تعمیر مزاروں

کے ضمن میں ”شریف“ پر تاکیداً اتنا زور دیکھا کہ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگتے ہیں۔ ہم نہ ضعیف العتقاد ہیں، نہ وہابی، لیکن کراچی کے ایک مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پُر ہوا ہے، ہم بالا علان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس سے متعلق ہر چیز شریف ہے، سوائے صاحبِ مزار کے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو روانی میں پھیل کر پورا پیرا بن گیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ قبلہ خود کو کسی زندہ پیر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں جب یہ پتہ چلا کہ بیوی اولادِ نرینہ کی منت مانگنے چوری چھپے نامحرموں کے مزاروں پر جانے لگی ہیں۔ تو بہت خفا ہوئے، وہ جب بہت خفا ہوتے تو کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ حلوائی کی دکان سے ربڑی، موتی چور کے لڈّو اور کچوری لا کر کھا لیتے۔ دوسرے دن بیوی کاسنی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ لیتیں اور انکے پسندیدہ کھانے یعنی دوپیازہ، ڈیوڑھی شکر والا زردہ، بہت تیز مرچوں کے ماش کے دہی بڑے کِھلا کے انھیں منا لیتیں۔ قبلہ انہی مرغوبات پر اپنے ایرانی اور عربی النسل بزرگوں کی نیاز دِلواتے۔ البتہ ان کے دہی بڑوں میں مرچیں برائے نام ڈلواتے۔ مزاروں پر حاضری پر قدغن بڑھا۔ بیوی بہت روئیں دھوئیں تو قبلہ کچھ پگھلے۔ مزاروں پر جانے کی اجازت دے دی، مگر اس شرط پر کہ مزار کا مکین ”ذات کا کمبوہ نہ ہو۔ کمبوہ مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے، خواہ مردہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان کے رگ و ریشہ

سے واقف ہوں"۔ ان کے دشمنوں سے روایت ہے کہ قبلہ خود بھی جوانی میں شاعر اور ننھیال کے طرف سے کمبوہ تھے۔ اکثر فرماتے "مرگِ کمبوہ جشنے دارد"۔

کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں گھنٹی

رفتہ رفتہ بیوی کو صبر آ گیا۔ ایک بیٹی تھی۔ قبلہ کو وہ عزیز سے عزیز تر ہوتی گئی۔ انھیں اس حد تک صبر آ گیا کہ اکثر فرماتے، خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے بڑا فضل کیا کہ بیٹا نہ دیا۔ اگر مجھ پر پڑتا تو تمام عمر خوار ہوتا۔ اور اگر نہ پڑتا تو ناخلف کو عاق کر دیتا۔

سیانی بیٹی، کتنی بھی چہیتی ہو، ماں باپ کی چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔ لڑکی، ضرورتِ رشتہ کی اشتہاری اصطلاحوں کے مطابق، قبول صورت، سلیقہ شعار، خوش اطوار، امورِ خانہ داری سے بخوبی واقف۔ لیکن کس کی شامت آئی تھی کہ قبلہ کی بیٹی کا پیام دے۔ ہمیں آتشِ نمرود میں کودنے کا ذاتی تجربہ تو نہیں، لیکن وثوق سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ آتشِ نمرود میں بے خطر کُودنے سے کہیں زیادہ خطرناک کام نمرود کے شجرہ نسب میں کود پڑنا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکے

ہیں، قبلہ ہمارے دوست بشارت کے پھوپا، چچا اور اللہ جانے کیا کیا لگتے تھے۔ دکان اور مکان دونوں اعتبار سے پڑوسی بھی تھے۔ بشارت کے والد بھی رشتے کے حق میں تھے، لیکن رقعہ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا کہ بہو کے بغیر پھر بھی گزارا ہو سکتا ہے، لیکن ناک اور ٹانگ کے بغیر تو شخصیت نامکمل سی معلوم ہو گی۔ بشارت نے ریل کی پٹڑی سے خود کو بندھوا کر بڑی لائن کے انجن سے اپنی خودکشی کی دھمکی دی۔ رسیوں سے بندھوانے کے بعد شرط خود اس لیے لگا دی کہ عین وقت پر اٹھ کر بھاگ نہ جائیں۔ لیکن ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ اس کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں تمہی گھنٹی ڈالو۔

قبلہ "مدمغ" بدلحاظ، منھ پھٹ مشہور ہی نہیں، تھے بھی۔ وہ دل سے۔۔۔۔۔۔ بلکہ بے دلی سے بھی۔۔۔ کسی کی عزّت نہیں کرتے تھے۔ دوسرے کو حقیر سمجھنے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور نکال لیتے۔ مثلاً کسی کی عمر اُن سے ایک مہینے بھی کم ہو تو اس کو لونڈا کہتے اور اگر ایک سال زیادہ ہو تو بڑھؤ!

ب و س ہ اور چار نقطے

بشارت نے ان دنوں بی اے کا امتحان دیا تھا اور پاس ہونے کا امکان، بقول ان کے، ففٹی ففٹی تھا۔ ففٹی ففٹی اتنے زور، فخر اور وثوق سے کہتے تھے گویا اپنی کانٹا تول نصفا نصف نالائقی سے ممتحن کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ کیرم اور کوٹ پیس کھیلتے۔ روحوں کو بلاتے اور ان سے ایسے سوالات کرتے کہ زندوں کو حیا آتی۔ کبھی دن بھر بیٹھے نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں وہ نقطے والے بلینک پُر کرتے رہتے جو منشی نول کشور پریس نے بہ تقاضائے تہذیب و تعزیراتِ ہند خالی چھوڑ دیے تھے۔ گفتگو میں ہر جملے کے بعد شعر کا "ٹھیکا" لگاتے۔ افسانہ نویسی کی مشق و مشقت بھی جاری تھی۔ نیاز فتح پوری کی اطلسی فقرہ طرازی اور ابوالکلام کی جھومتی جھامتی گج گامنی نثر کی چھاپ، ایک انہی پر موقوف نہیں، اچھے اچھوں کی طرز تحریر پر تھی۔ بعض پر ماتھے کے جھومر کے مانند۔ کچھ پر دھوبی کے نشان کی طرح۔ اور کچھ پر اس طرح جیسے انگریز ملاّح اپنی محبوباؤں کی تصویریں جسم پر گدوا لیتے ہیں۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کسی کی محتاجی نہیں۔ اُردو نثر اس زمانے میں فیل پا میں مبتلا

تھی۔ اس میں کچھ افاقہ ہوا تو معجونِ فلک سیر کھا کر ٹیگوری ادب پاروں کے اُڑن غالیچے پر سوار ہو گئی۔ بشارت کے ایک افسانے کا کلائمکس کچھ اس طرح تھا۔

انجم آرا کی حسن آفرینیوں، سحر انگیزیوں، اور حشر سامانیوں سے مشامِ جان معطّر تھا۔ وہ لغزیدہ لغزیدہ قدموں سے آگے بڑھی اور فرطِ حیا سے اپنی اطلسی بانہوں کو اپنی ہی دُزیدہ دُزدیدہ آنکھوں پر رکھا۔ سلیم نے انجم آرا کے دستِ حنائی کو اپنے آہنی ہاتھ میں لے کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی ہیرا تراش کلائی اور ساقِ بلوریں کو دیکھا اور گلنار سے لبوں پر.... چار نقطے ثبت کر دیے۔ اُس زمانے میں لفظ "بوسہ" فحش سمجھا جاتا تھا. لہٰذا اس کی جگہ نقطے لگا دیئے جاتے تھے. بشارت گن کر اتنے ہی نقطے لگاتے جن کی اجازت اس وقت کے حالات، حیا یا ہیروئن نے دی ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں انجمنِ ترقی اُردُو کے رسالے میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں جہاں جہاں لفظ بوسہ آیا، وہاں وہاں مولوی عبدالحق نے بربنائے تہذیب اس کے ہجے یعنی ب وس وہ چھاپ کر الٹا اس کی لذت و طوالت میں اضافہ کر دیا۔ یہاں ہمیں ان کا یا اپنی حبیبِ لبیب کی طرز نگارش کا مذاق اڑانا مقصود نہیں۔ ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ لفظ کبھی انگرکھا، کبھی عبا و عمامہ، کبھی ڈنر جیکٹ یا فولس کیپ، کبھی پیر میں

پائل یا بیڑی پہنے نظر آتے تھے۔ اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے سدھائے بندر ناچنے لگتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سن پیدائش اس طرح بتاتے ہیں:

"یہ غریب الدّیارِ عہد، نا آشنائے عصر، بیگانہ خویش، نمک پرودہ ریش، خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد، مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجّہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیءعدم سے اس عدمِ ہستی میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے مہتم"۔

اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے۔ اتنی خجالت، طوالت و اذیت تو آج کل سیزیرین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔[1]

---

[1] اسی طرح نو طرزِ مرصع کا ایک جملہ ملاحظہ فرمایئے:

"جب ماہتابِ عمر میرے کا بدرجہ چہار دوسالگی کے پہنچا، روزِ روشنِ ابتہاج اس تیرہ بخت کا تاریک تر شبِ یلدہ سے ہوا، یعنی پیمانہ عمر و زندگانی مادر و پدرِ بزرگوار حظوظِ نفسانی سے لبریز ہو کے اسی سال دستِ قضا سے دہلا"۔

کہنا صرف یہ چاہتے تھے کہ جب میں چودہ برس کا ہوا تو ماں باپ فوت ہو گئے۔ لیکن پیرایہ ایسا گنجلک اختیار کیا کہ والدین کے ساتھ مطلب بھی فوت ہو گیا۔

کوہ آتش فشاں میں چھلانگ

بالآخر ایک سہانی صبح بشارت نے بقلم خود رقعہ لکھا اور رجسٹری سے بھجوادیا، حالانکہ مکتوب الیہ کے مکان کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ رقعہ ۲۳ صفحات اور کم و بیش پچاس اشعار پر مشتمل تھا۔ جن میں سے آدھے اپنے اور آدھے عندلیب شادانی کے تھے جن سے قبلہ کے برادرانہ مراسم تھے۔ اس زمانے میں رقعے زعفران سے لکھے جاتے تھے۔ لیکن اس رقعے کے لیے تو زعفران کا ایک کھیت بھی ناکافی ہوتا۔ لہٰذا صرف القاب و آداب زعفران سے اور بقیہ مضمون سُرخ روشنائی سے زیڈ کے موٹے نِب سے لکھا۔ جن حصّوں پر بطور خاص توجہ دلانی مقصود تھی انھیں نیلی روشنائی سے باریک حروف میں لکھا۔ مدّعا اگرچہ گستاخانہ لیکن لہجہ برابر فدویانہ اور مضمون بے حد خوشامدانہ تھا۔ قبلہ کے حسن اخلاق، شفقت، خوش خوئی، خوش معاملگی، صلہ رحمی، نرم گفتاری، مردانہ وجاہت ۔۔۔۔۔

مرزا عبدالودود بیگ نے ایسے pompous style کے لیے سبک ہِندی کی طرز پر ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے: طرزِ اسطوخودوس۔ اس راقم الحروف کا نوٹ "دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ" کے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔ ویسے اس کے لغوی معنی ہیں: نزلے اور پاگل پن کی ایک دوا جسے اطبّا دماغ کی جھاڑو کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر اس خوبی کی جی کھول کر تعریف کی جس کا شائبہ تک قبلہ کے کردار میں نہ تھا۔ ساتھ ساتھ قبلہ کے دشمنوں کے نام بنام ڈٹ کر برائی کی۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ ۲۳ صفحات کے کوزے میں بند کر کے کھرل کرنا انہی کا کام تھا۔ بشارت نے جی کڑا کر کے یہ تو لکھ دیا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس وضاحت کی ہمت نہ پڑی کہ کس سے۔ مضمون بے ربط و ژولیدہ سہی لیکن قبلہ اپنے حسنِ سیرت اور دشمنوں کی حرمزدگیوں کے بیان سے بہت خوش ہوئے۔ اس سے پہلے ان کو کسی نے وجیہہ بھی نہیں کہا تھا۔ دو دفعہ پڑھ کر اپنے منشی کو پکڑا دیا کہ تم ہی پڑھ کر بتاؤ صاحب زادے کس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اوصاف تو میرے بیان کیے ہیں۔

قبلہ دیر تک اپنے مبینہ اوصاف حمیدہ پر دل ہی دل میں اِترایا کیے۔ گلیشیئر تھا کہ پگھلا جا رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے، منشی جی سے گویا ہوئے، بعضے بعضے بے استادے شاعر کے اشعار میں کبھی کبھی الف گرتا ہے۔ اس کے اشعار میں تو الف سے لے کر ے تک سارے حروف تہجی ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں۔ جیسے عید گاہ میں نمازی ایک دوسرے کی کمر پر رکوع و سجود کر رہے ہوں۔

بشارت کی جرات رندانہ کی کہانی جس نے سنی ششدر رہ گیا۔ خیال تھا کہ کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ قبلہ نے اگر ازراہِ ترحم سارے خاندان کو قتل نہیں کیا تو کم از کم ہر ایک ٹانگیں ضرور توڑ دیں گے۔ یہ سب کچھ نہیں ہوا قبلہ نے بشارت کو اپنی غلامی قبول کر لیا۔

راون کیوں مارا گیا؟

قبلہ کی دکانداری اور اس کی لائی ہوئی آفتوں کی ایک مثال ہو تو بیان کریں۔ کوئی گاہک اشارۃً یا کنایتہً بھی ان کی کسی بات یا بھاؤ پر شک کرے تو پھر اس کی عزّت ہی نہیں، ہاتھ پیر کی بھی خیر نہیں۔ ایک دفعہ عجلت میں تھے۔ لکڑی کی قیمت چھوٹتے ہی دس روپے بتا دی۔ دیہاتی گاہک نے پونے دس لگائے اور یہ گالی دیتے ہوئے مارنے کو دوڑے کہ جٹ گنوار کو اتنی جرات کیسے ہوئی۔ دکان میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ جس کے بانوں کو چَرا چَرا کر آرا کھینچنے والے مزدور چِلم میں بھر کے سلفے کے دم لگاتے تھے۔ قبلہ جب باقاعدہ مسلح ہو کر حملہ کرنا چاہتے تو اس چارپائی کا سیروا یعنی سرہانے کی پٹّی نکال کر اپنے دشمن یعنی گاہک پر جھپٹتے۔ اکثر سیروے کو پچکارتے ہوئے فرماتے ”عجب سخت جان ہے۔ آج تک اس میں فریکچر نہیں ہوا۔ لٹھ رکھنا بزدلوں اور گنواروں کا وتیرہ ہے۔ اور

لاٹھی چلانا، قصائی، کنجڑوں، غنڈوں، اور پولیس کا کام ہے"۔ استعمال کے بعد سیر وے کی فرسٹ ایڈ کر کے یعنی انگوچھے سے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر واپس جھلنگے میں لگا دیتے۔ اس طریقہ واردات میں غالباً یہ حکمت عملی پوشیدہ تھی کہ چار پائی تک جانے اور سیر وا نکالنے کے وقفے میں اگر غصّے کو ٹھنڈا ہونا ہے تو ہو جائے۔ اور اگر ان کے معتوب کی بینائی اور عقل زائل نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی ٹانگوں کے استعمال میں مزید بخل سے کام نہ لے۔ ایک قدیم چینی کہاوت ہے کہ لڑائی جو ۳۰۷ پینترے داناؤں نے گنوائے ہیں، ان میں جو پینترا سب سے کارآمد بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بھاگ لو! اس کی تصدیق ہندو دیومالا سے بھی ہوتی ہے۔ راون کے دس سر اور بیس ہاتھ تھے۔ پھر بھی مارا گیا۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ بھاگنے کے لیے صرف دو ٹانگیں تھیں۔ حملہ کرنے سے پہلے قبلہ کچھ دیر خو خیاتے تاکہ مخالف اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو بچا لے۔ فرماتے تھے، آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص کی ٹھکائی کرنے سے پہلے میں نے اسے گالی دے کر خبر دار نہ کیا ہو۔ کیا شعر ہے وہ بھلا سا؟ ہاں!

پشّہ سے سیکھے شیوہ مردانگی کوئی

جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

انسانی کردار میں مچھر کی صفات پیدا کر کے اتنا فخر کرتے ہم نے انہی کو دیکھا۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم اے، بی ٹی نے ان کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنے دو بقراطی لیکچروں کے مجموعے بعنوان "خطابات چاکسو" کی آؤٹ لائن بنائی۔ "مشرقی شعر و روایت میں پشہ کا مقام: تاریخی تناظر میں معروضی زاویے سے" اور "موازنہ پشہ و شاہین" ہمارے قارئین ماشاءاللہ عاقل ہیں۔ اشارے کی بھی ضرورت نہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔

ہوں لائقِ تعزیر، یہ الزام غلط ہے

قبلہ کی ہیبت سب کے دلوں پر بیٹھی تھی۔ بجز دائیں جانب والے دکان دار کے۔ وہ قنوج کا رہنے والا، نہایت خود سر، ہتھ چھُٹ، بد معاملہ اور بد زبان آدمی تھا۔ عمر میں قبلہ سے بیس سال کم ہو گا۔ یعنی جوان اور سرکش، چند سال پہلے تک اکھاڑے میں با قاعدہ زور کرتا تھا۔ پہلوان سیٹھ کہلاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک گاہک قبلہ کی سرحد میں ۴/۳ داخل ہو چکا تھا کہ پہلوان سیٹھ اسے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنی دکان میں لے گیا اور قبلہ "مہاراج! مہاراج!" پکارتے رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی دکان میں گھس کر گاہک کو چھڑا کر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ پہلوان سیٹھ نے ان کو وہ گالی دی جو وہ خود سب کو دیا کرتے تھے۔

پھر کیا تھا قبلہ نے اپنے اسلحہ خانہ خاص یعنی چارپائی سے پٹی نکالی اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے اس کی دکان میں دوبارہ داخل ہوئے۔ گاہک نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور اولین غفلت میں اپنا دانت تڑوا کر مصالحتی کاروائی سے ریٹائر ہو گیا۔ دریدہ دہن پہلوان سیٹھ دکان چھوڑ کر بگٹٹ بھاگا۔ قبلہ اس کے پیچھے سر پٹ۔ تھوڑی دور جا کر اس کا پاؤں ریل کی پٹڑی میں الجھا اور وہ منھ کے بل گرا قبلہ نے جالیا۔ پوری طاقت سے ایسا وار کیا کہ پٹّی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں اس سے چوٹ آئی یا ریل کی پٹڑی پر گرنے سے۔ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ اس کے گرد خون کی تلیا سی بن گئی۔

پہلوان سیٹھ کی ٹانگ کے multiple فریکچر میں گنگرین ہو گیا اور ٹانگ کاٹ دی گئی۔ فوجداری مقدمہ بن گیا۔ اس نے پولیس کو خوب پیسا کھلایا اور پولیس نے دیرینہ عداوت کی بنا پر قبلہ کا اقدام قتل میں چالان پیش کر دیا۔ تعزیرات ہند کی اور بہت سی دفعات بھی لگا دیں۔ لمبی چوڑی فردِ جرم سن کر قبلہ فرمانے لگے کہ ٹانگ کا نہیں، تعزیراتِ ہند کا ملٹی پل فریکچر ہوا ہے۔ پولیس گرفتار کر کے لے جانے لگی تو بیوی نے پوچھا "اب کیا ہوئے گا؟" کندھے اُچکاتے ہوئے بولے "دیکھیں گے" عدالت مجسٹریٹ میں بیچ بچاؤ کرنے والے گاہک کا دانت اور قتل یعنی چارپائی مع خون پلائی ہوئی پٹّی کے بطور exhibits پیش ہوئے۔

مقدّمہ سیشن سپرد ہو گیا۔ قبلہ کچھ عرصے ریمانڈ پر جوڈیشنل حوالات میں رہے تھے۔ اب جیل میں باقاعدہ خونیوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں اور عادی مجرموں کے ساتھ رہنا پڑا۔ تین چار مُچٹیوں کے بعد وہ بھی قبلہ کو اپنا چچا کہنے اور ماننے لگے۔

ان کی طرف سے یعنی بحثیت وکیل صفائی کانپور کی ایک لائق بیرسٹر مصطفٰے رضا قزلباش نے پیروی کی۔ مگر وکیل اور مؤکل کا کسی ایک نکتے پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ مثلاً قبلہ بضد تھے کہ حلف اٹھا کر بیان دوں گا مضروب نے اپنی ولدیت غلط لکھوائی ہے۔ اس کی صورت اپنے باپ سے نہیں، باپ کے ایک اوباش دوست سے ملتی ہے۔ بیرسٹر موصوف یہ موقف اختیار کرنا چاہتے تھے کہ چوٹ ریل کی پٹڑی پر گرنے سے آئی ہے، نہ کہ ملزم کی مبینہ ضرب سے۔ اِدھر قبلہ کمرہ عدالت میں فلمی بیرسٹروں کی طرح طرح ٹہل ٹہل کر اور کٹہرے کو جنھجھوڑ جنھجھوڑ کر یہ اعلان کرنا چاہتے تھے کہ میں سپاہی بچّہ ہوں۔ دکان داری میرے لیے کبھی ذریعہ عزت نہیں رہی بلکہ عرصہ دراز سے ذریعہ آمدنی بھی نہیں رہی۔ ٹانگ پر وار کرنا ہماری شانِ سپہ گری اور شیوہ مردانگی کی توہین ہے۔ میں تو دراصل اس کا سر پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اگر مجھے سزا دینی ہی تو ٹانگ توڑنے کی نہیں، غلط نشانے کی دیجیے: ہوں لائق تعزیر، پہ الزام غلط ہے۔

ایام اسیری اور جوں کا بلڈ ٹیسٹ

عدالت میں فوجداری مقدّمہ چل رہا تھا۔ قرائن کہتے تھے کہ سزا ہو جائے گی اور خاصی لمبی۔ گھر میں ہر پیشی کے دن رونا پیٹنا مچتا۔ اعزاء اور احباب اپنی جگہ پریشان اور سراسیمہ کہ ذرا سی بات پر یہ نوبت آ گئی۔ پولیس انھیں ہتھکڑی پہنا کر سارے شہر کا چکر دلا کر عدالت میں پیش کرتی اور پہلوان سیٹھ سے حق الخدمت وصول کرتی۔ بھولی بھالی بیوی کو یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتیں "بھیا! کیا سچ مچ کی ہتھکڑی پہنائی تھی؟" عدالت کے اندر اور باہر قبلہ کے تمام دشمنوں یعنی سارے شہر کا ہجوم ہوتا۔ سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ مگر قبلہ نے کبھی منھ پر تولیا اور ہتھکڑی پر رومال نہیں ڈالا۔ گشت کے دوران مونچھوں پر تاؤ دیتے تو ہتھکڑی جھن جھن جھن جھن کرتی۔ رمضان آیا تو کسی نے مشورہ دیا کہ نماز روزہ شروع کر دیجئے۔ اپنے کان ہی پورا[1] کے مولانا حسرت موہانی تو روزے میں چکی بھی پیستے تھے۔ قبلہ نے بڑی حقارت سے جواب دیا "لاحول ولا قوۃ! میں شاعر تھوڑا ہی ہوں۔ یہ نام ہو گا غمِ روزگار سہ نہ سکا"۔

---

[1] کان ہی پور کے: کانپور والے اکثر "کانپور ہی کے" کہنے کی بجائے "کان ہی پور کے" کہتے ہیں!

بیوی نے کئی مرتبہ پچھوایا "اب کیا ہوئے گا؟"

ہر بار ایک ہی جواب ملا "دیکھ لیں گے"۔

طیش کے عالم میں جو بات منھ سے نکل جائے یا جو حرکت سرزد ہو جائے، اس پر انہیں کبھی نادم ہوتے نہیں دیکھا۔ فرماتے تھے کہ آدمی کے اصل کردار کی جھلک تو طیش کے کوندے میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اپنے کسی کرتوت یعنی اصل کردار پر پشیمان یا پریشان ہونے کو مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک دن ان کا بھتیجا شام کو جیل میں کھانا اور جوئیں مارنے کی دوا دے گیا۔ دوا کے اشتہار میں لکھا گیا تھا کہ اس کے ملنے سے جوئیں اندھی ہو جاتیں ہیں۔ پھر انہیں آسانی سے پکڑ کر مارا جا سکتا ہے۔ جوں اور لیکھ مارنے کی مروّجہ ترکیب بھی درج تھی۔ یعنی جوں کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھو اور دائیں انگوٹھے کے ناخن سے چٹ سے کچل دو۔ اگر جون کے پیٹ سے کالا یا گہرا عُنابی خون نکلے تو فوراً ہماری دوا "اکسیر جالینوس" مصفّیٰ خون پی کر اپنا خون صاف کیجئے۔ پرچے میں یہ ہدایت بھی تھی کہ دوا کو کورس اس وقت جاری رکھا جائے جب تک جوں کے پیٹ سے صاف شدہ خون نہ نکلنے لگے۔ قبلہ نے جنگلے کے اس طرف اشارے سے بھتیجے کو کہا کہ اپنا کان میرے منھ کے قریب لاؤ۔ پھر اس سے کہا کہ برخوردار! زندگی کا

بھروسہ نہیں۔ دنیا، اس جیل سمیت، سرائے فانی ہے۔ غور سے سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے اور وصیت بھی۔ لوہے کی الماری میں دو ہزار روپے آڑے وقت کے لیے ردّی کے اخباروں کے نیچے چھپا آیا تھا۔ یہ رقم نکال کر الّن (شہر کا نامی غنڈہ) کو دے دینا۔ اپنی چچی کو میری طرف سے دلاسا دینا۔ الّن کو میری دُعا کہنا اور یہ کہنا کہ ان چھوؤں کی ایسی ٹھکائی کرے کہ گھر والے صورت نہ پہچان سکیں۔ یہ کہہ کر اخبار کا ایک مسلا ہوا پرزہ بھتیجے کو تھما دیا، جس کے حاشیے پر ان چھ گواہانِ استغاثہ کے نام درج تھے جن کو پٹوانے کا انہوں نے جیل میں اس وقت منصوبہ بنایا تھا جب ایسی ہی حرکت پر انھیں آج کل میں سزا ہونے والی تھی۔

ایک دفعہ اتوار کو ان کا بھتیجا جیل میں ملاقات کیلئے آیا اور بولا کہ جیلر تک بآسانی سفارش پہنچائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کا جی کسی خاص کھانے مثلاً زردہ یا دہی بڑے، شوق کی مثنوی، سگریٹ یا مہوے کے پان کو چاہے تو چوری چھپے ہفتے میں کم از کم ایک بار آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ چچی نے تاکید سے کہا ہے۔ عید نزدیک آ رہی ہے۔ رو رو کر آنکھیں سجالی ہیں۔

قبلہ نے جیل کے کھدر کے نیکر پر دوڑتا ہوا کھٹمل پکڑتے ہوئے کہا، مجھے قطعی کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اگلی دفعہ آؤ تو سراج فوٹو گرافر سے حویلی کا فوٹو کھنچوا کر لانا کئی مہینے ہو گئے دیکھے ہوئے۔ جدھر تمھاری چچی کے کمرے کی چق ہے، اس رخ سے کھینچے تو اچھی آئے گی۔

سنتری نے زمین پر زور سے بوٹ کی تھاپ لگاتے اور تھری ناٹ تھری کی رائفل کا کندہ بجاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا ملاقات کا وقت ختم ہو چکا۔ عید کا خیال کر کے بھتیجے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ قبلہ نے اس کا کان پکڑا اور کھینچ کر اپنے منھ تک لانے کے بعد کہا، ہاں! ہو سکے تو جلد ایک تیز چاقو کم از کم چھ انچ کے پھل والا، ڈبل روٹی یا عید کی سویوں میں چھپا کر بھجوا دو۔ دوم، بمبئی میں Pentangular[1] شروع ہونے والا ہے۔ کسی ترکیب سے مجھے روزانہ اسکور معلوم ہو جائے تو واللہ! ہر روز عید ہو، ہر شب شبِ برات! خصوصاً وزیرِ اعلیٰ کا اسکور دن کے دن معلوم ہو جائے تو کیا کہنا۔

---

[1] Pentagular بمبئی میں سالانہ کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تھا جس میں ہندو، مسلم، پارسی، اینگلو انڈین اور یورپین ٹیمیں حصّہ لیتی تھیں۔

سزا ہو گئی، ڈیڑھ سال قیدِ بامشقّت۔ فیصلہ سنا۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گویا آسمان سے پوچھ رہے ہوں "تو دیکھ رہا ہے! کیا ہو رہا ہے؟ ?How's that" پولیس نے ہتھکڑی ڈالی۔ قبلہ نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیل جاتے وقت بیوی کو کہلا بھیجا کہ آج میرے جدّ اعلیٰ کی روحِ پُر فتوح کتنی مسرور ہو گی۔ کتنی خوش نصیب بی بی ہو تم کہ تمہارا دولھا (جی ہاں! یہی لفظ استعمال کیا تھا) ایک حرامزادے کی ٹھکائی کر کے مَردوں کا زیور پہنے جیل، جا رہا ہے۔ لکڑی کی ٹانگ لگوا کر گھر نہیں آ رہا۔ دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھنا۔ بھتیجے کو تاکید کی کہ حویلی کی مرمت کراتے رہنا۔ اپنی چچی کا خیال رکھنا۔ ان سے کہنا یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ دل بھاری نہ کریں اور جمعے کو کاسنی دوپٹا اوڑھنا نہ چھوڑیں۔

بیوی نے پچھوایا "اب کیا ہوئے گا؟"

جواب ملا، "دیکھا جائے گا"۔

ٹارزن کی واپسی

دو سال تک دکان میں تالا پڑا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا جیل سے چھوٹنے کے بعد چپ چپاتے کہیں اور چلے جائیں گے۔ قبلہ جیل سے چھوٹے۔ ذرا جو بدلے

ہوں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں جوڑ نہیں تھے۔ جاپانی زبان میں کہاوت ہے کہ بندر درخت سے زمین پر گر پڑے، پھر بھی بندر ہی رہتا ہے۔ سو وہ بھی ٹارزن کی طرح AAuuaauuuu ! چنگاڑتے ہوئے جیل سے نکل کر سیدھے اپنے آبائی قبرستان گئے۔ والد کی قبر کی پائینتی کی خاک سر پر ڈالی۔ فاتحہ پڑھی اور کچھ سوچ کر مسکرا دیے۔

دوسرے دن دکان کھولی، کیبن کے باہر ایک بّلی گاڑ کر اس پر ایک لکڑی کی ٹانگ بڑھئی سے بنوا کر لٹکا دی۔ صبح و شام اس کو رَسّی سے کھینچ کر اس طرح چڑھاتے اور اتارتے تھے جس طرح اس زمانے میں چھاؤنیوں میں یونین جیک چڑھایا اتارا جاتا تھا۔ جن نادہندوں نے دو سال سے رقم دبا رکھی تھی انہیں یاد دہانی کے دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ اور اپنے نام کے دستخط کے بعد بریکٹ میں (سزا یافتہ) لکھا۔ جیل جانے سے پہلے خطوط میں خود کو بڑے فخر سے ”ننگِ اسلاف“ لکھا کرتے تھے۔ کس کی مجال نہ تھی کہ اس سے اتفاق کرے۔، اتّفاق تو درکنار، مارے ڈر کے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے نام کے ساتھ ننگِ اسلاف کے بجائے ”سزا یافتہ“ اس طرح لکھنے لگے جیسے لوگ ڈگریاں یا خطاب لکھتے ہیں۔ قانون اور جیل سے ان کی جھجک نکل چکی تھی۔

تو قبلہ جیسے گئے تھے ویسے ہی جیل کاٹ کر واپس آ گئے۔ طنطنے اور آواز کے کڑکے میں ذرا فرق نہ آیا۔ اس اثنا میں اگر زمانہ بدل گیا تو اس میں انکا کوئی قصور نہیں تھا۔ اب ان کی رائے میں قطعیت کے ساتھ فقطیت بھی پیدا ہو گئی۔ ان کا فرمایا ہوا مستند تو پہلے ہی تھا، اب مختتم بھی ہو گیا۔ سیاہ مخمل کی رام پوری ٹوپی اور زیادہ تِر چھّی ہو گئی۔ یعنی اتنی جھکا کر ٹیڑھی اوڑھنے لگے کہ دائیں آنکھ ٹھیک سے نہیں کھول سکتے تھے۔ اب کبھی بیوی گبھرا کے "اب کیا ہوئے گا؟"" کہتیں تو وہ "دیکھتے ہیں" کے بجائے "دیکھ لیں گے" اور "دیکھتی جاؤ" کہنے لگے۔ رہائی کے دن قریب آئے تو داڑھی کے علاقے کے بال بھی گچّھے دار مونچھوں میں شامل کر لیے جو اَب اتنی گھنی ہو گئی تھیں کہ ایک ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتے، تب کہیں دوسرے ہاتھ سے لقمہ رکھ پاتے تھے۔ جیل ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ فرماتے تھے "یہیں تیسرے بیرک میں ایک منشی فاضل پاس جعلیا ہے۔ فصاحت یار خان۔ بن اور دھوکہ دہی میں تین سال کی کاٹ رہا ہے۔ بامشقت۔ پہلے شعلہ اب حزیں تخلص کرتا ہے۔ بلا کا بسیار گو۔ چکی پیسنے میں اپنی ہی تازہ غزل گاتا رہتا ہے۔ موٹا پیستا ہے اور پٹتا ہے۔ اب یہ کوئی شاعری تو ہے نہیں۔ تس پر خود کو غالب سے کم نہیں سمجھتا۔ حالاں کہ مماثلت صرف اتنی ہے کہ دونوں نے جیل کی ہوا کھائی۔ خود کو روہیلہ بتاتا ہے۔ ہو گا۔ لگتا نہیں۔ قیدیوں سے بھی منھ

چھپائے پھرتا ہے۔ اپنے بیٹے کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا والد صاحب عارضی طور پر نقل مکانی کر گئے ہیں۔ جیل کو کبھی جیل نہیں کہتا۔ زنداں کہتا ہے۔ اور خود کو قیدی کے بجائے اسیر! ارے صاحب! غنیمت ہے کہ جیلر کو عزیزِ مصر نہیں کہتا۔ اسے تو چکی کو آسیا کہنے میں بھی عار نہ ہوتی، مگر میں تو جانوں پاٹ کی عربی معلوم نہیں۔ شاید وہ سمجھتا ہے استفراغ اور اسہال کہنے سے قے دست تو بند نہیں ہوتے، بو جاتی رہتی ہے۔ کس واسطے کہ اس کے باپ کا انتقال ہیضے میں ہوا تھا۔ ارے صاحب! میں یہاں کسی کی جیب کاٹ کر تھوڑا ہی آیا ہوں۔ شیر کو پنجرے میں بند کر دو، تب بھی شیر ہی رہتا ہے۔ گیڈر کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو، اور زیادہ گیڈر ہو جائے گا۔ اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ جیل کا گھٹنا (گھٹنوں تک نیکر) پہنتے ہی طبیعت میں سوزو گداز پیدا ہو جائے"۔ بلکہ ہمیں تو قبلہ کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ پھٹا ہوا کپڑا پہننے اور جیل میں قیام فرمانے کو سنتِ یوسفی سمجھتے ہیں۔ ان کی مزاج میں جو ٹیڑھ تھی وہ کچھ اور بڑھ گئی۔ کوّے پر کتنے ہی صدمے گزر جائیں، کتنا ہی بوڑھا ہو جائے، اس کے پر و بال کالے ہی رہتے ہیں۔ اکل کھرّے، کھرّے، کھُردرے کھَرے یا کھوٹے، وہ جیسے کچھ بھی تھے، ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔

تن اُجرا (اُجلا) من گادلا (گدلا) بگلا جیسے بھیس

ایسے سے کاگا بھلے، باہر بھیترا یک

فرماتے تھے، الحمد اللہ میں منافق، ریاکار نہیں۔ میں نے گناہ کو ہمیشہ گناہ سمجھ کر کیا۔

دکان دوسال سے بند پڑی تھی۔ چھوٹ کر گھر آئے تو بیوی نے پوچھا:

"اب کیا ہوئے گا؟"

"بیوی، ذرا تم دیکھتی جاؤ"۔

لبِ معشوق

اب کے دکان چلی اور ایسی چلی کہ اوروں ہی کو نہیں خود انہیں بھی حیرت ہوئی۔ دکان کے باہر اسی شکار گاہ یعنی کیبن میں اسی ٹھسّے سے گاؤ تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ مگر زاویہ پسر گیا تھا۔ پیروں کا رخ اب فرش کی بہ نسبت آسمان کی طرف زیادہ تھا۔ جیل میں سکونت پزیر ہونے سے پہلے قبلہ گاہک کو ہاتھ کے ملتجیانہ اشارے سے بلایا کرتے تھے۔ اب صرف انگشتِ شہادت کے خفیف سے اشارے سے طلب کرنے لگے۔ انگلی کو اس طرح حرکت دیتے جیسے ڈانواں ڈول پتنگ کو ٹھمکی دے کر اس کا قبلہ درست کر رہے ہوں۔ حقّے کی نَے میں

اب ایک فٹ کا اضافہ کر لیا۔ حقّہ اب پیتے کم، گڑگڑاتے زیادہ تھے۔ بدبودار دھویں کا چھلا اس طرح چھوڑتے کہ گاہک کی ناک میں نتھ کی طرح لٹک جائے۔ اکثر فرماتے واجد علی شاہ، جانِ عالم پیانے، جو خوب صورت نام رکھنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، حقّے کا کیسا پیارا نام رکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔لبِ معشوق۔ جو شخص کبھی حقّے کے پاس سے بھی گزرا ہو وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جانِ عالم پیا کا پالا کیسے لبوں سے پڑا ہو گا۔ چناچہ معزولی کے بعد وہ فقط حقّہ اپنے ہمراہ مٹیا برج لے گئے۔ پری خانے کے تمام معشوق لکھنؤ میں ہی چھوڑ گئے، اس لیے کہ معشوق کو نیچہ پکڑ کے گڑگڑایا نہیں جا سکتا۔

بَلّی پہ لٹکا دوں گا

منشی دیا نرائن نگم کے رسالے "زمانہ" کے کاتب سے عرفی کا مشہور شعر احاطے کی دیوار پر ڈامر سے لکھوا دیا:

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں

آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را[1]

ہمیں اس شعر سے نسلی عصبیت اور جانب داری کی بو آتی ہے۔ کتّے اگر شعر کہہ سکتے تو دوسرا مصرع کچھ یوں ہوتا:

آوازِ گدا کم نہ کند رزقِ سگاں را[2]

کچھ دن بعد ان کا لنگڑا دشمن یعنی پہلوان سیٹھ دکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا۔ قبلہ بات بے بات ہر ایک کو دھمکی دینے لگے کہ سالے کو ٹِلّی پر لٹکا دوں گا۔ ہیبت کا یہ عالم کہ اشارہ تو بہت بعد کی بات ہے، قبلہ جس گاہک کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ لیں، اسے کوئی دوسرا نہیں بلاتا تھا۔ اگر وہ از خود کسی دوسری دکان میں چلا جاتا تو دکان دار اسے لکڑی نہیں دکھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سڑک پر یوں ہی کوئی راہ گیر منھ اٹھائے جا رہا تھا کہ قبلہ نے اسے انگلی سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جس دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا اس کا مالک اور منیم اسے گھسیٹتے

---

[1] مطلب یہ کہ عرفی تو رقیبوں کے شور و غوغا کرنے سے اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ کتّوں کے بھونکنے سے گدا کا رزق کم نہیں ہوتا۔

[2] گدا کی صدا سے کتّوں کا رزق کم نہیں ہوتا۔

ہوئے قبلہ کی دکان میں اندر دھکیل گئے۔ اس نے قبلہ سے روہانسا ہو کر کہا میں تو مول گنج پتنگوں کے پیچ دیکھنے جا رہا تھا!

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

پھر یکایک ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ وہ کٹّر مسلم لیگی تھے۔ اس کا اثر ان کی بزنس پر پڑا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ انہوں نے اپنے نعرے کو حقیقت بنتے دیکھا۔ اور دونوں کی پوری قیمت ادا کی۔ گاہکوں نے آنکھیں پھر لیں۔ لکڑ منڈی کے چوہے شیر ہو گئے۔ عزیز و اقارب جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے اور نفرت کرتے رہے، ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے تو ایک جھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور جب اکلوتی بیٹی اور داماد بھی اپنی دکان بیچ کھوچ کے کراچی سدھارے تو انھوں نے بھی اپنے خیمے کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔ دُکان اونے پونے ایک دلال کے ہاتھ بیچی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ''بے نامی'' سودا ہے۔ دلال کی آڑ میں دکان دراصل اسی لنگڑے پہلوان سیٹھ نے خرید کر ان کی ناک کاٹی ہے۔ خفیف سا شبہ تو قبلہ کو بھی ہوا تھا، مگر ''اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے'' والی صورتِ حال تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں پیڑھیوں کے رشتے

ناتے ٹوٹ گئے اور قبلہ نے پُرکھوں کی جنم بھوم چھوڑ کر ان کے خوابوں کی سر زمین کا رُخ کیا۔

ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ اَنا کا ناچ دیکھتے دیکھتے، قبلہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو نہ صرف زمین اجنبی لگی، بلکہ اپنے پیروں پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور کے لگے۔ کھولنے کو تو لِی مارکیٹ میں ہر چند رائے روڈ پر لشتم پشتم دکان کھول لی، مگر بات نہیں بنی۔ گجراتی میں مثّل ہے کہ پرانے مٹکے پر نیا منھ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ آنے کو تو وہ ایک نئی سرسبز زمین میں آگئے، مگر ان کی بوڑھی آنکھیں پلکھن کو ڈھونڈھتی رہیں۔ پلکھن تو درکنا، انھیں تو کراچی میں نیم تک نظر نہ آیا۔ لوگ جیسے نیم بتاتے تھے، وہ دراصل بکائن تھی جس کی 'بنولی' کو لکھنؤ میں حکیم صاحب عالم، پیچش اور بواسیر کے نسخوں میں لکھا کرتے تھے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

کہاں کانپور کے دیہاتی گاہک، کہاں کراچی کے نخریل ساگوان خریدنے والے۔ درحقیقت انہیں جس بات سے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی وہ یہ تھی کہ یہاں اپنے قرب وجوار میں، یعنی اپنے سایۂ زحمت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے وہ بے وجہ و بے خطر گالی دے سکیں۔ ایک دن کہنے لگے "یہاں تو بڑھئی

آری کا کام زبان سے لیتا ہے۔ چار پانچ دن ہوئے ایک دریدہ دہن بڑھئی آیا، اقبال مسیح نام تھا۔ میں نے کہا، ابے! پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔ کہنے لگا: حضرت عیسٰی بھی تو ترکھان تھے۔ میں کہا، کیا کفر بکتا ہے؟ ابھی ٹِلّی پہ لٹکا دوں گا۔ کہنے لگا، اوہ لوک وی ایہی کہندے سان! (وہ لوگ بھی حضرت عیسٰی سے یہی کہتے تھے!)

میر تقی میر کراچی میں

پہلی نظر میں انہوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مسترد کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی میں کیڑے ڈالتے۔ شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا:

"حضنت! یہ مچھر ہیں یا مگر مچھر؟ کراچی کا مچھر ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا۔ صرف قوّالوں کی تالیوں سے مرتا ہے۔ یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولاد امرتا ہے۔ نمرود مردود کی موت ناک میں مچھر گھسنے سے واقع ہوئی تھی۔ کراچی کے مچھروں کا شجرۂ نسب کئی نمرودوں کے واسطے سے اسی مچھر سے جا ملتا ہے۔ اور ذرا زبان تو ملاحظہ فرمائیے، میں نے پہلی بار ایک صاحب کو پیٹّے والے کو پکارتے سنا تو میں سمجھا اپنے کتّے کو بلا رہے ہیں۔ معلوم ہوا یہاں چپراسی کو پیٹّے والا کہتے ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ پھڈا اور لفڑا ہوتا رہتا ہے۔ ٹوکو تو

کہتے ہیں، اُردُو میں اس صورتحال کیلئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھائی میرے! اُردُو میں یہ صورتحال بھی تو نہیں ہے۔ بمبئی والے لفظ اور صورتِحال دونوں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ میر تقی میر اونٹ گاڑی میں منھ باندھے بیٹھے رہے۔ اپنے ہم سفر سے اس لیے بات نہ کی کہ "زبانِ غیر سے اپنی زباں بگڑتی ہے"۔ میر صاحب کراچی میں ہوتے تو بخدا ساری عمر منھ پر ڈھاٹا باندھے پھرتے، یہاں تک کہ ڈاکوؤں کا سا بھیس بنائے پھرنے پر کسی ڈکیتی میں دَھر لیئے جاتے۔ اماں! ٹونک والوں کو امرود کو صفری کہتے تو ہم نے بھی سنا تھا۔ یہاں امرود کو جام کہتے ہیں۔ اور اس پر نمک مرچ کے بجائے "صاحب" لگا دیں تو مُراد نواب صاحب لسبیلہ ہوتے ہیں۔ اپنی طرف وکٹوریہ کا مطلب ملکہ ٹوریہ ہوتا تھا۔ یہاں کسی ترکیب سے دس بارہ جنے ایک گھوڑے پر سواری گانٹھ لیں تو اسے وکٹوریہ کہتے ہیں۔ میں دو دن لاہور رکا تھا۔ وہاں دیکھا کہ جس بازار میں کوئلوں سے منھ کالا کیا جاتا ہے، وہ ہیر امنڈی کہلاتی ہے! اب یہاں نیا فیشن چل پڑا ہے۔ گانے والے کو گلوکار اور لکھنے والے کو قلم کار کہنے لگے ہیں۔ میاں! ہمارے وقتوں میں تو صرف نیکوکار اور بدکار ہوا کرتے تھے۔ قلم اور گلے سے یہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔

"میں نے لالو کھیت، بہار کالونی، چاکیواڑہ اور گولیمار کا چپّہ چپّہ دیکھا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ آدمی (اخبار والے اب آدمی کہنے سے شرماتے ہیں۔ افراد اور نفوس

کہتے ہیں) ضرور رہتے ہوں گے، لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی، کاغذ تک کے پھول نظر نہ آئے، کانپور میں ہم جیسے شرفا کے گھروں میں کہیں نہ کہیں موتیا کی بیل ضرور چڑھی ہوتی تھی، حضور والا! یہاں موتیا صرف آنکھوں میں اترتا ہے! حد ہو گئی، کراچی میں لکھ پتی، کروڑ پتی سیٹھ لکڑی اس طرح تُلواتا ہے گویا کم خواب کا پارچہ خرید رہا ہے۔ لکڑی دن میں دو فٹ بکتی ہے اور برادہ خریدنے والے پچاس! میں نے برسوں اُپلوں پر پکایا ہوا کھانا بھی کھایا ہے۔ لیکن برادے کی انگیٹھی پر جو کھانا پکے گا وہ صرف دوزخی مُردوں کے چالیسویں کے لیے مناسب ہے"۔

"بھر پائے ایسی بزنس سے! مانا کہ روپیہ بہت کچھ ہوتا ہے، مگر سبھی کچھ تو نہیں، زر کو حاجت روا کرنے والا، قاضی الحاجات کہا گیا ہے۔ تسلیم۔ مگر جب یہ خود سب سے بڑی حاجت بن جائے تو وہ صرف موت سے رفع ہو گی، میں نے تو زندگی میں ایسی کانی کھتری لکڑی نہیں بیچی، نہ فروختنی، نہ سوختنی۔ بڑھئی کی یہ مجال چھاتی پہ چڑھ کر کمیشن مانگے۔ نہ دو تو مال کو گندے انڈے کی طرح قیامت تک سیتے رہو۔ ہائے نہ ہوا کانپور بسولے سے سالے کی ناک اتار کر ہتھیلی پر رکھ دیتا کہ جا اپنی جروا کو دین مہر میں دے دینا! واللہ! یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سنتا ہوں کہ یہاں کے بازار حسن نیپئیر روڈ اور جاپانی روڈ پر شب زادیاں

اپنے اپنے درشن دریچوں میں لال بتیاں جلتے ہی خنجراب چھاتیوں کے خوانچے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ فلموں میں بھی اشرف المعلّقات ہی کی نمائش ہوتی ہے، یہ تو وہ ہی مثل ہے کہ اوچھے کے گھر تیتر، باہر باندھوں کے بھیتر۔ جمہوریہ اسلامیہ کی سرکار بے سروکار کچھ نہیں کہتی۔ لیکن کسی طوائف کو شادی بیاہ میں مجرے کیلئے بلانا ہو تو پہلے اس کی اطلاع تھانہ متعلقّہ کو دینی پڑتی ہے! رنڈی کو پرمٹ راشن کارڈ پہ ملتے ہم نے یہیں دیکھا، نقد عیش عندالطلب نہ ملا تو کس کام کا، درشنی منڈیوں میں درشنی ہنڈیوں کا کیا کام“۔

مرزا عبدالودود بیگ اس صورت حال کی کچھ اور ہی تاویل کرتے تھے، فرماتے ہیں کہ طوائف کو تھانے سے NOC (نو آبجکشن سرٹیفکٹ) اس لیے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کرلے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جارہی ہے۔ وعظ سننے یا سیاست میں حصّہ لینے نہیں جارہی ہے۔ایک دن قبلہ فرمانے لگے ”ابھی کچھ دن ہوئے کراچی کی ایک نامی گرامی طوائف کا گانا سننے کا اتفاق ہوا۔ اماں! اس کا تلفّظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا۔ ہائے ایک زمانہ تھا، کہ شرفاء اپنے بچوں کو ادب آداب سیکھنے کے لیے چوک کی طوائفوں کے کوٹھے پر بھیجتے تھے“۔

اس باب میں بھی مرزا سوءِ ظن سے کام لیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر تو اس لیے بھیجتے تھے، کہ بزرگوں کی صحبت اور گھر کے ماحول سے بچّے رہیں۔

دوڑتا ہوا درخت

کراچی شہر انہیں کسی طور پر اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا۔ جھنجھلا کر بار بار کہتے "اماں! یہ شہر ہے یا جہنم؟" مرزا کسی دانا کے قول میں تصرفِ بیجا کر کے فرماتے ہیں کہ قبلہ اس دار المحن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدانخواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے تو چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہو گا کہ ہم نے تو سوچا تھا، کراچی چھوٹا سا جہنم ہے۔ جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا!

ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلّف دوست نے ان سے کہا کہ "تمہیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں تو بیٹھے بیٹھے ان پر کڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو"۔

ارشاد فرمایا ”سنو! میں نے ایک زمانے میں پی ڈبلیوڈی کے کام بھی کیے ہیں مگر دوزخ کی ایئر کنڈیشننگ کا ٹھیکا نہیں لے سکتا“۔

بات صرف اتنی تھی کہ اپنی چھاپ، تلک اور چھَب چھِنوانے سے پہلے وہ جس آئینہ میں خود کو دیکھ دیکھ کر ساری عمر اِترایا کیے، اس میں جب نئی دنیا اور نئے وطن کو دیکھا تو وہ امتدادِ زمانہ سے distorting mirror [1] بن چکا تھا، جس میں ہر شکل اپنا ہی منھ چڑاتی نظر آتی تھی۔

ان کے کاروباری حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ بزنس نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کی دکان کی دیوار پر ایک تازہ وصلی آویزاں دیکھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا:

نہ پوچھ حال مرا، چوب خشک صحرا ہوں

لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ہم نے ان کا دل بڑھانے کیلئے کہا کہ، آپ کو چوبِ خشک کون کہہ سکتا ہے؟ آپ کی جواں ہمتی اور مستعدی پر ہمیں تو رشک آتا ہے۔ خلافِ معمول مسکرائے۔

---

[1] ہم نے کہیں اور اس کا ترجمہ ”مسخائینہ“ کیا ہے۔ یعنی وہ آئینہ جس کا کام ہی شکل کو مسخ کرنا اور مضحکہ خیز بنانا ہے۔

جب سے ڈینچر ز ٹوٹے، منھ پہ رومال رکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ کہنے لگے "ہاں میاں! آپ جوان آدمی ہیں۔ اپنا تو یہ احوال ہوا کہ

"منفعل" ہوگئے قویٰ غالب

اب عناصر میں "ابتذال" کہاں

پھر منھ سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا "برخوردار! میں وہ درخت ہوں جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافروں کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے"۔

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

یوں وہ حتّٰی الامکان اپنے غصّے کو کم نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہتے تھے، میں ایسی جگہ ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتا جہاں آدمی کسی پر غصّہ ہی نہ ہو سکے۔ اور جب انہیں ایسی ہی جگہ رہنا پڑا تو وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے روٹھے۔ اب وہ آپ ہی آپ کڑھتے، اندر ہی اندر کھولتے، جلتے، سلگتے رہتے:

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا

میں ہی اگنی میں ہی ایندھن

انہی کا قول ہے کہ یاد رکھو، غصّہ جتنا کم ہو گا، اس کی جگہ اداسی لیتی چلی جائے گی۔ اور یہ بڑی بزدلی کی بات ہے۔ بزدلی کے ایسے ہی اداس لمحوں میں اب انہیں اپنا آبائی گاؤں جہاں بچپن گزرا تھا، بے تحاشا یاد آنے لگتا۔ واماندگیِ زیست نے ماضی میں اپنی پناہیں تراش لیں۔ گویا البم کھل گیا۔ دھندلاتے سیپیا رنگ کی تصویریں چشمِ تصّور کے سامنے بکھرتی چلی جاتیں۔ ہر تصویر کے ساتھ زمانے کا ورق الٹتا چلا گیا۔ ہر اسنیپ شاٹ کی اپنی ایک کہانی تھی: دھوپ میں ابرق کے ذروں سے جلتی کچی سڑک پر گھوڑوں کے پسینے کی نرم مہکار۔ بھیڑ کے نوزائیدہ بچّے کو گلے میں مفلر کی طرح ڈالے شام کو خوش خوش لوٹتے کسان۔ چلمنوں کے پیچھے ہار سنگھار کے پھولوں سے رنگے ہوئے دوپٹے۔ ارہر کے ہرے بھرے کھیت میں پگڈنڈی کی مانگ۔ خشک سالی میں ساون کے تھوتھے بادلوں کو رہ رہ کر تکتی نرآس آنکھیں۔ جاڑے کی اجاڑ راتوں میں ٹھٹھرتے گیدڑوں کی منحوس آوازیں۔ چراغ جلے باڑے میں لوٹتی گایوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں۔ کالی بھنور رات میں چوپال کی جلتی بجھتی گشتی چلم پر طویل سے طویل تر ہوتے ہوئے کش۔ موتیا کے گجروں کی لپٹ کے ساتھ کنوارے پنڈے کی بگولا مہکار۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں تازہ قبر پر جلتی اگر بتی کا بل کھاتا ہوا دھواں۔ دہکتی بالو میں تڑختے چنوں کی سوندھی لپٹ سے پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ میونسپلٹی کی مٹی کے

تیل کی لالٹین کا بھبھکا۔ یہ تھی ان کے گاؤں کی ست سگند۔ یہ ان کے اپنے نافہ ماضی کی مہکار تھی جو یادوں کے دشت میں دِوانی پھرتی تھی۔

اولتی کی ٹپاٹپ

ستر سالہ بچّے کے ذہن میں تصویریں گڈ مڈ ہونے لگتیں۔ خوشبوئیں، نرماہٹیں اور آوازیں بھی تصویر بن بن کر ابھرتیں۔ اسے اپنے گاؤں میں مینہ برسنے کی ایک ایک آواز الگ سنائی دیتی۔ ٹین کی چھت پر تڑ تڑ بجتے ہوئے تاشے۔ سوکھے پتوں پر کراری بوندوں کا شور۔ پکے فرش پر جہاں اُنگل بھر پانی کھڑا ہو جاتا، وہاں موٹی بوند گرتی تو ایک موتیوں کا تاج سا ہوا میں اچھل پڑتا۔ تپتی کھپریلوں پر اڑتی بدلی کے جھالے کی سنسناہٹ۔ گرمی دانوں سے اُپڑے بالک بدن پر برکھا کی پہلی پھوار، جیسے کسی نے منتھول میں نہلا دیا۔ جوان بیٹے کی قبر پر پہلی بارش اور ماں کا ننگے سر آنگن میں آ آ کر آسمان کی طرف دیکھنا۔ پھبک اٹھنے کے لیے تیار مٹی پر ٹوٹ کے برسنے والے بادلوں کی ہراول گرم لپٹ۔ ڈھولک پر ساون کے گیت کی تال پر بجتی چوڑیاں اور بے تال قہقہے۔ سوکھے تالاب کے پیندے کی چکنی مٹّی میں پڑی ہوئی دڑاڑوں کے لوزاتی جال میں ترسا ترسا کر برسنے والی بارش کے سرسراتے ریلے۔ تھونی سے لٹکتی ہوئی لالٹین کے سامنے،

تاحدِ روشنی، موتیوں کی رِم جھم جھالر، ہمک ہمک کر پرائے آنگن میں گرتے پر نالے۔ آموں کے پتوں پر مجیرے بجاتی نرسل بوچھار۔ اور جھولوں پر پینگیں لیتی دوشیزائیں۔

اور پھر رات کے سناٹے میں، پانی تھمنے کے بعد سوتے جاگتے میں اولتی[1] کی ٹپاٹپ! اولتی کی ٹپاٹپ تک پہنچتے پہنچتے قبلہ کی آنکھیں جل تھل ہو جاتیں۔ بارش تو ہم انہیں اپنے لاہور اور نتھیا گلی کی ایسی دکھاسکتے تھے کہ عمرِ رفتہ کی ساری ٹپاٹپ بھول جاتے۔ پر اولتی کہاں سے لاتے؟ اسی طرح آم تو ہم ملتان کا ایک سے ایک پیش کرسکتے تھے، دسہری، لنگڑا، ثمر بہشت، انور رٹول۔ لیکن ہمارے پنجاب میں تو ایسے درخت ناپید ہیں جن میں آموں کے بجائے دوشیزائیں لٹکی ہوئی ہوں۔

چنانچہ ایسے نازک موقعوں پر ہم خاموش، ہمہ تن گوش، بلکہ خرگوش بنے اولتی کی ٹپاٹپ سنتے رہتے۔

---

[1] اولتی: چھپّر یا کھپریل کا نچلا کنارہ جہاں سے بارش کا پانی نیچے گرتا ہے۔

قبلہ کا ریڈیو اونچا سنتا تھا

دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں تو خیر کوئی نقصان نہیں۔ ہمارا مطلب ہے کہ دریا کا نقصان نہیں۔ لیکن قبلہ تو سینکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبشار نیاگرا پر تیر کر چڑھنا چاہتے تھے، یا یوں کہیے کہ تمام عمر نیچے جانے والی ایسکیلیٹر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور ایسکیلیٹر بنانے والے کو گالیاں دیتے رہے۔ ایک دن کہنے لگے "مشتاق میاں! یہ تمہارا کراچی بھی عجب مردم ناشناس شہر ہے۔ نہ خریداری کی تمیز، نہ خوردی کے آداب، نہ کسی کی بزرگی کا لحاظ ملاحظہ، میں جس زمانے میں بشارت میاں کے ساتھ بہار کالونی میں رہتا تھا، ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو خرید لیا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو میں کار کی بیٹری لگوانی پڑتی تھی۔ بہار کالونی میں بجلی نہیں تھی۔ اس کا رکھنا اور چلانا ایک دردِ سر تھا۔ بشارت میاں روزانہ بیٹری اپنے کارخانے میں لے جاتے اور چارج ہونے کیلئے آرا مشین میں لگا دیتے۔ سات آٹھ گھنٹے میں اتنی چارج ہو جاتی تھی کہ بس ایک آدھ گھنٹے بی بی سی سُن لیتا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو سے آرا مشین کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں اور میں اُٹھ کر چلا آتا۔ گھر کے پچھواڑے ایک پچیس فٹ اونچی نہایت قیمتی، بے گانٹھ بلّی گاڑ کر ایریل لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ریڈیو اونچا

سنتا تھا۔ آئے دن پتنگ اڑانے والے لونڈے میرے ایریل سے پیچ لڑاتے۔ مطلب یہ کہ اس میں پتنگ الجھا کر زور آزمائی کرتے۔ ڈور ٹوٹ جاتی، ایریل خراب ہو جاتا۔ ارے صاحب ایریل کیا تھا، پتنگوں کا فضائی قبرستان تھا، اس پر یہ کٹی پتنگیں چوبیس گھنٹے اس طرح پھڑ پھڑاتی رہتیں، جیسے سڑک کے کنارے کسی نو فوتیدہ پیر کے مزار پر جھنڈیاں۔ پچیس فٹ کی اونچائی پر چڑھ کر ایریل دوبارہ لگانا۔ نہ پوچھیے کیسا عذاب تھا۔ بس یوں سمجھئے سُولی پہ لٹک کے بی بی سی سنتا تھا۔ بہر حال جب برنس روڈ کے فلیٹ میں منتقل ہونے لگا تو سوچا، وہاں تو بجلی ہے چلو ریڈیو بیچتے چلیں۔ بشارت میاں بھی عاجز آگئے تھے۔ کہتے تھے، اس سے تو پتنگوں کی پھڑ پھڑاہٹ براڈ کاسٹ ہوتی رہتی ہے۔ ایک دور کے پڑوسی سے ۲۵۰ روپے میں سودا پکّا ہو گیا۔ علی الصبح وہ نقد رقم لے آیا اور میں نے ریڈیو اس کے حوالے کر دیا۔ رات کو گیارہ بجے پھاٹک بند کرنے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں وہ شخص اور اس کے بیل جیسی گردن والے دو بیٹے کدال پھاوڑا لیے مزے سے ایریل کی بلّی کو اکھاڑ رہے ہیں۔ میں ڈپٹ کر پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ سینہ زوری دیکھیے! کہتے ہیں، بڑے میاں بلّی اکھاڑ رہے ہیں۔ ہماری ہے۔

"ڈھائی سو روپے میں ریڈیو بیچا ہے۔ بلّی سے کیا تعلق"۔

"تعلق نہیں تو ہمارے ساتھ چلو اور ذرا بِلّی کے بغیر بجا کے دکھا دو۔ یہ تو اس کی accessory ہے"۔

"نہ ہوا کانپور۔ سالے کی زبان گدی سے کھینچ لیتا اور ان حرامی پلّوں کی بیل جیسی گردن ایک ہی وار میں بھٹا سی اڑا دیتا۔ میں نے تو زندگی میں ایسا بد معاملہ، بے ایمان آدمی نہیں دیکھا۔ اس اثنا میں وہ نابکار بِلّی اکھاڑ کے زمین پر لٹال چکا تھا۔ ایک دفعہ جی میں تو آیا کہ اندر جا کر ۱۲ بور لے آؤں اور اسے بھی بِلّی کے برابر لمبا لٹال دوں۔ پھر خیال آیا کہ بندوق کا لائسنس تو ختم ہو چکا ہے۔ اس کی بے قصور بیوی رانڈ ہو جائے گی۔ وہ زیادہ قانون چھانٹے لگا تو میں کہا"، جا، جا! تو کیا سمجھتا ہے؟ بِلّی کی حقیقت کیا ہے۔ یہ دیکھ یہ چھوڑ کے آئے ہیں"۔ قبلہ حویلی کی تصویر دکھاتے ہی رہ گئے اور وہ تینوں بِلّی اٹھا کر لے گئے۔

معذور بیوی اور گشتی چلم

ان کی زندگی کا ایک پہلو ایسا تھا جس کا کسی نے انکو اشارتاً بھی ذکر کرتے نہیں سنا۔ ہم اس کی طرف ابتدائی حصّے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کی شادی بڑے چاؤ چونچلے سے ہوئی تھی۔ بیوی بہت خوب صورت، نیک طِینت اور سلیقہ شعار

خاتون تھیں۔ شادی کے چند سال بعد ایک مرض لاحق ہوا کہ پہنچوں تک دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گئیں۔ قریبی اعزہ بھی ملنے سے گریز کرنے لگے۔ روزمرہ کی ملاقاتیں، شادی غمی میں شرکت، سبھی سلسلے رفتہ رفتہ منقطع ہو گئے۔ گھر کا سارا کام نوکر اور مامائیں تو نہیں کر سکتیں۔ قبلہ نے جس محبت اور دل سوزی سے تمام عمر بے عذر خدمت اور دیکھ ریکھ کی، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی چوٹی بے گندھی اور دوپٹہ بے چنا ہو، یا جمعے کو کاسنی رنگ کا نہ ہو۔ وقت نے سر پر کاسنی دوپٹے کے نیچے روئی کے گالے جما دیے، مگر ان کی توجّہ اور پیار میں جو ذرا فرق آیا ہو۔ یقین نہیں آتا تھا، کہ ایثار و رفاقت کا یہ پیکر وہی مغلوب الغضب آدمی ہے جو گھر کے باہر ایک چلتی ہوئی تلوار ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہو تو صبر اور سبھاؤ کی آزمائش کے ہزار مرحلے آتے ہیں۔ مگر انھوں نے اس معذور بی بی سے کبھی اونچی آواز میں بھی بات نہیں کی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی جھلاہٹ اور غیظ و غضب کی ابتدا اسی سانحہ معذوری سے ہوئی۔ وہ بی بی تو مصلّے پر ایسی بیٹھیں کہ دنیا ہی میں جنت مل گئی۔ قبلہ کو نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن زندگی بھر جیسی سچی محبت اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جیسی بے عذر اور خاموش خدمت انھوں نے چالیس برس تک کی،

وہی ان کی عبادت وریاضت، وہ ہی ان کا ورد وظیفہ اور وہ ہی ان کی دعائے نیم شبی تھی۔ وہ بڑا بخشن ہار ہے۔ شاید یہی انکا وسیلہ بخشائش بن جائے۔

ایک دَور ایسا بھی آیا کہ بیوی سے ان کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ خود کہا کسی رانڈ، بیوہ سے شادی کرلو۔ بولے، ہاں! بھاگوان! کریں گے۔ کہیں دو گز زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو نہ جانے کب سے ہماری بارات کی راہ دیکھ رہا ہے۔ وہیں چار کاندھوں پہ ڈولا اترے گا۔ بیوی! مٹی سدا سُہاگن ہے۔ سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی۔

بیوی کی آنکھ میں آنسو دیکھتے تو بات کا رُخ پھیر دیا۔ وہ اپنی ساری "امیجری" لکڑی، حقّے اور تمباکو سے کشید کرتے تھے۔ بولے، بیوی! یہ رانڈ بیوہ کی قید تم نے کیا سوچ کر لگائی؟ مانا شیخ سعدی کہہ گئے ہیں، زن بیوہ مکن اگرچہ حور است۔ مگر تم نے شاید وہ پوربی مثل نہیں سنی: پہلے پیوے بھکوا۔ پھر پیوے تمکوا۔ پیچھے پیوے حلیم چاٹ۔ یعنی جو شخص پہلے حقّہ پیتا ہے وہ بدھو ہے کہ دراصل وہ تو چلم سلگانے اور تاؤ پر لانے میں ہی جٹا رہتا ہے۔ تمباکو کا اصل مزہ تو دوسرے شخص کے حصّے میں آتا ہے۔ اور جو آخر میں پیتا ہے وہ جلے ہوئے تمباکو سے خالی بھک بھک کرتا ہے۔

جدھر جائیں دہکتے جائیں

کراچی میں دکان تو پھر بھی تھوڑی بہت چلی، مگر قبلہ بالکل نہیں چلے۔ زمانے کے تغیر اور گردش پر کس کا زور چلا ہے جو اُن کا چلتا۔ حوادث کو روکا نہیں جاسکتا۔ ہاں تہذیبِ حواس سے حوادث کا زور توڑا جاسکتا ہے۔ شخصیت میں پیچ پڑ جائیں تو دوسروں کے علاوہ خود کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ نکلنے لگیں تو اور زیادہ اذیت ہوتی ہے۔ کراچی ہجرت کرنے کے بعد اکثر فرماتے کہ ڈیڑھ سال جیل میں رہ کر جو تبدیلی مجھ میں نہ آئی وہ یہاں ایک ہفتے میں آگئی۔ یہاں تو بزنس کرنا ایسا ہے جیسے سنگھاڑے کے تالاب میں تیرنا۔ کانپور ہی کے چھٹّے ہوئے چھاکٹے یہاں شیر بنے دندناتے پھرتے ہیں۔ اور اچھے اچھے شرفاء ہیں کہ گیدڑ کی طرح دُم کٹوا کے بھٹ میں جا بیٹھے۔ ایسا بجوگ پڑا کہ

خود بخود "بل" میں ہے ہر شخص سمایا جاتا

جو دانا ہیں وہ اپنی دُمیں چھپائے بلوں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس پر مرزا نے ہمارے کان میں کہا

انیس "دُم" کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ

ایک دوست نے اپنی آبرو جوکھم میں ڈال کر قبلہ سے کہا کہ گزار ہوا زمانہ لوٹ کر نہیں آسکتا۔ حالات بدل گئے۔ آپ بھی خود کو بدل لیجئے۔ مسکرائے۔ فرمایا، خربوزہ خود کو گول کرلے تب بھی تربوز نہیں بن سکتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ زمانے کا رُخ پہچاننے کی صلاحیت، حلم وبُردباری، نرمی اور لچک نہ ان کی سرشت میں تھی اور نہ زمیں دارانہ ماحول اور معاشرے میں ان کا شمار خوبیوں میں ہوتا تھا۔ سختی، خورائی، تمکنت، خشونت اور جلالی مزاج عیب نہیں، بلکہ فیوڈل کردار کی راستی اور مضبوطی کی دلیل تصوّر کیے جاتے تھے۔ اور زمیں دار تو ایک طرف رہے، اس زمانے کے علماء تک ان اوصاف پر فخر کرتے تھے:

ہم نہ نکہت ہیں، نہ گل ہیں، جو مہکتے جاویں

آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں

قبلہ کے حالات تیزی سے بگڑنے لگے تو ان کے بہی خواہ میاں انعام الٰہی نے جو اپنی خوردی کے باوصف انکے مزاج اور معاملات میں درخور رکھتے تھے، عرض کیا دکان ختم کر کے ایک بس خرید لیجیے۔ گھر بیٹھے آمدنی کا وسیلہ ہے۔ رُوٹ پرمٹ میرا ذمّہ۔ آج کل اس دھندے میں بڑی چاندی ہے۔ یک بارگی جلال آ

گیا۔ فرمایا، چاندی تو طبلہ سارنگی بجانے میں بھی ہے۔ ایک وضع داری کی ریت بزرگوں سے چلی آرہی ہے، جس کا تقاضا ہے کہ خراب و خوار ہی ہونا ہی مقدّر میں لکھا ہے تو اپنے آبائی اور آزمودہ طریقے سے ہوں گے۔ بندہ ایسی چاندی پر لات مارتا ہے۔

چرخ اب ہمیں جو دے ہے، نہیں لیتے ہم

کونین بھی گو دے ہے، نہیں لیتے ہم

ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے، نہیں دیتا وہ

جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے، نہیں لیتے ہم

آخری گالی

کاروبار مندا بلکہ بالکل ٹھنڈا۔ طبعیت زنگ رنگ۔ بے دِلی کے عالم میں دن گزر رہے تھے۔ دکان داری اب ان کی مالی نہیں، نفسیاتی ضرورت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دکان بند کر دی تو گھر میں پڑے کیا کریں گے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ان کا نیا پٹھان ملازم زرین گل خان کئی گھنٹے دیر سے آیا۔ ہر چند غصّے کو پینے کی کوشش کرتے، لیکن پرانی عادت کہیں جاتی ہے۔ چند ماہ قبل انہوں نے ایک

ساٹھ سالہ منشی آدھی تنخواہ پر رکھا تھا جو گیروے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا جبّہ پہنے، ننگے پیر زمین پر آلتی پالتی مارے حساب کتاب کرتا تھا۔ کرسی یا کسی بھی اونچی چیز پر بیٹھنا اس کے مسلک میں منع تھا۔ وارثی سلسلے سے کسی بزرگ سے بیعت تھا۔ فرض شناس، ایمان دار، پابندِ صوم صلوٰۃ، زود رنج، کام میں چوپٹ۔ قبلہ نے طیش میں آکر ایک دن اسے حرام خور کہہ دیا۔ سفید داڑھی کا لحاظ بھی نہ کیا۔ اس نے رسان سے کہا "حضور کے ہاں جو شے وافر ملتی ہے وہ ہی تو فقیر کھائے گا۔ سلام علیکم"۔ یہ جا وہ جا دوسرے دن سے منشی جی نے آنا اور قبلہ نے حرام خور کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن حرام خور کے علاوہ اور بھی تو دل دکھانے والے بہتیرے لفظ ہیں۔ زرین گل خان کو سخت سست کہتے کہتے ان کے منھ سے روانی اور سرگرانی میں وہی گالی نکل گئی جو اچھے دنوں میں ان کا تکیہ کلام ہوا کرتی تھی۔ گالی کی بھیانک گونج درہ آدم خیل کے پہاڑوں تک ٹھنٹھناتی پہنچی جہاں زرین گل بیوہ ماں رہتی تھی۔ وہ چھ سال کا تھا جب ماں نے بیوگی کی چادر اوڑھی تھی۔ بارہ سال کا ہوا تو اس نے وعدہ کیا کہ ماں میں اور بڑا ہو جاؤں تو کراچی میں نوکری کر کے تجھے پہلی تنخواہ سے بغیر پیوند کی چادر بھیجوں گا۔ اسے آج تک کسی نے یہ گالی نہیں دی تھی۔ جوان خون، غصّیلا مزاج۔ پٹھان کی غیرت اور پختو کا سوال تھا۔ زریں گل نے ان کی ترچھی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور چاقو تان کر کھڑا

ہو گیا۔ کہنے لگا "بڈھے! میرے سامنے سے ہٹ جا، نہیں تو ابھی تیرا پیٹ پھاڑ کر کلیجا کچا چبا جاؤں گا۔ تیرا پلپلا مُردہ بّلی پہ لٹکا دوں گا"۔ ایک گاہک نے بڑھ کر چاقو چھینا۔ بڈھے نے جھک کے زمین سے اپنی مخملی ٹوپی اٹھائی اور جھاڑے بغیر سر پر رکھ لی۔

کون کیسے ٹوٹتا ہے

دس پندرہ منٹ بعد وہ دکان میں تالا ڈال کر گھر چلے آئے اور بیوی سے کہہ دیا، اب ہم دکان نہیں جائیں گے۔ کچھ دیر بعد محلّے کی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور وہ دوسرے ہی اللہ اکبر پر وضو کر کے کوئی چالیس سال بعد نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو بیوی دھک سے رہ گئیں کہ خیر تو ہے۔ وہ خود بھی دھک سے رہ گئے۔ اس لیے کہ انھیں دو سورتوں کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وتر بھی ادھورے چھوڑ کر سلام پھیر لیا کہ یہ تک یاد نہیں آ رہا تھا کہ دعائے قنوت کے ابتدائی الفاظ کیا ہیں۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آدمی اندر سے ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اور یوں ٹوٹتا ہے! اور جب ٹوٹتا ہے تو اپنوں بیگانوں سے، حد یہ کہ اپنے سب سے بڑے دشمن

سے بھی صلح کرلیتا ہے۔ یعنی اپنے آپ سے۔ اسی منزل پر بصیرتوں کا نزول ہوتا ہے۔ دانش و بینش کے باب کھلتے ہیں:

چشم ہو تو آئنہ خانہ ہے دہر

منھ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

ایسے بھی محتاط لوگ ہیں جو پیکار و فشارِ زیست سے بچنے کی خاطر خود کو بے عملی کے حصارِ عافیت میں قید رکھتے ہیں۔ یہ بھاری و قیمتی پردوں کی طرح لٹکے لٹکے ہی لیر لیر ہو جاتے ہیں۔ کچھ گم صم گھمبیر لوگ اس دیوار کی مانند تڑختے ہیں جس کی مہین سی دراڑ جو عمدہ پینٹ یا کسی آرائشی تصویر سے با آسانی چھپ جاتی ہے، اس بات کی غمّازی کرتی ہے کہ نیو اندر ہی اندر کسی صدمے سے زمین میں دھنس رہی ہے۔ بعض لوگ چینی کے برتن کی طرح ٹوٹتے ہیں، کہ مسالے سے آسانی سے جڑ تو جاتے ہیں مگر وہ بال اور جوڑ پہلے نظر آتا ہے، برتن بعد میں۔ اس کے برعکس کچھ ڈھیٹ اور چیکو لوگ ایسے اٹوٹ مادّے کے بنے ہوتے ہیں کہ چیونگ گم کی طرح کتنا ہی چباؤ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتے۔ کھینچنے سے کھنچتے ہیں، چھوڑے سے جاتے ہیں سُکڑ۔ آپ انھیں حقارت سے تھوک دیں تو جوتے سے اس بری طرح چپکتے ہیں کہ چھٹائے سے نہیں چھوٹتے۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس سے تو

دانتوں تلے ہی بھلے تھے کہ پپول تو لیتے تھے۔ یہ چیونگ گم لوگ خود آدمی نہیں، پر آدم شناس ہیں۔ یہ کامیاب و کامران کامکار لوگ ہیں۔ یہ وہ ہیں جنھوں نے انسانوں کو دیکھا، پرکھا اور برتا ہے اور جب اسے کھوٹا پایا تو خود بھی کھوٹے ہوگئے۔ وقت کی اٹھتی موج نے اپنے حباب کا تاج ان کے سر پہ رکھا اور ساعت گزران نے اپنے تختِ رواں پہ بٹھایا۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ کار کے ونڈ اسکرین کی مانند ہوتے ہیں۔ ثابت و سالم ہیں تو سینہ عارف کی طرح شفاف کہ دو عالم کا نظارہ کرلو۔ اور یکا یک ٹوٹے تو ایسے ٹوٹے کہ نہ بال پڑا، نہ دَرکے نہ تڑخے۔ یکبارگی ایسے ریزہ ریزہ ہوئے کہ نا عارف رہا، نہ دو عالم کی جلوہ گری، نہ آئینے کا پتا کہ کہاں تھا، کدھر گیا۔ نہ حذر رہا نہ خطر رہا، جو رہی سو بے خبری رہی۔

اور ایک انا ہے کہ یوں ٹوٹتی ہے جیسے جابر سلطانوں کا اقبال یا حضرت سلیمان کا عصا جس کی ٹیک لگائے وہ کھڑے تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ لیکن ان کا قالب بے جان ایک مدت تک اسی طرح استادہ رہا اور کسی کو شبہ تک نہ گزرا کہ وہ رحلت فرما چکے ہیں۔ وہ اسی طرح بے روح کھڑے رہے اور ان کے اقبال اور رعب و دبدبے سے کاروبارِ سلطنت حسبِ معمولِ سابق چلتا رہا۔ ادھر

عصا کو دھیرے دھیرے گھن اندر سے کھاتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن وہ چٹاخ سے ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمان کا جسدِ خاکی فرشِ زمین پر آرہا۔ اس وقت ان کی امّت اور رعیت پر کھلا کہ وہ دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں۔

سو وہ دیمک زدہ عصائے پندار و جلال جس کے بَل قبلہ نے بے غِل و غش زندگی گزاری آج شام ٹوٹ گیا اور زیست کرنے کا وہ طنطنہ اور ہمہمہ سرنِگوں ہوا۔

میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ

انہیں اس رات نیند نہیں آئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ ٹمبر مارکیٹ کا ایک چوکیدار ہانپتا کانپتا آیا اور خبر دی کہ "صاحب جی! آپ کی دکان اور گودام میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بجھانے کے انجن تین بجے ہی آ گئے تھے۔ سارا مال کوئلہ ہو گیا۔ صاحب جی! آگ کوئی آپ ہی آپ تھوڑی لگتی ہے"۔ وہ جس وقت دکان پہنچے تو سرکاری اصطلاح میں آگ پر قابو پایا جا چکا تھا، فائر بریگیڈ کی مستعدی اور کارکردگی کے علاوہ اس کو بھی بڑا دخل تھا کہ اب جلنے کے لئے کچھ رہا نہیں تھا۔ شعلوں کی لپلپاتی دو شاخہ زبانیں کالی ہو چکیں تھیں۔ البتہ چیڑ کے تختے ابھی تک دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ اور فضا دور دور تک ان کی تیز خوشبو کے

آتشیں آبشار میں نہائی ہوئی تھی۔ مال جتنا تھا سب جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ صرف کونے میں ان کا چھوٹا سا دفتر بچا تھا۔ عرصہ ہوا، کانپور میں جب لالہ رمیش چندر نے ان سے کہا تھا حالات ٹھیک نہیں ہیں، گودام کی انشورنس پالیسی لے لو، تو انھوں نے ململ کے کرتے کی چنی ہوئی آستین الٹ کر اپنے بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا "یہ رہی یاروں کی انشورنس پالیسی!" پھر اپنے ڈنڑ پھلا کر لالہ رمیش چندر سے کہا "ذرا چھو کر دیکھو"۔ لالہ جی نے اچنبھے سے کہا "لوہا ہے! لوہا!" بولے "نہیں۔ فولاد کہو"۔

دکان کے سامنے خلقت کے ٹھٹ لگے تھے۔ ان کو لوگوں نے اس طرح راستہ دیا جیسے جنازے کو دیتے ہیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ نہ لبِ بے سوال پر کوئی لرزش۔ انھوں نے اپنے دفتر کا تالا کھولا۔ انکم ٹیکس کے حسابات اور گوشوارے بغل میں مارے اور گودام کے مغربی حصّے میں جہاں چیڑ سے ابھی شعلے اور خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں، تیز تیز قدموں سے گئے۔ پہلے انکم ٹیکس کے کھاتے اور ان کے بعد چابیوں کا گچھا نذرِ آتش کیا۔ پھر آہستہ آہستہ، دائیں بائیں نظر اٹھائے بغیر، دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوئے۔ حویلی کا فوٹو دیوار سے اتارا۔ رومال سے پونچھ کر بغل میں دبایا اور دکان جلتی چھوڑ کر چلے آئے۔

بیوی نے پوچھا ''اب کیا ہوئے گا؟''

انھوں نے سر جھکالیا۔

اکثر خیال آتا ہے، اگر فرشتے انھیں جنت کی طرف لے گئے جہاں موتیا دھوپ ہو گی اور کاسنی بادل، تو وہ بابِ بہشت پر کچھ سوچ کر ٹھٹک جائیں گے۔ رضوان جلد اندر داخل ہونے کا اشارہ کرے گا تو سینہ تانے اس کے قریب جا کر کچھ دکھاتے ہوئے کہیں گے:

''یہ چھوڑ کر آئے ہیں''۔

اسکول ماسٹر کا خواب

فیوڈل فینٹسی

شخص کے ذہن میں عیش و فراغت کا ایک نقشہ رہتا ہے جو دراصل چربہ ہوتا ہے اس ٹھاٹ باٹ کا جو دوسروں کے حصے میں آیا ہے۔ لیکن جو دکھ آدمی سہتا ہے، وہ تنہا اس کا اپنا ہوتا ہے۔ بلا شرکت غیرے۔ بالکل نجی، بالکل انوکھا۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والی جس آگ سے وہ گزرتا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں۔ جیسا داڑھ کا درد مجھے ہو رہا ہے ویسا کسی اور کو نہ کبھی ہوا، نہ ہو گا۔ اس کے برعکس، ٹھاٹ باٹ کا بلُو پرنٹ ہمیشہ دوسروں سے چُرایا ہوا ہوتا ہے۔ بشارت کے ذہن میں عیش و تنعم کا جو صد رنگ و ہزار پیوند نقشہ تھا وہ بڑی بوڑھیوں کی اس رنگارنگ رلّی کی مانند تھا جو وہ مختلف رنگ کی کترنوں کو جوڑ جوڑ کر بناتی ہیں۔ اس میں اس وقت کا جاگیردارانہ طنطنہ اور ٹھاٹ، بگڑے رئیسوں کا تیہا اور ٹھسا، مڈل کلاس دکھاوا، قصباتی اِترونا پن، ملازمت پیشہ

نفاست، سادہ دلی اور ندیدہ پن۔ سب بری طرح سے گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ انھی کا
بیاں ہے کہ بچپن میں میری سب سے بڑی تمنّا یہ تھی کہ تختی پھینک پھانک،
قاعدہ پھاڑ پھوڑ کر مداری بن جاؤں، شہر شہر ڈگڈگی بجاتا، بندر، بھالو، جھمورا نچاتا
اور ''بچہ لّوگ'' سے تالی بجواتا پھروں۔ جب ذرا عقل آئی، مطلب یہ کہ بد اور
بدتر کی تمیز پیدا ہوئی تو مداری کی جگہ اسکول ماسٹر نے لے لی۔ اور جب موضع
دھیرج گنج میں سچ مچ ماسٹر بن گیا تو میرے نزدیک انتہائے عیاشی یہ تھی کہ مکھن
زین کی پتلون، دو گھوڑا بوسکی کی قمیض، ڈبل قفوں میں سونے کے چھٹانک
چھٹانک بھر کے بٹن، نیا سولا ہیٹ جس پر میل خورا غلاف نہ چڑھا ہو اور پیٹنٹ
لیدر کے پمپ شوز پہن کر اسکول جاؤں اور اپنی غزلیات پڑھاؤں۔ سفید سلک
کی اچکن جس میں بدری کے کام والے بٹن نرخرے تک لگے ہوں۔ جیب میں
گنگا جمنی کام کی پانوں کی ڈبیا۔ سر پر سفید کمخواب کی رام پوری ٹوپی۔ ترچھی، مگر
ذرا شریفانہ زاویے سے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ نرے شریف ہی ہو کے رہ
جائیں۔ چھوٹی بوٹی کی چکن کا سفید کرتا جو موسم کی رعایت سے عطرِ حنا یا خس میں
بسا ہو۔ چوڑی دار پاجامے میں خوبرو دوشیزہ کے ہاتھ کا بُنا ہوا سفید ریشمی ازار
بند۔ سفید نری کا سلیم شاہی جوتا۔ پیروں پر ڈالنے کے لئے اٹالین کمبل جو فٹن
میں جتے ہوئے سفید گھوڑے کی دُم اور دُور مار بول و براز سے پاجامے کو محفوظ

رکھے۔ فٹن کے پچھلے پائیدان پر ''ہٹو! بچو!'' کرتا اور اس پر لٹکنے کی کوشش کرنے والے بچّوں کو چابک مارتا ہوا سائیس، جس کی کمر پر زردوزی کے کام کی پیٹی اور ٹخنے سے گھٹنے تک خاکی نمدے کی نواری پٹیاں بندھی ہوں۔ بچہ اب سیانا ہو گیا تھا۔ بچپن رخصت ہو گیا، پر بچپنا نہیں گیا۔

بچّہ اپنے کھیل میں جیسی سنجیدگی اور ہمہ تن محویت اور خود فراموشی دکھاتا ہے، بڑوں کے کسی مشن اور مہم میں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی کسی کھیل میں منہمک بچّے سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔ کھلونا ٹوٹنے پر بچّے نے روتے روتے اچانک روشنی کی طرف دیکھا تھا تو آنسو میں دھنک جھلمل جھلمل کرنے لگی تھی۔ پھر وہ سبکیاں لیتے لیتے سو گیا تھا۔ وہی کھلونا بڑھاپے میں کسی جادو کے زور سے اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو وہ بھونچکا رہ جائے گا کہ اسکے ٹوٹنے پر بھی بھلا کوئی اسطرح جی جان سے روتا ہے۔ یہی حال ان کھلونوں کا ہوتا ہے جن سے آدمی زندگی بھر کھیلتا رہتا ہے۔ ہاں، عمر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدلتے اور بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ کھلونے خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ کو دوسرے توڑ دیتے ہیں۔ کچھ کھلونے پروموٹ ہو کر دیوتا بن جاتے ہیں اور کچھ دیویاں دل سے اترنے کے بعد گوڈر

بھری گڑیاں نکلتی ہیں۔ پھر ایک ابھاگن گھڑی ایسی آتی ہے جب وہ ان سب کو توڑ دیتا ہے۔ اس گھڑی وہ خود بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

ترشیدم، پرستیدم، شکستم

آج ان طفلانہ تمناؤں پر خود ان کو ہنسی آتی ہے۔ مگر یہ اس وقت کی حقیقت تھی۔ بچّے کے لیے اس کے کھلونے سے زیادہ ٹھوس اور اصل حقیقت ساری کائنات میں کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب خواب۔ خواہ وہ خوابِ نیم شبی ہو یا خوابِ بیداری۔ دیکھا جا رہا ہوتا ہے تو وہی اور صرف وہی اس لمحے کی واحد حاضر و موجود حقیقت ہوتی ہے۔ یہ ٹوٹا کھلونا، یہ آنسوؤں میں بھیگی پتنگ اور الجھی ہوئی ڈور جس پر ابھی اتنی مار کٹائی ہوئی، یہ جلتا بجھتا جگنو، یہ تنا ہوا غبارہ جو اگلے لمحے ربر کے گلگلے ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا، میری ہتھیلی پر سرسراتی یہ مخملی بیر بہوٹی، آواز کی رفتار سے بھی تیز چلنے والی یہ ماچس کی ڈبیوں کی ریل گاڑی، یہ صابن کا بُلبُلا جس میں میرا سانس تھرّا رہا ہے، دھنک پر یہ پریوں کا رتھ جسے تتلیاں کھینچ رہی ہیں۔ اس پل اس آن بس یہی حقیقت ہے۔

اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

کچھ قوسِ قزح سے رنگ لیا، کچھ نور چُرایا تاروں سے

یہ قصّہ کھلونا ٹوٹنے سے پہلے کا ہے۔

وہ اس زمانے میں نئے نئے اسکول ماسٹر مقرر ہوئے تھے اور سیاہ فٹن ان کی تمناؤں کی معراج تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس یونیفارم یعنی سفید اچکن سفید جوتے سفید کرتے پاجامے اور سفید اِزار بند وغیرہ کی کھکھیڑ فقط خود کو سفید گھوڑے سے میچ کرنے کے لیے تھی، ورنہ اس بطخا بھیس پر کوئی بطخ ہی فریفتہ ہو سکتی تھی۔ انھیں چوڑی دار سے بھی سخت چڑ تھی۔ صرف خوبرو دوشیزہ کے ہاتھ کے بُنے ہوئے سفید ازار بند کو استعمال کرنے کی خاطر یہ ستار کا غلاف ٹانگوں پر چڑھانا پڑا۔ اس ہوائی قلعہ کی ہر اینٹ فیوڈل گارے سے بنی تھی جو بورژوا خوابوں سے گندھا تھا۔ اتنا ہی نہیں کہ ہر اینٹ کا سائز اور رنگ مختلف تھا، ہر ایک پر ان کی اُبھرواں شبیہ بھی بنی تھی۔ کچھ اینٹیں گول بھی تھیں، باریک سے باریک جزئیات، یہاں تک کہ اس حدِ ادب کا بھی تعین کر دیا تھا کہ ان کے حضور سفید گھوڑے کی دم کتنی ڈگری کے زاویئے تک اُٹھ سکتی ہے۔ اور ان کی سواری بادِ بہاری کے ''روٹ'' پر کس کس جھروکے کی چق کے پیچھے کس کلائی میں کس رنگ کی چوڑیاں چھنک رہی ہیں۔ کس کی ہتھیلی پر ان کا نام (مع بی اے کی

ڈگری) مہندی سے لکھا ہے۔ اور کس کس کی سُرمگیں آنکھیں چلمن سے لگی راہ تک رہی ہیں اور تیلیوں کو بار بار انگلیوں سے چوڑا کر کر کے دیکھ رہی ہیں کہ کب انقلابی شہزادہ یہ دعوت دیتا ہوا آتا ہے کہ

تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا

یہاں اتنا عرض کرتا چلوں کہ اس سے زیادہ محفوظ تقسیمِ کار اور کیا ہو گی کہ گھُمسان کے رن میں پرچم تو محبوب اٹھائے اٹھائے کٹتا مرتا پھرے اور خود شاعر دور کسی مرمریں مینار میں بیٹھا ایک متروک اور دقیانوسی ساز پر ویسا ہی کلام یعنی خود اپنا کلام گا رہا ہو۔ نثر میں اسی سچویشن کو دوسرے کو سولی پر چڑھ جانے کی تلقین اور رام بھلی کرنے والی کہاوت میں ذرا زیادہ پھوہڑ ایمانداری سے بیان کیا گیا ہے۔ لیجیے، مطلع میں ہی سخن گسترانہ بات آ پڑی۔ ورنہ کہنا صرف اتنا تھا کہ مزے کی بات یہ تھی کہ اس سوتے جاگتے خواب کے دوران، بشارت نے خود کو اسکول ماسٹر ہی کے "رول" میں دیکھا۔ منصب بدلنے کی خواب میں بھی جرأت نہ ہوئی۔ شاید اس لئے بھی کہ فٹن اور ریشمی اِزار بند سے صرف اسکول ماسٹروں پر ہی رعب پڑ سکتا تھا۔ زمیں داروں اور جاگیرداروں کے لئے یہ چیزیں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ انھیں اپنی پیٹھ پر بیس برس بعد بھی اس آتشیں لکیر کی جلن

محسوس ہوتی تھی جو چابک لگنے سے اس وقت اُپڑی تھی جب محلّے کے لونڈوں کے ساتھ شور مچاتے، چابک کھاتے وہ ایک رئیس کی سفید گھوڑے والی فٹن کا پیچھا کر رہے تھے۔

چوراہے بلکہ شش و پنج راہے پر

شعر و شاعری چھوڑ کر اسکول ماسٹری اختیار کی۔ اسکول ماسٹری کو دَھتا بتا کر دکانداری کی۔ اور آخر کار دکان بیچ کھوچ کر کراچی آ گئے۔ جہاں ہر چند رائے روڈ پر دوبارہ عمارتی لکڑی کا کاروبار شروع کیا۔ نیا ملک۔ بدلا بدلا سار ہن سہن۔ ایک نئی اور مصروف دنیا میں قدم رکھا۔ مگر اس سفید گھوڑے اور فٹن والی فینٹسی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ خوابِ نیم روز(day۔ (dreamingاور فینٹسی سے دو ہی صورتوں میں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ اوّل، جب وہ فینٹسی نہ رہے، حقیقت بن جائے۔ دوم، انسان کسی چوراہے بلکہ شش و پنج راہے پر اپنے سوتے جاگتے ہمزاد سے سارے خواب بخشوا کر رخصت چاہے۔

Heart breaker, dream maker, thank you for the dream!

اور اس کھُونٹ نکل جائے جہاں سے کوئی نہیں لَوٹا۔ یعنی گھر گرہستی کی طرف۔ لیکن بشارت کو اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا۔ وہ بھرا پُرا گھر اونے پونے بیچ کر اپنے حسابوں لٹے پٹے آئے تھے۔ پاکستان میں ایک دو سال میں ہی اللہ نے ایسا فضل کیا کہ کانپور ہیچ معلوم ہونے لگا۔ سارے ارمان پورے ہو گئے۔ مطلب یہ کہ گھر اشیائے غیر ضروری سے اٹااٹ بھر گیا۔ بس ایک کمی تھی:

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے گھوڑے کے سوا

اب وہ چاہتے تو نئی نہ سہی سیکنڈ ہینڈ کار بآسانی خرید سکتے تھے۔ جتنی رقم میں آج کل چار ٹائر آتے ہیں، اس سے کم میں اس زمانے میں کار مل جاتی تھی۔ لیکن کار میں انہیں وہ رئیسانہ ٹھاٹ اور زمیں دارانہ ٹُھسا نظر نہیں آتا تھا جو فٹن اور بگھی میں ہوتا ہے۔ گھوڑے کی بات ہی کچھ اور ہے۔

گھوڑے کی ساتھ شجاعت بھی گئی

مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ آدمی جب بالکل جذباتی ہو جائے تو اس سے کوئی عقل کی بات کہنا ایسا ہی ہے جیسے بگولے میں بیج بونا۔ چنانچہ بشارت کو اس شوقِ فضول سے باز رکھنے کے بجائے انہوں نے اُلٹا خوب چڑھایا۔ ایک دن آگ کو

پٹرول سے بجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب سے گھوڑا رخصت ہوا، دنیا سے شجاعت و سرفروشی، جاں بازی و دلاوری کی ریت بھی اٹھ گئی۔ جانوروں میں کتّا اور گھوڑا انسان کے سب سے پہلے اور پکے رفیق ہیں جنھوں نے اس کی خاطر ہمیشہ کے لیے جنگل چھوڑا۔ کتا تو خیر اپنے کتے پن کی وجہ سے چمٹا رہا۔ لیکن انسان نے گھوڑے کے ساتھ بیوفائی کی۔ گھوڑے کے جانے سے انسانی تہذیب کا ایک ساونتی باب ختم ہوتا ہے۔ وہ باب جب سورما اپنے دشمن کو للکار کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے تھے۔ موت ایک نیزے کی دوری پر ہوتی تھی اور یہ نیزہ دونوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ موت کا ذائقہ اجنبی سہی لیکن مرنے والا اور مارنے والا دونوں ایک دوسرے کا چہرہ پہچان سکتے تھے۔ غافل سوتے ہوئے۔ بے چہرہ شہروں پر مشروم بادل کی اوٹ سے آگ اور ایٹمی موت نہیں برستی تھی۔ گھوڑا صرف اس وقت بزدل ہو جاتا ہے جب اس کا سوار بزدل ہو۔ بہادر گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ دل دھک دھک کرتے اور اور دھرتی تھرّاتی تھی۔ پیچھے دوڑتے ہوئے بگولے، سموں سے اڑتی ہوئی چنگاریاں، نیزوں کی اَنی پر کرن کرن بکھرتے سورج اور سانسوں کی ہانپتی آندھیاں کوسوں دور سے شہ سواروں کی یلغار کا اعلان کر دیتی تھیں۔ گھوڑوں کے ایک ساتھ دوڑنے کی آواز سے آج بھی لہو میں ہزاروں سال پرانی وحشتوں کے الاؤ بھڑک اٹھتے ہیں۔

لیکن مرزا ذرا ٹھہرو۔ اپنے توسنِ خطابت کو لگام دو۔ یہ کس گھوڑے کا ذکر کر رہے ہو؟ تانگے کے گھوڑے کا؟

گل جی کے گھوڑے

لیکن یہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ گھوڑے کے بغیر طالع آزمائی، ملک گیری، شجاعت اور "شولری" کے عہد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ "گھوڑے کی کاٹھی ہی ہمارا راج سنگھاسن ہے"۔ گائیکواڑوں کو اپنے قدیم شاہی "ماٹو" پر بڑا ناز تھا۔ یورپ کو تاخت و تاراج کرنے والے ہُن شہ سواروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی گھوڑے سے نہیں اترتے تھے۔ اس کی پیٹھ پر ہی سوتے، ستاتے، کھاتے، شراب نوشی اور خرید و فروخت کرتے۔ یہاں تک کے حوائج ضروری سے فارغ ہوتے۔ انگلینڈ میں اسٹب نامی ایک آرٹسٹ گزرا ہے جو صرف اعلیٰ نسل کے گھوڑے پینٹ کرتا تھا۔ یورپ میں گھوڑوں۔ کتّوں اور رائلٹی کی حد تک ولدیت اور شجرہ نسب اب بھی تھوڑے بہت معنی رکھتے ہیں۔ گھوڑے کو برہنہ ماڈلوں پر ترجیح دینے کی وجہ ہمیں تو بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کی دُم نہیں ہوتی۔

اس میں یہ عافیت بھی تھی کہ گھوڑا کبھی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ تصویر اصل کے مطابق نہ ہو۔ بہتر ہو۔ ہم پاکستان کے ممتاز اور نامور آرٹسٹ گل جی کے گیارہ سال دیوار بیچ پڑوسی رہ چکے ہیں۔ انہیں بہت قریب سے پینٹ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ صرف رات کو، اور وہ بھی بارہ بجے کے بعد پینٹ کرتے ہیں۔ کافی عرصے تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید انہیں رات میں بہتر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب سے ہم نے السر کی تکلیف کے سبب رات کو لکھنا پڑھنا شروع کیا، ہمسائے کے بارے میں بدگمانی سے کام لینا چھوڑ دیا۔

کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

انہیں بھی گھوڑوں سے بے انتہا شغف ہے۔ ان کی تصویریں بنا کر لاکھوں کماتے ہیں۔ سنا ہے ایک دفعہ کسی نے (ہم نے نہیں) مذاق میں کہہ دیا کہ جتنے کی آپ ایک گھوڑے کی تصویر بیچتے ہیں، اس میں تو تین زندہ گھوڑے بآسانی آسکتے ہیں۔ اتنا تو ہم نے بھی دیکھا اس کے بعد وہ کینوس پر کم از کم تین گھوڑے بنانے لگے۔ یہ بھی دیکھا کہ جتنے پیار، تفصیل وار موشماری اور انسپریشن سے وہ گھوڑے کی دم بناتے ہیں، اس کا سوواں حصہ بھی گھوڑے اور سوار پر صرف نہیں کرتے۔ صرف گھوڑے ہی کی نہیں سوار کی بھی ساری پرسنلٹی کھینچ کر دُم میں آجاتی

ہے۔ چنانچہ ہر دُم منفرد، البیلی اور انمول ہوتی ہے۔ دل کی بات پوچھیئے تو وہ فقط دم ہی بنانا چاہتے ہیں۔ باقی ماندہ گھوڑا انہیں فقط دُم کو اٹکانے کے لئیے طوعاً و کرہاً بنانا پڑتا ہے۔ کبھی کسی وی آئی پی خاتون کی پورٹریٹ خاص توجہ سے بہت ہی خوب صورت بنانی مقصود ہوتی تو اس کے بالوں کی پونی ٹیل بطور خاص ایسی بناتے کہ کوئی گھوڑا دیکھ لے تو بے قرار ہو ہو جائے۔

افضل ترین دُم

لیکن اونٹ کی دُم سے مادہ کو رجھانا تو در کنار، کسی بھی معقول یا نا معقول جذبے کا انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو تو ٹھیک سے لٹکنا بھی نہیں آتا۔ سچ پوچھئے تو دُم تو بس مور، برڈ آف پیراڈائز اور کیسینو کی Bunnies کی ہوتی ہے۔ آخر الذّکر ہمیں اس لیے بھی اچھی لگتی ہے کہ وہ ان کی اپنی نہیں ہوتی، اور اس کا مقصد آدمی کے اندر سوئے ہوئے اور ہارنے والے خرگوش کو گدگدا جگانا ہوتا ہے۔ برڈ آف پیراڈائز چکور کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن نر کی دُم، خدا جھوٹ نہ بلوائے، پندرہ پندرہ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اگر بہت سے نر اونچے اونچے درختوں پر اپنی متعلقہ دُمیں لٹکائے امیدوارِ کرم بیٹھے ہوں تو مادہ ان کی شوہرانہ اہلیت جانچنے کے لیے وہی پیمانہ استعمال کرتی ہے جس سے اگلے زمانے میں علما و فضلا کا علم ناپا جاتا

تھا۔ مطلب یہ کہ فقط معلقات یعنی ڈاڑھی، شملہ اور دُم کی لمبائی پر فیصلے کا انحصار۔ جس کی دُم سب سے لمبی ہو، مادہ اسی کے پرلے سرے پر لگی ہوئی منّی سی چونچ میں اپنی چونچ ڈال دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بامقصد دُم بچھو کی ہوتی ہے۔ سانپ کا زہر کچلی میں اور بچھو کا دُم میں ہوتا ہے۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں اور پاگل کتّے کا زبان میں۔ انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔ لکھتے لکھتے یوں ہی خیال آیا کہ ہم بچھو ہوتے تو کس کس کو کاٹتے۔ اپنے ناپسندیدہ اشخاص کی فہرست کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ایک زندگی تو اس مشن کے لیے بالکل ناکافی ہوتی۔ لیکن یہاں تک نوبت ہی نہ آتی، اس لیے کہ ہمارے معتوبین کی فہرست میں سب سے پہلا نام تو ہمارا اپنا ہی ہے۔ رہی سانپ کی دُم، تو وہ ہمیں پسند تو نہیں fascinate (لبھاتی) ضرور ہے۔ اس میں وہی خوبی پائی جاتی ہے جو ہماری پیشانی میں ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ پھن کو چھوڑ کر ہمیں تو سارا سانپ دُم ہی دُم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سب سے اعلیٰ و افضل وہ دُم قرار پائے گی جو جھڑ چکی ہے، اس لیے کہ اس حادثے کے بعد ہی اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کا درجہ ملا ہے۔

ہماری سواری: کیلے کا چھلکا

فٹن اور گھوڑے سے بشارت کی شیفتگی کا ذکر کرتے کرتے ہم کہاں آ نکلے۔ مرشدی و آقائی مرزا عبدالودود بیگ نے ایک دفعہ بڑے تجربے کی بات کہی۔ فرمایا "جب آدمی کیلے کے چھلکے پر پھسل جائے تو پھر رکنے، بریک لگانے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس سے اور زیادہ چوٹ آئے گی۔ بس آرام سے پھسلتے رہنا چاہیے اور پھسلنے کو انجوائے کرنا چاہیے۔ بقول تمہارے استاد ذوق کے، تم بھی چلے چلو یہ جہاں تک چلی چلے۔ کیلے کا چھلکا جب تھک جائے گا تو خود بخود رک جائے گا۔ Just relax" "لہٰذا قدم ہی نہیں، قلم یا نگاہِ تصوّر بھی پھسل جائے تو ہم اسی اصول پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ صاف صاف کیوں نہ اقرار کرلیں کہ زندگی کے طویل سفر میں کیلے کا چھلکا ہی ہماری واحد سواری رہا ہے۔ یہ جو کبھی کبھی ہماری چال میں جوانوں کی سی تیزی اور چلت پھرت آجاتی ہے تو یہ اسی کے طفیل ہے۔ ایک دفعہ رپٹ جائیں تو پھر یہ قلم چال جو بھی کنویں جھنکوائے اور جن گلیوں گلیاروں میں لے جائے وہاں بے ارادہ لیکن بَرغبت جاتے ہیں۔ قلم کو روکنے تھامنے کی ذرا کوشش نہیں کرتے۔ اور جب بیروں کی پوٹ پھٹ کر کاغذ پر بکھر جاتی ہے تو ہماری مثال اس بچّے کی سی ہوتی

ہے جس کی ٹھساٹس بھری ہوئی جیب کے تمام رازوں کو کوئی اچانک نکال کر سب کے سامنے میز پر لگا دے۔ زیادہ خفت بڑوں کو ہوتی ہے کہ انہیں اپنا بھُولا بسرا بچپن اور اپنی موجودہ میز کی درازیں یاد آجاتی ہیں۔ جس دن بچّے کی جیب سے فضول چیزوں کے بجائے پیسے بر آمد ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے بے فکری کی نیند کبھی نصیب نہیں ہو گی۔

ریس کورس سے تانگے تک

جیسے جیسے بزنس میں منافع بڑھتا گیا، فٹن کی خواہش بھی شدید تر ہوتی گئی۔ بشارت مہینوں گھوڑے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے گھوڑے کے بغیر ان کے سارے کام بند ہیں۔ اور بادشاہ رچرڈ سوم کی طرح وہ ہر چیز گھوڑے کی خاطر تج دینے کے لئے تیار ہیں:

"A horse! a horse! my kingdom for a horse"

ان کے پڑوسی چودھری کرم الٰہی نے مشورہ دیا کہ ضلع سرگودھا کے پولیس اسٹڈ فارم سے رجوع کیجئے۔ وہاں پولیس کی نگرانی میں 'تھارو بریڈ' اور اعلیٰ ذات کے گھوڑوں سے افزائشِ نسل کروائی جاتی ہے۔ گھوڑے کا باپ خالص اور اصیل ہو

تو بیٹا لا محالہ اسی پر پڑے گا۔ مثل ہے کہ باپ پر پُوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر بشارت کہنے لگے کہ ”میرا دل نہیں ٹھکتا۔ بات یہ ہے کہ جس گھوڑے کی پیدائش میں پولیس کا حمل دخل ہو، وہ گھوڑا خالص ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ گھوڑا پولیس پر پڑے گا۔“

گھوڑے کے بارے میں یہ گفتگو سن کر پروفیسر قاضی عبد القدوس ایم اے۔ بی ٹی نے وہ مشہور شعر پڑھا اور حسبِ معمول بے محل پڑھا، جس میں دیدہ ور کی ولادت سے رونما ہونے والی پیچیدگیوں کے ڈر سے نرگس ہزاروں سال روتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ پروفیسر قاضی عبد القدوس اپنی دانست میں کوئی بہت ہی دانائی کی بات کہنے کے لئے اگر بیچ میں بولیں تو بیوقوف معلوم ہوتے ہیں۔ اگر نہ بولیں تو اپنے چہرے کے نارمل ایکسپریشن کے سبب اور زیادہ بیوقوف لگتے ہیں۔ گویا:

گویم مہمل و گرنہ گویم مہمل

پوفیسر مذکور کے نارمل ایکسپریشن سے مراد چہرے پر وہ رنگ ہیں جو اس وقت آتے اور جاتے ہیں جب کسی کی زپ اَدھ بیچ میں اٹک جاتی ہے۔

خدا خدا کر کے ایک گھوڑا پسند آیا جو ایک اسٹیل ری رولنگ مل کے سیٹھ کا تھا۔ تین چار دفعہ اسے دیکھنے گئے اور ہر دفعہ پہلے سے زیادہ مطمئن لوٹے۔ اس کا سفید رنگ ایسا بھایا کہ اٹھتے بیٹھتے اسی کے چرچے، اسی کے قصیدے۔ ہم نے ایک دفعہ پوچھا "پنچ کلیان ہے"؟ حقارت آمیز انداز سے ہنسے۔ فرمایا "پنچ کلیان تو بھینس بھی ہو سکتی ہے۔ فقط چہرہ اور ہاتھ پیر سفید ہونے سے گھوڑے کی دُم میں سُرخاب کا پر نہیں لگ جاتا۔ گھوڑا وہ جو آٹھوں گانٹھ کمیت ہو۔ چاروں ٹخنوں اور چاروں گھٹنوں کے جوڑ مضبوط ہونے چاہیئں۔ یہ بھاڑے کا ٹٹّو نہیں، ریس کا خاندانی گھوڑا ہے"۔ یہ گھوڑا ان کے اعصاب پر اس بُری طرح سوار تھا کہ اب اسے ان پر سے کوئی گھوڑی ہی اتار سکتی تھی۔ سیٹھ نے انھیں ایسوسی ایٹڈ پرنٹرز میں طبع شدہ کراچی ریس کلب کا وہ کتابچہ بھی دکھایا جو اس ریس سے متعلق تھا جس میں اس گھوڑے نے حصّہ لیا اور اوّل آیا تھا۔ اس میں اس کی تصویر اور تمام کوائف مع شجرۂ نسب درج تھے۔ نام White Rose ولد Wild Oats ولد Old Devil ۔ جب سے یہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیکھا، انھوں نے اپنے ذاتی بزرگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیا۔ ان کے بیان کے مطابق اس کے دادا نے ممبئی میں تین ریسیں جیتیں۔ چوتھی میں دوڑتے ہوئے ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کی دادی بڑی نرچگ تھی۔ اپنے زمانے کے نامی گرامی ولایتی گھوڑوں سے اس کا تعلق رہ

چکا تھا۔ اس کے دامنِ عصمت سے تمسّک و تمتّع کی بدولت چھ نرینہ اولادیں ہوئیں۔ ہر ایک اپنے متعلقہ باپ پڑی۔ سیٹھ سے پہلے وہائٹ روز ایک بگڑے رئیس کی ملکیت تھا جو باتھ آئی لینڈ میں ایک کوٹھی "ونڈر لینڈ" نام کی اپنی اینگلو انڈین بیوی ایلس کے لئے بنوا رہا تھا۔ ری رولنگ مِل سے جو سَریا وہ خرید کر لے گیا تھا اس کی رقم کئی مہینے سے اس کے نام کھڑی تھی۔ ریس اور سٹے میں دِوالا نکلنے کے سبب ونڈر لینڈ کی تعمیر رک گئی اور ایلس اسے حیرت زدہ چھوڑ کر ملتان کے ایک زمیں دار کے ساتھ یورپ کی سیر کو چلی گئی۔ سیٹھ کو ایک دن جیسے ہی خبر ملی کہ ایک قرض خواہ اپنے واجبات کے عوض پلاٹ پر پڑی ہوئی سیمنٹ کی بوریاں اور سَریا اٹھوا کے لے گیا، اس نے اپنے منیجر کو پانچ لٹھ بند چوکیداروں کی نفری ساتھ لے کر باتھ آئی لینڈ بھیجا کہ بھاگتے بھوت کی جو چیز بھی ہاتھ لگے، کھسوٹ لائیں۔ لہٰذا وہ یہ گھوڑا اصطبل سے کھول لائے۔ وہیں ایک سیامی بلی نظر آ گئی۔ سو اسے بھی بوری میں بھر کے لے آئے۔ گھوڑے کی ٹریجڈی کو پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لئے بشارت نے ضمناً ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ فرمایا "یہ گھوڑا تانگے میں جتنے کے لئے تھوڑا ہی پیدا ہوا تھا۔ سیٹھ نے بڑی زیادتی کی، مگر قسمت کی بات ہے۔ صاحب تین سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ آپ یوں

بینک میں جوت دیے جائیں گے۔ کہاں ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کرسی اور کہاں بینک کا چار فٹ اونچا اسٹول!"

شاہی سواری

انہیں اس گھوڑے سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی۔ اور محبت اندھی ہوتی ہے، خواہ گھوڑے سے ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ تک سجھائی نہ دیا کہ گھوڑے کی مدح میں اساتذہ کے جو اشعار وہ اوٹ پٹانگ پڑھتے پھرتے تھے، ان کا تعلق تانگے کے گھوڑے سے نہیں تھا۔ یہ مان لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ گھوڑا شاہی سواری ہے۔ رعبِ شاہی اور شوکتِ شہانہ کا تصور گھوڑے کے بغیر ادھورا بلکہ بالکل آدھا رہ جاتا ہے۔ بادشاہ کے قد میں گھوڑے کے قد کا اضافہ کیا جائے تب کہیں وہ قدِ آدم نظر آتا ہے۔

لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو شاہی سواری میں گھوڑا دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مستقل اور دلپسند سواری در حقیقت رعایا ہوتی ہے۔ یہ ایک دفعہ اس پر سواری گانٹھ لیں تو پھر انھیں سامنے کوئی کنواں، کھائی، باڑھ اور رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ جوشِ شہ زوری و شہ

سواری میں نوشتۂ دیوار والی دیوار بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ یہ نوشتہ ء دیوار اس وقت تک نہیں پڑھ سکتے جب تک وہ Braille میں نہ لکھا ہو۔ جسے وہ اپنا دربار سمجھتے ہیں، وہ دراصل ان کا محاصرہ ہوتا ہے۔ جو انہیں یہ سمجھنے سے قاصر رکھتا ہے کہ جس منہ زور سر شور گھوڑے کو صرف ہنہنانے کی اجازت دے کر بآسانی آگے سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے، اسے وہ پیچھے سے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ لگام کے بجائے دُم مڑوڑتا ہے۔ مگر اس بظاہر مسکیں سواری کا اعتبار نہیں کہ یہ ابلق لقا سدا ایک چال نہیں چلتی:

اکثر یہ بدرکاب بنی اور بگڑ گئی

غُربا کشتن روزِ اوّل

لیکن جو حکمراں ہوشیار، مردم شناس اور رموز و مصلحتِ مملکت سے آشنا ہوتے ہیں، وہ پہلے ہی دن غریبوں کی سرکوبی کر کے خواص کو عبرت دلاتے ہیں:

غُربا کشتن روزِ اوّل

ویسے خواص اور عمائد کو کسی تنبیہ اور آنکس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو بھی ان پر سونے کی عماری، چاندی کی گھنٹیاں، زربفت کی جھول اور تمغوں کی مالا ڈال

دے، اسی کا نشان ہاتھی بننے کے لئے کمر بستہ رہتے ہیں۔ پہلے کمر بستہ و دست و پا بستہ۔ پھر لب بستہ۔ اور آخر میں فقط بستہ بردار۔

چار دن کی زندگی ملی تھی۔ سو دو آرزوئے حضوری میں کٹ گئے، دو جی حضوری میں۔

ہمارا کجاوہ

ہم نے ایک دن گھوڑوں کی جناب میں کچھ گستاخی کی تو بشارت بھنّا گئے۔ ہم نے برسبیلِ تضحیک ایک تاریخی حوالہ دیا تھا کہ جب منگول ہزاروں کے غول بنا کر گھوڑوں پر نکلتے تو بدبو کے ایسے بھبھکے اٹھتے تھے کہ بیس میل دور سے پتہ چل جاتا تھا۔ ارشاد فرمایا، معاف کیجیے، آپ نے راجھستان میں، جہاں آپ نے جوانی گنوائی، اونٹ ہی اونٹ دیکھے، جن کی پیٹھ پر کلف دار راجپوتی صافے، چڑھوا اں داڑھیاں اور دس فٹ لمبی نال والی توڑے دار بندوقیں سجی ہوتی تھیں۔ اور نیچے کندھے پہ رکھی لاٹھی کے سِرے پر تیل پلائے ہوئے کچے چمڑے کے جُوتے لٹکائے، اردلی میں ننگے پیر جاٹ۔ گھوڑا تو آپ نے پاکستان میں آن کر دیکھا ہے۔ میاں احسان الٰہی گواہ ہیں، انھی کے سامنے آپ نے ان ٹھاکر صاحب کا قصّہ سنایا

تھا جو مہاراجا کی شتر نال پلٹن میں رسال دار تھے۔ جب ریٹائر ہو کر اپنے آبائی قصبے۔ کیا نام تھا اس کا۔ اودے پور توراواٹی پہنچے تو اپنی گڑھی میں ملاقاتیوں کے لئے دس بارہ مونڈھے ڈلوا دیے اور اپنے لئے سرکاری اونٹ جنگ بہادر کا پرانا کجاوہ۔ اسی پر اپنی پلٹن کا شنگرفی رنگ کا صافہ باندھے، سینے پر تمغے سجائے صبح سے شام تک بیٹھے ہلتے رہتے۔ ایک دن ہل ہل کر جنگ بہادر کے کارنامے بیان کر رہے تھے اور میڈل جھن جھن کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔ کجاوے پر ہی طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے اپنے عمودی سفر پر روانہ ہو گیا۔ دمِ واپسیں لبوں پر مسکراہٹ اور جنگ بہادر کا نام۔ معاف کیجیے، یہ سب آپ ہی کے لیے ہوئے اسنیپ شاٹس ہیں۔ بندہ پرور! آپ بھی تو اپنے کجاوے سے نیچے نہیں اُترتے۔ نہ اُتریں مگر یہ کجاوہ خاکسار کی پیٹھ پر رکھا ہوا ہے۔ صاحب، آپ گھوڑے کی قدر کیا جانیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ سمندِ سیاہ زانو کس چڑیا کا نام ہے۔ خچر کا 'کراس' کیسے ہوتا ہے؟ کھریرا کس شکل کا ہوتا ہے؟ کنوتیاں کہاں ہوتی ہیں؟ بیل کے آر کہاں چبھوئی جاتی ہے؟ چلغوزہ کس زبان کا لفظ ہے؟

آخری دو سوال کلیدی اور فیصلہ کن تھے۔ اس لیے کہ ان سے پتا چلتا تھا کہ بحث کس نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ کج بحثی ہمیں اس لیے اور بھی ناگوار گزری کہ ہمیں ایک بھی سوال کا جواب نہیں آتا تھا۔ وہ "اوکھے" نہیں طبعاً بہت

دھیمے اور میٹھے آدمی ہیں۔ لیکن جب وہ اسطرح پٹڑی سے اتر جائیں تو ہمیں دور تک کچے میں کھدیڑتے، گھسیٹتے لے جاتے ہیں۔ کہنے لگے ”جو شخص گھوڑے پر نہیں بیٹھا، وہ کبھی سیر چشم، غیوّر اور شیر دلیر نہیں ہو سکتا“۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ خود بھی کبھی گھوڑے پر نہیں بیٹھے تھے۔

جنازے سے دُور رکھنا

انھیں ایک عرصے سے زندگی میں جو روحانی خلا محسوس ہو رہا تھا، وہ اس گھوڑے نے پر کر دیا۔ انہیں بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس کے بغیر اب تک کیسے بلکہ کاہے کو جی رہے تھے!

I wonder by my troth what thou and I did till we loved____Donne

اس گھوڑے سے ان کی شیفتگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ فٹن کا خیال چھوڑ کر سیٹھ کا تانگا بھی ساڑھے چار سو روپے میں خرید لیا، حالانکہ انھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ بہت بڑا اور گنوارو تھا۔ لیکن کیا کیا جائے سارے کراچی میں ایک بھی فٹن نہیں تھی۔ سیٹھ گھوڑا اور تانگا ساتھ بیچنا چاہتا تھا۔ یہی نہیں اس نے دانے کی دو

بوریوں، گھاس کے پانچ پولوں، گھوڑے کے فریم کیے ہوئے فوٹو، ہاضمے کے نمک، دوا اور تیل پلانے کی نال، کھریرے اور توبڑے کی قیمت ساڑھے انیتس روپے علیحدہ سے دھروالی۔ وہ اس دھاندلی کو ''پیکج ڈیل'' کہتا تھا۔ گھوڑے کے بھی منہ مانگے دام دینے پڑے۔ گھوڑا اگر اپنے منہ سے دام مانگ سکتا تو یقیناً سیٹھ کے مانگے ہوئے داموں یعنی نو سو روپے سے کم ہی ہوتے۔ گھوڑے کی خاطر بشارت کو سیٹھ کا تکیہ کلام ''کیا؟'' اور ''سالا'' بھی برداشت کرنا پڑا۔ حساب چکتا کر کے جب انھوں نے لگام اپنے ہاتھ میں لی اور یہ یقین ہو گیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت ان سے ان کے خواب کی تعبیر نہیں چھین سکتی تو انہوں نے سیٹھ سے پوچھا کہ آپ نے اتنا اچھا گھوڑا کیوں بیچ دیا؟ کوئی عیب ہے؟ اس نے جواب دیا دو مہینے پہلے کی بات ہے، میں تانگے میں لارنس روڈ سے لی مارکیٹ جا رہا تھا۔ میونسپل ورک شاپ کے سامنے پہنچا ہوں گا کہ سامنے سے ایک سالا جنازہ آتا دکھلائی پڑا۔ کیا؟ کسی پولیس افسر کا تھا۔ گھوڑا آل آف اے سڈن بدک گیا۔ پر کندھا دینے والے اس سے بھی زیادہ بدکے۔ بے فضول ڈر کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیا؟ بیچ سڑک کے جنازے کی مٹی خراب ہوئی۔ ہم سالا اُلو کی موافق بیٹھا دیکھتا پڑا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، بیکار بندھا کھا رہا ہے۔ دل سے اتر گیا۔ کیا؟ ویسے عیب کوئی نہیں۔ بس جنازے سے دور رکھنا اچھا۔ سلامالیکم''

"آپ نے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"تم نے پہلے کیوں نہیں پوچھا؟ سلاما لیکم"

جگ میں چلے پَون کی چال

انہوں نے ایک کوچوان رحیم بخش نامی ملازم رکھ لی۔ تنخواہ منہ مانگی، یعنی پنتالیس روپے اور کھانا کپڑا۔ گھوڑا انہوں نے صرف رنگ، دانت اور گھنیری دُم دیکھ کر خریدا تھا۔ اور وہ ان حصوں سے اتنے مطمئن تھے کہ باقی ماندہ گھوڑے کی جانچ پڑتال ضروری نہیں سمجھی۔ کوچوان بھی کچھ اسی طرح رکھا۔ یعنی صرف زبان پر ریجھ کر۔ باتیں بنانے میں طاق تھا۔ گھوڑے جیسا چہرہ۔ ہنستا تو معلوم ہوتا گھوڑا ہنہنا رہا ہے۔ تیس سال سے گھوڑوں کی صحبت میں رہتے رہتے ان کی تمام عادتیں، عیب اور بدبوئیں اپنا لی تھیں۔ گھوڑے کی اگر دو ٹانگیں ہوتیں تو یقیناً اسی طرح چلتا، بچوں کو اکثر اپنا بایاں کان ہلا کر دکھاتا۔ فٹ بال کو ایڑی سے دولتی مار کر پیچھے کی طرف گول کرتا تو بچّے خوشی سے تالیاں بجاتے۔ گھوڑے کے چنے کی چوری کرتا تھا۔ بشارت کہتے تھے "یہ منحوس چوری چھپے گھاس بھی کھاتا ہے، ورنہ ایک گھوڑا اتنی گھاس کھا ہی نہیں سکتا۔ جبھی تو اس کے بال ابھی

تک کالے ہیں۔ دیکھتے نہیں حرام خور تین عورتیں کر چکا ہے !" موضوع کچھ بھی ہو تمام تر گفتگو سائیسی اصطلاحوں میں کرتا اور رات کو چابک لے کر سوتا۔ دو میل کے دائرے میں کہیں بھی گھوڑا یا گھوڑی ہو، وہ فوراً بُو پالیتا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے۔ راستے میں کوئی خوبصورت گھوڑی نظر آجائے تو وہیں رک جاتا اور آنکھ مار کے تانگے والے سے اس کی عمر پوچھتا۔ پھر اپنے گھوڑے کا چرمی چشم بند اٹھاتے ہوئے کہتا "پیارے ! تو بھی جلوہ دیکھ لے۔ کیا یاد کرے گا !" اور پنکھج ملک کی آواز، اپنی لے اور گھوڑے کی ٹاپ کی تال پر "جگ میں چلے پون کی چال" گاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ مرزا کہتے تھے یہ شخص پچھلے جنم میں گھوڑا تھا اور اگلے جنم میں بھی گھوڑا ہی ہو گا۔ یہ سعادت صرف مہاتماؤں اور رشیوں منیوں کو ہی حاصل ہوتی ہے کہ جو وہ پچھلے جنم میں تھے، اگلے میں بھی وہی ہوں۔ ورنہ ہما شما کی تو ایک ہی دفعہ میں جون پلٹ جاتی ہے۔

دست بدیوار رواں گیا

گھوڑے تانگے کا افتتاح کہئے، مہورت کہئے، breaking in کہئے۔۔۔ اس کی رسم بشارت کے والد نے انجام دی۔ ستّر کے پیٹے بلکہ لپیٹے میں آنے کے بعد مستقل بیمار رہنے لگے تھے۔ کراچی آنے کے بعد انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں

مارے، لیکن نہ کوئی مکان اور جائداد الاٹ کرا سکے، نہ کوئی ڈھنگ کی بزنس شروع کر پائے۔ بنیادی طور پر وہ بہت سیدھے آدمی تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں بھی وہ اپنے بندھے ٹکے اصولوں اور آؤٹ آف ڈیٹ طرزِ زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کو سراسر بدمعاشی گردانتے تھے۔ چنانچہ ناکامی سے دل گرفتہ یا شرمسار ہونے کی بجائے ایک گونہ افتخار اور طمانیت محسوس کرتے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی میں ناکام ہونے کو اپنی نیکی اور راست بازی کی سب سے روشن دلیل سمجھتے تھے۔ بے حد حساس، کم آمیز اور خود دار انسان تھے۔ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ پامسٹ کے سامنے بھی نہیں۔ اب یہ بھی کیا۔ خوشامد سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ یہ قسم بھی ٹوٹی مگر کار بر آری نہ ہونا تھی، نہ ہوئی۔ بقول مرزا عبد الودود بیگ، جب غیّور اور با اصول آدمی حتیٰ المقدور دھکے کھانے کے بعد ''ڈی مورلائز'' ہو کر کامیاب لوگوں کے ہتھکنڈے اپنانے کی بھونڈی کوشش کرتا ہے تو رہی سہی بات اور بگڑ جاتی ہے۔ یکایک ان پر فالج کا حملہ ہوا جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا۔ ذیابطیس، الرجی، پارکنسن کا عارضہ اور اللہ جانے کیا کیا لاحق ہو گیا۔ کچھ نے کہا ان کی مجروح انّا نے بیماریوں میں پناہ تلاش کر لی ہے۔ خود تندرست نہیں ہونا چاہتے کہ پھر کوئی ترس نہیں کھائے گا۔ اب انہیں اپنی ناکامیوں کا ملال نہیں تھا جتنا کہ عمر

بھر کی وضع داری ہو تھ سے چھوٹنے کا قلق۔ لوگ آ آ کر انہیں حوصلہ دلاتے اور کامیاب ہونے کی ترکیبیں سجھاتے تو ان کے آنسو رواں ہو جاتے۔

تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

(میر کی مراد صاحبی سے "صاحب پن" نہیں بلکہ ناز و غمزہ اور تغافلِ معشوقانہ ہے۔)

سُبکی، بے وقری اور ذلت کی سب سے ذلیل صورت یہ ہے کہ آدمی کو اپنی نظر میں بے وقعت و بے توقیر ہو جائے۔ سو وہ اس جہنم سے گزرے:

جانانہ تھا جہاں سو بار واں گیا

ضعفِ قویٰ سے دست بدیوار واں گیا

محتاج ہو کے ناں کا طلب گار واں گیا

چارہ نہ دیکھا مضطر و لاچار واں گیا

اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنّی کے سماجت مِری گئی

نالائقوں سے ملتے لیاقت مِری گئی

کیا مفت ہائے شانِ شرافت مِری گئی

ایسا پھرایا اس نے کہ طاقت مِری گئی

مشہور شہر اب ہوں سبک سار و بے وقار

بشارت بیان کرتے ہیں کہ "باوا جب دست بد دیوار، والا مصرع پڑھتے تو ہَوا میں دائیں ہاتھ سے دیوار پکڑ پکڑ کر چلنے کی تصویر سی کھینچ دیتے۔ بایاں بے جان ہاتھ لٹکا الگ اپنی با تصویر کہانی سناتا۔ لیکن بے کسی اور بے بسی کی تصویر کھینچنے کے لیے انھیں کچھ زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ساری عمر داغ کی غزلوں پر سر دھنا کئے۔ انھوں نے کبھی کسی طوائف کو فانی یا میر کی غزل گاتے نہیں سنا۔ دراصل ان دنوں محفلِ رقص و سرود میں کسی شعلہ رو، شعلہ گُلو سے فانی یا میر کی غزل گوانا ایسا ہی تھا جیسے شراب میں برابر کا نیبو کا رس نچوڑ کر پینا پلانا! گستاخی معاف۔ ایسی مرد افگن پینے کے بعد تو آدمی صرف طبلہ بجانے کے قابل رہ جائے گا! تو صاحب، باوا ساری عمر فانی اور میر سے نفور رہے۔ اب جو پناہ ملی تو انھیں کے ابیات میں ملی۔ وہ قوی اور بہادر آدمی تھے۔ میں تصور بھی نہیں

کر سکتا تھا کہ کبھی ان کو روتے ہوئے دیکھوں گا۔ مگر دیکھا۔ ان آنکھوں سے اکثر"۔

کراچی میں ان کا آدھا وقت تو یارانِ رفتہ کی یاد میں گزرتا تھا۔ بقیہ آدھا یارانِ از کارِ رفتہ ضائع کر دیتے تھے۔

اللہ دین ہشتم

بزرگوار کے امراض نہ صرف متعدد تھے، بلکہ متعدّی بھی۔ ان میں سب سے موذی مرض بڑھاپا تھا۔ ان کا ایک داماد ولایت سے سرجری میں تازہ تازہ ایف آر سی ایس کر کے آیا تھا۔ اس نے اپنی سسرال میں کسی کا اپنڈکس سلامت نہ چھوڑا۔ کسی کی آنکھ میں بھی تکلیف ہوتی تو اس کا اپنڈکس نکال دیتا تھا۔ حیرت اس پر ہوتی کہ آنکھ کی تکلیف جاتی رہتی تھی۔ بزرگوار حالاں کہ تمام عمر دردِ شکم میں مبتلا رہے، لیکن اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہتے تھے کہ میں نے آج تک کسی ڈاکٹر کو اپنے اپنڈکس پر ہاتھ نہیں ڈالنے دیا۔ ایک مدت سے صاحبِ فراش تھے لیکن ان کی معذوری ابھی نامکمل تھی۔ مطلب یہ کہ سہارے سے چل پھر سکتے تھے۔ انھوں نے رسمِ افتتاح اس طرح ادا کی کہ اپنے کمرے کے دروازے

میں جس سے نکلے انہیں کئی مہینے ہو گئے تھے، ایک سرخ ربن بندھوا کر اپنے ڈانواں ڈول ہاتھ سے قینچی سے کاٹی۔ تالی بجانے والے بچوں میں لڈو تقسیم کرنے کے بعد دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی۔ پھر گھوڑے کو اپنے ہاتھ سے گیندے کا ہار پہنایا۔ اس کی پیشانی پر ایک بڑی سی بھونری تھی۔ زعفران میں انگلی ڈبو کر اس پر، اللہ، لکھا اور کچھ پڑھ کر دَم کیا۔ چاروں سموں اور دونوں پہیوں پر شگون کے لیے سیندور لگا کر دعا دی کہ جیتے رہو سدا سرپٹ چلتے رہو۔ رحیم بخش کوچوان کا منہ کھلوا کر اس میں سالم لڈو فٹ کیا۔ خود ورقِ نقرہ میں لپٹی ہوئی گلوری کلے میں دبائی۔ پرانی کشمیری شال اوڑھ لپیٹ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور اگلی سیٹ پر اپنا بیس سال پرانا ہارمونیم رکھوا کر اس کی مرمت کرانے ماسٹر باقر علی کی دکان روانہ ہو گئے۔

گھوڑے کا نام بدل کر بزرگوار نے بلبن رکھا۔ کوچوان سے کہا ہمیں تمہارا نام رحیم بخش بالکل پسند نہیں۔ ہم تمہیں اللہ دین کہہ کر پکاریں گے۔ جب سے ان کا حافظہ خراب ہوا تھا وہ ہر نوکر کو اللہ دین کہہ کر بلاتے تھے یہ اللہ دین ہشتم تھا۔ اس کا پیش رَو اللہ دین ہفتم کثیر العیال تھا۔ حقہ کی تمباکو اور روٹیوں کی چوری میں نکالا گیا۔ گرم روٹیاں پیٹ پر باندھ کر لے جا رہا تھا۔ چال سے پکڑا گیا۔ بزرگوار موجودہ اللہ دین یعنی رحیم بخش کو عام طور پر اللہ دین ہی کہتے تھے۔ البتہ کوئی

خاص کام مثلاً پیر دبوانے ہوں یا بے وقت چلم بھروانی ہو یا محض پیار اور شفقت جتانی ہو تو الٰہ دین میاں کہہ کر پکارتے۔ لیکن گالی دینی ہو تو اصل نام لے کر گالی دیتے تھے۔

ہاف ماسٹ چابک

دوسرے دن سے تانگا صبح بچّوں کو اسکول لے جانے لگا۔ اس کے بعد بشارت کو دکان چھوڑنے جاتا۔ تین دن یہی معمول رہا۔ چوتھے دن کو چوان بچوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آیا تو بیحد پریشان تھا۔ گھوڑا پھاٹک سے باندھ کر سیدھا بشارت کے پاس آیا۔ ہاتھ میں چابک اس طرح اٹھائے ہوئے تھا جیسے زمانہ قدیم میں عَلم بردار جنگی عَلم لے کر چلتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے، جس طرح نیویارک کے اسٹیچو آف لبرٹی نے اپنے ہاتھ کو آخری سنٹی میٹر تک اونچا کر کے مشعلِ آزادی بلند کر رکھی ہے۔ آگے چل کر معلوم ہوا کوئی بجوگ پڑ جائے یا منحوس خبر سنانی ہو تو وہ اسی طرح چابک کا عَلم بلند کر کے آتا تھا۔ چابک کو عمودی حالت میں دیکھ کر بشارت ایسے سراسیمہ ہوتے جیسے ہیملٹ ghost دیکھ کر ہوتا تھا۔

Here it cometh, my lord

بشارت کے قریب آکر اس نے چابک کو "ہاف ماسٹ" کیا اور پندرہ روپے طلب کیے۔ کہنے لگا "اسکول کی گلی کے نکڑ پہ اچانک چالان ہو گیا۔ گھوڑے کے بائیں پاؤں میں لنگ ہے! اسکول سے نکلا ہی تھا کہ، بے رحمی والوں انے دھر لیا۔ بڑی منتوں سے پندرہ روپے دے کر گھوڑا چھڑایا ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ سرکار بھی بے فضول کھچے کھچے پھرتے۔ میری آنکھوں کے سامنے، بے رحمی والے، ایک گدھا گاڑی کے مالک و ہنکال کے تھانے لے گئے۔ اس کے گدھے کا لنگ تو اپنے گھوڑے کا پاسنگ بھی نہیں"۔ کوچوان نے گدھے کے خفیف سے لنگ کا ذکر اتنی حقارت سے کیا اور اپنے گھوڑے کے لنگ کی شدّت اور برتری بیان کرنے میں اتنے فخر اور غلو سے کام لیا کہ بشارت نے غصّے سے کانپتے ہوئے ہاتھ سے پندرہ روپے دے کر اسے خاموش کیا۔

شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور

اسی وقت ایک سلوتری کو بلا کر گھوڑے کو دکھایا۔ اس نے بائیں نلی ہاتھ سے سونتی تو گھوڑا چمکا۔ تشخیص ہوئی کہ پرانا لنگ ہے۔ سارا گھپلا اب کچھ کچھ سمجھ میں

---

[1] کوچوان انجمنِ انسدادِ بے رحمی جانوراں (SPCA) کو اسی مختصر نام سے پکارتا اور کوستا تھا۔

آنے لگا۔ غالباً کیا یقیناً، اسی وجہ سے گھوڑا ریس سے ڈِس کوالی فائی ہوا ہو گا۔ ایسے گھوڑے کو تو اسی وقت گولی مار دی جاتی ہے جو اس کے حق میں تانگے میں ذلیل و خوار ہونے سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ تاہم سلوتری نے امید دلائی کہ لنگ اس صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ چھ مہینے تک حواصل کے تیل کی مالش کرائیں۔ مالش کی اجرت پانچ روپے یومیہ! یعنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار۔ چھ مہینے کے نو سو روپے ہوئے۔ نو سو کا گھوڑا، نو سو کی مالش۔ گویا ٹاٹ کی گدڑی میں کمخواب کا پیوند! ابھی کچھ دن ہوئے انہوں نے اپنے والد کی مالش اور پیر دبانے کے لیے ایک شخص کو اسّی روپے ماہوار پر رکھا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کی کمائی کا نصف حصہ تو انکم ٹیکس والے دھر والیں گے اور ایک تہائی چمپی مالش والے کھا جائیں گے۔ حلال کی کمائی کے بارے انھوں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ وہ اس تناسب سے غیر مستحقین میں تقسیم ہوتی ہے۔ چار بجے تانگا جتوا کر سیٹھ سے نمٹنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ تانگے میں بیٹھنے سے پہلے انھوں نے گہرے رنگ کی دھوپ کی عینک لگالی، تاکہ سخت بات کہنے میں حجاب محسوس نہ ہو اور چہرہ پر ایک پُراَسرار خونخواری کا ایکسپریشن آجائے۔ آدھا راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ ایک شخص نے بم[1] پکڑ کر تانگا روک لیا۔ کہنے لگا، آپ کا گھوڑا بری طرح لنگڑا رہا ہے۔

---

[1] بم: گاڑی کے آگے لگانے والی لکڑی جس میں گھوڑا جوتتے ہیں۔

چالان ہو گا۔ بشارت ہک دک رہ گئے۔ معلوم ہوا "بے رحمی والے" آج کل بہت سختی کر رہے ہیں۔ ہر موڑ پر ایک انسپکٹر گھات میں کھڑا ہے۔ قدم قدم پر بات بے بات چالان ہو رہا ہے۔ وہ کسی طرح نہ مانا تو بشارت نے قانونی موشگافی کی، آج صبح ہی اس کا چالان ہو چکا ہے۔ سات گھنٹے میں ایک ہی جرم میں دو چالان نہیں ہو سکتے۔ انسپکٹر نے یہ بات بھی فردِ جرم میں ٹانک لی اور کہا کہ اس سے تو جرم کی نوعیت اور سنگین ہو گئی ہے۔ کوئی جائے فرار نظر نہ آئی تو بشارت نے کہا "اچھا بابا! تمھی سچے سہی۔ دس روپے پہ معاملہ رفع دفع کرو۔ برانڈ نیو گھوڑا ہے۔ خریدے ہوئے تیسرا دن ہے"۔ یہ سنتے ہی وہ شخص تو آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا"۔ بڑے صاب گاگلز کے باوجود آپ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پیسے سے لنگڑا گھوڑا تو خرید سکتے ہیں۔ آدمی نہیں خرید سکتے"۔ چالان ہو گیا۔

اسٹیل ری رولنگ مل پہنچے تو سیٹھ گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اس کے یہاں ایک بزرگ کی نیاز میں ڈیڑھ دو سو فقیروں کو پلاؤ کھلایا جا رہا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس سے مہینے بھر کی کمائی پاک ہو جاتی ہے۔ اور یہ laundering (شست و شو) کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک بینک میں پندرہ بیس برس تک یہ دستور رہا کہ ہر برانچ میں روزانہ جتنے نئے اکاؤنٹ کھلتے شام کو اتنے ہی فقیر کھلائے جاتے۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کھانا اکاؤنٹ کھلنے کی خوشی میں کھلایا جاتا تھا یا سودی کاروبار میں بڑھوتری کا کفارہ تھا۔ ہمیں ایک مرتبہ ملتان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس دن بنک کے مالکان میں سے ایک بہت سینئر سیٹھ انسپکشن پر آئے ہوئے تھے۔ شام کو برانچ میں مساوات کا یہ ایمان افروز منظر دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ سیٹھ صاحب پندرہ بیس فقیروں کیساتھ زمین پر اکڑوں بیٹھے پلاؤ کھا رہے ہیں اور فرداً فرداً ہر فقیر اور اس کے اہل و عیال کی عدم خیریت کی تفصیلات دریافت کر رہے ہیں۔ لیکن مرزا عبد الودود بیگ کو غبارے پنکچر کرنے کی بڑی بری عادت ہے۔ انھوں نے یہ کہ کر ہماری ساری خوشی کرکری کر دی کہ جب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پینے لگیں تو سمجھ لو کہ شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور ہے۔ محمود و ایاز کا ایک ہی صف میں بیٹھ کر پلاؤ کھانا بھی "آڈٹ اینڈ انسپکشن "کا حصہ ہے۔ سیٹھ صاحب دراصل یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ کھانے والے اصلی فقیر ہیں یا منیجر نے اپنے یاروں، رشتے داروں کی پنگت[1] بٹھا دی ہے۔

[1] پنگت: فرشی دعوت میں مہمانوں کی قطار۔

ہم کہاں سے کہاں آ گئے۔ ذکر اسٹیل مل والے سیٹھ کا تھا جو سات آٹھ سال سے کالے دھن کو ماہ بماہ نیاز فاتحہ کے لوبان کی دھونی سے پاک اور "وہائٹ" کرتا رہتا تھا۔ نئ جادوئی چھڑی ایجاد ہونے میں ابھی کافی دیر تھی کہ ہمارے ذہین اور طبّاع وزیرِ کالی خزانہ اور ماہرینِ اقتصادیات تو اس زمانے میں میٹرک کے امتحان کی تیاری میں لگے ہوں گے۔ لہٰذا اسیاہ کو سفید کرنے کا شعبدہ ہنوز پیر فقیر، نوسرباز، سفلی عمال اور باورچی خانے پر سفیدی کرنے والے انجام دیتے تھے۔

مہاتما بدھ بہاری تھے!

سیٹھ نے گھوڑے کے لنگ سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ الٹا سر ہو گیا کہ "تم گھوڑے کو دیکھنے ہاف ڈزن ٹائم تو آئے ہو گے۔ گھوڑا تلک تم کو پچھاننے لگا تھا۔ دس دفعہ گھوڑے کے دانت گنے۔ کیا؟ تم ایک دفعہ اس کے لیے نان خطائی بھی لائے تم نے ہم کو یہاں تلک بولا کہ گھوڑا نو ہاتھ لمبا ہے۔ اس سمے تمہیں یہ نو گزا

---

[1] ۱۹۸۵ء میں سترہ ارب روپے کو حکومت نے بیک لغزشِ قلم بلیک سے وہائٹ کر دیا۔ اس امید میں کہ اب لوگ بلیک کرنا چھوڑ دیں گے، جب کہ کالا دھن اس اساطیری ہزار سر والے اژدھے کی طرح ہے جس کا ایک سر کاٹیں تو اس کی جگہ سو نئے سَر نکل آتے ہیں۔

دکھلائی پڑتا تھا۔ آج چار پانچ دن بعد گھوڑے کے گاگلز خود پہن کے بہتان طوفان لگانے آئے ہو۔ کیا؟ تین دن میں تو قبر میں مردے کا بھی حساب کتاب بروبر خلاص ہو جاتا ہے۔ اس ٹیم تم کو مال میں یہ ڈیفکٹ دکھلائی نئیں پڑا۔ تانگے میں جوت کر غریب خانے لے گئے تب بھی نجر نئیں آیا"۔ بشارت سیٹھ کے سامنے اپنے گھر کو اتنی دفعہ غریب خانہ کہہ چکے تھے کہ وہ یہ سمجھا کہ یہ ان کے گھر کا نام ہے۔

بشارت نے کچھ کہنا چاہا تو قطع کلام کرتے ہوئے بولا "ارے بابا! گھوڑے کا کوئی پارٹ کوئی پُرزہ ایسا نہیں جس پہ تم نے دس دس دفعہ ہاتھ نئیں پھیرا ہو۔ کیا؟ تم بزنس مین ہو کے ایسا کچی بات منہ سے نکالیں گا تو ہم کدھر کو جائیں گا؟ بولو نی! ہلکٹ مانس (گھٹیا آدمی) کے موافق بات نئیں کرو۔ کیا؟ سیٹھ بری الذمہ ہو گیا۔

بشارت نے زچ ہو کر کہا "حد تو یہ کہ سودا کرنے سے پہلے یہ بھی نہ بتایا کہ گھوڑا جنازہ الٹ چکا ہے۔ آپ خود کو مسلمان اور پاکستانی کہتے ہیں" !

(سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) "تو کیا تم کو بدھسٹ دکھلائی پڑتا ہوں ؟ ہم نے جوناگڑھ کاٹھیاواڑ سے مائی گریٹ کیا ہے۔ کیا؟ اپنے پاس بروبر سندھ کا ڈومیسائل ہے۔ مہاتما بدھ تو بہاری تھا! (اپنے منہ میں پان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

میرے منہ میں رزق ہے۔ تم بھی بچوں کی قسم کھا کر بولو۔ جب تم نے پوچھا گھوڑا کائے کو بیچ رہے ہو، ہم نے بھی پھی الپھور (فی الفور) بول دیا۔ سودا پکا کرنے سے پہلے پوچھتے تو ہم پہلے بول دیتے۔ تم لکڑی بیچتے ہو۔ تو کیا گراہک کو لکڑی کی ہر گانٹھ، ہر داغ پر انگلی رکھ رکھ کے بتاتے ہو کہ پہلے اسے دیکھو؟ ہم سالا اپنا بنج بیوپار کرے کہ تمھارے کو گھوڑے کی بیا گرا پھی (بایو گرافی) بتائے۔ فادر میرے کو ہمیش بولتا تھا کہ گراہک ۴۲۰ ہو تو پہلے دیکھو بھالو۔ پھر سودے کے ٹیم بولو کم تولو زیادہ۔ پر تمھارے اوپر تو کھولو، ابھی کھولو! کی دھن سوار تھی۔ تمھارے منہ میں پیسے بج رہے تھے۔ گجراتی میں کہاوت ہے کہ پیسا تو شیرنی کا دودھ ہے! اسے حاصل کرنا اور ہجم کرنا دونوں بروبر مسکل ہیں۔ پر تم تو سالا شیر کو ہی دوہنا مانگتا ہے۔ ہم کروڑوں کا بزنس کریلا ہے۔ آج تلک زبان دے کر نئیں پھریلا۔ اچھا! تم قرآن اٹھا کے بول دو کہ تم گھوڑا خریدتے ٹیم پئے لا (پیئے ہوئے) تھا تو ہم فوراً ایک ایک پائی ریپھنڈ (رفنڈ) کر دیں گا"۔

بشارت نے گڑگڑاتے ہوئے درخواست کی "سیٹھ، سو ڈیڑھ سو کم میں گھوڑا واپس لے لو۔ میں عیال دار آدمی ہوں۔ تاعمر احسان مند رہوں گا"۔

سیٹھ آپے سے باہر ہو گیا"۔ ارے بابا خچر کے موافق ہم سے اڑی نئیں کرو۔ ہم سے ایک دم کڑک اُردُو میں ڈائیلاگ مت بولو۔ تم پھلم کے ولین کے موافق گاگلز لگا کے ادھر کائے کو تڑی دیتا پڑا ہے۔ بھائی صاحب! تم پرھیلا مانس ہو۔ کوئی پھَڈے باز موالی، ملباری نئیں جو شریپھوں سے دادا گیری کرے، تم نے سائن بورڈ نئیں پڑھا۔ بابا! یہ ری رولنگ مل ہے۔ اشٹیل ری رولنگ مل۔ ادھر گھوڑوں کا دھندا نئیں ہوتا۔ کیا؟ کل کو تم بولیں گا کہ تانگہ بھی واپس لے لو۔ ہم سالا اکھا (تمام) عمر ادھر بیٹھا گھوڑے تانگے کا دھندا کریں گا تو ہمارا فیملی پریوار کیا گھر میں بیٹھا قوالی کریں گا؟ بھائی صاحب! اپن کا گھر تو گھر ہستیوں کا گھر ہے۔ کسی بجرگ کا مزار نئیں کہ بائی لوگ گج گج بھر لمبے بال کھول کے دھمال ڈال دیں۔ دَھمادَھم مست کلندر" !

بشارت نے تانگا اسٹیل ری رولنگ مل کے باہر کھڑا کر دیا۔ اور خود ایک تھڑے پر پیر لٹکائے انتظار کرنے لگے کہ اندھیرا ذرا گہرا ہو جائے تو واپس جائیں تاکہ نو گھنٹے میں تیسری مرتبہ چالان نہ ہو۔ غصّے سے ابھی تک ان کے کان کی لَویں تپ رہی تھیں اور حلق میں کیکٹس اگ رہے تھے۔ بلبن گولڈ مہر کے پیڑ سے بندھا سر جھکائے کھڑا تھا۔ انھوں نے پان کی دکان سے ایک لیمونڈ کی گولی والی بوتل خریدی۔ اور ایک ہی گھونٹ میں انھیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے انتظار میں یہ

بوتل کئی مہینوں سے دھوپ میں تپ رہی تھی۔ پھر یک لخت یاد آیا کہ اس افراتفری میں آج دوپہر بلبن کو چارہ اور پانی بھی نہیں ملا۔ انھوں نے بوتل ریت پر انڈیل دی اور گاگلز بھی اتار دیے۔

"باوجود دھر لیا"

تانگا لشتم پشتم چلتا رہا۔ رحیم بخش اس کے بعد تین چار دفعہ اور دھر لیا گیا۔ لیکن بات سات آٹھ روپے پر ٹل گئی۔ دس پندرہ دن کا بھلاوہ دے کر ایک دن پھر چابک بلند کیے آیا۔ کہنے لگا "سرکار! باوجود دھر لیا۔ ہر چند کہ آج میرے پاس نانواں (روپیہ) نہیں تھا، مگر بہت منہ پھاڑ رہا ہے۔ پچیس مانگتا ہے۔ چنانچہ تانگا اس کے پاس گروی رکھ کے آ رہا ہوں۔ اگرچہ بچّے تانگے میں بمعہ گھوڑے کے ہیں۔ آپ ہر دفعہ سمجھتے ہیں کہ رحیم بخش ڈریامہ کھیل رہا ہے۔ چنانچہ خود چل کے چھڑا لیجیے۔ اگرچہ زحمت۔۔۔"۔ بشارت اس وقت اکڑوں بیٹھے ایک دغیلے تختے کی گرہ کا معائنہ کر رہے تھے۔ یک لخت بھڑک کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور تو کسی پر بس چلا نہیں، بری خبر لانے والے کے ہاتھ سے چابک چھین کر اسے تڑ سے زمین پر مارتے ہوئے کہنے لگے "ہر چند کے بچّے! اگر تو نے آئندہ

میرے سامنے باوجود، اگرچہ اور چنانچہ کیا تو اسی چابک سے چمڑی ادھیڑ دوں گا"۔

دورانِ سرزنش رحیم بخش نے یکایک اپنا بایاں کان ہلایا تو بشارت کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ غصے کو لاحول اور ایک گلاس پانی سے بجھا کر، چابک ہاتھ میں لیے وہ رحیم بخش کے ساتھ ہو لیے کہ آج جھوٹے کو گھر تک پہنچا کر دم لیں گے۔ جائے واردات پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک "بے رحمی والا" سچ مچ گھوڑے کی راس تھامے کھڑا ہے۔ بچّے گلے میں تھرمس اور بستے لٹکائے، دھوپ میں سہمے کھڑے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان کے خون کی کھولن یکبارگی نقطہ انجماد پر اتر آئی۔ گلے میں اون کا گولا سا اٹکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ چابک کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے"۔ بے رحمی والے" کو علیحدہ لے جا کر انھوں نے رحم کی اپیل کی اور اپنے مخصوص دکاندارانہ انداز میں اس پہلو پر بھی توجہ دلائی کہ ہم تو آپ کے 'مستقل کلائنٹ' ہیں۔ اٹھاؤ چولھا پاوندے نہیں کہ آج ہیں، کل نہیں۔ اس نے بیس روپے کا ڈسکاؤنٹ دے کر صرف پانچ روپے میں معاملہ رفع دفع کر دیا۔

اسی اثنا میں "بے رحمی کا ہفتہ" جو اکیس دن تک منایا گیا، شروع ہو گیا۔ جب تک وہ بلا خیر و خوبی ختم نہ ہو گیا، گھوڑا، سلوتری اور رحیم بخش تینوں بالترتیب بندھے،

کھڑے اور چھٹے کھاتے رہے۔ رحیم بخش کو گھوڑے کے ساتھ بریکٹ کرنا یوں بھی ضروری ہو کہ اس کی خوراک گھوڑے سے کسی طرح کم نہ تھی۔

گھوڑے کو تو خیر تیسرے چوتھے بدہضمی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن رحیم بخش کا نظام ہضم نہ صرف ہر قسم کے بیکٹیریا سے بلکہ مقدار سے بھی immune ہو گیا تھا۔ نئےpet ، نئی نویلی دلہن اور لاڈلے بچّے کے ساتھ شفقت کا اظہار کرنے کا ہمارے ہاں لے دے کے ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ہر شخص انھیں کچھ نہ کچھ کھلا کر اوور فیڈ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ گھوڑے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نتیجتاً اسے بار بار رچمنڈ کرافورڈ ہاسپٹل (جانوروں کا اسپتال) بھیجنا پڑتا۔ بشارت کا بیان ہے کہ ایک دن شام کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ رحیم بخش گھوڑے کے جلاب کا سارا پاؤڈر پھنکے مار کر کھا گیا۔

"ہفتہ" ختم ہوتے ہی بچّوں کو پھر تانگے پر بھیجنا شروع کر دیا۔ ان کی اپنی دکان زیادہ دور نہیں تھی، لہٰذا پیدل ہی چلے جاتے تھے۔ تین ہفتے خیریت سے گزرے۔ مطلب یہ کہ گھوڑے کا لنگ بڑھ گیا، مگر چالانوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ چوتھا ہفتہ شروع ہی ہوا تھا کہ رحیم بخش چابک کا عَلَم اُٹھائے، آہ و بُکا کرتا، بائیں ٹانگ سے لنگڑاتا آیا۔ گھوڑے کے دیکھا دیکھی اب وہ بھی بائیں ٹانگ سے

لنگڑانے لگا تھا۔ کہنے لگا "سرکار! آج پھر دھر لیا! آگاہ کیے بغیر ناگاہ دھر لیا! چناں چہ بیس روپے بھر کے آ رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے بہتیرے ٹھڈی میں ہاتھ دیے"۔ بشارت نے بادل نخواستہ بیس روپے اس کے منہ پر مارے۔ اب جو تابڑ توڑ چالان ہونے شروع ہوئے تو چوٹ سہلانے تک کی مہلت نہیں ملی۔ انھوں نے رحیم بخش کو سختی سے ہدایت کی کہ چھپ چھپا کر راستے بدل بدل کر، گلیوں گلیوں جایا کرے۔ اس وضع احتیاط میں اس نے اپنی طرف سے یہ اضافہ اور کر لیا کہ خود بھی چھپ کر یعنی سر سے پیر تک ایک لال کھیس اوڑھ کے تانگا چلانے لگا۔ گھونگھٹ میں سے صرف اس کا سگریٹ باہر نکلا رہتا تھا۔ لیکن اس سے واقعی بڑا فرق پڑا۔ وہ اس طرح کہ انسپکٹر اب گھوڑے کو پہچانے بغیر ہی، دور سے صرف لال کھیس دیکھ کر چالان کر دیتا تھا۔

بزرگوار کی حکمتِ عملیات

رشوت اور مالش کی مجموعی رقم اب گھوڑے کی قیمت اور ان کی قوتِ برداشت سے تجاوز کر چکی تھی۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ عاجز آ کر انھوں نے رحیم بخش کی زبانی انسپکٹر کو یہ تک کہلایا کہ تم میری دکان پر

اُگاہی کے کام پر ملازم ہو جاؤ۔ موجودہ تنخواہ سے زیادہ دوں گا۔ اس نے کہلا بھیجا"سیٹھ کو سلام بولنا اور کہنا کہ ہم تین ہیں"۔

انھوں نے گھوڑا تانگا بیچنا چاہا تو کسی نے سو روپے بھی نہ لگائے۔ بالآخر اس پریشانی کا ذکر اپنے والدِ بزرگوار سے کیا۔ انھوں نے سارا احوال سن کر فرمایا"اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم دعا کریں گے۔ تانگے میں جوتنے سے پہلے ایک گلاس دَم کیا ہوا دودھ پلا دیا کرو۔ اللہ نے چاہا تو لنگ جاتا رہے گا اور چالانوں کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ ایک دفعہ وظیفے کا اثر تو دیکھو"۔

بزرگوار نے اسی وقت رحیم بخش سے بستر پر ہارمونیم منگوایا۔ وہ دھونکنی سے ہوا بھرتا رہا اور بزرگوار کانپتی، کپکپاتی آواز میں حمد گانے لگے۔

ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا،

تری شان جل جلالہ،

تری شان جل جلالہ

آنکھ جہاں پڑتی وہاں انگلی نہیں پڑ رہی تھی۔ اور جس پردے پر انگلی پڑتی، اس پر پڑی ہی رہ جاتی۔ ایک مصرع گانے اور بجانے کے بعد یہ کہہ کر لیٹ گئے کہ اس

ہارمونیم کے کالے پردوں کے جوڑ جکڑ گئے ہیں۔ ماسٹر باقر علی نے خاک مرمّت کی ہے۔

دوسرے دن بزرگوار کی چارپائی ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اس لیے کہ یہی ایک ایسا کمرہ تھا جہاں گھوڑا علی الصبح اپنے ماتھے پر اللہ لکھوانے اور دَم کروانے کے لیے اندر لایا جاسکتا تھا۔ صبح تڑکے بزرگوار نے دو نفلوں کے بعد عرقِ گلاب میں انگلی ڈبو کر گھوڑے کی پیشانی پر اللہ لکھا اور سُموں کو لوبان کی دھونی دی۔ کچھ دیر بعد اس پر ساز کسا جانے لگا تو بشارت دوڑے دوڑے بزرگوار کے پاس آئے اور کہنے لگے گھوڑا دَم کا دودھ نہیں پی رہا۔ بزرگوار متوجہ ہوئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں بعد انھیں نیم وا کر کے فرمایا، کوئی مضائقہ نہیں۔ کوچوان کو پلا دو۔ گھوڑا وجع الاسنان[1] میں مبتلا ہے۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ دَم کا دودھ رحیم بخش نوشِ جان کرنے لگا۔ بظاہر ایسی کراہت سے پیتا جیسے اس زمانے میں یونانی دواؤں کے قدحے پیے جاتے تھے۔ یعنی ناک پکڑ کے منہ بنا بنا کے۔ اللہ شافی! اللہ شافی! (نعوذ باللہ) کہتا جاتا۔ دودھ کے لیے نہ جانے کہاں سے دھات کا بہت لمبا گلاس لے آیا جو اس کی ناف تک پہنچتا تھا۔

---

[1] وجع الاسنان: دانتوں کے درد کو کہتے ہیں۔ جس شخص کے دانتوں میں درد ہو وہ اس کا تلفظ بھی نہیں کر سکتا۔

بزرگوار کی عملیاتی تدابیر کا اثر پہلے دن ظاہر ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اس دن چالان ایک داڑھی والے نے کیا! رحیم بخش اپنا لہراتا ہوا چابک ہاف ماسٹ کر کے کہنے لگا "سرکار! باوجود دھر لیا" پھر اس نے قدرے تفصیل سے بتایا کہ ایک داڑھی والا آج ہی جمشید روڈ کے حلقے سے تبدیل ہو کے آیا ہے۔ بڑا ہی رحم دل اور اللہ والا آدمی ہے۔ چناں چہ صرف ساڑھے تین روپے لیے۔ وہ بھی بطور چند ا۔ پڑوس میں ایک بیوہ کے بچّے کے علاج کے لیے۔ آپ چاہیں تو چل کر ملاقات کر لیں مل کر بہت خوش ہوں گے۔ ہر وقت منہ ہی منہ میں وظیفہ پڑھتا رہتا ہے۔ اندھیری رات میں سجدے کے گٹے سے ایسی روشنی نکلتی ہے کہ سوئی پرو لو۔ (اپنے بازو سے تعویذ کھولتے ہوئے) گھوڑے کے لیے یہ تعویذ دیا ہے۔

کہاں پچیس روپے، کہاں ساڑھے تین روپے! بزرگوار نے رشوت میں کمی کو اپنے وظیفے اور کشف و کرامات پر محمول کیا۔ اور فرمایا کہ تم دیکھتے جاؤ۔ انشاءاللہ چالیسویں دن "بے رحمی " کے انسپکٹر کو گھوڑے کی ٹانگ نظر آنی بند ہو جائے گی۔ بزرگوار کی چارپائی کے گرد اُن کا سازو سامان بھی ڈرائنگ روم میں قرینے سے سجا دیا گیا۔ دوائیں، بیڈ پین، حقہ، سلفچی، ہارمونیم، آغا حشر کے ڈرامے، مولانا آزاد کے "الہلال" کے مجلد فائل، انیما کے آلات اور کجن ایکٹرس کی تصویر۔ ڈرائنگ روم اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس میں گھوڑے اور بزرگوار اور ہر دو

کا فضلہ اٹھانے والی مہترانی کے علاوہ کوئی اور پانچ منٹ بھی ٹھیر سکے۔ بشارت کے دوستوں نے آنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ گھوڑے کی خاطر بزر گوار کو برداشت کر رہے تھے۔

ایک گھوڑا بھرے گا کتنے پیٹ؟

جس دن سے داڑھی والے مولانا تعینات ہوئے، رحیم بخش ہر چوتھے پانچویں دن آ کے سر پر کھڑا ہو جاتا "چندہ دیجیے"۔ لیکن ڈھائی تین روپے زیادہ سے زیادہ پانچ روپے میں آئی بلا ٹل جاتی۔ اس سے جرح کی تو معلوم ہوا کہ کراچی میں تانگے اب صرف اسی علاقے میں چلتے ہیں۔ تانگے والوں کا حال گھوڑوں سے بھی خستہ ہے۔ انھوں نے پولیس اور "بے رحمی والوں" کا برائے نام ماہانہ باندھ رکھا ہے جو اُن کی گزر بسر کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ ادھر ننگے بھوکے گدھا گاڑی والے مکرانی سر پھاڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ زخمی گدھا، پسینے میں شرابور گدھا گاڑی والا اور پھٹے حالوں "بے رحمی" کا انسپکٹر ۔۔۔۔۔۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں کون زیادہ خستہ اور مظلوم ہے۔ یہ تو ایسا ہی تھا کہ جیسے ایک سُوکھی بھُوکی جونک دوسری سُوکھی بھُوکی جونک کا خون پینا چاہے۔ نتیجہ یہ کہ "بے رحمی والے" پوپھٹے ہی اکلوتی موٹی اسامی یعنی ان کے تانگے کے انتظار میں گلی کی نکڑ پر

کھڑے ہو جاتے اور اپنے پیسے کھرے کر کے چل دیتے۔ اکیلا گھوڑا سارے عملے کے بال بچّوں کے پیٹ پال رہا تھا۔ لیکن کرامت حسین (داڑھی والے مولانا کا یہی نام تھا) کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ اپنے حلیے اور پھٹے حالوں سے اتنے مسکین لگتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا گویا انھیں رشوت دینا کارِ ثواب ہے۔ اور وہ رشوت لے کر در حقیقت رشوت دینے والے کو داخلِ حسنات کر رہے ہیں۔ وہ رشوت مانگتے بھی خیرات ہی کی طرح تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا سارا رزق اس گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ کے توسّل سے نازل ہوتا ہے۔ ایسے پھٹیچر رشوت لینے والے کے لیے ان کے دل میں نہ کوئی ہمدردی تھی نہ خوف۔

کتّوں کے چال چلن کی چوکیداری

احباب نے مشورہ دیا کہ گھوڑے کو رچمنڈ کرافورڈ ہاسپٹل میں انجکشن سے ٹھکانے لگوا دو۔ لیکن ان کا دل نہیں مانتا تھا۔ بزرگوار تو سنتے ہی روہانسے ہو گئے۔ کہنے لگے آج لنگڑے گھوڑے کی باری ہے، کل اپاہج باپ کی ہو گی۔ شریف گھرانوں میں آئی ہوئی دلہن اور جانور تو مر کر ہی نکلتے ہیں۔ وہ خود تین دلہنوں کے جنازے نکال چکے تھے، اس لیے گھوڑے کے بارے میں بھی ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ رحیم بخش بھی گھوڑے کو ہلاک کرانے کے سخت خلاف تھا۔ جیسے ہی

ذکر آتا، اپنے تیس سالہ تجربات بیان کرنے بیٹھ جاتا۔ یہ تو ہم نے بھی سنا تھا تاریخ در حقیقت بڑے لوگوں کی بایوگرافی ہے۔ لیکن رحیم بخش کوچوان کی ساری آٹو بایوگرافی دراصل گھوڑوں کی بایوگرافی تھی۔ اس کی زندگی سے ایک گھوڑا نکل نہیں پاتا تھا کہ دوسرا داخل ہو جاتا۔ کہتا تھا اس کے تین سابق آقاؤں نے "ویٹ" سے گھوڑوں کو زہر کے انجکشن لگوائے تھے۔ پہلا آقا تین دن کے اندر چٹ پٹ ہو گیا۔ دوسرے کا چہرہ لقوے سے ایسا ٹیڑھا ہوا کہ دائیں باچھ کان کی لو سے جا ملی۔ ایک دن غلطی سے آئینے میں خود پر نظر پڑ گئی تو گھگھّی بندھ گئی۔ تیسرے کی بیوی جاکی کے ساتھ بھاگ گئی۔ دیدہ عبرت نگاہ سے دیکھا جائے تو ان تینوں میں جو فوراً مر گیا، اسی کا انجام نسبتاً باعزّت معلوم ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک سائیس خبر لایا کہ لاڑکانہ میں ایک گھوڑی تیلیا کمیت بالکل مفت یعنی تین سو روپے میں مل رہی ہے۔ بس وڈیرے کے دل سے اُتر گئی ہے۔ گنے کی فصل کی آمدنی سے اس نے گنے ہی سے لمبائی ناپ کر ایک امریکی کار خرید لی ہے۔ آپ کی صورت پسند آ جائے تو ممکن ہے مفت ہی دے دے۔ اس کی مخالفت پہلے ہم نے اور بعد میں بزرگوار نے کی۔ ہمیں ان دنوں کتّے پالنے کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ ہر بات انھی کے حوالے سے کرتے تھے۔ کتّے کے لیے من حیث الجنس ہمارے دل میں دفعتاً اتنا احترام پیدا ہو گیا تھا کہ کتیا کو مادہ کتا کہنے لگے

تھے۔ ہم نے بشارت کو سمجھایا کہ خدارا! مادہ گھوڑا نہ خریدو۔ عامل کالونی میں دستگیر صاحب نے ایک مادہ کتّا پال لیا ہے۔ کسی خیر خواہ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ جس گھر میں کتّے ہوں، وہاں فرشتے، بزرگ اور چور نہیں آتے۔ اس ظالم نے یہ نہ بتایا کہ پھر صرف کتّے آتے ہیں۔ اب سارے شہر کے بالغ کتّے ان کی کوٹھی کا محاصرہ کیے پڑے رہتے ہیں۔ عفیفہ خود غنیم سے ملی ہوئی ہے۔ ایسی تن داتا نہیں دیکھی۔ جو بوائے اسکاؤٹ کا ماٹو ہے وہی اس کا:،Be prepared۔ مطلب یہ کہ ہر حملہ آور سے تعاون کے لیے ہمہ تن تیار رہتی ہے۔ پھاٹک کھولنا ناممکن ہو گیا ہے۔ خواتین نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ مرد اسٹول رکھ کر پھاٹک اور کتّے پھلانگتے ہیں۔ دستگیر صاحب ان کتّوں کو دونوں وقت باقاعدگی سے راتب ڈلواتے ہیں تاکہ آنے جانے والوں کی پنڈلیوں کے بوٹوں سے اپنا پیٹ نہ بھریں۔ ایک دفعہ راتب میں زہر ڈلوا کر بھی دیکھ لیا۔ گلی میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اپنے خرچ پر ان کی تدفین کروائی۔ ایک صاحب کا پالتو کتّا جو صحبت بد میں پڑ گیا تھا، اس رات گھر والوں کی نظر بچا کر تماش بینی کرنے آیا۔ وہ بھی وہیں کھیت رہا۔ ان جید کتّوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوا وہ اسی طرح پر ہوا، جس طرح ادب اور سیاست میں پُر ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ نئی نسل کے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر اس تیزی سے پُر کی کہ خلا بالکل ناکافی ثابت ہوا۔ ہم تو اتنا جانتے

ہیں کہ خود کو indispensable یعنی بے مثل و بے بدل سمجھنے والوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ در حقیقت صرف دو گز زمین میں ہوتا ہے جو انھیں کے جسدِ خاکی سے اسی وقت پُر ہو جاتا ہے۔ خیر یہ علیحدہ قصّہ ہے۔ کہنا یہ تھا کہ اب دستگیر صاحب سخت پریشان ہیں"۔ پیڈ گ ری" (خاندانی) مادہ پنچ ذات کے کتّوں سے شجرہ بگڑنے کا خدشہ ہے۔ میں نے تو دستگیر صاحب سے کہا تھا کہ ان کی توجہات divert کرنے کے لیے کوئی معمولی ذات کی کتیا رکھ لیجیے تا کہ کم از کم یہ دھڑ کا تو نہ رہے۔ راتوں کی نیند تو حرام نہ ہو۔ تاریخ میں آپ پہلے آدمی ہیں جس نے کتّوں کے چال چلن کی چوکیداری کا بیڑا اٹھایا ہے۔

مونسِ تنہائی

اس قصّے سے ہم نے انہیں عبرت دلائی۔ بزرگوار نے دوسرے پینترے سے گھوڑی خریدنے کی مخالفت کی۔ وہ اس پر بہت برافروختہ ہوئے کہ بشارت کو ان کے کراماتی وظیفے پر یقین نہیں۔ وہ خاصے گلیر تھے۔ بیٹے کو کھل کر گالی تو نہیں دی۔ بس اتنا کہا کہ اگر تمھیں اپنی نسل چلانے کے لیے پیڈ گری گھوڑی ہی رکھنی ہے تو شوق سے رکھو۔ مگر میں ایسے گھر میں منٹ نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ جہاں بلبن گھوڑا جائے گا وہ بھی جائیں گے۔ قصّہ دراصل یہ تھا

کہ بزرگوار اور گھوڑا ایک دوسرے سے اس درجہ مانوس ہو چکے تھے کہ اگر گھر والے مانع نہ ہوتے تو وہ اسے ڈرائنگ روم میں اپنی چارپائی کے پائے سے باندھوا کر سوتے۔ وہ بھی ان کے قریب آکر خود بخود سر نیچے کر لیتا تاکہ وہ اسے بیٹھے بیٹھے پیار کر سکیں۔ وہ گھنٹوں منہ سے منہ بھڑائے اس سے گھر والوں اور بہوؤں کی شکائتیں اور برائیاں کرتے رہتے۔ بچوں کے لیے وہ زندہ کھلونا تھا۔ بزرگوار کہتے تھے جب سے یہ آیا ہے میرے ہاتھ کا رعشہ کم ہو گیا ہے اور بُرے خواب آنے بند ہو گئے۔ وہ اب اسے بیٹا کہنے لگے تھے۔ سدا روگی سے اپنے پرائے سب اکتا جاتے ہیں۔ ایک دن وہ چار پانچ گھنٹے درد سے کراہتے رہے۔ کسی نے خبر نہ لی۔ شام کو اختلاج اور مایوسی زیادہ بڑھی تو خانساماں سے کہا کہ بلبن بیٹے کو بلاؤ۔ بڑھاپے اور بیماری کے بھیانک سناٹے میں یہ دکھی گھوڑا ان کا واحد ساتھی تھا۔

اک لقمہ تر کی صورت

گھوڑے کو جوت نہیں سکتے۔ بیچ نہیں سکتے۔ ہلاک نہیں کروا سکتے۔ کھڑے کھلا نہیں سکتے۔ پھر کیں تو کیا کریں۔ جب بلیک موڈ آتا تو اندر ہی اندر کھولتے اور اکثر سوچتے کہ سیٹھ، سرمایہ دار، وڈیرے، جاگیر دار اور بڑے افسران اور کرپشن کے لیے زمانے بھر میں بدنام ہیں۔ مگر ”بے رحمی والے“ دو ٹکے کے

آدمی کس سے کم ہیں۔ انھیں اس سے پہلے ایسے رجعتی اور غیر انقلابی خیال کبھی نہیں آئے تھے۔ ان کی سوچ میں ایک مردم گزیدہ کی کلبیت اور جھنجھلاہٹ در آئی۔ یہ لگ تو غریب ہیں۔ مظلوم ہیں۔ مگر یہ کس کو بخشتے ہیں؟ سنتری بادشاہ بھی تو غریب ہے۔ وہ ریڑھی والے کو کب بخشتا ہے؟ اور غریب ریڑھی والے نے کل شام آنکھ بچا کر ایک سیر سیبوں میں دو داغ دار سیب ملا کر تول دیے۔ اس کی ترازو صرف ایک چھٹانک کم تولتی ہے۔ صرف ایک چھٹانک اس لیے کہ ایک من کم تولنے کی گنجائش نہیں۔ اسکول ماسٹر لائقِ صد رحم و احترام ہے۔ ماسٹر نجم الدین برسوں سے چیتھڑے لٹکائے ظالم سماج کو کوستے پھرتے ہیں۔ انھیں ساڑھے چار سو روپے کھلائے جب جا کے بھانجے کے میٹرک کے نمبر بڑھے۔ اور رحیم بخش کوچوان سے زیادہ مسکین کون ہو گا؟ ظلم، ظالم اور مظلوم دونوں کو خراب کرتا ہے۔ ظلم کا پہیہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اژدھا سالم نگلتا ہے۔ شارک دانتوں سے خونم خوں کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اچھی طرح چبا چبا کے کھاتا ہے۔ بلی، چھپکلی، مکڑی اور مچھر سب حسبِ مقدور و مقدار خون کی چسکی لگاتے ہیں۔ بھائی میرے! بخشتا کوئی نہیں۔ وہ یہاں تک پہنچے تھے کہ معاً انھیں اپنے انکم ٹیکس کے ڈبل بہی

کھاتے یاد آ گئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔ بھائی میرے! بخشتا کوئی نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا ازوقہ ہیں۔ بڑے جتن سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔

تب نظر آتی ہے اک لقمہ تر کی صورت

سطحِ سمندر اور خطِ ناداری سے نیچے

آئے دن کے چالان تاوان سے وہ عاجز آ چکے تھے۔ کیسا اندھیر ہے۔ سارے پاکستان میں یہی ایک جرم رہ گیا ہے! بہت ہو چکی۔ اب وہ اس کا دوٹوک فیصلہ کر کے چھوڑیں گے۔ مولانا کرامت حسین سے وہ ایک دفعہ مل چکے تھے اور ساری دحشت نکل چکی تھی۔ پون انچ کم پانچ فٹ کا پودنا! اس کی گردن ان کی کلائی کے برابر تھی۔ گول چہرے اور تنگ پیشانی پر چیچک کے داغ ایسے چمکتے تھے جیسے تانبے کے برتن پر ٹھنکے ہوئے کھپرے۔ آج وہ گھر کا پتہ معلوم کر کے اس کی خبر لینے جا رہے تھے۔ پورا ڈائیلاگ ہاتھ کے اشاروں اور آواز کے زیر و بم سمیت تیار تھا۔ آج اس کا داڑھا پکڑ کے پوچھوں گا کہ ماتھے پہ یہ ادھورے سدھورے گٹّے کا ٹریڈ مارک لگائے پھرتے ہو۔ ایک دفعہ پیسا آگ پر دہکا کر اچھی طرح

دغوا کیوں نہیں لیتے کہ پانچ وقت ٹکریں مارنے کے جھنجھٹ سے نجات ملے۔ داڑھی پر انھیں کسی دل جلے کی پھبتی بھی یاد آئی"۔ قصرِ تقدس کا چھجا!" ان کے طنز کا سارا زور نماز پڑھنے اور داڑھی رکھنے پر تھا، گویا اصل گناہ وہی ہے! "سمجھتے کیا ہو؟ تم جیسے چپڑ قنات تو اپنے نیفے میں رکھتا ہوں۔ حلوہ پلاؤ کھا کھا کے تم مُلاّں لوگ ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اللہ کی رسی کو پکڑ رہے ہو! تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! میں بھی اپنی پہ آ گیا تو پائی پائی آنتوں میں سے نکلوالوں گا"۔ ریہرسل اتنا مکمل تھا کہ ذہن میں یہ تک نوٹ کر لیا تھا کہ اللہ کی رسی کہنے سے پہلے دل میں نعوذ باللہ ضرور کہیں گے۔

انھیں لیاری میں مولانا کرامت حسین کی جھگّی تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوئی، حالانکہ بتانے والے نے بالکل صحیح پتہ بتایا تھا کہ جھگی بجلی کے کھمبے نمبر ۲۳ کے عقب میں کیچڑ کی دلدل کے اس پار ہے۔ تین سال سے کھمبے بجلی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ پتے میں اس کے بائیں طرف ایک گیابھن بھُوری بھینس بندھی ہوئی بتائی گئی تھی۔ سڑکیں نہ راستے۔ گلیاں نہ فٹ پاتھ۔ ایسی بستیوں میں گھروں کے نمبر یا بورڈ نہیں ہوتا۔ ہر گھر کا ایک انسانی چہرہ ہوتا ہے۔ اسی کے پتے سے گھر ملتا ہے۔ کھمبا تلاش کرتے کرتے انھیں اچانک ایک جھگی کے ٹاٹ کے پردے پر مولانا کا نام کرامت حسین سرخ روشنائی سے لکھا نظر آیا۔ بارش کے

ریلوں نے بدخط لکھائی کو خطِ غبار بنا دیا تھا۔ کراچی کا یہ سب سے پسماندہ علاقہ سطح سمندر اور خطِ ناداری (Poverty Line) سے گزوں نیچے تھا۔ سمندر کا حصہ ہوتے ہوتے اس لیے رہ گیا تھا کہ درمیان میں انسانی جسموں کا ایک ڈھیٹ پشتہ کھڑا ہو گیا تھا۔ زمین سے ہر وقت کھاری پانی رِستا رہتا تھا جو لکڑی اور لوہے کو چند مہینوں میں گلا دیتا تھا۔ ہوا میں رُکے ہوئے سمندری پانی کی سڑاند بسی ہوئی تھی جو سڑی ہوئی مچھلی کی بدبو سے بھی بدتر تھی۔ چاروں طرف ٹخنوں ٹخنوں بج بجاتا کیچڑ۔ خشک زمین کہیں نظر نہ آئی۔ چلنے کے لیے لوگوں نے پتھر اور اینٹیں ڈال کر پگ ڈنڈیاں بنالی تھیں۔ ایک نو دس سال کی بچی سر پر خود سے زیادہ بھاری گھڑا رکھے، اپنی گردن اور کمر کی جنبش سے پیروں کو ڈگمگاتے پتھروں پر اور گھڑے کو سر پر بیلنس کرتی آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے ریلے بہ رہے تھے۔ راستے میں جو بھی ملا اس نے بچی کو احتیاط سے چلنے کا مشورہ دیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانچ چھ اینٹوں کا ٹریفک آئی لینڈ آتا تھا، جہاں جانے والا آدمی کھڑے رہ کر آنے والے کو راستہ دیتا تھا۔ جھگیوں کے اندر بھی کچھ ایسا ہی نقشہ تھا۔ بچّے، بزرگ اور بیمار دن بھر اونچی اونچی کھاٹوں اور کھٹّوں پر ٹنگے رہتے۔ قرآن شریف، لپٹے ہوئے بستر، برتن بھانڈے، متروکہ جائداد کی دستاویزات، میٹرک کے سرٹیفکٹ بانس کے مچان پر۔۔۔۔ ترپال تلے۔۔ اور ترپال کے اوپر

مرغیاں۔ مولانا کرامت حسین نے جھگّی کے ایک کونے میں کھانا پکانے کے لیے ایک ٹیکری پر ایک چبوترہ بنا رکھا تھا۔ ایک کھاٹ کے پائے سے بکری بھی بندھی تھی۔ کچھ جھگّیوں کے سامنے بھینسیں کیچڑ میں دھنسی تھیں اور ان کی پیٹھ پر کیچڑ کا پلاسٹر پپڑا رہا تھا۔ یہ بھینسوں کی جنّت تھی۔ ان کا گوبر کوئی نہیں اٹھاتا تھا۔ اس لیے کہ اُپلے تھاپنے کے لیے کوئی دیوار یا خشک زمین نہ تھی۔ گوبر بھی انسانی فضلے کے ساتھ اس زمین میں متھ جاتا تھا۔ ان ہی جھگیوں میں ٹین کی چادر کے سلنڈر نما ڈبّے بھی نظر آئے جن میں دودھ بھر کے صدّر کی سفید ٹائلوں والی ڈیری کی دوکانوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ ایک لنگڑا کتا جھگی کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے اچانک خود کو جھڑ جھڑایا تو اس کے زخم پر بیٹھی ہوئی مکھیوں اور ادھ سوکھے کیچڑ کے چھرّے اُڑ اُڑ کر بشارت کی قمیض اور چہرے پر لگے۔ جن پڑھنے والوں نے اس زمانے کی بہار کالونی، چاکی واڑہ اور لیاری نہیں دیکھی وہ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ انسان ایسی گندی، اگھوری حالت میں نہ صرف زندہ رہ سکتا ہے بلکہ نئی زندگیوں کو جنم بھی دے سکتا ہے۔ ایسا تعفن، ایسی بھیانک غلاظت تو مشرقی پاکستان میں بھی نظر نہ آئی۔ وہاں انسان نہ سہی کم از کم نیچر تو مہربان تھی۔ دھوپ، پانی اور ہوا ہر ایک چیز کو پاک اور صاف کرتے رہتے تھے۔ چلچلاتی دھوپ، لال آندھیاں، بچّے کے آنسوؤں جیسی برسات، کفِ درکنار سیلاب،

سائیکلون۔۔۔ان سے زیادہ تیز و تند، ظالم اور بے خطا ڈس انفکٹنٹ اور کیا ہو گا۔ تاہم باریسال کے دو منظر نہیں بھولتے۔ لگتا ہے کسی نے ذہن پر تیزابی قلم سے کندہ کر دیے ہیں۔

سونار بنگلہ

۱۹۶۷ میں ہمیں کار اور "فیری" سے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ چھ سات سو میل کے سفر میں کوئی فرلانگ ایسا نہ تھا جس میں اوسطاً پانچ چھ آدمی سڑک پر پیدل چلتے نظر نہ آئے ہوں۔ اوسطاً بیس میں سے صرف ایک کے پیر میں چپل ہوں گے۔ نہ ہمیں کسی کے پورے تن پر کپڑا نظر آیا، سوائے میت کے! راستے میں تین جنازے ایسے دیکھے جن کے کفن کی چادر دو مختلف رنگ کی لنگیاں جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ ایک ضعیف شخص ایک جنازے پر پھٹی چھتری لگائے چل رہا تھا۔ یہ مرنے والے جوان کا باپ تھا۔ اس کی سفید داڑھی اور آنکھوں سے بارش کے ریلے بہہ رہے تھے۔ ہم باریسال سے گزر رہے تھے۔ بلا کی اُمس تھی۔ پیاس سے برا حال۔ پانی یا لیمنیڈ پینے کا سوال ہی نہ تھا، اس لیے کہ ان دنوں ہر جگہ ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ سڑکوں پر جنازے ہی جنازے نظر آ رہے تھے۔ ایک بے تکلف دوست نے ٹپ دیا تھا کہ راستے میں خودکشی کرنے کو جی

چاہے تو بازار سے کوئی بھی چیز لے کر کھا لینا۔ ناریل کے بارے میں البتہ ایک بنگالی دوست نے کم و بیش وہی بات کہی جو غالب آم کے بارے میں کہہ گئے ہیں :

انگبیں کے بحکم ربّ الناس

بھر کر بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

اس دوست نے کہا تھا کہ ناریل میں جراثیم کا گزر نہیں۔ پانی کے بجائے یہی توڑ توڑ کر پینا۔ السر کو بھی فائدہ کرتا ہے۔ ہم نے چھ چھ پیسے کے دو ناریل خریدے۔ ڈرائیور نے ناریل والے ہی سے مانگ کر پانی پیا اور اپنے حصے کا ناریل کار کے بوٹ میں سنگوا کر رکھ لیا۔ ہم نے ناریل وہیں توڑا۔ اندر کھوپرے کی بہت پتلی اور نرم تہ نکلی۔ ایسے ادھ کچرے ناریل کی ڈابھ بہت مفرّح، ملین اور شیریں ہوتی ہے۔ ڈابھ پی کر ناریل ہم نے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ پان والے سے "تھری کاسل" سگریٹ کی ڈبیا خریدی۔ سگریٹ نکالا تو بے حد پرانا اور سوکھا کھڑنک۔ کیڑے نے اس میں مہین مہین سوراخ کر دیے تھے جن کی وجہ سے کش میں جگہ جگہ سے پنکچر ہو جاتے تھے۔ ایسے سگریٹوں سے ہمارے یہاں ان گھروں میں تواضع کی جاتی ہے جہاں صاحبِ خانہ خود سگریٹ نہیں پیتا۔ اور عید الفطر پر

خریدے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ سے دوسرے عید الفطر تک بالاصرار اپنے
ملاقاتیوں کے حلق اور اخلاق کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے
تھے کہ وہ کون ساظالم کیڑا ہوگا جو تمباکو سے اپنا پیٹ بھر کر زندہ رہتا ہے۔ اس کا
توماءاللحم اور کشتہ بنا کر کینسر کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ اتنے میں ایک بوڑھی عورت
کوڑے کے ڈھیر کی طرف بڑھی۔ اس نے گھورے کی گہرائیوں میں سر نگیں
لگاتی ہوئی بلیوں اور آنول سے جڑی آلائش کو بھنبھوڑتے ہوئے کتے کو ڈھیلے مار
مار کر بھگا دیا۔ اس کے تن پر بغیر چولی کے لیر لیر ساری کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ قدم
جما جما کر گھورے پر چڑھی۔ جیسے ہی اس نے پیر سے آنول پرے ہٹایا ایک چیل
جھپٹا مار کر اسے لے گئی، مگر ابھی پوری طرح اٹھی بھی نہ تھی کہ پنجے سے چھوٹ
گیا۔ بڑھیا رسان سے ناریل اٹھالائی کہ اس کا کوئی اور دعوے دار نہ تھا۔ اس کے
ساتھ ایک منی سی بچی اور دو ننگ دھڑنگ لڑکے تھے جن کی یہ غالباً نانی یا دادی
ہو گی۔ وہ ناریل کا گودا کھرچ کھرچ کے بڑے ندیدے پن سے کھاتی رہی، یہاں
تک کہ چھوٹے لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اس نے دونوں
لڑکوں کو تھوڑا سا کھوپرا دیا۔ بچی اتنی چھوٹی تھی کہ بڑھیا نے کھوپرے کو پہلے خود
اپنے پوپلے منہ سے چبا چبا کر نرم کیا۔ پھر منہ سے منہ ملا کر اگال بچی کے منہ میں
ڈالا۔ جب وہ ناریل اٹھانے کے لیے گھورے پر جھکی تو اس کی ننگی چھاتیاں

بھلبھلائے بینگن کی مانند جھریائی ہوئی اور خالی اوجھڑی کی طرح جھول رہی تھیں۔ لگتا تھا کھمبیوں کی طرح یہ بھی اسی زمین سے اُگی ہیں۔ نہ تو دیکھنے والوں کو، نہ خود اس مائی کو اپنے ننگے ہونے کا احساس تھا، لیکن اس دن میں نے اپنے آپ کو بالکل ننگا محسوس کیا۔

دوسرا منظر ذرا آگے چل کر بازار میں دیکھا۔ بینک کے دفتر کے سامنے کوئی چار فٹ اونچے تھڑے پر ایک شخص مچھلی بیچ رہا تھا۔ اس کے بنیان میں بے شمار آنکھیں بنی تھیں۔ اس پر اور لنگی پر مچھلی کے خون اور آلائش کی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ ہاتھ بہت گندے ہو جاتے تو وہ انھیں لنگی پر رگڑ کر تازہ گندگی کو پرانی گندگی سے پونچھ لیتا تھا۔ جب تھوڑے تھوڑے وقفے سے مچھلیوں پر پانی کے چھپکے دینے سے مکھیوں کے چھتے اڑ جاتے تو نظر آتا کہ مچھلی کتنی چھوٹی اور کس ذات کی ہے۔ غلیظ پانی اور مچھلیوں کا کیچڑ ایک ٹین کی نالی سے ہوتا ہوا نیچے رکھے ہوئے کنستر میں جمع ہو رہا تھا۔ وہ بغدے سے کسی بڑی مچھلی کے ٹکڑے کر کے بیچتا تو اس کے کھپرے اور آلائش بھی اسی کنستر میں جاتی تھی۔ وہ جب بھر جاتا تو اسے ہٹا کر دوسرا کنستر رکھ دیا جاتا۔ بلیلاں بار بار پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو ہو کر منہ مارتیں اور چھیچھڑوں کو کنستر میں گرنے سے پہلے ہی بڑی تیزی سے اچک لیتیں۔ دیکھنے والے کو ہول آتا تھا کہ تیز چلتے ہوئے بغدے سے بلی کا سر کچ سے

اب اُڑا کہ اب اُڑا۔ کوئی جوان عورت مچھلی لینے آتی تو مچھلی والا ڈھال ڈھال کر بلی کو آرزو بھری گالیاں دینے لگتا۔ کوئی ایک گھنٹے میں اس نے دو بھرے ہوئے کنستر ایک ایک آنے میں بیچے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ غریب غربا اس پانی میں چاول پکاتے ہیں تاکہ چاولوں میں مچھراند (مچھلی کی باس) بس جائے۔ مچھلی کی بدبو کے اس ایسنس کے ایک کنستر سے تین گھروں میں ہنڈیا پکتی ہے۔ غریبوں میں جو لوگ نسبتاً آسودہ حال ہیں، وہی یہ لگژری افورڈ کر پاتے ہیں!

خاندانِ مغلیہ کا زوال و نزول

بشارت نے جھگی کے باہر کھڑے ہو کر مولانا کو آواز دی، حالانکہ اس کے "اندر" اور "باہر" میں کچھ ایسا فرق نہیں تھا۔ بس چٹائی، ٹاٹ اور بانسوں سے اندر کے کیچڑ اور باہر کے کیچڑ کے درمیان حد بندی کر کے ایک خیالی privacy (تخلیہ) اور ملکیت کا حصار کھینچ لیا تھا۔

یہ میری لحد، وہ تیری ہے

کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے حیدرآبادی انداز سے تالی بجائی، جس کے جواب میں اندر سے چھ بچّوں کا تلے اوپر پتیلیوں کا سا سیٹ نکل آیا، جن کی عمروں میں

بظاہر نو نو مہینے سے بھی کم فرق نظر آ رہا تھا۔ سب سے بڑے لڑکے نے کہا، مغرب کی نماز پڑھنے گئے ہیں، تشریف رکھیے۔ بشارت کی سمجھ میں نہ آیا کہاں تشریف رکھیں۔

ان کے پیر تلے اینٹیں ڈگمگا رہیں تھیں۔ تعفن سے دماغ پھٹا جارہا تھا۔

جہنم اگر رُوئے زمین پر کہیں ہو سکتا ہے تو

ہمیں است وہمین است وہمین است

وہ دل ہی دل میں مولانا کو ڈانٹنے کا ریہرسل کرتے ہوئے آئے تھے"۔ یہ کیا اندھیر ہے مولانا؟" کچکچا کر مولانا کہنے کے لیے انھوں نے بڑے طنز و تلخی سے وہ لہجہ کمپوز کیا تھا جو بہت سڑی گالی دیتے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن جھگی اور کیچڑ دیکھ کر انھیں اچانک خیال آیا کہ میری شکایت پر اس شخص کو بالفرض جیل ہو جائے تو اس کے تو الٹے عیش آ جائیں گے۔ مولانا پر پھینکنے کے لیے طعن و تشنیع کے جتنے پتھر وہ جمع کر کے لائے تھے، ان سب پر داڑھیاں لگا کر جانمازیں لپیٹ دی تھیں تا کہ چوٹ بھلے ہی نہ آئے، شرم تو آئے۔ وہ سب دھرے رہ گئے۔ ان کا ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ اس شخص کو گالی دینے کا فائدہ؟ اس کی زندگی تو خود ایک گالی ہے۔ ان کے گرد بچّوں نے شور مچانا شروع کیا تو سلسلہ ملامت ٹوٹا۔

انھوں نے ان کے نام پوچھنا شروع کیے۔ تیمور، بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب۔ یا اللہ پورا دودمانِ مغلیہ اس ٹپکتی جھگی میں تاریخی تسلسل سے ترتیب وار اترا ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے ناموں کا اسٹاک ختم ہو گیا، مگر اولادوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ چھُٹ بھیّوں پر اتر آئے تھے۔ مثلاً ایک لختِ جگر کا پیار کا نام (مرزا) کوکا تھا، جو اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا، جس کو اس نے قلعے کی فصیل پر سے نیچے پھنکوا دیا تھا۔ اگر حقیقی بھائی ہوتا تو اس سے بھی سخت سزا دیتا۔ یعنی قزاقوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے حج پر بھیج دیتا یا آنکھیں نکلوا دیتا۔ رحم کی اپیل کرتا تو ازراہ ترحمِ خسروانہ وشفقتِ برادرانہ جلاد سے ایک ہی وار میں سر قلم کروا کے اس کی مشکل آسان کر دیتا۔ جو شیر خوار اور گھٹنیوں چلتے بچّے اندر رہ گئے تھے ان کے ناموں سے بھی شکوہِ شاہانہ ٹپکتا اور تاج و تخت سے وابستگی کا نشان ملتا تھا، حالانکہ یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ ان میں سے کون تخت پر متمکن ہونے کے بعد قتل ہوا اور کون پہلے۔ بات یہ ہے کہ اورنگزیب کی وفات کے بعد انتزاع سلطنت اور طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ بارہ سال میں آٹھ بادشاہ اس طرح سریر آرائے سلطنت ہوئے کہ ایک بادشاہ ٹھیک سے تخت پر بیٹھ نہیں پاتا تھا کہ اس کا تختہ الٹ دیا جاتا۔ تاج اور سر ہوا میں بازیگر کی گیندوں

کی طرح اچھلنے لگے۔ ہر چند کہ اورنگزیب کو موسیقی سے نفرت تھی، لیکن اُس کی آنکھیں بند ہوتے ہی تخت و تاج کے دعوے داروں نے شاہی تخت کے گرد میوزیکل چیئرز کھیلنا شروع کر دیا۔ اس ادنیٰ تصرف کے ساتھ کہ میوزک کے بجائے شاعر لہک لہک کر قصیدے پڑھتے اور جب پڑھتے پڑھتے اچانک رک جاتے تو ایک نیا شہزادہ جھٹ سے تخت پر بیٹھ جاتا۔ نادر شاہ کو یہ مغلئی کھیل ایسا بھایا کہ تختِ طاؤس اٹھوا کے وطن لے گیا۔ اس کے باوجود کھیل جاری رہا۔ تخت اٹھوانے کے ضمن میں ہم نے نہ رہے بانس نہ بجے بانسری کا محاورہ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا۔ اس لیے کہ چین کی بانسری بجانے کے لیے بادشاہوں اور آمروں کو بانس کی محتاجی کبھی نہیں رہی۔ شاہوں کا نالہ پابندِ لے ہی نہیں، پابندِ نے بھی نہیں ہوتا۔

ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ خانوادہ تیمور کے جو باقی ماندہ چشم و چراغ جھگی کے اندر تھے ان کے نام بھی تخت نشینی بلکہ تخت الٹنے کی ترتیب کے اعتبار سے درست ہی ہوں گے، اس لیے کہ مولانا کا حافظہ اور تاریخ کا مطالعہ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ لائحہ حمل بناتے وقت انھوں نے خاندانی منصوبہ شکنی کو تاریخِ مغلیہ کے تقاضوں اور تخت نشینی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے تابع

رکھا ہے۔ بشارت نے پوچھا "تم میں سے کسی کا نام اکبر نہیں؟" بڑے لڑکے نے جواب دیا "نہیں جی۔۔ وہ تو دادا جان کا تخلص ہے"۔

گفتگو کا سلسلہ کچھ انہوں نے کچھ بچوں نے شروع کیا۔ انھوں نے دریافت کیا "تم کتنے بہن بھائی ہو؟" جواباً ایک بچّے نے ان سے پوچھا "آپ کے کتنے چچا ہیں؟" انھوں نے دریافت کیا "تم میں سے کوئی پڑھا ہوا بھی ہے؟" بڑے لڑکے تیمور نے ہاتھ اٹھا کر کہا "جی ہاں! میں ہوں" معلوم ہوا یہ لڑکا جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہو گی مسجد میں بغدادی قاعدہ پڑھ کر کبھی کا فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ تین سال تک پنکھے بنانے کی ایک فیکٹری میں مفت کام سیکھا۔ ایک سال ہوا دائیں ہاتھ کا انگوٹھا مشین میں آ گیا۔ کاٹنا پڑا۔ اب ایک مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا ہے۔ ہمایوں اپنے ہم نام کی طرح ہنوز خواری و آوارہ گردی کی منزل سے گزر رہا تھا۔ جہانگیر تک پہنچتے پہنچتے پاجامہ بھی طوائف الملوکی کی نظر ہو گیا۔ البتہ شاہ جہاں کا ستر پھوڑوں پھنسیوں پر بندھی ہوئی پٹیوں سے اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ اورنگ زیب کے تن پر صرف اپنے والد کی ترکی ٹوپی تھی۔ بشارت کو اس کی آنکھیں اور اسے بشارت نظر نہ آئے۔ سات سال کا تھا مگر بے حد باتونی۔ کہنے لگا "ایسی بارش تو میں نے ساری زندگی نہیں دیکھی"۔ ہاتھ پیر ماچس کی تیلیاں لیکن اس کے غبارے کی طرح پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا کہ کہیں

پھٹ نہ جائے۔ کچھ دیر بعد ننھی نور جہاں آئی۔ اس کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں میں کاجل اور کلائی پر نظر گزر کا ڈورا بندھا تھا۔ سارے منہ پر میل، کاجل، ناک اور گرد لپی ہوئی تھی، سوائے ان حصوں کے جو ابھی ابھی آنسوؤں سے دھلے تھے۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سنہری بالوں میں گیلی لکڑیوں کے کڑوے کڑوے دھویں کی بو بسی ہوئی تھی۔ ایک بھولی سی صورت کا لڑکا اپنا نام شاہ عالم بتا کر چل دیا۔ آدھے رستے سے واپس آکر کہنے لگا کہ میں بھول گیا تھا۔ شاہ عالم تو بڑے بھائی کا نام ہے۔ یہ سب مغل شہزادے کیچڑ میں ایسے مزے سے پھچاک پھچاک چل رہے تھے جیسے ان کا سلسلہ نصب امیر تیمور صاحبقران کے بجائے کسی راج ہنس سے ملتا ہو۔

ہر کونے کھدڑے سے بچّے ابلے پڑ رہے تھے۔ ایک کمانے والا اور یہ ٹبر! دماغ چکرانے لگا۔

عالم تمام حلقہ دامِ عیال ہے

کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

کچھ دیر بعد مولانا آتے ہوئے نظر آئے۔ کیچڑ میں ڈگمگ ڈگمگ کرتی اینٹوں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہے تھے۔ اس ڈانواڈول پگڈنڈی پر اس طرح چلنا

پڑتا تھا جیسے سرکس میں کرتب دکھانے والی لڑکی تنے ہوئے تار پر چلتی ہے۔ لیکن اس کی کیا بات ہے۔ وہ تو خود کو کھلی چھتری سے بیلینس کرتی رہتی ہے۔ ذرا ڈگمگا کر گرنے لگتی ہے تو تماشائی پلکوں پر جھیل لیتے ہیں۔ مولانا خدا جانے بشارت کو دیکھ کر بوکھلا گئے یا اتفاقاً ان کی کھڑاؤں اینٹ پر پھسل گئی، وہ دائیں ہاتھ کے بل، جس میں دم کے پانی کا گلاس تھا، گرے۔ ان کا تہبند اور داڑھی کیچڑ میں لت پت ہو گئی اور ہاتھ پر کیچڑ کا موزہ سا چڑھ گیا۔ ایک بچّے نے بدقلعی لوٹے سے پانی ڈال کر ان کا منہ دھلایا، بغیر صابن کے۔ انھوں نے انگوچھے سے تسبیح، منہ اور ہاتھ پونچھ کر بشارت سے مصافحہ کیا اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ بشارت ڈھے چکے تھے۔ ریہرسل کیے ہوئے طعن آمیز ابتدائیہ فقرے جو داڑھی، نماز اور گٹے سے متعلق تھے، اس کیچڑ میں غرق ہو گئے "قصرِ تقدّس کا چھجّا" والی پھبتی بھی اسی بج بجاتی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔ ان کا بے اختیار جی چاہا کہ بھاگ جائیں۔ مگر دلدل میں آدمی جتنی تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، اتنی ہی تیزی سے دھنستا چلا جاتا ہے۔

ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب شکایت و فہمائش کا آغاز کہاں سے کریں۔ اسی شش و پنج میں انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ سے، جس سے ذرا دیر پہلے بہ کراہت مصافحہ کیا تھا، ہونٹ کھجایا تو اُبکائی آنے لگی۔ اس کے بعد انھوں نے اس ہاتھ کو اپنے

جسم اور کپڑوں سے ایک بالشت دور رکھا۔ مولانا غایتِ آمد بھانپ گئے۔ خود پہل کی۔ اس اعتراف کے ساتھ کے میں آپ کے کوچوان رحیم بخش سے پیسے لیتا رہا ہوں، پڑوسن کی بچی کے علاج کے لیے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میری تعیناتی سے پہلے یہ دستور تھا کہ آدھی رقم آپ کا کوچوان رکھ لیتا تھا۔ اب جتنے پیسے آپ سے وصول کرتا ہے وہ سب مجھ تک پہنچتے ہیں۔ اس کا حصہ ختم ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ مجھ سے اپنی بیوی کے لیے تعویذ لے گیا۔ اللہ نے اس کا مرض دور کر دیا۔ وہی شافی و کافی ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ اس کے بعد وہ میرا معتقد ہو گیا۔ بہت دکھی آدمی ہے۔

مولانا نے یہ بھی بتایا پہلے آپ چالان اور رشوت سے بچنے کے لیے جب بھی اسے راستہ بدلنے کا حکم دیتے، وہ محکمے والوں کو پیشگی نوٹس دے دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ برضاو رغبت پکڑا جاتا تھا۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ ایک دفعہ انسپکٹر کو نمونیہ ہو گیا اور وہ تین ہفتے تک ڈیوٹی پر نہیں آیا تو رحیم بخش ہمارے آفس میں یہ دریافت کرنے آیا کہ اتنے دن سے چالان کیوں نہیں ہوا۔ خیریت تو ہے؟

بشارت نے دو تین سوال کوچوان کے متعلق تو کیے، لیکن مولانا کو کچھ کہنے سننے کا اب ان میں یارانہ تھا۔ ان کا بیان جاری تھا۔ وہ مجوب خاموشی سے سنتے رہے:

میرے والد کی کولھے کی ہڈی ٹوٹے دو سال ہو گئے۔ وہ سامنے پڑے ہیں۔ بیٹھ بھی نہیں سکتے چارپائی کاٹ دی ہے۔ مستقل لیٹے رہنے سے ناسور ہو گئے ہیں۔ ایک تو اتنا گہرا ہے کہ پوری انگلی اندر چلی جائے۔ سُتلی برابر موٹی ایک رگ اندر نظر آتی ہے۔ پیپ رستی رہتی ہے۔ زخم صاف کرتے ہوئے مجھے کئی دفعہ قے ہو چکی ہے۔ ڈالڈا کے ڈبوں میں پانی بھر کے چاروں پایوں کے نیچے رکھ دیے ہیں تاکہ دوبارہ لال چیونٹے زخموں میں نہ لگیں۔ پڑوسی آئے دن جھگڑتا ہے کہ تمہارے بڑے ہوئے دن بھر تو خراٹے لیتے ہیں اور رات بھر چیختے کراہتے ہیں۔ ناسوروں کی سڑاند کے مارے ہم کھانا نہیں کھا سکتے۔ وہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ فقط چٹائی کی دیوار ہی تو بیچ میں ہے۔ چار مہینے قبل فضلِ ایزدی سے ایک اور فرزند تولد پذیر ہوا۔ اللہ کی دین ہے بِن مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ بھیک۔ اللہ نبی کی امت کو بڑھاتا ہے۔ جاپے کے بعد ہی بیوی کو whit leg ہو گئی۔ ہل نہیں سکتی۔ مرضی مولا۔ رکشا میں ڈال کر جناح ہسپتال لے گیا۔ کہنے لگے، فوراً ہسپتال میں داخل کرواؤ مگر یہاں کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ ایک مہینے بعد پھر لے گیا۔ اب کی دفعہ کہنے لگے، اب لائے ہو لمبی بیماری ہے۔ ہم ایسے مریض کو ایڈمٹ نہیں کر سکتے۔ صبر کیا۔ راضی ہیں ہم اسی میں جس میں رضا ہو تیری۔ فجر اور مغرب کی نماز سے پہلے دونوں مریضوں کا گُوہ مُوت کرتا ہوں۔ نماز کے بعد خود روٹی

ڈالتا ہوں تو بچوں کے پیٹ میں کچھ جاتا ہے۔ ایک دفعہ نور جہاں نے ماں کے لیے بکری کا دودھ گرم کیا تو کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں"۔

بشارت اب کہیں اور پہنچ چکے تھے۔ اب نہ انھیں بدبو آرہی تھی نہ متلی ہو رہی تھی۔ سنّاٹے میں آگئے تھے:

سمجھتے کیا تھے، مگر سنتے تھے فسانہ دہر

سمجھ میں آنے لگا جب، تو پھر سنا نہ گیا

مولانا نے کہا کہ دائی کا علاج ہے۔ عرقِ مکو، رومی مصطگی، مغزِ کنجشک اور افیم کا لیپ بتایا ہے۔ بڑی ہمدرد عورت ہے۔ فجر اور مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے پانی دَم کروا کے لاتا ہوں۔ سو ڈیڑھ سو نمازیوں کے انفاسِ متبرکہ بڑے بڑے رئیسوں کو نصیب نہیں ہوتے۔ مگر شاید مولا کو شفاء منظور نہیں۔ مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ۔

مشیتِ ایزدی اور مرضیِ مولا کے جتنے حوالے اس آدھ گھنٹے میں بشارت نے سنے اتنے پچھلے دس برسوں میں بھی نہیں سنے ہوں گے۔ مولانا کی باتوں سے انہیں لگا

جیسے اس بے نوانگری میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ خدا کی مرضی کے عین مطابق ہو رہا ہے۔

انھیں سُرنگ کے دوسری طرف بھی اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ ایسی ناامیدی، ایسی بے بسی، ایسے اندھیرے اور اندھیر کی تصویر کھینچنے کے لیے تو دانتے کا قلم چاہیے۔

پلید ہاتھ

مولانا کو جیسے کوئی بات اچانک یاد آگئی اور معذرت کر کے کچھ دیر کے لیے اندر چلے گئے۔ ادھر بشارت اپنے خیالات میں کھو گئے۔ اس ایک آرپار جھگی میں جس میں نہ کمرے ہیں نہ پردے، نہ دیواریں نہ دروازے، جس میں آواز، ٹیس اور سوچ تک ننگی ہے، جہاں لوگ شاید ایک دوسرے کا خواب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ایک کونے میں بوڑھا باپ پڑا دَم توڑ رہا ہے۔ دوسرے کونے میں زچگی ہو رہی ہے اور درمیان میں بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ بھائی میرے! جہاں اتنی رشوت لی تھی وہاں تھوڑی سی اور لے کر بیوی کو ہسپتال میں داخل کرا دیتے تو کیا حرج تھا۔ جان پر بنی ہو تو شراب تک حرام نہیں رہتی۔ لیکن پھر ہانڈی چولھا،

جھاڑو بہارو کون کرتا؟ اس ٹبر کا پیٹ کیسے بھرتا؟ مولانا نے بتایا تھا کہ زچگی کے دوسرے ہی دن بیوی نے بچوں کے لیے روٹی پکائی اور کپڑے دھوئے تھے۔ بشارت سوچنے لگے کہ ان جنگجو تاتاری عورتوں کے قصیدوں سے تو تاریخ بھری پڑی ہے جو عرب شاہ کے بیان کے مطابق تیمور کی فوج کے شانہ بشانہ نیزوں اور تلواروں سے لڑتی تھیں۔ اگر کوچ کی حالت میں کسی عورت کے دردِ زہ شروع ہو جاتا تو وہ دوسرے گھڑ سواروں کے لیے راستہ چھوڑ کر ایک طرف کو کھڑی ہو جاتی۔ گھوڑے سے اتر کر بچہ جنتی۔ پھر اسے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے گلے میں حمائل کرتی اور دوبارہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر لشکر سے جا ملتی۔ مگر جھگیوں میں چپ چاپ جان سے گزر جانے والی ان بے نام بی بیوں کا نوحہ کون لکھے گا؟ بشارت کا دَم گھٹنے لگا۔ اب تلک مولانا نے کل ملا کر یہی سو ڈیڑھ سو روپے وصول کیے ہوں گے۔ وہ ناحق یہاں آئے۔ انہوں نے موضوع بدلا اور دَم کے پانی کی تاثیر کے بارے میں سوچنے لگے کہ ابھی تو یہ بے چاری ایک بیماری میں مبتلا ہے۔ سو آدمیوں کا پھونکا ہوا پانی پی کر سو نئی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گی۔

کچھ دیر بعد مولانا نے اندر پردہ کرایا۔ یعنی جب نور جہاں نے اپنی بیمار ماں کو سر سے پیر تک چیکٹ لحاف اڑھا کر لٹا دیا تو مولانا نے بشارت کو جھگی میں چلنے کو کہا۔

دونوں ایک چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئے۔ اَدوان پر ایک نقشین سینی میں تام چینی کی نیلی چینک اور دو کپ رکھے تھے۔ کپ کے کناروں پر مکھیوں کی کلبلاتی جھالر۔ مولانا نے کپ میں تھوڑی سی چائے ڈالی اور انگلی سے اچھی طرح رگڑ کر دھویا۔ پھر اس میں چائے بن کر بشارت کو پیش کی۔ اگر وہ اس انگلی سے نہ دھوتے جو کچھ دیر پہلے کیچڑ میں سنی ہوئی تھی تو شاید اتنی اُبکائی نہ آتی۔ مولانا چائے دینے کو جھکے تو ان کی داڑھی میں سے گٹر کی بو آرہی تھی۔

مولانا کا بیان جاری تھا۔ بشارت میں اب اتنا حوصلہ باقی نہیں رہا تھا کہ نظر اٹھا کر ان کی صورت دیکھیں"۔ مجھے محکمہ انسدادِ بے رحمیِ جانوران ساٹھ روپے تنخواہ دیتا ہے۔ اک بیٹا سات سال کا ہے ذہن، ڈیل اور شکل و صورت میں سب سے اچھا۔ چار پانچ مہینے ہوئے اسے تین دن بڑا تیز بخار رہا۔ چوتھے دن بائیں ٹانگ رہ گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ بولا، پولیو ہے۔ انجکشن لکھ دیے۔ خدا کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ میرا بچہ صرف ایک ٹانگ سے معذور ہوا۔ پڑوس میں، چار جھگی چھوڑ کر، ایک بچی کی دونوں ٹانگیں رہ گئیں۔ وبا پھیلی ہوئی ہے۔ جو رَب چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ بن باپ کی بچی ہے۔ ڈاکٹر کی فیس کہاں سے لائے۔ میں نے اپنے بیٹے کے تین انجکشن اس بچّی کو لگوا دیے۔ کیا بتاؤں اس بیوہ بی بی نے کیا دعائیں دی ہیں۔ پانچوں وقت اس بچّی کے لیے بھی دعا کرتا ہوں۔ ہر جمعے کو جنگلی کبوتر

کے خون اور لونگ اور بادام کے تیل سے بیٹے اور اس بچّی کی ٹانگوں کی مالش کرتا ہوں۔ ویسے اس ڈاکٹر کا علاج بھی جاری ہے۔ آپ کے کوچوان سے جتنی بار پیسے لیے اسی علاج معالجے کے واسطے لیے"۔

بشارت کو ایسا محسوس ہوا جیسے دماغ سُن ہو گیا ہو۔ بیماری، بیماری! یہاں لوگ کیچر گھان بچّے پیدا کرنے اور بیمار پڑنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ اس آدھے گھنٹے میں ان کے منہ سے بمشکل دس بارہ جملے نکلے ہوں گے۔ مولانا ہی بولتے رہے۔ بشارت کی زبان پر ایک سوال آ آ کر رہ جاتا تھا۔ کیا سب جھگیوں میں یہی حال ہے؟ کیا ہر گھر میں لوگ اسی طرح رِنجھ رِنجھ کر جیتے ہیں؟

مولانا جاری تھے "اسے قرضِ حسنہ سمجھ کر معاف کر دیجیے۔ آپ کے کوچوان نے دھمکی دی تھی کہ، ہمارا صاب کہتا ہے اس دڑھیل کو بول دینا کہ ایسا ذلیل کروں گا، ایسا ملیا میٹ کروں گا کہ یاد کرے گا۔، یہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ برستا بادل ہمارا اوڑھنا اور کیچڑ ہمارا بچھونا ہے۔ اس کے آگے اب اور کیا ہو گا؟ مولا سے دعا کی تھی کہ اکل حلال اور صدقِ مقال عطا ہو۔ عزت کی روٹی ملے۔ گنہ گار ہوں۔ دعا قبول نہ ہوئی۔ اس پر سب روشن ہے۔ آج صبح ناشتے میں ایک روٹی کھائی تھی۔ اس کے بعد ایک کھیل کا دانہ بھی منہ میں گیا ہو تو لحم الخنزیر ہے۔ وہ

جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم اتنے بے بس اور عاجز ہو کہ تمہارے ہاتھ سے مکھی بھی ایک ریزہ اٹھا کر لے جائے تو تم اس سے چھین نہیں سکتے"۔

مولانا نے کرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھایا جس میں غار پڑا ہوا تھا۔ دھونکنی سی چل رہی تھی۔ بشارت نے نظریں جھکا لیں۔

"مدت سے حضرت ذہین شاہ تاجی سے بیعت ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک پڑوسی نے جو اس بیوہ بی بی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور مجھے اس میں حارج سمجھتا ہے، پیر و مرشد کو ایک گمنام خط بھیجا کہ میں رشوت لیتا ہوں۔ اب حضرت فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدّین گنج شکر علیہ الرحمتہ نے رزقِ حلال کو اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ جب تک تم رشوت کا ایک ایک پیسا واپس نہ کر دو گے، پلید ہاتھ سے بیعت نہیں لوں گا۔ خدا مجھ پر رحم فرمائے۔ میرے حق میں دعا کیجیے"۔

مولانا ان کے سامنے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ ان کے ملیشیا کے کرتے پر جذب ہوتے ہوئے آنسوؤں کا ایک سیاہ زنجیر سا بن گیا تھا۔ بشارت نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

دوا کیلے

ایک ہفتے بعد دیکھا کہ مولانا کرامت حسین بشارت کی دکان پر منشی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور فیتہ ہاتھ میں لیے دیودار اور "پین" کی لکڑی کی پیمائش کرتے خوش خوش پھر رہے ہیں۔ ان کی تنخواہ تگنی ہو گئی۔ تین چار دن بعد بشارت نے صرف اتنی تنبیہ کی کہ مولانا ایمانداری اچھی چیز ہے، مگر آپ گاہک کے سامنے لکڑی کی گرہ کو اس طرح نہ تکا کیجیے جیسے گھوڑے کی گردن کے زخم کو دیکھ رہے ہوں۔ رحیم بخش کوچوان کو برخواست کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مولانا کے آتے ہی وہ کہے سنے بغیر غائب ہو گیا۔

گھوڑے کے بکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مولانا کے لحاظ اور مروت میں "بے رحمی والوں " نے ستانا چھوڑ دیا۔ بشارت نے بزرگوار سے اشارتاً کہا کہ آپ کی دعا سے چالانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب آپ ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے میں تشریف لے جاسکتے ہیں۔ لیکن بزرگوار گھوڑے کے اسقدر عادی ہو گئے تھے کہ کسی طرح نفل نماز اور وظیفہ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ گھوڑا انھیں دیکھتے ہی بقول کوچوان کے بچپانے لگتا، یعنی مارے خوشی کے اپنے کان کھڑے کر کے دونوں سرے ملا دیتا۔ علی الصبح گھوڑا ڈرائنگ روم میں بالاصرار و

بالالتزام بلوایا جاتا۔ جیسے ہی ''گھوڑا آرہا ہے!'' کا غلغلہ بلند ہوتا تو جس کو دین و دل یا کچھ اور بھی عزیز ہوتا راستہ چھوڑ کر تماشا دیکھنے کھڑا ہو جاتا۔ یہ منظر آرسی مصحف کی یاد دلاتا تھا۔ جب نوشہ کو زنانے میں بلوایا جاتا ہے تو بار بار اعلان کیا جاتا ہے ''لڑکا آرہا ہے! لڑکا آرہا ہے!'' یہ سن کر لڑکیاں بالیاں اور پردہ نشن بیبیاں نقاب الٹ کر طباق سے چہرے کھول کر بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ بدگمانی بیجا نہیں معلوم نہیں ہوتی کہ بعض مرد بڑھاپے میں شادی فقط ''لڑکا آرہا ہے'' سننے کے لالچ میں کرتے ہیں ورنہ جہاں تک نکاح یا وظیفہ زوجیت کا تعلق ہے تو:

اس سے غرضِ نشاط ہے کس روسیاہ کو

بزرگوار اس کی پیشانی پر انگشتِ شہادت سے ''اللہ '' لکھتے۔ کچھ عرصے سے اس کے پیر پر دَم کر کے ہاتھ بھی پھیرنے لگے تھے۔ جس دن سے وہ ایال میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے، اس سے گھر والوں کی شکایتیں نام لے لے کر کرنے لگے۔ اس دن سے رشتہ انسان اور جانور کا نہیں رہا۔ جب وہ اپنی نئی تکلیفوں کا حال سنا کر چپ ہو جاتے تو وہ بڑے پیار سے اپنا منہ ان کے مفلوج جسم کے ساتھ رگڑتا اور پھر سر جھکا لیتا۔ جیسے کہہ رہا ہو بابا! آپ تو مجھ سے بھی زیادہ

دکھی نکلے! وہ کہتے تھے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری بائیں ٹانگ میں دھیرے دھیرے پھر سے sensation (حس) آرہی ہے۔

غرض کہ بزرگوار اب اسے گھوڑا سمجھ کر پیار نہیں کرتے تھے۔ ادھر گھوڑا بھی ان سے اس قدر مانوس ہو گیا اور ایسے یگانگت برتنے لگا جیسے وہ انسان نہ ہوں۔ وہ اب اسے کبھی گھوڑا نہیں کہتے تھے۔ بلبن یا بیٹا کہہ کر پکارتے۔ وہ آتا تو دونوں کی ملاقات دیدنی و شنیدنی ہوتی:

جیسے مجذوب کے گھر دوسرا مجذوب آئے

بزرگوار ایک دن کہنے لگے کہ گھوڑا دراصل مزمن وجع المفاصل میں مبتلا ہے (انہی کی طرح اب گھوڑے کو بھی ہر مرض عربی میں ہوتا تھا) پھر صراحتاً فرمایا کہ ٹانگ کے جوڑ جکڑ گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے جوڑ کھولنے کے لیے ڈرائنگ روم میں انگیٹھی جلوا کر اپنی نگرانی میں تین سیر کھوئے اور گھی میں گھیکوار کا حلوہ بنوا کر چالیس دن تک خود کھایا، جس سے ان کی اپنی زبان اور بھوک کھل گئی۔ ادھر وہ کچھ دن سے یہ بھی کہنے لگے تھے کہ گھوڑے میں جن سما گیا ہے۔ اسے اتارنے کے لیے جمعرات کی جمعرات مرچوں کی دھونی دیتے اور آدھ سیر دانے دار قلاقند پر نیاز دے کر مستحقین میں تقسیم کرتے۔ مطلب یہ کہ آدھا خود کھاتے

آدھا اپنے دوست چودھری کرم الٰہی کے ہاں بھجواتے۔ قلاقند کھاتے جاتے اور فرماتے جاتے بعض جنوں کی نیت کسی طرح نہیں بھرتی۔ سابق کوچوان رحیم بخش بھی کہتا تھا یہ گھوڑا نہیں، جن ہے۔ جن پلید آدمیوں کو دکھلائی نہیں دیتے۔ اسی سے روایت ہے کہ ایک دن میں بلبن کو صبح ڈرائنگ روم میں نہ لے جا سکا تو شام کو مغرب کے بعد رسّی تڑّا کر خود ہی دَم کروا کے واپس آ گیا۔ میں دانہ چارا لے کر آیا تو جناب ادھر کچھ اور ہی سماں تھا۔ دیکھا کہ اس کے سُم کافور کے ہو گئے ہیں اور ان میں سے ایسی چکا چوند شعاعیں نکل رہی ہیں کہ آپ ادھر نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتے۔ نتھنوں سے لوبان کا دھواں نکل رہا ہے۔ اس پر عبداللہ گزک والے نے رحیم بخش کے سر کی قسم کھا کر کہا کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے، عین اسی وقت میں نے گھوڑے کو کلفٹن میں حضرت عبداللہ شاہ غازی کی درگاہ کے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔ اس پر ایک نورانی داڑھی والے سبز پوش بزرگ سوار تھے۔

بزرگوار نے گھوڑے کی کرامات کو اپنی کرامات سمجھا۔ کرید کرید کر کئی بار سبز پوش بزرگ کا حلیہ پوچھا اور ہر بار جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا کہ بزرگ کا حلیہ ان سے نہیں ملتا تھا۔ اب وہ بلبن بیٹے کو مغرب کے بعد بھی اپنے پاس بلوانے لگے۔ دونوں عشاء تک سر جوڑے ایسی باتیں کرتے کہ

لوگ سن پائیں تو دونوں ہی کو دیوانہ کہیں

اس واقعہ کے بعد کوچوان گھوڑے کو بلبن صاحب اور شاہ جی کہنے لگا۔ بزرگوار اکثر فرماتے کہ یہ گھوڑا بڑا بھاگوان ہے۔ بشارت کے ہاں لڑکے کی پیدائش کو وہ گھوڑے کی آمد سے منسوب کرتے تھے! محلّے کی چند بانجھ عورتیں شاہ جی کے درشن کو آئیں۔

”وقوعہ ہو گیا“

ہم یہ تو بتانا تو بھول ہی گئے کہ رحیم بخش کے جانے کے بعد انھوں نے ایک نیا کوچوان رکھا۔ نام مرزا وحید الزمان بیگ۔ مگر شرائطِ ملازمت کے مطابق بزرگوار اسے بھی اللہ دین ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات چیت اور شکل وصورت سے مسکین لگتا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ ایسا بنا رکھا تھا کہ اس کے ساتھ خواہ مخواہ بھلائی کرنے کو جی چاہتا۔ منگول نقوش، سانولا رنگ، گٹھا ہوا بدن، چھوٹے چھوٹے کان، کشادہ پیشانی۔۔۔ کاٹھی ایسی ٹانٹھی کہ عمر کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ صدری کی اندرانی جیب میں پستول کے بجائے ایک گھسی ہوئی نعل کا شیر پنجہ رکھ چھوڑا تھا۔ بندر روڈ کے عقب میں ٹرام ڈپو کے پاس جو تھیٹریکل کمپنی تھی، اس

کے کھیل ''رستم و سہراب'' میں وہ ڈیڑھ مہینے تک رستم کا گھوڑا ''رخش'' بنا تھا۔ اسٹیج پر پوری طاقت سے ہنہناتا تو تھیٹر کے باہر کھڑے ہوئے تانگوں کی گھوڑیاں اندر آنے کے لیے لگام تڑانے لگتیں۔ اس کی ایکٹنگ سے خوش ہو کر ایک تماشائی نے یہ نعل اسٹیج پر پھینکی تھی۔ چھوٹے سے جثے پر بڑی پاٹ دار آواز پائی تھی۔ روزمرّہ گفتگو کے دوران اچانک تھیٹر کی یاد آ جائے تو گھوڑے کو اسپ، گویے کو رامش گر اور خود کو روسیاہ کہنے لگتا۔ آغا حشر کے دھواں دھار ڈراموں کے گرجتے کڑکتے مکالمے زبانی یاد تھے، جنھیں گھوڑے کے ساتھ بولتا رہتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے مکالموں کے صحیح مخاطب بھی وہی ہو سکتے ہیں۔ آغا حشر کے مکالمے حجلہ عروسی میں بھی خود اور زرہ بکتر پہنے، برہنہ تلوار لہراتے داخل ہوتے ہیں، جب کہ میدانِ جنگ میں ان کا ہر قدم نقارے پر پڑتا ہے۔ الفاظ کے دھنی ہمیشہ قبضے پر گھنگرو باندھ کر تلوار چلاتے ہیں۔ اور اگر بہ تقاضائے بشریت یا پبلک کے پرزور اصرار پر، آ گیا عین لڑائی میں وقتِ وصال، تو محبوبہ سے بھی اس مقفیٰ شمشیر برہنہ زبان میں گفتگو فرماتے ہیں جس میں جانی دشمنوں کا قافیہ تنگ کرتے ہیں۔ ایسے نازک مقامات پر بھی جہاں صبر یا شائستگی کا جامہ اترنے لگے وہ قافیے کا دامن دانتوں سے پکڑے رہتے ہیں۔ آغا حشر کے ہیرو کی جان اور آن الفاظ کے طوطوں میں بند ہوتی ہے اور طوطا جتنا چھوٹا ہو، اس سے

اتنی ہی بڑی توپ چلواتے ہیں۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے تانگے والے، ملوں کے مزدور اور خوانچہ فروش تک آپس میں انھیں مکالموں کے ٹکڑے بولتے پھرتے تھے۔

مرزا وحید الزمان بیگ جس کے نام کے آگے یا پیچھے کوچوان لکھتے ہوئے کلیجہ خون ہوتا ہے، اپنا ہر جملہ "قصور معاف!" سے شروع کرتا تھا۔ ملازمت کے انٹرویو کے دوران اس نے دعویٰ کیا کہ میں موٹر ڈرائیونگ بھی بہت اچھی جانتا ہوں۔ بشارت نے جل کر حقارت سے کہا، تو پھر تم تانگہ کیوں چلانا چاہتے ہو؟ دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا، پاک پروردگار آپ کو کار دے گا تو کار بھی چلالیں گے۔

بشارت نے اسے یہ سوچ کر ملازم رکھا تھا کہ چلو مسکین آدمی ہے۔ قابو میں رہے گا۔ مرزا عبدالودود بیگ نے ٹِپ دیا تھا کہ ذہانت پر ریجھ کر کبھی کسی کو ملازم نہیں رکھنا چاہیے۔ ملازم جتنا غبی ہو گا اتنا ہی زیادہ تابعدار اور خدمتی ہو گا۔ لیکن اس نے کچھ دن تو بڑی تابعداری دکھائی، پھر یہ حال ہو گیا کہ سکول سے کبھی ایک گھنٹا لیٹ آرہا ہے، کبھی دن میں تین تین گھنٹے غائب۔ ایک دفعہ اسے ایک ضروری انوائس لے کر پاکستان ٹوبیکو کمپنی بھیجا۔ چار گھنٹے بعد لوٹا۔ بچّے اسکول

کے پھاٹک پر بھوکے پیاسے کھڑے رہے۔ بشارت نے ڈانٹا۔ اپنی پیٹی کی طرف جسے راچھ اوزار کی پیٹی بتاتا اور تانگے میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا، اشارہ کر کے کہنے لگا، قصور معاف، وقوعہ ہو گیا۔ میونسپل کارپوریشن کی بغل والی سڑک پر گھوڑا سکندری (ٹھوکر) کھا کے گر پڑا۔ ایک تنگ ٹوٹ گیا تھا۔ نعل بھی جھانجھن کی طرح بجنے لگی۔ انھیں ٹھیک کر رہا تھا۔ قصور معاف، نعل کی ایک بھی میخ ڈھیلی ہو تو ایک میل دور سے فقط ٹاپ سن کر بتا سکتا ہوں کہ کون سا سُم ہے۔ بشارت نے حیرت سے پوچھا، تم خود نعل باندھ رہے تھے؟ بولا، اور نہیں تو۔ کہاوت ہے، کھیتی، پانی، بینتی اور گھوڑے کا تنگ۔ اپنے ہاتھ سنواریے چاہے لاکھوں ہوں سنگ[1] گھوڑے کی چاکری تو خود ہی کرنی پڑتی ہے۔

وہ ہر دفعہ نئی داستان اور نیا عذر تراشتا تھا۔ جھوٹے لپاٹی آدمی کی مصیبت یہ ہے کہ وہ سچ بھی بولے تو لوگ جھوٹ سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ اسی کی بات سچ نکلی۔ تاہم اس کی بات پر دل نہیں ٹھکتا تھا۔ ایک دن بہت دیر سے آیا۔ بشارت نے آڑے ہاتھوں لیا تو کہنے لگا "جنابِ عالی" میری بھی تو سنیے۔ میں ریس کلب کے اصطبل کے سامنے سے اچھا بھلا گزر رہا تھا کہ گھوڑا ایک دَم اَڑ گیا۔ چابک مارے

---

[1] کھیتی، پانی، دست بستہ التجا اور گھوڑے کی زین کا تسمہ، یہ سب اپنے ہاتھ سے کرنے کے کام ہیں خواہ تمہارے ساتھ لاکھوں آدمی ہوں۔

تو بالکل الف ہو گیا۔ راہ گیر تماشا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں اندر سے ایک بڈھا سلوتری نکل کے آیا۔ گھوڑے کو پہچان کے کہنے لگا، "ارے ارے! تُو اس شہزادے کو کائے کو مار رہا ہے۔ اس نے اچھے دن دیکھے ہیں۔ قسمت کی بدنصیبی کو صیّاد کیا کرے۔ یہ تو اصل میں دُرِ شہوار (گھوڑی کا نام) کی بُولیتا یہاں آن کے مچلا ہے۔ جس ریس میں اس کی ٹانگ میں موچ آئی ہے، دُرِ شہوار بھی اس کے ساتھ دوڑی تھی۔ دو اتوار پہلے پھر اوّل نمبر پر آئی ہے۔ اخباروں میں فوٹو چھپے تھے۔ بھاگوان نے مالک کو لکھ پتی کر دیا" پھر اس نے اس کے پرانے سائیس کو بلایا۔ ہم تینوں اسے تانگے سے کھول کے اندر لے جانے لگے۔ اسے سارے رستے معلوم تھے۔ سیدھا ہمیں اپنے تھان پہ لے گیا۔ وہاں ایک بے ڈول کالا بھجنگ گھوڑا کھڑا اپشتک (دولتی) مار رہا تھا۔ ذرا دور پہ، دوسری طرف دُرِ شہوار کھڑی تھی۔ وہ اسے پہچان کے بے کل ہو گئی۔ کہاں تو یہ اتنا مچل رہا تھا اور کہاں یہ حال کہ بالکل چپکا، بے ست ہو گیا۔ گردن کے زخم کی مکھیاں تک نہیں اڑائیں، صاحب جی، اس کا گھاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ سائیس نے اسے بہت پیار کیا۔ کہنے لگا، بیٹا! اس سے تو بہتر تھا کہ تجھے اسی وقت انجکشن دے کے سلا دیتے۔ یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔ یہ تیرے مالک کو ترس آ گیا۔۔ پھر اس نے اس کے سامنے ریس کلب کا راتب رکھا۔ صاحب، ایسا جینا تو انسان کو بھی نصیب نہیں۔ پر قسم لے لو

جو اس نے چکھا ہو۔ بس سر جھکائے کھڑا رہا۔ سائیس نے کہا، اسے تو بخار ہے۔ اس نے اس کا بقیہ ساز کھول دیا اور لپٹ کے رونے لگا۔

”صاحب جی! میرا ابھی جی بھر آیا۔ ہم دونوں جنے مل کر آبدیدہ ہو رہے تھے کہ اتنے میں ریس کلب کا ڈاکٹر آن ٹپکا۔ اس نے ہم تینوں کو نکال باہر کیا۔ کہنے لگا: ابے اس بھنکنی ہتّیا کو یہاں کائے کو لایا ہے؟ اور گھوڑوں کو بھی مارے گا؟“

نتھ کا سائز

ایک اور موقع پر دیر سے آیا تو قبل اس کے کہ بشارت ڈانٹ ڈپٹ کریں، خود ہی شروع ہو گیا ”صاحب جی! قصور معاف۔ وقوعہ ہو گیا۔ میونسپل کارپوریشن کے پاس ایک مشکی گھوڑی بندھی ہوئی تھی، اسے دیکھتے ہی ایسا درپے ہوا کہ دونوں نے کلفٹن پہنچ کے دَم لیا۔ آگے آگے گھوڑی اس کے پیچھے گھوڑا۔ پھر کیا نام، یہ روسیاہ۔ چوتھے نمبر پہ گھوڑی کا دَھنی۔ صاحب جی، اپنا گھوڑا اس طریوں جا ریا تھا جیسے گلے سے ملائی اتر رئی ہو“۔

یہاں اس نے چابک اپنی ٹانگوں کے بیچ دبایا اور اور دوڑ کر بتایا کس طرح گھوڑا، آپ کا غلام اور گھوڑی کا مالک، اسی ترتیب سے گھوڑے کی مطلوبہ کے تعاقب

میں سرپٹ جا رہے تھے۔" جناب والا اس شخص نے پہلے تو مجھے کیا نام کہ نرگسی کو فتے جیسی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر الٹا مجھی پہ غرایا۔ حالانکہ میرا گھوڑا بے قصور تھا۔ سارے رستے اسی کی گھوڑی مُڑ مُڑ کے اپن کے گھوڑے کو دیکھتی رہی کہ برابر پیچھے آ رہا ہے کہ نہیں۔ میں نے اس کو بولا کہ اگر ایسا ہی ہے تو اپنی بے نتھی سنکھنی[1] کو سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے۔ مالک کی آبرو تو گھوڑی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ راہ چلتے گھوڑے کے ساتھ زلیخائی کرتی ہے۔ جناور کو پیغمبری آزمائش میں ڈالتی ہے۔ آخر کو مرد ذات ہے۔ برف کا پُتلا تو نہیں۔ صاحب جی! میں نے کیا نام اس دیوث کو بولا کہ جا جا! تیری جیسی گھوڑیاں بہت دیکھی ہیں۔ کراچی تھیٹر کوپنی میں اس جیسی ایک اُچھال چھکا چھوکری ہے۔ پر اس کی نائکہ ماں اسے اب بھی کنوارپنے کی نتھ پہنائے رہتی ہے۔ جیسے جیسے اس پٹاخہ کا چال چلن خراب ہوتا جائے ہے، نتھ کا سائز بڑا ہوتا جائے ہے۔ صاحب جی! یہ سنتے ہی اس کا غصہ رفو چکر ہو گیا۔ مجھ سے تھیٹر کوپنی کا پتہ اور چھوکری کا نام پوچھنے لگا۔ کہاں تو گالی پہ گالی بک رہا تھا، اب مجھے استاد! استاد! کہتے زبان سوکھ رئی تھی۔ بولا! استاد! غصہ

---

[1] سنکھنی: شاستروں میں عورت کی ایک قسم آئی ہے۔ اس وقت ہمارے پاس جو لغت ہے (علمی اُردُو لغت) وہ کہتا ہے کہ اس کا قد دراز، جسم چھریرا، مزاج چڑچڑا اور زلفیں اور خواہشِ نفسانی بڑھی ہوئی ہوتی ہے

تھو کو، یہ لو پان کھاؤ! قسم سے ! اپن کا گھوڑا تو نظریں نیچی کیے، تو بڑے میں منہ ڈالے، میونسپل کارپوریشن کے پاس کھڑا جگالی کر رہا تھا۔ جناب والا! سوچنے کی بات ہے۔ اس کی گھوڑی تو دور کا بہ (بہت اونچی) تھی۔ ڈھوئی ڈھوئی! جب کہ گھوڑا !بہت سے بہت آپ کے قد کے برابر ہو گا"۔

بشارت کے آگ ہی تو لگ گئی "ابے قد کے بچّے! تیرے گھوڑے کے ساتھ ہر وقوعہ میونسپل کارپوریشن کے پاس ہی ہوتا ہے!"

ہاتھ جوڑ کے بولا"اب کے وقوعہ گھوڑے کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

بشارت ھئیر کٹنگ سیلون

میونسپل کارپوریشن والا عقدہ بھی بالآخر کھل گیا۔ ان دنوں بشارت اپنی دکان میں سڑک کے رخ کچھ تبدیلیاں اور اضافے کرنا چاہتے تھے۔ نقشہ پاس کرانے کے سلسلے میں میونسپل کارپوریشن جانے کی ضرورت پیش آئی، مگر کوچوان کا کہیں پتا نہ تھا۔ تھک ہار کر وہ تین بجے رکشا میں بیٹھ میونسپل کارپوریشن چل دیے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ فٹ پاتھ پر مرزا وحید الزمان بیگ کوچوان پھٹی دری

کا ٹکڑا اچھائے ایک شخص کی حجامت بنا رہا ہے۔ وہ اوٹ میں کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ حجامت کے بعد اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی صابن اور شیو کی قاشیں اُسترے سے صاف کیں اور اسے چموٹے اور اپنی کلائی پر تیز کیا۔ پھر گھٹنوں کے بَل نیم قد کھڑے ہو کر بغلیں لیں۔ انہیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ لیکن ''اوزاروں'' کی جانی پہچانی پیٹی سے پھٹکری کا ڈلا اور تبت ٹیلکم پاؤڈر نکالتے دیکھا تو اپنی بینائی پر اعتماد بحال ہو گیا۔ اب جو غور سے دیکھا تو دری کے کنارے پر گتّے کا ایک سائن بورڈ بھی نظر آیا جس پر نہایت خوش خط اور جلی حروف میں لکھا تھا:

بشارت ہئیر کٹنگ سیلون

ہیڈ آفس

ہر چند رائے روڈ

بیچ بازار میں اسے بے آبرو کرنا مناسب نہ سمجھا۔ غصّے میں بھرے، رکشا لے کر دکان واپس آ گئے۔ اس روز وہ اسکول سے بچوں کو لے کر سات بجے شام گھر لوٹا۔ بشارت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کے ہاتھ سے چابک چھین کر دھمکی آمیز انداز میں لہراتے ہوئے بولے ''سچ سچ بتا۔ ورنہ ابھی چمڑی اُدھیڑ دوں گا۔ حرام

خور! تم نائی ہو! پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہر بات میں جھوٹ بات بے بات جھوٹ۔ آج دیکھتا ہوں کیسے جھوٹ بولتا ہے۔ سچ سچ بتا کہاں تھا"۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور تھر تھر کانپتے ہوئے کہنے لگا "قصور معاف! سرکار سچ فرماتے ہیں۔ آج سے قسم وحدہٗ لاشریک کی، ہمیشہ سچ بولوں گا۔"

چنانچہ اس کے بعد زندگی میں اس کی جتنی بھی خواری ہوئی، وہ سب سچ بولنے کے سبب ہوئی۔ مرزا کہتے ہیں کہ سچ بول کر ذلیل و خوار ہونے کی بہ نسبت جھوٹ بول کر ذلیل و خوار ہونا بہتر ہے۔ آدمی کو کم از کم صبر تو آجاتا ہے کہ کس بات کی سزا مل رہی ہے۔

بشارت کی جرح پر پہلا سچ جو اس نے بولا وہ یہ تھا کہ میونسپل کارپوریشن کے بندھے ہوئے گاہکوں کو نمٹا کر میں ساڑھے چار بجے برنس روڈ پر ختنے کرنے گیا۔ ختنے کے براتیوں کو جمع ہونے میں خاصی دیر ہو گئی۔ پھر لونڈا کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ اکلوتا لاڈلا ہے۔ آٹھ سال کا دھینگڑا۔ اس کے باوا حاجی مقصود الٰہی پنجابی سوداگران دلّی نے بہتیرا بہلایا پھسلایا کہ بیٹا! مسلمان ڈرا نہیں کرتے۔ تکلیف ذرا نہیں ہو گی۔ مگر لونڈا بضد تھا کہ پہلے آپ! آپ کے تو داڑھی بھی ہے۔

بشارت کا چہرا غصّے سے سرخ ہو گیا۔

ایک اور سچ بزورِ چابک اس سے بلوایا گیا کہ اس کا اصل نام بدھن ہے۔ اس کے میٹرک پاس بیٹے کو اس کے نام اور کام دونوں پر سخت اعتراض تھا۔ بار بار خود کشی کی دھمکی دیتا تھا۔ اس نے بہتیرا سمجھایا کہ بیٹا بزرگوں کے نام ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ نام میں کیا دھرا ہے۔ جھنجھلا کے بولا۔ ”ابا جی! یہ بات تو شیخ پئیر (شیکسپئیر) نے کہی تھی۔ پر اس کے باپ کا نام بدھن تھوڑا ہی تھا۔ وہ کیا جانے۔ تم اور کچھ نہیں بدل سکتے تو کم از کم نام تو بدل لو“۔ چنانچہ جب کچھ دن اس نے ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں چپراسی کی ملازمت کی تو اپنا نام مرزا وحید الزمان بیگ لکھوا دیا۔ بس اسی زمانے سے چلا آرہا تھا۔ دراصل یہ اس افسر کا نام تھا جس کی وہ بیس سال پہلے حجامت بنایا کرتا تھا۔ وہ لاولد مرا۔ رشوت سے بنائی ہوئی جائداد پر بھتیجوں بھانجوں نے اور نام پر اب اس نے قبضہ کر لیا۔

اب جو کمبخت سچ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ مرزا عبدالودود بیگ کا قول ہے کہ فی زمانہ ۱۰۰ فیصد سچ بول کر زندگی کرنا ایسا ہی ہے جیسے بجری ملائے بغیر، صرف سیمنٹ سے مکان بنانا۔ کہنے لگا ”قصور معاف! اب میں سارا سچ ایک ہی قسط میں بول دینا چاہتا ہوں۔ میرا خاندان غیرت دار ہے۔ اللہ کا شکر ہے، ذات کا سائیس

نہیں۔ سو سال سے بزرگوں کا پیشہ حجّامی ہے۔ ماشا اللہ سے دس بارہ کھانے والے ہیں۔ سرکار کے علم میں ہے کہ ایک گھوڑے پر جتنا خرچ آتا ہے، اس کی آدھی تنخواہ مجھے ملتی ہے۔ ستّر روپے سے کس کس کے ناک میں دھونی دوں۔ ہار جھک مار کر یہ پرائیویٹ پریکٹس کرنی پڑتی ہے۔ برسوں اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کے بڑے لڑکے کو میٹرک پاس کروایا۔ علیم الدّین صاحب کے بال بیس برس سے کاٹ رہا ہوں۔ سر پہ تو اب کچھ رہا نہیں۔ بس بھنویں بنا دیتا ہوں۔ سرکار! اس فن کے قدردان سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب تو بالبر (باربر) اس طرح بال اتاریں گویا کہ بھیڑ کو مونڈ رہے ہوں۔ میری نظر موٹی ہو گئی ہے، مگر آج بھی پیر کے انگوٹھے کے ناخن نہرنی روکے بغیر ایک ہی دفعہ میں تراش لیتا ہوں۔ تو علیم الدّین صاحب کے ہاتھ پیر جوڑ کے لونڈے کو مسلم کمرشل بینک میں کلرک لگوا دیا۔ اب وہ کہتا ہے مجھے تمہارے نائی ہونے سے شرم آتی ہے۔ پیشہ بدلو۔ سرکار میرے باپ دادا نائی تھے، نواب نہیں۔ محنت مشقت سے حق حلال کی روٹی کماتا ہوں۔ پر صاب جی، میں نے دیکھا ہے کہ جن کاموں میں محنت زیادہ پڑتی ہے، لوگ انہیں نیچ اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ بیٹا کہتا ہے کہ میرے ساتھ کے سب لڑکے اکاؤنٹینٹ ہو گئے۔ تجوری کی چابیاں بجاتے پھرتے ہیں۔ فقط ولدیت کے چکر میں میری ترقی رکی ہوئی ہے۔ اگر تم نے نائی کا دھندا نہیں چھوڑا

تو تمہارے ہی استرے سے اپنا گلا کاٹ لوں گا۔ کبھی کبھی اپنی ماں کو ڈرانے کے لیے رات گئے نرخرے سے ایسی آوازیں نکالنے لگا جیسے بکرا ذبح ہو رہا ہو۔ وہ نیک بخت مجھے خدا رسول کے واسطے دینے لگی۔ مجبور ہو کر میں نے کوچوانی شروع کر دی۔ یہ پرائیویٹ پریکٹس اس سے لُک چھُپ کے کرتا ہوں۔ اس کی بے عزتی کے ڈر سے پیٹی، اوزار، کسبت وغیرہ کبھی گھر نہیں لے جاتا۔ یقین جانیے، اسی وجہ سے اپنے ہیر ڈریسنگ سیلون کے سائن بورڈ پہ حضور کا نام پتا لکھوا دیا۔ بڑی برکت ہے آپ کے نام میں۔ قصور معاف!"

اللہ دین بے چراغ

وہ ہاتھ جوڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور پھر ہل ہل کے ان کے گھٹنے دبانے لگا۔ جیسے ہی وہ پسیجے، اس نے ایک اور سچ بولا۔ کہنے لگا کہ سرکار کے چہرے پر روزانہ صبح کٹ دیکھ کر اس کا دل خون ہو جاتا ہے۔ دیسی بلیڈ بال کم اور کھال زیادہ اتارتا ہے۔ کھونٹیاں رہ جاتی ہیں۔ قصور معاف! قلمیں بھی اونچی نیچی۔ جیسے نو بج کر بیس منٹ ہوئے ہوں۔ اس نے درخواست کی کہ اسے گھوڑے کا کھریرا کرنے سے پہلے ان کا شیو بنانے کی اجازت دی جائے۔ مزید خدمات یہ کہ بچوں کے بال کاٹے گا۔ بہاری کباب، بمبیا بریانی، مرغ کا قورمہ اور شاہی ٹکڑے لاجواب بناتا

ہے۔ اور دیگ کا حلیم اور ڈھبریوں کی فیرنی ایسی کہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ سو ڈیڑھ سو آدمیوں کی دعوت کے لیے تین گھنٹے میں پلاؤ زردہ بنا سکتا ہے۔ بشارت چٹورے آدمی ٹھرے۔ یوں بھی انگریزی محاورے کے مطابق، مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ کارل مارکس بھی یہی کہتا ہے:

ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے، معدے سے گزر کر جاتی ہے

انہیں یہ حجام اچھا لگنے لگا۔

اس نے یہ بھی کہا کہ گھوڑے کے کھریرے کے بعد وہ ان کے والد کے پیر دبائے گا۔ اور رات کو ان (بشارت) کا مساج کرے گا۔ گردن کے پیچھے جہاں سے ریڑھ کی ہڈی شروع ہوتی ہے، ایک رگ ایسی ہے کہ نرم گرم انگلیوں سے ہولے ہولے دبائی جائے تو سارے جسم کی تھکن اتر جاتی ہے۔ یہ آنکھ کو نظر نہیں آتی۔ اس کے استاد مرحوم لڈّن میاں کہا کرتے تھے کہ مالشیا اپنی انگلی کی پور سے دیکھتا ہے۔ یہی اس کی دوربین ہے جو چھوتے ہی بتا دیتی ہے کہ درد کہاں ہے۔ پھر اس نے بشارت کو لالچ دیا کہ جب روغنِ بادام سے سر کی مالش کرے گا اور انگوٹھے سے ہولے ہولے کنپٹیاں دبانے کے بعد، دونوں ہاتھوں کو سر پر پرندے کے بازوؤں کی طرح پھڑپھڑائے گا تو یوں محسوس ہو گا جیسے بادلوں سے

نیند کی پریاں پرے باندھے روئی کے پہل در پہل گالوں پر ہولے ہولے اتر رہی ہیں۔ ہولے ہولے، ہولے ہولے۔

بشارت دن بھر کے تھکے ہارے تھے۔ اس کی باتوں ہی سے آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔

اور آخری ناک آؤٹ وار اس ظالم نے یہ کیا کہ "ماشے اللہ سے ننھے میاں تین مہینے کے ہونے کو آئے۔ ختنے جتی کم عمری میں ہو جائیں، وتّی ہی جلدی کھرنڈ آئے گا"

اب تو چہرے کا گلاب کھل اٹھا۔ بولے "بھئی خلیفہ جی! تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ اماں حد کر دی! بھئی تم تو چھپے رستم نکلے !"

تِس پر اس نے اپنی جیب سے وہ نعل نکال کر دکھائی جو اسے رستم کا گھوڑا بننے پر انعام میں ملی تھی۔

مرزا وحید الزّمان بیگ اس دن سے خلیفہ کہلائے جانے لگے۔ ویسے یہ اللہ دین نہم تھا۔ کام کم، ڈینگیں بہت مارتا تھا۔ مرزا عبد الودود بیگ اسے اللہ دین بے چراغ کہتے تھے۔ بزرگوار نے اس کو اللہ دین کے بجائے خلیفہ کہنا اس شرط پر منظور کیا

کہ آئندہ اس کی جگہ کوئی اور کوچوان یا ملازم رکھا جائے گا تو اسے بھی خلیفہ ہی کہیں گے۔

گھوڑے کے آگے بین

رفتہ رفتہ مولانا، خلیفہ، گھوڑا اور بزرگوار۔۔۔۔۔ باعتبارِ اہمیت، اسی ترتیب سے خاندان کے فرد گردانے گئے اور یہ ادغام و اختلاط اتنا مکمل تھا کہ گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ بھی کنبے کا اٹوٹ انگ بن گئی۔ گھوڑے کے طفیل گھر کے معاملات میں بزرگوار کا دوبارہ عمل دخل ہو گیا۔ عمل دخل ہم نے محاورتاً کہہ دیا، ورنہ سراسر دخل ہی دخل تھا۔ ایک عمر ایسی آتی ہے جب انسان دوسروں کے معاملات میں دخل دینے ہی کو اپنا عمل شمار کرنے لگتا ہے۔ بعض لوگ تو ساری عمر اوروں کی خطائیں گننے اور ان کی حماقتوں کی اصلاح یعنی دخل در نامعقولات میں گزار دیتے ہیں۔ اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی

محشر میں گئے شیخ تو اعمال ندارد

جس مال کے تھے تاجر وہی مال ندارد

سب گھر والے فرداً فرداً بلبن کو چمکارتے، تھپتھپاتے۔ دانہ چارا تو غالباً اب بھی اتنا ہی کھاتا ہو گا۔ پیار کی نظر سے اس کی ایال اور جلد ایسی چمکیلی اور چکنی ہو گئی کہ نگاہیں اور مکھیاں پھسلیں۔ بچّے چھپ چھپ کر اپنے حصے کی مٹھائی کھلانے آتے اور اسی کی طرح کان ہلانے کی کوشش کرتے۔ کچھ بچّے اب فٹ بال کو آگے کک کرنے کی بجائے ایڑی سے دولتی مار کر پیچھے کی طرف گول کرنے لگے تھے۔ بیت بازی کے مقابلے میں جب کسی لڑکے کا گولہ بارود ختم ہو جاتا یا کوئی غلط شعر پڑھ دیتا تو مخالف ٹیم اور سامعین مل کر ہنہناتے۔ خود بزرگوار کوئی اچھی بری خبر سنتے یا سورج کے سامنے بادل کا کوئی اودا ٹکڑا آ جاتا تو فوراً گھوڑے کو ہارمونیم سنانے بیٹھ جاتے۔ اکثر فرماتے کہ جب واقعی اچھا بجاتا ہوں تو یہ بے اختیار اپنی دُم چنور کی طرح ہلانے لگتا ہے۔ ہمیں ان کے دعوے کی صداقت میں نہ جب شبہ تھا، نہ اب ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ کہ انھوں نے کبھی غور نہیں فرمایا کہ گھوڑا ان کے کمالِ فن کی داد کس عضو سے دے رہا ہے!

بلبن بزرگوار کا کھلونا، اولاد کا نعم البدل، مونسِ تنہائی، آنسوؤں سے بھیگا تکیہ۔۔۔۔۔ سبھی کچھ تھا۔ اس کے آنے سے پہلے وہ تمام وقت اپنی زنگ خوردہ چول پر اَن گھڑ کواڑ کی طرح کراہتے رہتے، خواہ درد ہو یا نہ ہو۔ اگر ان کے سامنے کوئی دوسرا بوجھ اٹھاتا تو منہ سے ایسی آوازیں نکالتے گویا خود بھی بوجھوں

مر رہے ہیں۔ کوئی پوچھتا، کہ طبیعت کیسی ہے تو جواب میں دائیں ہاتھ کو آسمان کی طرف اٹھا کر نفی میں ڈگڈگی کی طرح ہلاتے اور دو تین منٹ تک سُر بدل بدل کر کھانستے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی بیماری کو "انجوائے" کرنے لگے ہیں۔ بعض کہنہ مشق مریض یہ تسلیم کرنے میں اپنے مرتبہ علالت کی توہین سمجھتے ہیں کہ اب تکلیف میں افاقہ ہے۔ بزرگوار بڑی زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ اگر کبھی مرض دور ہو جاتا تو محض اپنی قوتِ ارادی کے زور سے دوبارہ پیدا کر لیتے۔ آپ نے انھیں نہیں دیکھا، مگر ان جیسے دائم المرض بزرگ ضرور دیکھے ہوں گے جو اپنی پالی پوسی بیماریوں کا حال اس طرح سناتے ہیں جیسے ننانوے پر آؤٹ ہونے والا بیٹس مین اپنی ادھوری سنچری اور دیہات کی عورتیں اپنی زچگیوں کے قصے سناتی ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر دفعہ نئی کمنٹری اور نئے پچھتاوے کے ساتھ۔ بلبن کے آنے سے پہلے طبیعت بے حد چڑ چڑی رہنے لگی تھی۔ لوگ عیادت سے احتراز کرنے لگے۔ سب نے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ کسی کی جرات نہیں تھی کہ ان کے لطفِ علالت میں مخل ہو۔

لیکن اب طبیعت میں اعتدال بلکہ انشراح پیدا ہو چکا تھا۔ ہر ایک کو اپنے امراض کی تازہ ترین کیفیت سے آگاہی بخشتے۔ ذات الجنب، وجع المفاصل اور احتباسِ بول کی تفصیلات بتاتے۔ پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر نفخ اور آنتوں کی قراقر کا حال،

متعلقہ صوتی اثرات کے ساتھ سناتے۔ رات کو خواب میں جن جن محلہ والوں کو مُردہ حالت میں دیکھا تھا، ان کے نام گنواتے اور باز آنے اور بکرا صدقہ دینے کی تلقین کرتے۔ کبھی فرماتے کہ تین دن سے بلغم میں اس قدر لزوجت ہے کہ سر کو دس بارہ دفعہ زور زور سے جھٹکا دوں تب کہیں ٹوٹ کر اگالدان میں گرتا ہے۔ ان دنوں بہار کالونی میں جاہل سے جاہل شخص کو۔۔۔۔ حتیٰ کہ مہترانی اور پروفیسر عبدالقدوس کو بھی۔۔۔۔ لزوجت[1] کے معنی مع مثال معلوم ہو گئے تھے۔ مرزا کہتے تھے کہ قبلہ کے امراض کے جراثیم عربی بولتے ہیں۔ انگریزی دواؤں کے قابو میں نہیں آنے کے۔

---

[1] لزوجت: پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی کے شعور لاشعور میں یہ لفظ ایسا بیٹھا کہ کئی سال بعد اسے اپنے تھیسس کا موضوع بنایا "ملٹن، جوش، ابوالکلام آزاد، علامہ مشّرقی، آغا حشر کاشمیری، عبدلعزیز خالد اور مشتاق احمد یوسفی کے یہاں لزوجت کا عنصر" ان مشاہیر کو ہمارے ساتھ بریکٹ کرنے میں پروفیسر موصوف کا منشا ہماری توقیر بڑھانا ہرگز نہ تھا۔ غزالوں کو اس عاجز کے ساتھ three legged race ریس میں نتھی کر کے انہیں رگیدنا اور ہمیں کھدیڑنا مقصود تھا۔ سنا ہے اس تھیسس کی آؤٹ لائن کو پروفیسروں نے اس بنا پر رد کر دیا کہ ایک پتھر سے اتی ساری چڑیاں نہیں ماری جا سکتیں! اب انہیں کون سمجھاتا کہ پروفیسر عبدلقدوس تیر، تفنگ اور پتھر کے محتاج نہیں۔

کیوں وہ صیاد کسی صید پر توسن ڈالے
صید جب خود ہی چلے آتے ہوں گردن ڈالے

نشہ بڑھتا ہے شرابی جو شرابی سے ملیں

ان کے ایک پرانے وضع دار دوست فدا حسین خاں تائب جمعے کے جمعے مزاج پُرسی کو آتے تھے۔ کسی زمانے میں بڑے یار باش اور رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ چوری چھُپے پیتے بھی تھے، مگر مفت کی۔ گناہ سمجھ کر چوری چھپے پینے میں فائدہ یہ ہے کہ ایک پیگ میں سو بوتلوں کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن ایک منحوس عادت تھی۔ جب بہت زیادہ چڑھ جاتی تو سب موضوعات چھوڑ کر صرف اسلام پر گفتگو فرماتے۔ اس پر تین چار مرتبہ شرابیوں سے پٹ بھی چکے تھے۔ وہ کہتے تھے ہمارا نشہ خراب کرتے ہو۔ لیکن شیخ حمید الدین جن کے ساتھ تائب پیتے تھے، ان کے انتخابِ موضوع پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔ شیخ صاحب بڑے اہتمام سے پیتے اور یاروں کو پلاتے تھے۔ عمدہ وہسکی۔ چیکوسلواکیہ کے کرسٹل گلاس، تیز مرچوں کی بھُنی کلیجی اور کباب، ریاض خیر آبادی کے اشعار۔۔۔۔ اور ایک تولیے سے مے نوشی کا آغاز ہوتا۔ تائب کو جیسے ہی چڑھتی، اپنی پہلی بیوی کو یاد کر کر کے بھُوں بھُوں روتے اور تولیے سے آنسو پونچھتے جاتے۔ کبھی لمبا ناغہ ہو جاتا تو شراب پر فقط اس لیے ٹوٹ کر پڑتے کہ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم

کبھی نشہ زیادہ چڑھ جاتا اور گھر یا محلّے میں جا کر چاندنی رات میں مرحومہ کو یاد کر کے دھاڑیں مارتے تو موجودہ بیوی اور محلّے والے مل کر ان کے سر پر بہشتی سے ایک مشک چھڑکوا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جنوری میں ٹھنڈی برف مشک سے انھیں زکام ہو گیا جس نے بعد میں نمونیے کی شکل اختیار کر لی۔ اس واقعے کے بعد بیوی ان کو تُرکی ٹوپی اُڑھا کر مشک چھڑواتی تھی۔

فدا حسین خاں تائب

فدا حسین خاں تائب کی عمر یہی کوئی ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔ لیکن تاکنے جھانکنے کا لپکا نہیں گیا تھا۔ بقول شخصے، جس نظر سے وہ پرائی بہو بیٹیوں کو دیکھتے تھے، اس نظر کے لیے ان کی اپنی بیوی ایک عمر سے ترس رہی تھی۔ تیسرے بچّے کے بعد ان کی شوہرانہ توجہات میں فرق آ گیا تھا کہ ہمارے ہاں گرہستی محبت کے لیے بچّے اسپیڈ بریکرس (رفتار شکن) کا کام دیتے ہیں۔ طبع آزاد نے ایک بیوی پر توکل نہ کیا۔ مدتوں زنانِ زودِ یاب میں نروان ڈھونڈا کیے۔ جب تک بد رای ہونے کی استطاعت رہی، تنگنائے نکاح سے نکل نکل کر شب خون مارتے رہے۔ ادھر بے زبان بیوی یہ سمجھ کر سب کچھ انگیز کرتی رہی کہ

کچھ اور وسعت چاہیے مرے میاں کے لیے

لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ موصوف نے کیا سمجھ کے تائب تخلص اختیار کیا۔ کون سا عیب ہے جو اُن میں نہیں۔ آخر کس چیز سے تائب ہوئے ہیں؟ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ شاید اشارہ نیکیوں کی طرف ہو۔

تائب کسی زمانے میں ایک کوآپریٹو بینک میں ملازمت اور شاعری کرتے تھے۔ اعداد و شمار کے ساتھ بھی شاعری کرنے کی کوشش کی اور غبن کے الزام میں نکالے گئے۔ شاعری اب بھی کرتے تھے، مگر سال میں صرف ایک بار۔ پچاسویں سالگرہ کے بعد یہ وتیرہ بنا لیا کہ ہر سال یکم جنوری کو اپنا قطعہ تاریخِ وفات کہہ کر رکھ لیتے جو بارہ تیرہ سال سے شرمندہ تعبیر ہونے سے محروم تھا۔ کلام میں صفائیِ بیان، سلاست، بندش کی چستی، خیال آفرینی اور نحوست کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دورانِ سال کسی دوست یا واقف کار کا انتقال ہو جاتا تو اس کا نام کسی مصرعے میں ٹھونس کر اپنا قطعہ اسے بخش دیتے۔

"Thy need is yet greater then mine"[1]

---

[1] سر فلپ سڈنی زتفن کے میدانِ جنگ (۱۵۸۶ء) میں زخمی حالت میں اپنی موت سے ذرا دیر پہلے پانی کی چھاگل ایک دم توڑتے ہوئے سپاہی کو دیتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے جو امر ہو گئے

کلام میں آمد تھی نہ آورد۔۔۔ بس مرحومین کی آمدورفت تھی۔ بزرگوار ان کے کلام کی داد ایک عجیب انداز سے دیتے جس کی نقل اتاری جاسکتی ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں مارے باندھے کی رسمی داد، مجلسی شائستگی، دانستہ طنز اور بے ساختہ ہنسی کی بحصہ غیر مساوی آمیزش ہوتی تھی۔ ہنسی ایسی کہ دور سے کوئی سنے تو طے نہ کرسکے کہ ہنس رہے ہیں یا رو رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ زار و قطار ہنستے تھے۔

نام کی تبدیلی کے سبب بہت سے قطعات میں سکتہ پڑنے لگتا جسے وہ ضرورتِ شعری اور تقاضائے موت کے تحت روا سمجھتے تھے۔ بعض لبِ گور دوست محض ان کے قطعے کے خوف سے مرنے سے گریز کر رہے تھے۔ بزرگوار کو تائب صاحب کا آنا بھی ناگوار گزرنے لگا۔ ایک دن کہنے لگے، یہ منحوس کیوں منڈلاتا رہوے ہے؟ میں تو جانو اس کی نیت مجھ پہ خراب ہو رہی ہے۔ اس سال کا قطعہ میرے سر، گویا کہ میرے سرہانے چیپکنا چاہتا ہے۔ پھر بطور خاص وصیت فرمائی کہ اول تو میں ایسا ہونے نہیں دوں گا، لیکن بالفرضِ محال، بالفرضِ محال فدا حسین تائب سے پہلے مر جاؤں، گو کہ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔۔۔۔ تو اس کا قطعہ میری پائینتی لگانا۔ جن قبروں کے کتبوں پر یہ قطعات مع مرحومین کے ناموں اور پھر ان کے اپنے تخلص، تائب، کے کندہ تھے، ان سے یہ پتہ نہیں

چلتا تھا کہ در حقیقت قبر میں دفن کون ہے۔ یابقول پروفیسر قاضی عبد القدوس، انتقال اہلِ قبر کا ہوا ہے یا شاعر کا۔ بعض لوگ یہ کتبے دیکھ کر تعجب کرتے کہ ایک ہی شاعر کو بار بار کیوں در گور کیا گیا۔ لیکن جب کلام پر نگاہ کرتے تو کہتے ٹھیک ہی کیا۔ کسی شاعر ہی نے کہا ہے کہ "اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد" مطلب یہ کہ بہت سے شاعر ایسے ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ شاعر مر جاتا ہے، مگر کلام باقی رہ جاتا ہے۔ اُردُو شاعری کو یہی چیز لے ڈوبی۔

محفلِ سماع خراشی

یوں کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ بزرگوار مرنے کی دھمکی نہ دیتے ہوں۔ جنرل شیر علی کی طرح قبرستان میں ایک قطعہ زمین خرید کر اپنا پختہ مزار بنوا لیا تھا جو کافی عرصے سے بے آباد پڑا تھا کہ قبضہ لینے سے ہنوز کتراتے تھے۔ اکثر خود پر عالمِ یاس طاری کر کے یہ شعر پڑھتے:

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے اُٹھ جاؤں گا

دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

شعر میں اپنی چٹ پٹ موت پر زبان کا کھیل دکھلایا گیا ہے۔ تذکیر و تانیث کی اُلٹ پلٹ سے، یعنی دیکھتے ہی دیکھتے اور دیکھتی کی دیکھتی سے بیک وقت نزاکتِ زبان و نزع اور لذّتِ تجنیس دکھانی مقصود ہے۔ اس سے تو بقول مرزا عبدالودود بیگ یہی پتہ چلتا ہے کہ بزرگوار کی موت زبان کے چٹخارے سے واقع ہوئی۔ گویا زبان سے اپنی قبر کھودی۔ تاہم حق مغفرت کرے عجب پابندِ محاورہ و روزمرہ مرد تھا۔

جس دن سے گھوڑا بزرگوار کی محفلِ سماع خراشی میں شریک ہونے لگا، انھوں نے اپنی پرانی کمخواب کی اچکن اُدھڑوا کر ہارمونیم کا غلاف بنوالیا۔ خلیفہ دھونکنی سنبھالتا اور وہ کانپتی لرزتی انگلیوں سے ہارمونیم بجانے لگتے۔ کبھی بہت جوش میں آتے تو منہ سے بے اختیار گانے کے بول نکل جاتے۔ یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل تھا کہ ان کی آواز زیادہ کپکپاتی ہے یا انگلیاں۔ جیسے ہی انتراسانس جھکولے کھانے لگتا، ان کے پڑوسی چودھری کرم الٰہی، ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر ٹلکتے ہوئے آنکلتے۔ عرصہ ہوا، گلاکوما (کالا پانی) سے ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔ انھوں نے بطورِ خاص گجرات سے ایک گھڑا منگوا کر اس کی شوخ شنگرفی زمین پر ہالہ (سندھ) ٹائلز کے نقوش پینٹ کروالیے تھے۔ کہتے تھے اوروں کو تو نظر آتا ہے۔ وہ جب اپنی آستین چڑھا کر چوڑی کلائی پر چنبیلی کا گجرا لپیٹے گھڑے پر سنگت

کرتے تو سماں باندھ دیتے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ جب سے آنکھیں گئی ہیں مالک نے مجھ پر سُر سنگیت اور سُگند کے ان گنت بھید کھول دیے ہیں۔ گمّت ہو چکتی اور راگ خشبو بن کے سارے میں رچ بس جات تو بزرگوار فرماتے "واہ وا! چوئی صاحب بھئی خوب بجاتے ہو"۔ اور چودھری صاحب اپنی بے نور آنکھیں وفورِ کیف سے بند کرتے ہوئے کہتے "لو جی تسی وی اج بڑا کمال کیتا اے" اور واقعی یہ کمالِ فن نہیں تو اور کیا تھا کہ دونوں معذور بزرگ جب جھوم جھوم کے اپنے اپنے ساز پر بیک وقت اپنے اپنے راگ درباری اور تین تال بے تال میں ماہیا کی دھن بجا کر ایک دوسرے کی سنگت کرتے تو یہ کہنا بہت دشوار تھا کہ کون کس کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں!

بزرگوار اپنی مفلوج ٹانگ کی پوزیشن چودھری کرم الٰہی سے بدلواتے ہوئے اکثر کہتے کہ جوانی میں ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ اچھے اچھے ہارمونیم ماسٹر کان پکڑتے تھے۔ ان کا یہ شوق اس دور کی یادگار تھا جب وہ بمبئی سے آئی ہوئی تھیٹریکل کمپنی کا ایک ہی کھیل ایک مہینے تک روزانہ دیکھتے اور بقیہ گیارہ مہینے اس کے ڈائیلاگ بولتے پھرتے۔ ۱۹۲۵ سے وہ ہر کھیل آرکسٹرا کے Pit میں بیٹھ کر

دیکھنے لگے تھے جو اس زمانے میں شوقینی اور رئیسانہ ٹھاٹ کی انتہا سمجھی جاتی تھی۔ ہارمونیم ایک کمپنی کے ریٹائر پیٹی بجانے والے سے سیکھا تھا جو پیٹی ماسٹر کہلاتا تھا۔ فرماتے تھے کہ پوروں کے جوڑوں اور انگلیوں کے رگ پٹھوں کو نرم اور رواں دواں رکھنے کے لیے میں نے مہینوں انگلیوں پر مہین روے کی سوجی کا حلوہ باندھا۔ ان کا رنگ گورا اور جلد بہت شفاف اور نازک تھی۔ اتنی لمبی بیماری کے باوجود اب بھی جاڑوں میں رخساروں پر سرخی جھلکتی تھی۔ غلافی آنکھیں بند کر لیتے تو اور خوب صورت لگتیں۔ سفید اچکن۔ بھری بھری پنڈلیوں پر پھنسا ہوا چوڑی دار۔ جوانی میں وہ بہت وجیہہ اور جامہ زیب تھے۔ اپنی جوانی کا ذکر آتے ہی تڑپ اٹھتے:

اک تیر تو نے مارا جگر میں کہ ہائے ہائے!

وہ بھی کیسے ارمان بھرے دن تھے، جب ہر دن ایک نئے کنول کی مانند کھِلتا تھا۔ ”جب سائے دھانی ہوتے تھے جب دھوپ گلابی ہوتی تھی“ ان کے تصور ہی سے سانس تیز تیز چلنے لگتی۔ بیٹے ہوئے روز و مہ و سال خزاں کے پتّوں کی مانند چاروں اور اُڑنے لگتے۔ ہائے! وہ استاد فیاض خاں کی وحشی بگولے کی طرح اٹھتے ہوئی الاپ۔ وہ گوہر جان کی ٹھنکتی ٹھنکارتی آواز۔ اور مختار بیگم کیسی بھری بھری

آسودہ آواز میں گاتی تھی۔ اس میں ان کی اپنی جوانی تان لیتی تھی۔ پھر خوابگینے پگھلنے لگتے۔ یادوں کا دریا بہتے بہتے خواب سَراب کے آبِ گم[1] میں اترتا چلا جاتا۔ موٹی موتی بوندیں پڑنے لگتیں۔ زمین سے لپٹ اٹھتی اور بدن سے ایک گرم مدھ ماتی مہکار پھوٹتی۔ بارش میں بھیگے تربہ ستر مہین کُرتے کچھ بھی تو نہ چھپا پاتے۔ پھر بادل باہر بھیتر ایسا ٹوٹ کے برستا کہ سبھی کچھ بہا کر لے جاتا:

سینے سے گھٹا اُٹھے، آنکھوں سے جھڑی برسے

پھاگن کا نہیں بادل جو چار گھڑی برسے

برکھا ہے یہ بھادوں کی، جو برسے تو بڑی برسے

جھما جھم مینھ برستا رہتا اور وہ ہارمونیم پر دونوں ہاتھوں سے کبھی بین، کبھی استاد جھنڈے خاں کی چہچہاتی دھوم مچاتی سلامیاں بجاتے تو کہنے والے کہتے ہیں کہ

---

[1] [10] آبِ گم: اس نام کا ایک ریلوے اسٹیشن، اور بستی بھی، بلوچستان میں ہے۔ وجہِ تسمیہ کم و بیش وہی ہے۔ قواعد کی رو سے گُم شدہ ہونا چاہیے۔ حضرت ذہین شاہ تاجی مرحوم کا شعر ہے:

وہ آئینہ کہ جس میں دیکھتے تھے عکس تم اپنا

لیے بیٹھا ہے آغوش تہی میں عکسِ گُم اپنا

کالے ناگ بلوں سے نکل کر جھومنے لگتے۔ دریچوں میں چاند نکل آتے۔ کہیں ادھورے چھڑکاؤ سے کورے پنڈے کی طرح سنسناتی چھتوں پر لڑکیاں دھنک کو دیکھ دیکھ کر اپنے لہریوں میں اتارتیں۔ اور کہیں چندن باہنوں پر سے چٹکی اور کچی چُنری کے رنگ چھٹائے نہیں چھوٹتے۔ انترے کی لے تیز ہوتی تو فضا جھن جھنن جھن گونج اٹھتی، جیسے کسی نے مستی میں آسمان اور زمین کو اٹھا کے مجیرے کی طرح ٹکرا دیا ہو اور اب رگ تاروں میں جھنک جھنکار ہے کہ کسی طور تھمنے کا نام نہیں لیتی۔

اخباری ٹوپی

تین چار مہینے بڑے سکون و عافیت سے گزرے۔ بچوں کا اسکول گرمیوں کی تعطیلات میں بند ہو گیا۔ ایک دن بشارت نے تانگا جتوایا اور کوئی دسویں دفعہ نقشہ پاس کروانے میونسپل کارپوریشن گئے۔ چلتے چلتے مولانا سے کہہ گئے کہ آج نقشہ پاس کروا کے ہی لوٹوں گا۔ بہت ہو چکی۔ دیکھتا ہوں آج باسٹرڈ کیسے پاس نہیں کرتے۔ یہ فقط گالی بھری شیخی نہیں تھی۔ اب تک وہ نظیریں اور دلائل و

براہین ساتھ لے کے جاتے تھے۔ لیکن آج وہ "سبزوں" اسے لیس ہو کر جا رہے تھے کہ شمشیرِ زرہر گتھی اور گرہ کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ تانگا گلیوں گلیوں بڑے لمبے راستے سے لے جانا پڑا، اس لیے کہ بہت کم سڑکیں بچی تھیں جن پر تانگا چلانے کی اجازت تھی۔ تانگا اب رکشہ سے بھی پھٹیچر چیز سمجھی جانے لگی۔ لہٰذا صرف انتہائی غریب علاقوں میں چلتا تھا جو شہر میں ہوتے ہوئے بھی شہر کا حصہ نہیں تھے۔ نیرنگیِ زمانہ کیا کہیے۔ کانپور سے یہ خواب دیکھتے ہوئے آئے تھے کہ اللہ ایک ایسا دن بھی لائے گا جب فٹن میں ٹانگوں پر اٹالین کمبل ڈال کر نکلوں گا تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھیں گے، کس رئیس کی سواری جارہی ہے ؟ لیکن جب خواب کی تعبیر نکلی تو دنیا اتنی بدل چکی تھی کہ نہ صرف تانگہ چھپ کر نکلتا بلکہ وہ خود بھی اس میں چھُپ کر بیٹھتے۔ ان کا بس چلتا تو اٹالین کمبل سر سے پیر تک اوڑھ لپیٹ کر نکلتے کہ کوئی پہچان نہ لے۔ دن میں جب بھی تانگے میں بیٹھتے تو "ڈان" اخبار کے دونوں ورق اپنے چہرے اور سینے کے سامنے پھیلا کر بیٹھتے کہ ان کی لٹکی ہوئی ٹانگیں اخبار ہی کا ضمیمہ معلوم ہوتی تھیں۔ مرزا عبدلودود

[1] سبزے: سوروپے کے نوٹ، اپنے سبز رنگ کے سبب سبزے کہلاتے تھے۔ جب نوٹ کا رنگ سرخ ہو گیا تو لوگ نوٹ کو نوٹ ہی کہنے لگے۔ سُرخا کسی نے نہیں کہا۔

بیگ نے تو ایک دن کہا بھی کہ تم اخبار کی ایک ٹوپی بنوالو جس میں اپنا منہ چھپا سکو۔ ویسی ہی جِلادی ٹوپی جیسی مجرم کو پھانسی پر لٹکانے سے پہلے پہنائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مجرم کو اخباری ٹوپی ہی پہنا کر پھانسی دینی چاہیے تاکہ اخبار والوں کو بھی تو عبرت ہو۔

اسپ کی ایک جست نے۔۔۔

میونسپل کارپوریشن کی عمارت کوئی چار پانچ سو گز دور رہ گئی ہوگی کہ اچانک گلی کے موڑ سے ایک جنازہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ خلیفہ کو ملازم رکھتے وقت انھوں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ گھوڑے کو بہر صورت جنازے سے دور رکھنا۔ لیکن اس وقت اس کا دھیان کہیں اور تھا اور جنازہ تھا کہ گھوڑے پر چڑھا چلا آرہا تھا۔ بشارت اخبار پھینک کر پوری طاقت سے چیخے "جنازہ! جنازہ!! خلیفہ جنازہ!!!" یہ سنتے ہی خلیفہ نے چابک مارنے شروع کر دیے۔ گھوڑا وہیں کھڑا ہو کر ہنہنانے لگا۔ خلیفہ اور بدحواس ہو گیا۔ بشارت نے خود لگام پکڑ کر گھوڑے کو دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اڑیل ہو کر دولتیاں مارنے لگا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ دراصل یہی وہ جگہ تھی جہاں خلیفہ گھوڑے کو باندھ کر حجامت کرنے چلا جاتا تھا۔ وہ چیخے "ذرا طاقت سے چابک مار"۔ ادھر خطرہ یعنی جنازہ لمحہ بہ

لمحہ قریب آ رہا تھا۔ ان پر اب دہشت طاری ہو گئی۔ ان کے بوکھلائے ہوئے اندازے کے مطابق جنازہ اب اسی "رینج" میں آ گیا تھا جہاں چند ماہ بیشتر بقول اسٹیل مل کے سیٹھ کے

اسپ کی ایک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام

وہ خود اس وقت گھوڑے سے بھی زیادہ بدکے ہوئے تھے، اس لیے کہ گھوڑے کے پیٹ پر لات مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی ہنہناہٹ ان کی چیخوں میں دب گئی۔ گھوڑے کے اس پار خلیفہ دیوانہ وار چابک چلا رہا تھا۔ چابک زور سے پڑتا تو گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو ہو جاتا۔ خلیفہ نے غصے سے بے قابو ہو کر دو مرتبہ اسے "تیرا دھنی مرے"! کی گالی دی تو بشارت سناٹے میں آ گئے۔ لیکن سرِ دست وہ گھوڑے کو قابو میں لانا چاہ رہے تھے۔ خلیفہ کو ڈانٹنے لگے "ابے کیا ڈھیلے ڈھیلے ہاتھوں سے مار رہا ہے، خلیفے!"

یہ سننا تھا کہ خلیفہ فاسٹ بولر کی طرح سٹارٹ لے کر دوڑتا ہوا آیا اور دانت کچکچا تے ہوئے، آنکھیں بند کر کے پوری طاقت سے چابک مارا، جس کا آخری سرا بشارت کے منہ اور آنکھ پر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے تیزاب سے لکیر کھینچ دی ہے۔ فرماتے تھے "یہ کہنا تو under statement (کسر بیانی) ہو گا کہ

آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے دونوں آنکھوں کا فیوز اڑ گیا ہو‘‘۔
خلیفہ سے خلیفے، خلیفے سے ابے اور ابے سے الّو کے پٹّھے تک کی تمام منزلیں ایک ہی چابک میں طے ہو گئیں۔ عالمِ وحشت میں وہ خلیفہ تک کیسے پہنچے، گھوڑے کو پھلانگ کر گئے یا ٹانگوں کے نیچے سے، یاد نہیں۔ خلیفہ کے ہاتھ سے چابک چھین کر دو تین اسی کو رسید کیے۔ اس نے اپنی چیخوں سے گھوڑے کو سر پر اٹھا لیا۔

ایک آنکھ میں اتنی سوزش تھی کہ اس کے اثر سے دوسری بھی بند ہو گئی۔ اور وہ بند آنکھوں سے گھوڑے پر چابک چلاتے رہے۔ کچھ دیر بعد دفعتاً احساس ہوا کہ چابک کو روکنے کے لیے سامنے کچھ نہیں ہے۔ زخمی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر بائیں کھولی تو نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ جنازہ بیچ سڑک پر اریب (diagonal) رکھا تھا۔ تانگا بگٹٹ جا رہا تھا۔ کندھا دینے والے غائب۔ خلیفہ لاپتا۔ البتہ ایک سوگوار بزرگ جو زرد املتاس کے پیڑ سے لٹکے ہوئے تھے گھوڑے کے شجرہ نسب میں پدری حیثیت سے داخل ہونے اور اپنا وظیفہ زوجیت حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔

چند منٹ بعد لوگوں نے اپنی اپنی گھُڑپناہ سے نکل کر انہیں نرغے میں لے لیا۔ جسے دیکھو اپنی ہی دھائیں دھائیں کر رہا ہے، ان کی سننے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ طرح طرح کی آوازیں اور آوازے سنائی دیے:

"اس پر سالے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں!"

"گھوڑے کو شوٹ کر دینا چاہیے"

"گھوڑے کو نہیں مالک کو"

"تھانے لے چلو"۔

(بشارت کی ٹائی پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے) "ہماری میت کی بے حرمتی ہوئی ہے۔ اس کا منہ کالا کر کے اسی گھوڑے پہ جلوس نکالو"

بشارت نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ بلبن کو انجکشن سے ہلاک کروا دیں گے۔

گھر آ کے انھوں نے بلبن کو چابک سے اتنا مارا کہ محلّے والے جمع ہو گئے۔

اس رات وہ اور بلبن دونوں نہ سو سکے۔ اس سے پہلے انہوں نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ خلیفہ نے چابک میں بجلی کا تار باندھ رکھا ہے۔

بلبن کو سزائے موت

صبح انھوں نے خلیفہ کو برخواست کر دیا۔ وہ پیٹی بغل میں مار کے جانے لگا تو ہاتھ جوڑ کے بولا "بچوں کی قسم! گھوڑا بالکل بے قصور تھا۔ وہ تو چپکا کھڑا تھا۔ آپ ناحق پٹوا رہے تھے۔ اتنی مار کھا کے تو مردہ گھوڑا بھی اُٹھ کے سرپٹ دوڑنے لگتا۔ السلام علیکم (لوٹ کر آتے ہوئے) قصور معاف! حجامت بنا بے جمعے کو کس وقت آؤں؟"

ایک دوست نے رائے دی کہ گھوڑے کو "ویٹ" سے انجکشن نہ لگواؤ۔ جانور بے انتہا اذیت اٹھا کے تڑپ تڑپ کے مرتا ہے۔ میں نے اپنے السیشن کتّے کو اسپتال میں انجکشن سے مرتے دیکھا تو دو دن تک ٹھیک سے کھانا نہ کھا سکا۔ وہ میرے کڑے وقتوں کا ساتھی تھا۔ مجھے بڑی بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ یہ بڑا بدنصیب، بڑا دکھی گھوڑا ہے۔ اس نے اپنی معذوری اور تکلیف کے باوجود تمھاری، تمھارے بچوں کی بڑی خدمت کی ہے۔

اسی دوست نے کسی شخص کو فون کر کے بلبن کو گولی مارنے کا انتظام کر دیا۔

بلبن کو ٹھکانے لگوانے کا کام مولانا کرامت حسین کے سپرد ہوا۔ وہ بہت الجھے۔ بڑی منطق چھانٹی۔ کہنے لگے، پالتو جانور، خدمتی جانور، جانور نہیں رہتا۔ وہ تو بیٹا بیٹی کی طرح ہوتا ہے۔ بشارت نے جواب دیا، آپ کو معلوم ہے گھوڑے کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ اس لنگڑ دین کو آٹھ نو سال تک کھڑا کون کھلائے گا؟ میں نے تمام عمر اسے ٹھسانے، زندہ رکھنے کا ٹھیکا تو نہیں لیا۔ مولانا اپنی ماتحتانہ حیثیت بھول کر یکایک جلال میں آ گئے۔ زمین کے قضیے کا رخ آسمان کی طرف موڑتے ہوئے کہنے لگے کہ انسان کی یہ طاقت، یہ مجال کہاں کہ کسی کو روزی دے سکے۔ رازق تو وہی ہے جو پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے۔ جو بندہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی کو رزق دیتا ہے، وہ در حقیقت خدائی کا دعوے دار ہے، ہر ذی روح اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اللہ کا وعدہ بر حق ہے۔ وہ ہر حال میں، ہر صورت میں رزق دیتا ہے۔

”بے شک! بے شک! رشوت کی صورت میں بھی!“ بشارت کے منہ سے نکل گیا۔ فقرہ ترازو ہو گیا۔ مولانا ہی نہیں خود بشارت بھی دھک سے رہ گئے کہ کیا کہہ دیا۔ جس کمینے، انتقامی فقرے کو آدمی برسوں سینے میں دبائے رکھتا ہے، وہ ایک نہ ایک دن اچھل کر اچانک منہ پر آ ہی جاتا ہے۔ پٹّی باندھنے سے کہیں دل کی پھانس نکلا کرتی ہے۔ اور جب تک وہ نکل نہ جائے آرام نہیں آتا۔

وہ جو قرض اک تھا زبان پر، وہ حساب آج چکا دیا

مولانا صبح تڑکے بلبن کو لینے آ گئے۔ گیارہ بجے اسے نارتھ ناظم آباد کی پہاڑیوں کی تلیٹی میں گولی ماری جانے والی تھی۔

بشارت ناشتے پر بیٹھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے حلق میں پھندا الگ گیا ہو۔ آج انھوں نے بلبن کی صورت نہیں دیکھی"۔ گولی تو ظاہر ہے پیشانی پر مارتے ہوں گے"۔ اُنھوں نے سوچا بائیں آنکھ کی بھونری واقعی منحوس نکلی۔ جان لے کر رہے گی۔ مولانا کو انھوں نے رات ہی کو ہدایت کر دی تھی کہ لاش کو اپنے سامنے ہی گڑھے میں دفن کرا دیں۔ جنگل میں چیل کوؤں کے لیے پڑی نہ چھوڑیں۔ انھیں جھرجھری آئی اور وہ کباب پراٹھا کھائے بغیر اپنی دکان روانہ ہو گئے۔ راستے میں انھوں نے اس کا ساز اور روہڑ کا وہ خون آلود پیڈ پڑا دیکھا جو اس کی زخمی گردن پر باندھا جاتا تھا۔ ایسا لگا جیسے انھیں کچھ ہو رہا ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نکل گئے۔

بزرگوار کو اصل صورتِ احوال سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ انھیں صرف یہ بتایا گیا کہ بلبن دو ڈھائی مہینے کے لیے چَرائی پر پنجاب جا رہا ہے۔ وہ کہنے لگے "گائے

بھینسوں کو تو چرائی پر جاتے سنا تھا، مگر گھوڑے کو گھانس کھانے کے واسطے کراچی سے صوبہ پنجاب جاتے آج ہی سنا! کراچی سے تو صرف سیٹھ اور لکھ پتی سیزن کے سیزن چَرائی پر کوہ مری جاویں ہیں"۔ یہ ان سے الجھنے کا موقع نہیں تھا۔ ان کا بلڈ پریشر پہلے ہی بہت بڑھا ہوا تھا۔ انھیں کسی زمانے میں اپنی طاقت اور کسرتی بدن پر بڑا ناز تھا۔ اب بھی بڑے فخر سے کہتے تھے کہ میرا بلڈ پریشر دو آدمیوں کے برابر ہے۔ دو آدمیوں کے برابر والے دعوے کی ہم بھی تصدیق کریں گے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انھیں معمولی سا درد ہوتا تو دو آدمیوں کی طاقت سے چیختے تھے۔ لہٰذا بشارت اپنے دروغِ مصلحت آمیز پر ڈٹے رہے۔ اور ٹھیک ہی کیا۔ مرزا اکثر کہتے ہیں کہ اپنے چھوٹوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، کیوں کہ اس سے انھیں بھی تحریک ہوتی ہے۔ لیکن بزرگوں کی اور بات ہے۔ انھیں کسی خارجی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مولانا راس پکڑے بلبن کو بزرگوار سے ملوانے لے گئے۔ ان کا آدھے سے زیادہ سامان ان کے اپنے کمرے میں منتقل ہو چکا تھا۔ ہارمونیم رحیم بخش کے لال کھیس میں لپیٹا جا رہا تھا۔ بلبن کا فوٹو ریس جیتنے کے بعد اخبار میں چھپا تھا، ابھی دیوار سے اتارنا باقی تھا۔ وہ رات سے بہت مغموم تھے۔ خلافِ معمول عشاء کے بعد دو مرتبہ حقّہ پیا۔ اب وہ صبح و شام کیسے کاٹیں گے؟ اس وقت جب بلبن ان

کے پاس لایا گیا تو وہ سر جھکائے دیر تک اپنے ایال میں کنگھی کراتا رہا۔ آج انھوں نے اس کے پاؤں پر دَم نہیں کیا۔ جب وہ اس کی پیشانی پر اللہ لکھنے لگے تو ان کی انگلی چابک کے اُبڑے ہوئے لمبے نشان پر پڑی اور وہ چونک پڑے۔ جہاں تک یہ درد کی لکیر جاتی تھی ہاں تک خود کو زخماتے رہے۔ پھر دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگے "کس نے مارا ہے ہمارے بیٹے کو؟" مولانا اسے لے جانے لگے تو اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے "اچھا۔ بلبن بیٹے! ہمارا تو چل چلاؤ ہے۔ خدا جانے واپسی پر ہمیں پاؤ گے بھی یا نہیں۔ جاؤ، اللہ کی امان میں دیا"۔

بلبن کی جدائی کے خیال سے بزرگوار ڈھے گئے۔ اب وہ اپنے دل کی بات کس سے کہیں گے؟ کس کی شفا کے لیے دعا کو بے اختیار ہاتھ اٹھیں گے؟ انھوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ قدرت کو اتنا سا آسرا، ایک جانور کی دُسراتھ تک منظور نہ ہو گی۔ جو خود کبھی تنہائی کے جان کو گھلا دینے والے کرب سے نہ گزرا ہو وہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اکیلا آدمی کیسی کیسی دسراتھ کا سہارا لیتا ہے۔ بے مثل انشائیوں کے مصنف چارلس لیمب نے ایک عمر کرب و تنہائی میں گزاری۔ پیر ۱۲ مئی ۱۸۰۰ء کو وہ کولرج کو اپنے خط میں لکھتا ہے "گزشتہ جمعے کو ہیٹی (ضعیف ملازمہ) آٹھ دن کی علالت کے بعد چل بسی۔ اس کی میّت اس وقت کمرے میں میرے سامنے رکھی ہے۔ میری (چارلس لیمب کی بہن جسے دیوانگی کے دَورے پڑتے

تھے)اس صدمے کی تاب نہ لا سکی اور اس پر شدید دَورہ پڑا۔ لہٰذا اسے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا۔ اب اس گھر میں، میں تنہا ہوں اور دسراہٹ کے لیے بیٹی کی نعش کے سوا اور کوئی نہیں۔ کل میں اسے بھی دفن کر دوں گا تو بالکل ہی تنہا رہ جاؤں گا۔ پھر اس بلی کے اور کوئی نہ ہو گا جو مجھے یاد دلائے کہ ان آنکھوں نے کبھی اس گھر کو بھرا پُرا دیکھا تھا۔ کبھی اس میں بھی مجھ جیسے ذی روح رہتے تھے“۔

مولانا دن بھر غیر حاضر رہے۔ دوسرے دن وہ بند بند اور کھنچے کھنچے سے نظر آئے۔ کئی سوال ہونٹوں پر لرز لرز کر رہ گئے۔ کسی کو ان سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ بلبن کے گولی کہاں لگی۔ کہتے ہیں جانوروں کو موت کا premonition (پیش آگاہی) ہو جاتا ہے۔ تو کیا جب وہ ویران پہاڑیوں میں لے جایا جا رہا تھا تو اس نے بھاگنے کی کوشش کی؟ اور کبھی آکری لمحے میں معجزہ بھی تو ہو جایا کرتا ہے۔ وہ بہت جفاکش، سخت جان اور حوصلے والا تھا۔ دل نہیں مانتا کہ اس نے آسانی سے موت سے ہار مانی ہو گی:

Do not go gentle into that good night.

Rage, rage against the dying of the light

آہا آہا! برکھا آئی!

کوئی دو ہفتے بعد بشارت کی طاہر علی موسیٰ بھائی سے اسپنسر آئی ہاسپٹل کے سامنے مڈبھیڑ ہو گئی۔ موسیٰ بھائی بوہری تھا اور اس کی لکڑی کی دکان ان سے اتنے فاصلے پر تھی کہ پتھر پھینکتے تو ٹھیک اس کی سنہری پگڑی پر پڑتا۔ یہ حوالہ اس لیے بھی دینا پڑا کہ کئی مرتبہ بشارت کا دل اس پر پتھر پھینکنے کو چاہا۔ وہ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ ان کے لگے ہوئے گاہک توڑتا اور طرح طرح کی افواہیں پھیلاتا رہتا۔ دراصل وہ ان کی بزنس خراب کر کے ان کی دکان خریدنا چاہتا تھا۔ اس کی چھدری داڑھی طوطے کی چونچ کی طرح مڑی رہتی تھی۔

وہ کہنے لگا ''بشارت سیٹھ! لاسٹ منتھ ہم کو کسی نے بولا آپ گھوڑے کو شوٹ کر وا رہے ہو۔ ہم بولا، باپ رے باپ! یہ تو ایک دَم ہتھیا ہے۔ وہ گھوڑا تو عشرہ (محرم) میں دُلدل جنا (ذوالجناح) بنا تھا! ہماری آرا مشین پہ ایک مجور کام کرتا ہے، تراب علی۔ اس نے ہم کو آ کے بولا کہ میری جھگّی کے سامنے سے دُلدل کی سواری نکلی تھی۔ آپ ہی کا گھوڑا تھا۔ سیم ٹو سیم۔ سولہ آنے۔ تراب علی نے اس کو اپنے ہاتھ سے دودھ جلیبی کھلائی۔ آپ کے کوچوان نے اس کا پورا بھاڑا وصول کیا۔ پچاس روپے۔ وہ بولتا تھا بشارت سیٹھ دُلدل بھاڑے ٹیکسی پہ چلانا مانگتا ہے۔

دُلدل کے آگے وہ شاہ مرداں، شیر یزداں، وگیرہ وگیرہ گاتا جارہا تھا۔ اس کے پندرہ روپے الگ سے۔ گھوڑے کو ہمارے پاس بھی سلام کرانے لایا تھا۔ گریب بال بچّے دار مانس ہے"۔

اس کے اگلے روز مولانا کام پر نہیں آئے۔ دو دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ چار دن قبل جیسے ہی ریڈیو کراچی والوں نے بارش کا پہلا قطرہ گرتے دیکھا ساون کے گیت مسلا دھار نشر کرنے شروع کر دیے۔ گیتوں ہی سے اطلاع ملی کہ یہ ساون ہے ورنہ ساون کے مہینے کو کراچی میں کون پہچانتا ہے۔ لیکن ذرا سوچیے تو، گیت میں اگر ساون کے بجائے جون جولائی تو برکھارُت کا سارا رومانس پُروا اڑا کر لے جائے۔ وہ مسکرا دیے۔ آج صبح گھر سے چلتے وقت کہہ آئے تھے "بیگم! آج تو کڑھائی چڑھنی چاہیے۔ کراچی میں تو ساون کے پکوان کو ترس گئے۔ خستہ سموسے، کرارے پاپڑ اور کچوریاں۔ کراچی کے پیتے کھا کھا کے ہم تو بالکل پلپلا گئے"۔ شام کو جب وہ دکان بند کرنے والے تھے، ایک شخص خبر لایا کہ کل شام مولانا کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آج ظہر و عصر کے درمیان جنازہ اٹھا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ چلو اچھا ہوا۔ اللہ نے بیچارے کی سُن لی۔ برسوں کی جان کنی ختم ہوئی۔ مٹی عزیز ہو گئی۔ بلکہ یوں کہیے، کیچڑ سے اٹھا کر کر خشک مٹی میں دبا آئے۔ وہ تعزیت کے لیے سیدھے مولانا کے گھر پہنچے۔ بارش تھم چکی تھی اور چاند نکل آیا

تھا۔ آسمان پر ایسا لگتا تھا جیسے چاند بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے اور بادل اپنی جگہ ساکت ہیں۔ اینٹوں، پتھروں اور ڈالڈا کے ڈبوں کی پگڈنڈیاں جا بجا پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ ننگ دھڑنگ لڑکوں کی ایک ٹولی پانی میں ڈبک ڈبک کرتے ایک گھڑے میں باری باری منہ ڈال کر فلمی گانے گا رہی تھی۔ ایک ڈھئی ہوئی جھگی کے سامنے ایک کریہہ الصّوت شخص بارش کو روکنے کے لیے اذان دیے چلا جا رہا تھا۔ ہر جزو کے آخری لفظ کو اتنا کھینچتا گویا اذان کے بہانے پکا راگ الاپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کانوں میں انگلی کی پور زور سے ٹھونس رکھی تھی تاکہ اپنی آواز کے عذاب سے محفوظ رہے۔ ایک ہفتے پہلے اسی جھگی کے سامنے اسی شخص نے بارش لانے کے لیے اذانیں دی تھیں۔ اسوقت بچوں کی ٹولیاں گھروں کے سامنے مولا میگھ دے! مولا پانی دے! تال، کنویں، مٹکے سب خالی۔ مولا! پانی! پانی! پانی!" گاتی اور ڈانٹ کھاتی پھر رہی تھیں۔

عجیب کسمپرسی کا عالم تھا۔ کہیں چٹائی، ٹاٹ، سرکی اور اخبار کی ردی سے بنی ہوئی چھتوں کے پیالے پانی کے لبالب بوجھ سے لٹکے پڑ رہے تھے اور کہیں گھر کے مرد پھٹی ہوئی چٹائیوں میں دوسری پھٹی ہوئی چٹائیوں کے پیوند لگا رہے تھے۔ ایک شخص ٹاٹ پر پگھلا ہوا تارکول پھیلا کر چھت کے اس حصے کے لیے ترپال بنا رہا تھا جس کے نیچے اس کی بیمار ماں کی چارپائی تھی۔ دوسرے کی جھگی بالکل ڈھیر ہو گئی

تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مرمت کہاں سے شروع کرے۔ چنانچہ وہ ایک بچّے کی پٹائی کرنے لگا۔ جگہ جگہ لوگ نالیاں بنا رہے تھے جن کا مقصد بظاہر اپنی غلاظت کو پڑوسی کی غلاظت سے علیحدہ رکھنا تھا۔ ایک صاحب آٹے کی بھیگی بوری میں بغل تک ہاتھ ڈال ڈال کر دیکھ رہے تھے کہ اندر کچھ بچا بھی ہے کہ سارا پیڑے بنانے کے لائق ہو گیا۔ ایک جھگی کے باہر بکری کی اوجھڑی پر برساتی مکھیاں چپکو اور لدّھڑ ہو گئیں تھیں، خارشی کتّے کے اُڑائے سے نہیں اُڑ رہی تھیں۔ یہ اس دودھ دینے والی مگر بیمار بکری کی اوجھڑی تھی جسے تھوڑی دیر پہلے اس کے دو مہینے کے بچّے سے ایک گز دور تین پڑوسیوں نے مل کر ٹُرت پھُرت ذبح کیا تھا تاکہ چھری پھرنے سے پہلے ہی ختم نہ ہو جائے۔ اس کا خون معاون نالوں اور نالیوں کے ذریعے دور دور تک پھیل گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے ایک بھائی کی حق حلال کی کمائی کو ضائع ہونے سے بال بال بچالیا۔ موت کے منہ سے کیسا نکالا تھا انھوں نے بکری کو! چند جھگیوں میں مہینوں بعد گوشت پکنے والا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انھیں اس وقت ہوئی جب وہ اس جھگی کے سامنے سے گزرے جس میں لڑکیاں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ باہر لگی ہوئی کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں تو اب نظر نہیں آ رہی تھیں، لیکن ان کے کچے رنگوں کے باؤلے ریلوں سے ٹاٹ کی دیوار پر

psychedelic patterns بن گئے تھے۔ ایک لڑکی آٹا گوندھنے کے تسلے پر سنگت کر رہی تھی کہ بارش سے اس کی ڈھولک کا گلا بیٹھ گیا تھا:

اماں! میرے بابا کو بھیجوری کہ ساون آیا!

امّاں! میرے بھیا کو بھیجوری کہ ساون آیا!

کہ ساون آیا

ہر بول کے بعد لڑکیاں بے وجہ ہنستیں۔ گاتے ہوئے ہنستیں اور ہنستے ہوئے گاتیں تو راگ اپنی سُر سیما پار کر کے جوانی دوانی کی لے میں لے ملاتا کہیں اور نکل جاتا۔ سچ پوچھیے تو کنوار پنے کی کلکارتی گھنگھرالی ہنسی کی مُرکی ہی گیت کا سب سے البیلا ہریالا انگ تھا۔ ایک جھگّی کے سامنے میاں بیوی لحاف کو رسّی کی طرح بل دے کر نچوڑ رہے تھے۔ بیوی کا بھیگا ہوا گھونگھٹ ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹک رہا تھا۔ بیس ہزار کی اس بستی میں دو دن سے بارش کے سبب چُولہے نہیں جلے تھے۔ نشیبی علاقے کی کچھ جھگیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا تھا۔ جھگیّوں کی پہلی قطار کے سامنے ایک نیک نیت، خدا ترس، باریش بزرگ قورمہ اور تنوری روٹیاں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو وہ رکشا میں رکھ کر لائے تھے۔ تین لحاف

بھی مستحقین میں بانٹنے کے لیے ساتھ لائے تھے۔ وہ گھر سے چلے تو انھیں اندازہ نہیں تھا کہ بیس ہزار کی بستی میں تین لحاف لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی انجکشن کی سرنج سے آگ بجھانے کی کوشش کرے۔ پھر یہ بھی تھا کہ کسی جھگّی میں دو گز زمین کا ایسا خشک جزیرہ نہ تھا جہاں کوئی یہ لحاف اوڑھ کر سو سکے۔ اس بزرگ کے چاروں طرف کوئی ڈیڑھ دو سو ننگ دھڑنگ بچوں کا ہجوم جسے وہ کیو بنانے کے فوائد سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان اَن پڑھ ٹھوٹ بچوں کی حِس حساب ان سے کہیں بہتر تھی، کیوں کہ ان کے اندر والا بھوکا حساب داں بخوبی جانتا تھا کہ اگر تیس روٹیوں کو دو سو ننگے بھوکوں اور تین لحافوں کو بیس ہزار مستحقین میں تقسیم کیا جائے تو حاصل تقسیم میں مخیر بزرگ کے تن پر ایک دھجّی بھی باقی نہ رہے گی۔ اور اس وقت یہی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ بشارت آگے بڑھے تو دیکھا کوئی جھگّی ایسی نہیں جہاں سے بچوں کے رونے کی آواز نہ آ رہی ہو۔ پہلی مرتبہ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ بچّے رونے کی ابتدا ہی انترے سے کرتے ہیں۔ جھگّیوں میں آدھے بچّے تو اس لیے پٹ رہے تھے کہ رو رہے تھے۔ اور بقیہ آدھے اس لیے رو رہے تھے کہ پٹ رہے تھے۔

وہ سوچنے لگے، تم ایک شخص کو پُرسا دینے چلے تھے، یہ کس دکھ ساگر میں آ نکلے۔ طرح طرح کے خیالوں نے گھیر لیا۔ بڑے میاں کو تو کفن بھی بھیگا ہوا

نصیب ہوا ہو گا۔ یہ کیسی بستی ہے جہاں بچّے نہ گھر میں کھیل سکتے ہیں، نہ باہر۔ جہاں بیٹیاں دو گز زمین پہ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے درختوں کی طرح بڑی ہو جاتی ہیں۔ جب یہ دلہن بیاہ کر پردیس جائے گی تو اس کے ذہن میں بچپن اور میکے کی کیا تصویر ہو گی؟ پھر خیال آیا کیسا پردیس، کہاں کا پردیس، یہ تو بس لال کپڑے پہن کر یہیں کہیں ایک جھگّی سے دوسری جھگّی میں پیر پیدل چلی جائے گی۔ یہی سکھیاں سہیلیاں "کاہے کو بیاہی بدیس رے! لکھی بابل مورے!" گاتی ہوئے اسے دو گز پرائی زمین کے ٹکڑے تک میں چھوڑ آئیں گی۔ پھر ایک دن مینہ برستے میں ایسا ہی سماں ہو گا، وہاں سے آخری دو گز زمین کی جانب ڈولی اٹھے گی۔ اور زمین کا بوجھ زمین کی چھاتی مین سما جائے گا۔ مگر سنو! بندہ خدا! تم کاہے کو یوں جی بھاری کرتے ہو؟ کہیں اس طرح آنکھوں میں پانی بھر کے دنیا کو دیکھا کرتے ہیں؟ درختوں کو کیچڑ گارے سے گھن تھوڑا ہی آتی ہے۔ کبھی پھول کو بھی کھاد کی بدبو آئی ہے؟

انھوں نے ایک پھریری لی اور ان کے ہونٹوں کے دائیں کونے پر ایک کڑوی سی، ترچھی سی مسکراہٹ کا بھنوّر پڑ گیا۔ جو رونے کا یارا نہیں رکھتے وہ اسی طرح مسکرا دیتے ہیں۔

انھوں نے پہلے پہل اس اگھور بستی کو دیکھا تھا تو کیسی ابکائی آئی تھی۔ آج خوف آ رہا تھا۔ بھیگی بھیگی چاندنی میں یہ ایک شہر آسیب لگتا تھا جو کسی طور کراچی کا حصہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ حدِ نگاہ تک اونچے نیچے بانس ہی بانس۔ اور ٹپکتی چٹائیوں کی گپھائیں۔ بستی نہیں بستی کا پنجر لگتا تھا جسے ایٹمی دھماکے کے بعد بچ جانے والوں نے کھڑا کیا ہو۔ ہر گڑھے میں چاند نکلا ہوا تھا اور مہیب دلدلوں پر آسیبی کرنیں اپنا چھلاوا ناچ ناچ رہی تھیں۔ جھینگر ہر جگہ بولتے سنائی دے رہے تھے اور کسی جگہ نظر نہیں آرہے تھے۔ بھُنگوں اور پتنگوں کے ڈر سے لوگوں نے لالٹینیں گل کر دیں تھیں۔ عین بشارت کے سر کے اوپر سے چاند کو کاٹتی ایک ٹیٹری بولتی ہوئی گزری۔ اور انھیں ایسا لگا جیسے اس کے شہ پَر کی ہَوا سے ان کے سر کے بال اُڑے ہوں۔ نہیں۔ یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب ہے۔ جیسے ہی وہ موڑ سے نکلے، اگربتیوں اور لوبان کی ایک سوگوار لپٹ آئی اور آنکھیں ایکا ایکی چکاچوند ہو گئیں۔ یا خدا! ہوش میں ہوں یا عالمِ خواب ہے؟

کیا دیکھتے ہیں کہ مولانا کرامت حسین کی جھگّی کے دروازے پر ایک پیٹرومیکس جل رہی ہے۔ چار پانچ پُرسا دینے والے کھڑے ہیں۔ اور باہر اینٹوں کے ایک چبوترے پر ان کا سفید براق گھوڑا بلبن کھڑا ہے! مولانا کا پولیو زدہ بیٹا اس کو پڑوسی کے گھر سے آئے ہوئے موت کے کھانے کے نان کھلا رہا تھا۔

کار، کابلی والا [1] اور الہ دین بے چراغ

اعصاب پہ گھوڑا ہے سوار

علامہ اقبال نے ان شاعروں، صورت گروں اور افسانہ نویسوں پر بڑا ترس کھایا ہے جن کے اعصاب پہ عورت سوار ہے۔ مگر ہمارے حبیب لبیب اور ممدوح بشارت فاروقی ان بد نصیبوں میں سے تھے جن کی بے داغ جوانی اس شاعر کے کلام کی طرح تھی جس کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ موصوف کا کلام غلطیوں اور لطف دونوں سے پاک ہے! بشارت کی ٹریجڈی شاعروں، آرٹسٹوں اور

---

[1] کابلی والا: برصغیر کی تقسیم سے قبل تقریباً ہر بڑے شہر میں سود پر قرض دینے والے افغانی بکثرت نظر آتے تھے۔ ان کی شرح بالعموم سو فیصد سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ اور وصولی کے طریقے اس سے بھی زیادہ ظالمانہ۔ قرض لینے والے عموماً غریب غربا اور نوکری پیشہ لوگ ہوتے تھے۔ جس نے ان سے ایک دفعہ قرض لے لیا، وہ تادمِ مرگ سُود ہی ادا کرتا رہتا تھا۔ اور تادمِ زرِ اصل اور خان صاحب سر پر جوں کے توں کھڑے رہتے تھے۔ بنگال اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی بیاج پر روپیہ چلانے والے افغانی کا کابلی والا کہتے تھے۔ ٹیگور نے اسی عنوان سے ایک بہت خوبصورت کہانی لکھی ہے، جس کا ہمارے قضیۂ نما قصّے سے کوئی تعلق نہیں۔

افسانہ نویسوں سے کہیں زیادہ گھور گھمبیر تھی۔ اس لئے کہ دکھیا کے اعصاب پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی سوار رہا، سوائے عورت کے۔ اس دور میں جسے ناحق جوانی دیوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے اعطاب پر بالترتیب مُلّا، ناصح، بزرگ، ماسٹر فاخر حسین، ممتحن، مولوی مظفر، داغ دہلوی، سہگل اور خسرِ بزرگوار سوار رہے۔ خدا خدا کر کے وہ اسی ترتیب سے ان پر سے اترے تو گھوڑا سوار ہو گیا، جس کا قصّہ ہم ''اسکول ماسٹر کا خواب'' میں بیان کر چکے ہیں۔ وہ سبز قدم ان کے خواب، ذہنی سکون اور گھریلو بجٹ پر جھاڑو پھیر گیا۔ روز روز کے چالان، جرمانے اور رشوت سے وہ اتنے تنگ آ چکے تھے یہ اکثر کہتے کہ اگر مجھے چوائس دی جائے کہ تم گھوڑا بننا پسند کرو گے یا اس کا مالک یا کوچوان تم میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے SPCA کا انسپکٹر بننا پسند کروں گا جو ان تینوں کا چالان کرتا ہے۔

سنگین غلطی کرنے کے بعد پس بینی (hindsight) کا مظاہرہ کرنے والوں کی طرح وہ اُس زمانے میں چوائس کی بہت بات کرتے تھے۔ مگر چوائس ہے کہاں؟ مہاتما بدھ نے تو دوٹوک بات کہہ دی کہ اگر چوائس دی جاتی تو وہ پیدا ہونے سے ہی انکار کر دیتے۔ لیکن ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ گھوڑے کو اگر چوائس دی جائے تو وہ اگلے جنم میں بھی گھوڑا ہی بننا پسند کرے گا۔ مہاتما بدھ بنناب ہرگز پسند نہیں کرے گا، کیوں کہ وہ گھوڑیوں کے ساتھ ایسا سلوک روا نہیں رکھ سکتا

جیسا گوتم بدھ نے یشودھرا کے ساتھ کیا۔ یعنی انہیں غافل سوتا چھوڑ کر بیابان کو نکل جائے یا کسی جاکی کے ساتھ بھاگ جائے۔ گھوڑا کبھی اپنے گھوڑے پن سے شرمندہ نہیں ہو سکتا۔ نہ کبھی اس غریب کو فلکِ کج رفتار سے شکوہ ہو گا۔ نہ اپنے سوارِ گردوں رکاب سے کوئی شکایت۔ نہ تن بہ تدبیر، بسیار جُو ماداؤں کے ہرجائی پن کا کوئی گلہ۔ یہ تو آدمی ہی ہے جو ہر دم اپنے آدی پن سے نادم و نالاں رہتا ہے، اور اس فکر میں غلطاں کہ

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

گھوڑا تانگہ رکھنے اور اسے ٹھکانے لگانے کے بعد بشارت میں بظاہر دو متضاد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ گھوڑے اور اس کے دور و نزدیک کے تمام متعلقات سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہو گئی۔ تنہا ایک لنگڑے گھوڑے نے انہیں جتنا نقصان پہنچایا اتنا تمام ہاتھیوں نے مل کر پورس کو نہیں پہنچایا ہو گا۔ دوسری تبدیلی یہ آئی کہ اب وہ سواری کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ آدمی کو ایک دفعہ سواری کی عادت پڑ جائے تو پھر اپنی ٹانگوں سے ان کا فطری کام لینے میں توہین کے علاوہ نقاہت بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ان کی لکڑی کی بزنس اب کافی پھیل گئی تھی جسے وہ بھی اپنی دوڑ دھوپ کا پھل اور کبھی اپنے والد بزرگوار کی

جوتیوں کا طفیل بتاتے تھے، جب کہ خود بزرگوار اسے بھاگوان گھوڑے کے قدموں کی برکت پر محمول کرتے تھے۔ بہر صورت، قابل غور بات یہ کہ ان کی ترقی کا محرک اور سبب کبھی پیروں اور جوتیوں کی سطح سے اوپر نہیں گیا۔

کسی نے بلکہ خود انہوں نے بھی ذہانت اور فراست کو اس کا کریڈٹ نہیں دیا۔ لکڑی کی بکری بڑھی تو دفتروں کے چکر بھی بڑھے۔ اسی قدر سواری کی ضرورت میں اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں کمپنیوں میں رشوت نہیں چلتی تھی۔ لہٰذا کام نکالنے میں کہیں زیادہ ذلّت وخواری ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں ایمان دار افسر کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ جب تک بیجا سختی، خوردہ گیری اور اڑیل اور سڑیل پن سے سب کو اپنی ایمانداری سے عاجز نہ کر دے، وہ اپنی ملازمت کو پکّا اور خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ بے ایمان افسر سے بزنس مین بآسانی نمٹ لیتا ہے، ایمان دار افسر سے اسے ہول آتا ہے۔ چنانچہ صورت یہ تھی کہ کمپنی سے لکڑی اور کھوکھوں کا آرڈر لینے کے لیے پانچ چکر لگائیں تو بل کی وصولی کے لئے دس چکر لگانے پڑتے تھے۔ جب سے کمپنیاں لچڑ ہوئیں، انہوں نے دس پھیروں کا کرایہ اور محنت بھی لاگت میں شامل کرکے قیمتیں بڑھادیں۔ ادھر کمپنیوں نے ان کی نئی قیمتوں کو لٹس قرار دے کر دس فی صد کٹوتی شروع کر دی۔ بات وہیں کی وہیں رہی۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ ہر دو فریق ایک دوسرے کو لالچی، کائیاں اور

چور سمجھ کر لین دین کرنے لگے۔ اور یہ چوکس اور کامیاب بزنس کا بنیادی اصول ہے۔

اب بغیر سواری کے گزر نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون سی سواری موزوں رہے گی۔ ٹیکسی ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ٹیکسی صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال ہوتی تھی۔ مثلاً ہارٹ اٹیک کے مریض کو اسپتال لے جانے، اغوا کرنے، ڈاکہ ڈالنے اور پولیس والوں کو لفٹ دینے کے لیے۔ اور یہ جو ہم نے کہا کہ مریض کو ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال لے جاتے تھے تو فقط یہ معلوم کرنے کے لیے لے جاتے تھے کہ زندہ ہے یا مر گیا؟ کیوں کہ اس زمانے میں بھی جناح اور سول اسپتال میں صرف انہی مریضوں کو داخلہ ملتا تھا جو پہلے اسی اسپتال کے کسی ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں preparatory (ابتدائی) علاج کروا کے اپنی حالت اتنی غیر کر لیں کہ اسی ڈاکٹر کے توسط سے اسپتال میں آخری منزل آسان کرنے کے لئے داخلہ مل سکے۔ ہم اسپتال میں مرنے کے خلاف نہیں۔ ویسے تو مرنے کے لئے کوئی بھی جگہ ناموزوں نہیں، لیکن پرائیویٹ اسپتال اور کلینک میں مرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مرحوم کی جائداد جمع جتھا اور بینک بیلنس کے بٹوارے پر پسماندگان میں خون خراب نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ سب ڈاکٹروں کے حصّے میں

آجاتے ہیں۔ افسوس! شاہ جہاں کے عہد میں پرائیویٹ اسپتال نہ تھے۔ وہ ان میں داخلہ لے لیتا تو قلعہ آگرہ میں اتنی طویل مدت تک اسیر رہنے اور ایڑیاں رگڑر گڑ کر جینے سے صاف بچ جاتا۔ اور اس کے چاروں بیٹے تخت نشینی کی جنگ میں ایک دوسرے کا سر قلم کرنے کے جتن میں سارے ہندوستان میں آنکھ مچولی کھیلتے نہ پھرتے، کیوں کہ فساد کی جڑ یعنی سلطنت و خزانہ تو بِلوں کی ادائیگی میں نہایت پُرامن طریقے سے جائز وارثوں یعنی ڈاکٹروں کو منتقل ہو جاتا۔ بلکہ انتقالِ اقتدار کے لیے فرسودہ ایشیائی رسم یعنی بادشاہ کے انتقال کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ اس لیے کہ جیتے جی تو ہر حکمراں انتقال اقتدار کو اپنا ذاتی انتقال سمجھتا ہے۔

چلی سمت غرب سے اک ہوا۔۔۔

بِلوں کی وصولی کے سلسلے میں وہ کئی بار سائیکل رکشا میں بھی گئے۔ لیکن ہر بار طبیعت منغّص ہوئی۔ پیڈل رکشا چلانے والے کو اپنے سے دُگنی راس ڈھونی پڑتی تھی، جب کہ خود سواری کو اس سے بھی زیادہ بھاری بوجھ اٹھانا پڑتا تھا کہ وہ اپنے ضمیر سے بوجھوں مرتی تھی۔ ہمارے خیال میں آدمی کو آدمی ڈھونے کی اجازت صرف دو صورتوں میں ملنی چاہیے۔ اوّل، اس موقع پر جب دونوں میں سے ایک

وفات پا چکا ہو۔ دوسرے، اس صورت میں جب دونوں میں سے ایک اُردُو نقّاد ہو جس پر مر دے ڈھونا فرض ہی نہیں، ذریعہ معاش اور وجہ شہرت بھی ہو۔ دو دفعہ بسوں کی ہڑتال کے دوران بشارت کو سائیکل پر بھی جانا پڑا۔ ان پر انکشاف ہوا کہ کراچی میں بارہ ماسی باد مخالف کے سبب سائیکل اور سیاست دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوا گویا سارا شہر ایک بگولے کی آنکھ میں بسا دیا گیا ہے۔ اب اسے مغرب سے چلنے والی سمندری ہوا کی کینہ پروری کہیے یا کراچی والوں کی شومئ قسمت، آپ سیاست میں، یا سائیکل پر کسی بھی سمت نکل جائیں، آپ کو ہوا ہمیشہ مخالف ہی ملے گی۔ ہر دو عمل ایسے ہی ہیں جیسے کوئی آندھی میں پتنگ اڑانے کی کوشش کرے۔

خودکشی غریبوں کی دسترس سے باہر

ایک آدھ دفعہ خیال آیا کہ بسوں میں دھکے کھانے اور اسٹرپ ٹیز کروانے سے تو بہتر ہے کہ آدمی موٹر سائیکل خرید لے۔ موٹر سائیکل رکشا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ تین پہیوں پر خودکشی کا یہ سہل اور شرطیہ طریقہ ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں عام آدمی کو خودکشی کے لیے طرح طرح کی صعوبتیں اور کھکھیڑ اٹھانی پڑتی تھی۔ گھروں کا یہ نقشہ تھا کہ ایک ایک کمرے

میں دس دس آدمی اس طرح ٹھنسے ہوتے کہ ایک دوسرے کی آنتوں کی قراقر تک سن سکتے تھے۔ ایسے میں اپنا تخلیہ کہاں نصیب کہ آدمی پھانسی کا پھندا کڑے میں باندھ کر تنہا سکون سے لٹک سکے۔ علاوہ ازیں کمرے میں صرف ایک ہی کڑا ہوتا تھا جس میں پہلے ہی ایک پنکھا لٹکا ہوتا تھا۔ گرم کمرے کے مکین اس کی جگہ کسی اور کو لٹکنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ رہے پستول اور بندوق، تو ان کے لئے لائسنس کی شرط تھی جو صرف امیروں، وڈیروں اور افسروں کو ملتے تھے۔ چنانچہ خودکشی کرنے والے ریل کی پٹری پر دن دن بھر لیٹے رہتے کہ ٹرین بیس بیس گھنٹے لیٹ ہوتی تھی۔ آخر غریب موت سے مایوس ہو کر کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔

موٹر سائیکل میں بشارت کو سب سے بڑی قباحت یہ نظر آئی کہ موٹر سائیکل والا سڑک کے کسی بھی حصّے پر موٹر سائیکل چلائے، محسوس یہی ہو گا غلط جگہ چلا رہا ہے۔ ٹریفک کے حادثات کے اعداد و شمار پر ریسرچ کرنے کے بعد ہم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے ہاں پیدل چلنے اور موٹر سائیکل چلانے والے کا نارمل مقام ٹرک اور منی بس کے نیچے ہے! دوسری مصیبت یہ کہ ہم نے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو پانچ سال سے کراچی میں موٹر سائیکل چلا رہا ہو اور کسی حادثے میں ہڈی پسلی نہ تڑوا چکا ہو مگر ٹھہریے۔ خوب یاد آیا۔ ایک شخص بے

شک ایسا ملا جو سات سال سے کراچی میں بغیر کسی ایکسیڈنٹ کے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ مگر وہ صرف موت کے کنویں(Well of Death) میں چلاتا تھا۔ تیسری قباحت انہیں یہ نظر آئی کہ مین ہول بناتے وقت کراچی میونسپل کارپوریشن دو باتوں کا ضرور لحاظ رکھتی ہے۔ اوّل یہ کہ وہ ہمیشہ کھلے رہیں تاکہ ڈھکنا دیکھ کر چوروں اور اُچکوں کو خواہ مخواہ یہ تجسس نہ ہو کہ نہ جانے اندر کیا ہے۔ دوم، دہانہ اتنا چوڑا ہو کہ موٹر سائیکل چلانے والا اس میں اندر تک بغیر کسی رکاوٹ کے چلا جائے۔ آسانی کے ساتھ۔ تیز رفتاری کے ساتھ۔ پیچھے بیٹھی ہوئی سواری کے ساتھ۔

خر گزشت

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ جب ہر سواری کے حسن و قبح پر باقاعدہ غور اور آپ سے مشورہ کیا گیا تو گدھے اور گدھا گاڑی کو کیوں چھوڑ دیا۔ ایک وجہ تو وہی ہے جو معاً آپ کے ذہن میں آئی۔ دوسری یہ کہ جب سے ہم نے گدھے پر چیسٹر ٹن کی معرکتہ الآرا نظم پڑھی ہم نے اس جانور پر ہنسنا اور اسے حقیر سمجھنا چھوڑ دیا۔ گیارہ برس لندن میں رہنے کے بعد ہم پر بالکل واضح ہو گیا کہ مغرب میں گدھے اور الّو کو گالی نہیں سمجھا جاتا۔ بالخصوص الّو تو علوئے

فکر اور دانائی کا سمبل ہے۔ یہاں اوّل تو کوئی ایسا نہیں ملے گا جو صحیح معنوں میں الّو کہلانے کا مستحق ہوں لیکن اگر کسی کو الّو کہہ دیا جائے تو وہ اپنے جامے بلکہ اپنے پروں میں پھولا نہیں سمائے گا۔ لندن کے چڑیا گھر میں الّوؤں کے کچھ نہیں تو پندرہ پنجرے تو ضرور ہوں گے۔ ہر بڑے مغربی ملک کا نمائندہ الّو موجود ہے۔ ہر پنجرہ اتنا بڑا جتنا اپنے یہاں شیر کا ہوتا ہے۔ اور ہر الّو اتنا بڑا جتنا اپنے یہاں کا گدھا۔ اپنے یہاں کا الّو تو ان کے سامنے بالکل ہی الّو معلوم ہوتا ہے۔ انگلینڈ میں عینک سازوں کی سب سے بڑی کمپنی Donald Aitcheson کا logo (تجارتی نشان) الّو ہے جو ان کے سائن بورڈ، لیٹر ہیڈ اور بِلوں پر بنا ہوتا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے ایک بڑے اسٹاک بروکر کا "لوگو" الّو ہے۔ یہ محض سُنی سُنائی بات نہیں، ہم نے خود ڈانلڈ ایچیسن کی عینک لگا کر اسٹاک بروکر مذکور کے مشورے اور پیش گوئی کے مطابق کمپنی شیئرز (حصص) اور بونڈز کے تین چار "فارورڈ" سودے کیے، جن کے بعد ہماری صورت دونوں کے لوگو سے ملنے گی۔

سابق پریسیڈنٹ کارٹر کی ڈیموکریٹک پارٹی کا نشان گدھا تھا، بلکہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ پارٹی پرچم پر بھی یہی بنا ہوتا ہے۔ اسی پرچم تلے پوری امریکن قوم ایران کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑی رہی۔ ہمارا مطلب ہے بے حس و حرکت۔ مغرب کو گدھے میں قطعی کوئی مضحکہ خیز بات نظر نہیں آتی۔

فرانسیسی مفکر اور انشائیہ نگار مونتین تو اس جانور کے اوصافِ حمیدہ کا اس قدر معترف اور معروف تھا کہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ روئے زمین پر گدھے سے زیادہ پر اعتماد، مستقل مزاج، گھمبیر، دنیا کو حقارت سے دیکھنے والا اور اپنے ہی دھیان اور دُھن میں مگن رہنے والا اور کوئی ذی روح نہیں ملے گا۔" ہم ایشیائی دراصل گدھے کو اس لیے ذلیل سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ انسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اپنی سہار اور بساط سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے اور جتنا زیادہ پٹتا اور بھوکوں مرتا ہے، اتنا ہی اپنے آقا کا مطیع و فرمانبردار اور شکر گزار ہوتا ہے۔

بے کار مباش

سواریوں کے حسن و قبح پر مدلّل بحث سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ بشارت نے ظاہر یہ کیا کہ وہ فقط استدلال اور رد و قبول کے عمل سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کار خریدنا، کاروباری ضرورت سے زیادہ ایک منطقی تقاضا ہے اور خدانخواستہ نہ خریدی تو کاروبار تو ٹھپ ہو گا سو ہو گا، منطق کا خون ہو جائے گا اور ارسطو کی روح جنت میں، یا جہاں کہیں بھی وہ ہے، تڑپ اٹھے گی، جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ انہیں زندگی میں جس شے کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی، وہ دراصل کار نہیں، اسٹیٹس سمبل تھا۔ جب کوئی شخص دوسروں کو قائل

کرنے کے لئے زور شور سے فلسفہ اور منطق بگھارنے لگے تو سمجھ جایئے کہ اندر سے وہ بچارا خود بھی ڈھلمل ہے، اور کسی ایسے جذباتی اور نامعقول فیصلے کا عقلی جواز اور توجیہ تلاش کر رہا ہے جو وہ بہت پہلے کر چکا ہے۔ ہنری ہشتم نے تو محض اپنی ملکہ کو طلاق دینے اور دوسری عورت سے شادی رچانے کی خاطر پاپائے روم سے قطع تعلق کر کے ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈال دی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انگلینڈ کے مذہب یعنی چرچ آف انگلینڈ کی بنیاد ایک طلاق پر رکھی گئی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ فی زمانہ نئے مذہب کی ایجاد کا اس سے زیادہ معقول جواز اور ہو بھی نہیں سکتا۔

میوہ میم کی مسکراہٹ کی قیمت

بشارت کافی عرصے سے سیکنڈ ہینڈ کار کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ ایک دِن خبر ملی کہ ایک برٹش کمپنی کے انگریز افسر کی چھ سلنڈر کی بہت بڑی کار بکاؤ ہے۔ افسر کا دو مہینے قبل اچانک انتقال ہو گیا تھا اور اب اس کی جوان بیوہ اسے اونے پونے ٹھکانے لگانا چاہتی تھی۔ بشارت نے بیوی کو ایک نظر دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کی کار کو جسے انھوں نے ہنوز دور سے بھی نہیں دیکھا تھا، خرید لیں گے۔ وہ اس کمپنی کو تین سال سے چیڑ کے پیکنگ کیس اور لکڑی سپلائی کر رہے

تھے۔ کمپنی کے پارسی چیف اکاؤنٹنٹ نے کہا کہ آپ یہ کار ۱۱-۱۰-۳۴۸۳
روپے میں لے جائیے۔ ممکن ہے پڑھنے والوں کو یہ رقم اور آخری پائی تک کی
باریکی عجیب لگے مگر بشارت کو عجیب نہیں لگی۔ اس لیے کہ یہ وہ رقم تھی جو کمپنی
ایک عرصے سے اس بہانے سے دبائے بیٹھی تھی کہ انہوں نے ناقص کھوکھے
سپلائی کیے جس کی وجہ سے چنیوٹ اور سیالکوٹ میں سیلاب کے دوران کمپنی کے
سارے مال کی لگدی بن گئی۔ بشارت کہتے تھے کہ میں نے بارہ بارہ آنے میں چیڑ
کے کھوکھے سپلائی کیے تھے، آبدوز یا کشتی نوح نہیں۔ کمپنی کے کھسیانے افسر
Act of God (آفت سماوی) کا الزام عاجز پر لگا رہے ہیں۔

خوبصورت میم نے، جس کے بیوہ ہونے سے وہ ناخوش نہ تھے، لیکن جسے بیوہ کہتے
ہوئے ان کا کلیجہ منہ کو آتا تھا، یہ پخ اور لگا دی کہ تین مہینے بعد جب وہ Batori
جہاز سے لندن جائے گی تو اس کے سامان کی پیکنگ کے لیے مفت کریٹ مع
کیلوں اور ترکھان کے سپلائی کرنے ہوں گے۔ اس شرط کو انہوں نے نہ صرف
منظور کیا، بلکہ اپنی طرف سے یہ اور اضافہ کیا کہ میں روزانہ آپ کے بنگلے آ آکر
آپ کی اور اپنی نگرانی میں خود بنفس نفیس (بنفس نفسانی؟) پیکنگ کراؤں گا۔
بشارت نے چیف اکاؤنٹنٹ سے کہا کہ کار بہت پرانی ہے۔ ۲۵۰۰ میں مجھے دے
دو۔ اس نے جواب دیا، منظور۔ بشرطیکہ آپ اپنے ناقص کھوکوں کا بل گھٹا کر

۲۵۰۰ کر دیں۔ بشارت نے میم سے فریاد کی کہ ”قیمت بہت زیادہ ہے۔ کہہ سن کے کچھ کم کرادو“ اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اتنی حاشیہ آرائی اور کر دی کہ ”غریب آدمی ہوں۔ تلے اوپر کے سات آٹھ بچّے ہیں۔ ان کے علاوہ تیرہ بھائی بہن مجھ سے چھوٹے ہیں“۔

یہ سنتے ہی میم کے چہرے پر حیرت، ہمدردی اور ستائش کا ملا جلا ایکسپریشن آیا۔ کہنے لگی:

Oh! dear, dear! I see what you mean. Your parents too were poor but passionate."

اس پر انہیں بہت طیش آیا۔ جواباً یہ کہنا چاہتے تھے کہ تم میرے باپ تک کیوں جاتی ہو؟ لیکن اس جملے کی بامحاورہ انگریزی نہیں بنتی اور جو لفظی ترجمہ معاً ان کی زبان پر آتا آتا رہ گیا، اس پر خود انہیں ہنسی آگئی۔ انہوں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کیا کہ اب کبھی اپنے بچوں اور بھائی بہنوں کی تعداد بتانے میں مبالغے سے کام نہیں لیں گے، سوائے راشن کارڈ بنواتے وقت۔ اتنے میں میم بولی کہ ان داموں یہ کار مہنگی نہیں۔ اس سے زیادہ تو میرے شوہر کے ٹیک (ساگوان) کے تابوت کی لاگت آئی تھی۔ اس پر سیلز مین شپ کے جوش میں بشارت کے منہ

سے بے ساختہ مل گیا کہ ”میڈم! آیندہ آپ بالکل یہ چیز ہم سے آدھے داموں میں لے لیجئے گا۔“ میم مسکرادی اور سودا پکا ہو گیا۔ یعنی ۳۳۸۴ روپے، دس آنے اور گیارہ پائی میں کار ان کی ہو گئی۔

اس واقعے کا ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ آئندہ کسی گاہک کے نام کا بل بناتے تو یہ لحاظ ضرور رکھتے کہ کم سے کم قیمت پر مال بیچیں تا کہ کم سے کم رقم ڈوبے۔ اور اگر مرحوم نادہند کی حسین بیوی سے رقم کے عوض کوئی چیز لینی پڑے تو کم سے کم داموں میں ہاتھ لگ جائے۔

میں خود آئی نہیں لائی گئی ہوں؟

بشارت اس زعم میں مبتلا تھے کہ انہوں نے سستے داموں کار خریدی ہے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے کھوکھے گھاٹے سے بیچے تھے۔ لیکن خوش فہمی اور مغالطے سے دل خوش ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ مرزا اسی بات کو اپنے بقراطی انداز میں یوں کہتے ہیں کہ ہم نے باون گز گہرے ایسے اندھے کنویں بھی دیکھے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ خود کو اوندھا دیں یعنی سر کے بل الٹے کھڑے ہو جائیں

تو باون گز کے مینار بن جائیں گے۔ بہر کیف، بشارت نے beige[1] رنگ کی کار خرید لی۔ وہ انتہائی منکسر مزاج آدمی ہیں۔ چنانچہ دوستوں سے یہ تو نہیں کہا کہ ہم بھی کار والے ہو گئے۔ البتہ اب ایک ایک سے کہتے پھر رہے ہیں کہ آپ نے بیژ رنگ دیکھا ہے؟ ہر شخص نفی میں گردن ہلاتا۔ فرماتے "صاحب! انگریز نے عجب رنگ ایجاد کیا ہے۔ اُردُو میں تو اس کا کوئی نام بھی نہیں۔ نمونہ حاضر خدمت کروں گا"۔

کار خریدتے ہی وہ بے حد سوشل ہو گئے۔ اور ایسے لوگوں کے گھر بھی بیژ رنگ کا نمونہ دکھانے کے لیے جانے لگے جن سے وہ عید بقر عید پر بھی ملنے کے روادار نہ تھے۔ جو دوست احباب یہ عجوبہ دیکھنے ان کے گھر آتے، انہیں مٹھائی کھلائے بغیر نہیں جانے دیتے تھے۔ اسی مبارک سلامت میں ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن

---

[1] افسوس، ہمیں احساس نہیں کہ ہمارے ہاں رنگوں کے قدیم اور خوبصورت نام بڑی تیزی سے متروک ہو رہے ہیں۔ کل انہیں کون پہنچانے کا۔ شنگرفی، ملاگیری، اگرئی، عنّابی، کپاسی، کبودی، شُتری، زمردی، پیازی، قرمزی، کاہی، کاکریزی، کاسنی، نقرئی، قناویزی، موتیا، نیلوفری، دھانی، شربتی، فالسئی، جامنی، نسواری، چمپئی، تربوزی، مٹیالا، گیروا، مونگیا، شہتوتی، ترنجی، انگوری، کشمشی، فاختئی، ارغوانی، پستئی، شفتالو، طاؤسی، آبنوسی، عودی، عنبری، حنائی، بنفشی، کسمبری، طوسی اور۔۔۔۔ صوفیانہ، سوقیانہ۔

ہم نے اپنے خزانے پر لات ماری سو ماری، اپنی دھرتی سے پھُوٹنے والی دھنک پن بھی خاک ڈال دی۔

ایک دوست کے ہاں کار کی رونمائی کروانے جارہے تھے کہ وہ آدھے راستے میں ہچکولے کھانے لگی۔ پھر اس پر کالی کھانسی کا دورہ پڑا۔ حبسِ دم کے سبب دھڑکن کبھی ہلکی ہلکی سنائی دیتی کبھی بالکل غائب۔ خیال ہوا مکر کئے پڑی ہے۔ دفعتاً سنبھالا لیا۔ ہیڈ لائٹ میں ایک لحظہ کے لیے روشنی آئی۔ ہارن نے کچھ بولنا چاہا، مگر نقاہت مانع ہوئی۔ چند لمحوں بعد دھکڑ دھکڑ دھک دھک دھوں کرکے جہاں کھڑی تھی وہیں انجر پنجر بکھیر کے ڈھیر ہو گئی۔ radiator کے ایک سرے سے بھاپ اور دوسرے سے تلل تل پانی نکلنے لگا۔ گدھا گاڑی سے کھچوا کر گھر لائے۔ مستری کو گھر بلا کر دکھایا۔ اس نے بونٹ کھولتے ہی تین دفعہ دائیں ہاتھ سے اپنا ماتھا پیٹا۔ بشارت نے پوچھا، خیر تو ہے؟ بولا بہت دیر کر دی۔ اس میں تو کچھ رہا نہیں۔ سب پُرزے جواب دے چکے ہیں۔ آپ کو مجھے چھ مہینے پہلے بلانا چاہیے تھا۔ بشارت نے جواب دیا کہ بلاتا کہاں سے خریدے ہوئے کل ایک مہینہ ہوا ہے۔ بولا، تو پھر خریدتے وقت پوچھا ہوتا۔ آدمی صراحی بھی خریدتا ہے تو پہلے ٹن ٹن بجا کر دیکھ لیتا ہے۔ یہ تو کار ہے۔ آپ زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہتے تو میں فی الحال کام چلاؤ مرمت کئے دیتا ہوں۔ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ آنکھوں گوڈوں میں پانی اتر آئے تو معجون اور چمپئی مالش کارگر نہیں ہوتی۔ پھر تو لاٹھی بیساکھی

چاہیے۔ یا جوان جورُو۔ بشارت کو اس کی یہ بے تکلفی بہت ناگوار گزری، مگر غرض مند صرف آئینے کا منہ چڑا سکتا ہے۔

اس کے بعد کار مستقل خراب رہنے لگی۔ کوئی پُرزہ درست معلوم نہیں ہوتا تھا۔ صرف rear view mirror یعنی پیچھے آنے والا ٹریفک دکھانے والا آئینہ صحیح کام کر رہا تھا۔ بعض اوقات کار کی رفتار گدھا گاڑی سے بھی زیادہ سست ہو جاتی، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسی میں باندھ کر کشاں کشاں لائی جاتی تھی۔

میں خود آئی نہیں، لائی گئی ہوں

کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ گدھا گاڑی کا کرایہ اور باندھنے کے لئے رسّی وغیرہ ضرور رکھ لیتے تھے۔ اس مشینی جنازے کو گلیوں میں کھینچے پھرنے کا عمل جسے وہ tow کرنا کہتے تھے، اس کثرت سے دہرایا گیا کہ گھر میں کسی نیفے میں کمر بند اور چارپائی میں ادوان نہ رہی۔ اور ثانی الذکر پر سونے والے رات بھر کروٹ کروٹ جھولا جھولنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن بنارس خاں چوکیدار کی بکری کی زنجیر کھول لائے۔ مرزا کہتے ہی رہ گئے کہ جو زنجیر بالشت بھر کی بکری کو جو تین دفعہ ”ہری“ (امید سے) ہو چکی ہے، قابو میں نہ رکھ سکی، وہ تمہاری بے کہی کار کو کیا خاک باندھ کے رکھے گی۔

ہر فن (مست) مولا: الہ دین بے چراغ[1]

ڈرائیور کا مسئلہ خود کو اس طرح حل ہو گیا کہ مرزا وحید الزماں بیگ عرف خلیفہ نے جو کچھ نے پہلے ان کا تانگہ چلا چکا تھا، جس کا مفصل حال ہم "اسکول ماسٹر کا خواب" میں بیان کر چکے ہیں، خود کو اس خدمت پر مامور کر لیا۔ تنخواہ البتہ دُگنی مانگی جس کا جواز یہ پیش کیا کہ پہلے آدھی تنخواہ پر اس لئے کام کرتا تھا کہ گھوڑے کا دانہ چارہ خود بازار سے لاتا تھا۔ پہلے پہل کار دیکھی تو بہت خوش ہوا، اس لیے کہ اس کی لمبائی گھوڑے سے تین ہاتھ زیادہ تھی۔ دوسرے، اس پر صبح شام کھریرا کرنے کا جھنجھٹ نہیں تھا۔ آبائی پیشہ حجامی، لیکن وہ ہر فن مولا نہیں، ہر فن مست مولا تھا۔ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جو اس نے نہ کیا ہو اور بگاڑا نہ ہو۔ کہتا تھا کہ جس زمانے میں وہ برما فرنٹ پر جاپانیوں کو شکست دے رہا تھا، تو ان کی

---

[1] * الہ دین بے چراغ: بشارت کے ضعیف اور دائم المرض والد کو نام یاد نہیں رہتے تھے۔ لہٰذا وہ ہر نوکر کو الہ دین کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ الہ دین نہم تھا، جس کا مفصل تعارف ہم "اسکول ماسٹر کا خواب" میں کرا چکے ہیں۔ خود کو ہر فن میں طاق سمجھتا تھا۔ مگر اس کا ہر کام بگڑ جاتا تھا۔ اکثر کہتا کہ میرے ہاتھ میں جادو ہے۔ سونے کو چھُولوں تو پیتل ہو جائے۔ مرزا اسے طنزاً الہ دین بے چراغ کہتے تھے۔

اصل نام بُدھن تھا۔ بشارت بوجوہ اسے خلیفہ کہنے لگے تھے۔ ان صفحات میں جہاں بھی خلیفہ کا ذکر آیا ہے اس سے الہ دین نہم مراد ہے۔

سر کوبی سے جو وقت بچتا، جو کہ بہت کم بچتا تھا، اس میں فوجی ڈرائیونگ کیا کرتا تھا۔ اس کی سواریوں نے کبھی اس کی ڈرائیونگ پر ناک بھوں نہیں چڑھائی۔ بڑے سے بڑا ایکسیڈنٹ بھی ہوا تو کسی سواری کی موت واقع نہیں ہوئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گوروں کی میت گاڑی چلاتا تھا۔ جو شیخی بھری کہانیاں وہ سناتا تھا ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ رجمنٹ کے مرنے والوں کو اُتھلی قبر تک پہنچانے اور جو فی الحال نہیں مرے تھے ان کی حجامت کے فرائض اس نے اپنی جان پر کھیل کھیل کر انجام دیے۔ اس بہادری کے صلے میں اسے ایک کانسی کا میڈل ملا تھا جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ایک سردار جی نے کرپان دکھا کر چھین لیا۔

ایسے انا بھرے غباروں میں سوئی چبھونا چنداں ضروری نہیں۔ البتہ اتنی تصدیق ہم بھی کر سکتے ہیں کہ جب سے اس نے سنا کہ بشارت کار خریدنے والے ہیں، اس نے گُل بادشاہ خان ٹرک ڈرائیور سے کار چلانی سیکھ لی۔ مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص لوہار کی شاگردی اختیار کر کے سُنار کا کام شروع کر دے۔ ڈرائیونگ ٹیسٹ اس زمانے میں ایک اینگلو انڈین سارجنٹ لیا کرتا تھا جس کے سارے کنبے کے بال وہ پانچ چھ سال سے کاٹ رہا تھا۔ خلیفہ کا اپنا بیان تھا کہ سارجنٹ نے جناح کورٹ کے پاس والے میدان میں میرا ٹیسٹ لیا۔ ٹیسٹ کیا تھا، فقط ضابطے کی خانہ پُری کہیئے۔ بولا "Well! caliph! کار سے انگلش کا ۸ figure of

بنا کر دکھاؤ۔ صرف اس ایریا میں، جہاں ہم یہ لال جھنڈی لیے کھڑا ہے۔ اس لائن کو کراس نئیں کرنا۔ ۸ ایکدم ریورس میں بنانا مانگتا۔ یہ سنتے ہی میں بھچک رہ گیا۔ ریورس میں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ گُل بادشاہ خان سے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ استاد تھے ریورس میں بھی چلانا سکھا دو۔ وہ کہنے لگا کہ یہ میرے استاد نے نہیں سکھایا۔ نہ کبھی اس کی ضرورت پڑی۔ میرا استاد چنار گل خان بولتا تھا کہ شیر، ہوائی جہاز، گولی، ٹرک اور پٹھان ریورس گیئر میں چل ہی نہیں سکتے۔

"میں نے اپنے دل میں کہا کہ چُقندر کی دُم میں انگلش کا ۸ کا ہندسہ بنا سکتا تو تیرے جیسے بھالو کی حجامت کائے کو کرتا۔ غلام محمد گورنر جنرل کی چمپی مالش کرتا۔ کیا بتاؤں، اس گُنے گار نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہیں۔ جی جی ہاؤس میں مالی کا کام بھی کیا ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں تو نہیں اگائی، البتہ کراچی میں، کیا نام اس کا، ٹیولپ اُگا کے دکھایا ہے۔ پر بڑے آدمیوں کی کوٹھیوں میں پھولوں کو کوئی نگاہ بھر کے نہیں دیکھتا۔ بس مالی خود ہی پھول اگاتے ہیں اور خود بھی دیکھ دیکھ کے خوش ہو لیتے ہیں۔ ہدایت اللہ بیرا میرے کو بولتا تھا کہ بی بی صاحب کا ہر عضو ملفوج ہو گیا ہے۔ زبان بھی۔ اسی حالیت میں ہر آئے گئے کو مادر پدر کرتا رہتا ہے۔ پر آدی ہے نر۔ چھوٹوں پر گالی ضائع نہیں کرتا۔ جیسے جیسے طاقت جواب دے رہی ہے، گالی اور زبان اور موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی بات اب صرف

اس کا خدمت کار بیرا اس کے منہ سے اپنا کان بھڑا کر سنتا اور سمجھتا ہے۔ وہی اس کی پنجابی گالی کا دلّی والوں کی اُردُو میں تجربہ کر کے قرۃ اللہ شباب صاحب کو بتاتا ہے۔ وہ فٹافٹ اس کا انگریزی ترجمہ کر کے جی جی کی امریکی سکریٹری مس روتھ مورل کو بتاتے ہیں۔ پھر وہ پٹاخہ، فارنر لوگوں اور وزیروں سفیروں کو کولہے مٹکا مٹکا کر بتاتی ہے کہ جی جی صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ سے مل کے بہت ہی خوش ہوا۔ کئی دفعہ جی چاہا کہ جی جی کو اپنی مالش سے ٹھیک کر دوں۔ دو منٹ میں ناف اور دگ پٹّھے ایسے بٹھادوں کہ ہرن کی موافق قلانچیں بھرتا پھرے۔ پر یہ سوچ کے چُپ ہو رہا کہ کل کلاں کو وہ فوت ہو گیا، جو کہ اسے ہونا ہے، تو مجھے جیل، اور تیل کی بوتل کو معائنے کے لیے بھیج دیں گے"۔

تو جناب عالی! سارجنٹ نے اپنے بوٹ سے زمین پر ۸ بنا کر دکھایا۔ لاحول ولا قوۃ! میں بے فضول ڈر گیا تھا۔ اب پتہ چلا کہ سائیسی میں جسے اٹیرن کہتے ہیں اسے انگریزی میں فگر آف ۸ کہتے ہیں۔ جنگلی گھوڑے کو سدھانے اور اس کی ساری مستی نکالنے کے لیے اسے تیزی سے دو گھری پھرت چکّر دینے کو اٹیرن کہتے ہیں۔ تو گویا ڈرائیونگ ٹیسٹ کا یہ مقصد ہے! پر میں کچھ نہیں بولا۔ بس جل تو جلال تو کہہ کے ریورس میں ۸ کے بجائے کسے ہوئے ازار بند کی سی گرہ بنانے لگا کہ یکایک پیچھے سے سارجنٹ کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ اسٹاپ یو

ایڈیٹ! وہ اپنی جان بچانے کے لیے کار کے بمپر پہ لال جھنڈی سمیت چڑھ گیا تھا۔ ازار بند کی گرہ میں لپٹتے لپٹتے یعنی کار کے نیچے آتے آتے بچا۔ میں نے کہا، سر! دوبارہ ٹیسٹ کے لیے آجاؤں؟ مگر اس نے دوبارہ ٹیسٹ لینا مناسب نہ سمجھا۔ دوسرے دن آپ کے غلام کو لائسنس مل گیا"۔

"آپ کی جوتیوں کے طفیل ہر فن میں طاق ہوں مجھے کیا نہیں آتا۔ جرّاحی بھی کی ہے۔ ایک آپریشن بگڑ گیا تو کان پکڑے۔ ہوا یوں کہ میرا دوست الّن اپنی ماموں زاد بہن پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ پر وہ کسی طور شادی پر رضامند نہیں ہو رہی۔ نہ جانے کیوں الّن کو یہ وہم ہو گیا کہ اس کی بائیں ران پر جو مسّا ہے، اس کی وجہ سے شادی نہیں ہو رہی۔ میں نے وہ مسّا کاٹ دیا۔ ناسور بن گیا۔ وہ لنگڑا ہو گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے سرجری نہیں کی۔ وہ لڑکی آخر کے تئیں میری زوجہ بنی۔ میری دائیں ٹانگ پر مسّا ہے"۔

ماحول پر لاحول اور مارکونی کی قبر پر۔۔۔

کار متعدد اندرونی و غیر اندرونی، خفیہ اور علانیہ امراض میں مبتلا تھی۔ ایک پرزے کی مرمت کرواتے تو دوسرا جواب دے دیتا۔ جتنا پٹرول جلتا، اتنا ہی

موبل آئل۔ اور ان دونوں سے دُگنا ان کا اپنا خون جلتا۔ آج کلچ پلیٹ جل گئی تو کل ڈائی نمو بیٹھ گیا۔ اور پرسوں گیر بکس بدلوا کر لائے تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سِیٹ کے نیچے کدال چلا رہا ہے۔ خلیفہ نے تشخیص کی کہ صاحب! اب یونیورسل اڑی کر رہا ہے۔ پھر بریک گڑبڑ کرنے لگے۔ مستری نے کہا، ماڈل بہت پرانا ہے۔ پرزے بننے بند ہو گئے۔ آپ کہتے ہیں تو مرمت کر دوں گا، مگر مرمت کے بعد بریک یا تو مستقل لگا رہے گا، یا مستقل کھلا رہے گا۔ سوچ کر دونوں میں سے چُوز کر لیجئے۔ دو ہفتے بعد خلیفہ نے اطلاع دی کہ کار کے shock Observers ختم ہو گئے۔ وہ Shock Absorbers کو Shock Observers کہتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب وہ شاک روکنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ جہاں دیدہ بڑے بوڑھوں کی مانند ہو گئے تھے جو کسی نیم تاریک کونے یا زینے کے نیچے والی تکلونی بخاری میں پڑے پڑے صرف observe کر سکتے ہیں۔ جو ناخلف دکھائیں سو ناچار دیکھنا۔ یہ مقام خود شناسی اور دانائی کا ہے۔ جب انسان بچشم خود لغو سے لغو حرکت اور کرتوت دیکھ کر نہ آزردہ ہو نہ طیش میں آئے اور نہ ماحول پر لاحول پڑھے تو اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلے ہم دوسری وجہ بیان کریں گے۔ وہ یہ کہ اب وہ جہاں دیدہ، بردبار اور درگزر کرنے والا ہو گیا ہے۔ اور پہلی وجہ یہ کہ وہ حرکت اس کی اپنی ہی ہے۔

ایک دن گیارہ بجے رات کو ظریف جبل پوری کے مکان واقع ایلومینیم کوارٹر زسے واپسی میں گوراقبرستان کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہارن کی آواز میں رعشہ پیدا ہوا۔ گھنگھرو سا بولنے لگا۔ خود ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کہ ہیڈلائٹ کی روشنی جاچکی تھی۔ خلیفہ نے کہا" جناب عالی! بیٹری جواب دے رہی ہے"۔ انہیں تعجب ہوا، اس لیے کہ وہ روزانہ اپنی لکڑی کی دکان پر پہنچتے ہی بیٹری کو کار سے نکال کر آرا مشین سے جوڑ دیتے تھے تاکہ آٹھ گھنٹے تک چارج ہوتی رہے۔ شام کو گھر پہنچتے ہی اسے نکال کر اپنے ریڈیو سے جوڑ دیتے جو صرف کار بیٹری سے چلتا تھا۔ پھر رات کو بارہ ایک کے جب ریڈیو پروگرام ختم ہو جاتے تو اسے ریڈیو سے علحدہ کر کے واپس کار میں لگا دیتے تاکہ صبح خلیفہ ٹرٹر نہ کرے۔ اس طرح بیٹری آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شِفٹوں میں تین مختلف چیزوں سے جُڑی رہتی تھی۔ جواب نہ دیتی تو کیا کرتی۔ بالکل کنفیوز ہو جاتی تھی۔ ہم نے خود دیکھا کہ ان کے ریڈیو سے چھپے ہوئے پروگرام کے بجائے اکثر آرا مشین کی آوازیں نشر ہوتی رہتی تھیں جنہیں وہ پکا راگ سمجھ کر ایک عرصے تک سر دھنا کئے۔ اسی طرح کار کے انجن سے موسم کی خرابی کی ریڈیائی آوازیں

---

[1] * اس زمانے میں ریڈیو میں ٹارچ بیٹری کے بجائے کار بیٹری لگانی پڑتی تھی اور اسے روزانہ چارج کرنا پڑتا تھا۔ بہار کالونی میں، جہاں وہ رہتے تھے، اس زمانے میں بجلی نہیں آئی تھی۔

آنے لگی تھیں۔ عجیب کھپلا تھا۔ رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں جب اچانک عجیب و غریب آوازیں آنے لگتیں تو گھر والے یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ریڈیو کی ہیں، یا کار کی، یا آرا مشین میں قوّال پھنس گیا ہے۔ اور ان بیچاروں کی معذوری قابل معافی تھی۔ اس لئے کہ ان آوازوں کا مخرج دراصل وہ گلا تھا جس سے بشارت خراٹے لے رہے ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کراچی ریڈیو سے میرے گلے میں مستقل خراش پڑ گئی ہے۔ ایک اور عذاب یہ کہ جب تک ریڈیو اسٹیشن بند نہ ہو جاتا، تین چار پڑوسی ان کی چھاتی پر سوار پروگرام سنتے رہتے۔ اب بشارت اس مردم آزاد ایجاد سے سخت متنفّر ہو گئے تھے۔ غالباً ایسے ہی حالات اور ایسے ہی بلیک مُوڈ میں عصر حاضر کے سب سے بڑے انگریزی شاعر فلپ لارکن نے کہا تھا کہ مارکونی[1] کی قبر پر پبلک ٹائلٹ بنا دینا چاہیے۔

سوداوی اور صوبائی مزاج کے چار پہیے

چند روز سے جب گرمی نے شدت پکڑی تو چاروں پہیوں کا مزاج سوداوی و صوبائی ہو گیا۔ مطلب یہ کہ چاروں پہیے چار مختلف سمتوں میں جانا چاہتے اور

---

[1] مارکونی ریڈیو کا موجد

اسٹیئرنگ وہیل سے روٹھے رہتے تھے۔ یہی نہیں، بعض اوقات خود اسٹیئرنگ وہیل پہیوں کی مرضی کے مطابق گھومنے لگتا تھا۔ خلیفہ سے پوچھا "اب یہ کیا ہو رہا ہے "؟ اس نے مطلع کیا "حضور! اسے ببلنگ (wobbling) کہتے ہیں۔ انہوں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ مرض کا نام معلوم ہو جائے تو تکلیف تو دور نہیں ہوتی الجھن دور ہو جاتی ہے۔ ذرا دیر بعد وہ یہ سوچ کر مسکرا دیئے کہ کار یہ چال چلے توWobbling۔ راج ہنس چلے تو Waddling ۔ ناگن چلے تو Wriggling۔ اور ناری چلے توwiggling ۔

یہ کنارا چلا کہ ناؤ چلی

واہ کیا بات دھیان میں آئی

اس دفعہ وہ خود بھی ورکشاپ گئے۔ مستری نے کہا، زنگ سے سائی لینسر بھی جھڑنے والا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ "کراچی کی ہوا میں اتنی رطوبت اور دلوں میں اتنی رقّت ہے کہ کھلے میں ہاتھ پھیلا کر اور آنکھیں مُوند کر کھڑے ہو جاؤ تو پانچ منٹ میں چلو بھر پانی اور ہتھیلی بھر پیسے جمع ہو جائیں گے۔ اور اگر چھ منٹ تک ہاتھ پھیلائے اور آنکھیں موندے رہو تو پیسے غائب ہو جائیں گے۔ یہاں بال، سائی لینسر اور لچھّن قبل از وقت جھڑ جاتے ہیں۔ لاہور میں کم از کم اتنا تو

ہے کہ سائی لینسر نہیں جھڑتے"۔ مستری نے مشورہ دیا کہ "اگلے مہینے جب نیا ہارن فِٹ کرائیں تو سائی لنسر بھی بدلوالیں۔ اس وقت تو یہ اچھا خاصا ہارن کا کام دے رہا ہے"۔ بشارت نے جھلّا کر پوچھا "اس کا کوئی پرزہ کام بھی کر رہا ہے یا نہیں؟" مستری پہلے تو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر جواب دیا کہ mileometer دُگنی رفتار سے کام کر رہا ہے!" دراصل اب کار کی کارکردگی بلکہ ناکارکردگی Murphy's Law 1 کے عین مطابق ہو گئی تھی یعنی اس کی ہر وہ چیز جو بگڑ سکتی تھی، بگڑ گئی تھی۔ اس صورت میں حکومت تو چل سکتی ہے، کار نہیں چل سکتی۔

شتر ترانہ

متواتر مرمت کے باوجود بریک درست نہ ہوئے۔ لیکن اب ان کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ ان کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ جس جگہ بریک لگانا ہو کار اس سے ایک میل پہلے ہی رُک جاتی تھی۔ اور بشارت نے تو جب سے ڈرائیونگ سیکھنی شروع کی، وہ بجلی کے کھمبوں سے بریک کا کام لے

---

[1] Murphy's Law: Any thing that can go wrong will go wrong.

رہے تھے۔ کھمبوں کے استعمال پر ان کا کئی کتّوں سے جھگڑا بھی ہوا۔ مگر اب بعض کتّوں نے چمکتی وہیل کیپ سے کھمبے کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس عمل کے دوران خود کو گردن موڑ موڑ کر وہیل کیپ میں دیکھتے جاتے تھے۔ حال ہی میں بشارت نے یہ بھی نوٹس کیا کہ کار کچھ زیادہ ہی زود رنج اور حسّاس ہو گئی ہے۔ سڑک کراس کرنے والے کی گالی سے بھی رُکنے لگی تھی، بشرطیکہ انگریزی میں ہو۔ وہ بتدریج خوش خرامی سے سبک خرامی اور مست خرامی، پھر آہستہ خرامی اور مخرامی کی منزلوں سے گزر کر اب نری نمک حرامی پر اتر آئی تھی۔ اس کی چال اب ان اڑیل اور مٹھّے اونٹوں سے ملنے لگی جس کی تصویر رڈیارڈ کپلنگ نے اونٹوں کے Marching Song میں کھینچی ہے، جس کی تان اس پر ٹوٹتی ہے:

Can’t! Don’t! Shan’t! Won’t!

بلاشبہ یہ تان حقیقت ترجمان اس لائق ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک جو کسی طور آگے نہیں پڑھنا چاہتے، اسے اپنا قومی ترانہ بنا لیں۔

"اسٹوپڈ کاؤ" سے مکالمہ

ڈھائی تین مہینے تک بشارت کا تمام وقت، محنت، کمائی، دعائیں اور گالیاں ناکارہ کار پر صرف ہوتی رہیں۔ ابھی اسپِ نابکار (بلین) کا زخم پوری طرح نہیں بھرا تھا کہ یہ فوپا[1] ہو گیا۔ بقول استاد قمر جلالوی:

ابھی کھا کے ٹھوکر سنبھلنے نہ پائے کہ پھر کھائی ٹھوکر سنبھلتے سنبھلتے

کار اب اپنی مرضی کی مالک ہو گئی تھی۔ جہاں چلنا چاہیے وہاں ڈھٹائی سے کھڑی ہو جاتی اور جہاں رُکنا ہو وہاں ادبدا کے چلتی رہتی۔ مطلب یہ کہ چوراہے اور سپاہی کے اجازتی سگنل پر کھڑی ہو جاتی، لیکن بمپر کے سامنے کوئی راہگیر آ جائے تو اسے صرفِ نظر کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔ جس سڑک پر نکل جاتی، اس کا سارا ٹریفک اس کے خرام و قیام کا تابع ہو جاتا جو اب فیض کے مصرع کی الٹ ہو گیا تھا:

جو چلے تو کوہ گراں تھے ہم، جو رکے تو جاں سے گزر گئے

---

[1] فوپا: (پنجابی) میرا خیال ہے کہ اس کا اصل ساختہ فیچ کا faux pas ہے، جس کا تحفظ اور معنی بعینہ وہی ہیں۔

تھک ہار کر بشارت اسی میم کے پاس گئے اور منت سماجت کی کہ خدارا پانچ سو کم میں ہی یہ کار واپس لے لو۔ وہ کسی طرح نہ مانی۔ انہوں نے اپنی فرضی مفلوک الحالی اور اس نے اپنی بیوگی کا واسطہ دیا۔ انصاف کی توقع اٹھ گئی تو رحم کی اپیل میں زور پیدا کرنے کے لیے دونوں خود کو ایک دوسرے سے زیادہ مسکین اور بے آسرا ثابت کرنے لگے۔ دونوں پریشان تھے۔ دونوں دکھی اور مصیبت زدہ تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے لیے پتھر کا دل رکھتے تھے۔ بشارت نے اپنی آواز میں مصنوعی رقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور بار بار رومال سے ناک پوچھی۔ جواب میں میم پچ پچ رو پڑی۔ اب بشارت نے جلدی جلدی پلکیں پٹ پٹا کر آنکھوں میں آنسو لانے چاہے مگر الٹی ہنسی آنے لگی۔ بدرجہ مجبوری دو تین نہایت دردناک مگر بالکل فرضی منظر (مثلاً اپنے مکان اور دکان کی ترقی اور نیلام کا منظر۔ ٹریفک کے حادثے میں اپنی بے وقت موت اور اس کی خبر ملتے ہی بیگم کا جھٹ سے سفید موتی ململ کا دوپٹہ اوڑھ کر چھن چھن چوڑیاں توڑنا اور رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لینا) آنکھوں میں بھر کر خود پر رقّت طاری کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ دل پسیجا نہ آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں اپنے سنّی ہونے پر سخت غصہ آیا۔ دفعتاً انہیں اپنے انکم ٹیکس کے نوٹس کا خیال آ گیا اور ان کی گھگی بندھ گئی۔ انہوں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا کہ "میں آپ سے عرض کرتا

ہوں، اگر یہ کار کچھ دن اور میرے پاس رہ گئی تو میں پاگل ہو جاؤں گا یا بے موت مر جاؤں گا“۔

سنتے ہی میم پگھل گئی۔ آنکھوں میں دوبارہ آنسو بھر کے بولی، آپ کے بچوں کا کیا بنے گا، جن کی صحیح تعداد کے بارے میں بھی آپ کو شک ہے کہ سات ہیں یا آٹھ۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے میاں کی ہارٹ اٹیک سے موت بھی اسی منحوس کار کی وجہ سے ہوئی۔ اور اسی میں --اسٹیئرنگ وہیل پر دم توڑا۔

ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ اس سے تو بہتر تھا کہ میں گھوڑے کے ساتھ ہی گزارہ کرلیتا۔ اس پر وہ عفیفہ چونکی اور مشتاقانہ بے صبری سے پوچھنے لگی:

You mean a real horse?"

Yes. Of course! Why?

میرے پہلے شوہر کی موت گھوڑے پر سے گرنے سے واقع ہوئی تھی۔ وہ بھلا چنگا پولو کھیل رہا تھا کہ گھوڑے کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ گھوڑا اس پر گرا۔ وہ مجھے بڑے پیار سے Stupid cow کہتا تھا۔ اس کی اینگلو سیکسن بلو گرے آنکھوں میں سچ مچ آنسو تیر رہے تھے۔

ویسے بشارت رقیق القلب واقع ہوئے ہیں۔ جوان عورت کو اس طرح آبدیدہ دیکھ کر ان کے دل میں اس کے آنسوؤں کو ریشمی رومال سے پوچھنے اور اس کی حالت بیوگی کو فی الفور ختم کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ یہ کہنا تو کسر بیانی ہوگی کہ ان کے نہاں خانۂ دل کی کسی منزل میں خوبصورت عورت کے لئے ایک نرم گوشہ تھا، اس لیے کہ یہاں تو تمام منزلیں، سارے کا سارا خان ویراں

انتظار صید میں آگ دیدۂ بے خواب تھا

۔۔۔ کہ بنے ہیں دوست ناصح

انسان کا کوئی کام بگڑ جائے تو ناکامی سے اتنی کوفت نہیں ہوتی جتنی ان بن مانگے مشوروں اور نصیحتوں سے ہوتی ہے جن سے ہر وہ شخص نوازتا ہے جس نے بھی اس کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کسی دانا نے کیسی پتے کی بات کہی تھی کہ کامیابی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پھر آپ کو کوئی مشورہ دینے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ ہم اپنے چھوٹے منہ سے بڑی بات نہیں کہہ سکتے۔ نہ چھوٹی۔ لہٰذا یہ نہیں بتا سکتے کہ ہم کامیاب ہیں یا ناکام۔ لیکن اتنا اتا پتا بتائے دیتے ہیں

کہ اگر ہمارے اسکرو اور ڈھبریاں لگی ہوتیں تو ہمارے تمام دوست احباب اور بہی خواہ سارے کام دھندے چھوڑ چھاڑ، اپنے اپنے پیچ کس اور پانے (spanners) لے کر ہم پر پل پڑتے۔ ایک اپنے چوکور پانے سے ہماری گول ڈھبری کھولنے کی کوشش کرتا۔ دوسرا تیل دینے کے سوراخ میں تھوڑے سے اسکریو ٹھونک دیتا۔ تیسرا شبانہ روز کی محنت سے ہمارے تمام اسکرو ''ٹائٹ'' کرتا۔ آخر میں سب مل کر ہمارے سارے اسکرو اور ڈھبریاں کھول کر پھینک دیتے۔ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم ان کے بغیر بھی فقط دوستوں کی قوت ارادی سے چل پھر اور چَرچُگ سکتے ہیں یا نہیں۔ ہماری اور ان کی ساری عمر اسی کُھڑ پیچ میں تمام ہو جاتی۔ کچھ ایسا ہی احوال میاں بشارت کا ہوا۔ کار کے ہر بریک ڈاؤن کے بعد انہیں بکثرت ایسی نصیحتیں سننی پڑتیں جن میں کار کی خرابیوں کے بجائے ان کی اپنی خامیوں کی طرف ایسے بلیغ اشارے ہوتے تھے جنہیں سمجھنے کے لیے عاقل ہونا ضروری نہیں۔ اور پیدل چلنے والے بشارت کو دیکھ دیکھ کر شکر کرتے کہ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ کار نہیں رکھتے۔

نصیحت کرنے والوں میں صرف حاجی عبد الرحمٰن علی محمد بانٹوا والے نے کام کی بات کہی۔ اس نے نصیحت کی کہ کبھی کسی بزرگ کے مزار، انکم ٹیکس کے دفتر یا ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں جانا ہو تو کار ایک میل دور کھڑی کر دو۔ ایک ہفتے

پہلے سے پان کھانے کے بعد دانت صاف کرنا بند کر دو۔ دہانے کے دونوں طرف ریکھوں میں پیک کے بریکٹ لگے رہنے دو۔ اور چار دن کے پہنے ہوئے کپڑے اور اتنی ہی مدت کا بڑھا ہوا شیو لے کر ان کے سامنے جاؤ۔ اگر فیکٹری کے مالک ہو تو ریڑھی والے کا سا حلیہ بنا لو۔ ''نئیں تو سالا لوگ ایک دم چمڑی اتار لیں گا اور کورے بدن پہ نمک مرچی کی مالش کر کے ہوا بندر کو بھیج دیں گا، تم اکھّا (تمام) عمر تِراہ تِراہ کرتا پھریں گا۔ اے بھائی ہو تمہارے کو بولتا ہے۔ کبھی انکم ٹیکس افیسر، پولیس، جوان جورُو اور پیر فقیر کے پاس جاؤ تو سولجر کی مافک کھالی ہاتھ ہلاتے، ڈبل مارچ کرتے نئیں جاؤ۔ ہمیش کوئی ڈالی، کچھ مال پانی، کچھ نجر نجرانہ لے کے جاؤ۔ نئیں تو سالا لوگ کھڑے کھڑے کھال کھنچوا کے اس میں ڈان اخبار کی ردّی بھروا دیں گا۔ سبجا (سبز ہ۔ سو روپے کا نوٹ) دیکھ کے جس کی آنکھ میں ٹو ہنڈرڈ کینڈل پاور کا چمکارا نئیں آئے تو سمجھو سالا سولہ آنے کلر بلائنڈ ہے یا اولیا اللہ بنے لا (بن گیا) ہے۔ نئیں تو پھر ہوئے نہ ہوئے اسٹیٹ بینک کا گورنر ہے جو نوٹوں پر دسکھت (دستخط) کرتا ہے''۔

۴

مکالمہ در مذمّتِ نیم

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کار کے عیبوں پر سے پردہ اٹھاتے اٹھاتے خلیفہ اپنا نامۂ اعمال کھول کے بیٹھ جاتا اور اپنے کرتوت کو کرامات کی طرح بیان کرنے لگتا۔ یہ تو کوئی مزاج داں ہی بتا سکتا تھا کہ حقیقت بیان کر رہا ہے یا حسرتوں کے میدان میں خیالی گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ ایک دن فقیر محمد خانساماں سے کہنے لگا ”آج تو سعید منزل کے سامنے ہماری گھوڑی (کار) بالکل باؤلی ہو گئی۔ ہر پرزہ انا الحق کہنے لگا۔ پہلے تو انجن گرم ہوا۔ پھر radiator جس کے لِیک (leak) کو میں نے صابن کی لگدی سے بند کر رکھا تھا، پھٹ گیا۔ پھر پچھلا ٹائر لِیک کرنے لگا۔ میں نے ہوا بھرنے کے لیے کار کا ہم عمر پمپ نکالا تو معلوم ہے کیا ہوا؟ پتہ چلا کہ پمپ میں سے ہوا لیک کر رہی ہے! فین بیلٹ بھی گرمی سے ٹوٹ گئی۔ انگریز کی سواری میں رہنے سے اس کا مزاج بھی سوداوی ہو گیا ہے۔ حکیم فہیم الدین آگرے والے کہا کرتے تھے کہ عورت سوداوی مزاج کی ہو تو مرد آتشی مزاج کا چاہیے ہی چاہیے۔ یار! آتشی مزاج پر یاد آیا۔ عبد الرزاق چَھیلا کو، ابے وہی چھیلا باز سنیما کا گیٹ کیپر، آتشک ہو گئی ہے۔ سالا اپنے کیفرِ کرتوت کو پہنچا۔ کہتا ہے انگلش فلمیں دیکھنے اور گُڑ کی گزک کھانے اور نور جہاں کے گانوں سے خون

گرمی کھا گیا ہے۔ پرانے زمانے میں ہمارے یہاں دستور تھا، پتا نہیں تیری طرف تھا کہ نہیں، کہ تماش بینی کے چکرّ میں کسی کو آبلہ فرنگ یا بادِ فرنگ[1] (V.D) ہو جائے تو اُسے ٹخنوں سے ایک بالشت اونچا تہمد بندھوا کے نیم کی ٹہنی ہاتھ میں تھما دیتے تھے۔ جوانی میں میں نے اچھے اچھے اشرانوں کو محلّے میں ہری جھنڈی لیے پھرتے دیکھا۔ مشہور تھا کہ نیم کی ٹہنی سے چُھوت کی بیماری نہیں لگتی۔ پر میرے خیال میں تو فقط ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے یہ ڈھونگ رچاتے تھے۔ خون اور طبیعت صاف کرنے کے لیے مریض کو ایسا کڑوا چرائتہ پلایا جاتا کہ حلق سے ایک گھونٹ اترتے ہی پُتلیاں اوپر چڑھ جاتیں۔ اگلے وقتوں میں خود علاج کے اندر بھی سزا پوشیدہ ہوتی تھی۔ مولوی یعقوب علی نقشبندی کہا کرتے تھے کہ اسی لئے دیسی (یونانی) علاج کو حکمت کہتے ہیں۔

یار! ان دنوں سالے نیم نے بھی جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ غریب غربا کو یہ رئیسوں کا روگ لگ جائے یا معمولی پھُوڑے پھنسیاں نکل آئیں تو گاؤں قصبے کے جراح شروع سے اخیر دم تلک نیم ہی سے علاج کرتے تھے۔ ساری ادویاتیں نیم

---

[1] آبلہ فرنگ، باد فرنگ: یعنی ارمغان فرنگ، ان معنوں میں کہ ان اصطلاحات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آلو تمباکو ریلوے، ریس، یوروپین پھول، شیکسپیئر، جِن اینڈ ٹانک، چائے، کرکٹ اور دوسرے بے شمار تحفوں کے ساتھ ان امراض کی سوغات بھی انگریز اپنے ساتھ لائے۔ واللہ اعلم۔

سے ہی بنتی تھیں۔ نیم کے صابن سے نہلواتے۔ نیم کی نبولی اور بکّل کا لیپ بتاتے۔ نیم کا مرہم لگاتے۔ نیم کی سینکوں اور خشک پتوں کی دھونی دیتے۔ جوان خون زیادہ گرمی دکھائے تو نیم کے بور اور کونپلوں کا عرق پلاتے۔ نیم کے گوند کا لعوق بنا کر چٹاتے۔ نبولی کی گری کا سفوف زہر مار کراتے۔ ہر کھانے سے پہلے نیم کی مسواک کرواتے تاکہ ہر کھانے میں اسی کا مزہ آئے۔ فاسد مادہ نکالنے کے بہانے جونکوں کو آئے دن سیروں خون پلوادیتے، یہاں تک کہ اگلا بالکل چُسا آم ہو جاتا اور حرمزدوگی تو درکنار دو رکعت نماز بھی پڑھتا تو گھٹنے چٹ چٹ چٹخنے لگتے۔ ناسور کو نیم کے اونٹتے پانی سے دھارتے تاکہ مرض کے جراثیم مر جائیں۔ اور اگر مریض جراثیم سے پہلے ہی جراح کو پیارا ہو جائے تو گھڑے میں نیم کے پتے ابال، غسل میت دے کے جنازہ نیم تلے رکھ دیتے۔ پھر تازہ قبر پر تین ڈول پانی چھڑک کے سرھانے نیم کی ٹہنی گاڑ دیتے۔ دفنا کے گھر آتے تو مرنے والے کی بیوی کی سونے کی لونگ اترواکر اسی نیم کی سینک ناک میں پہنا دی جاتی جس میں جھولا ڈال کے وہ کبھی ساون میں جھولا کرتی تھی۔ پھر ایسے سفید دوپٹہ اُڑھاتے اور ایک ہاتھ میں سروتہ اور دوسرے میں کوّے اڑانے کے لیے نیم کی قمچی تھما کر نیم کی چھاؤں تلے بٹھال دیتے۔

"جب میں نے واہگہ بارڈر کراس کر کے ہجرت کی تو یقین جان میرے پاس تن کے دو کپڑوں اور ایک اُسترے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ جو تو مجھے اس حالت میں دیکھ رہا ہے تو یہ مولا کا فضل اور پاکستان کی دین ہے۔ دوسرے روز میں اپنے یار جانی محمد حسین کی میت (معیت) میں شالیمار باغ دیکھنے گیا تو اس نے بتایا کہ پاکستان میں نیم نہیں ہوتا! قسم خدا کی! مجھے پاکستان پہ بہت پیار آیا۔ اور میں وہیں مغلیہ پھنوارے (فوارے) کے پاس سجدۂ شکر بجالایا"۔

خلیفہ کی پاپ بیتی

خلیفہ کی مصیبت یہ تھی کہ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بوڑھا ہو چلا تھا، مگر اس کی ڈینگوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے فینٹسی اور خواہش نفس کو بھی حقیقت نفس الامری بنادیا ہے۔ اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک پرانی مثل ہے کہ بڑھاپے میں انسان کی شہوانی قوت زبان میں آجایا کرتی ہے۔ اس کی مشیخت بھری داستان سچی ہو یا نہ ہو داستان کہنے کا انداز سچا اور کھرا تھا۔ اس کے سادہ دل سننے والے ایسے ہپناٹائز ہوتے کہ یہ خیال ہی نہ آتا سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ بس جی چاہتا یونہی بولے چلا جائے۔ خلیفہ کی کہانی اسی کی زبانی جاری ہے۔ ہم نے صرف نئی سرخی لگادی ہے:

"اور یار فقیرا! گلبیاٹی اتو جانو آگ بھری چھچھوندر[۲] تھی۔ اُچٹتی سی نظر بھی پڑ جائے تو جھٹ ٹیم کی ٹہنی ہاتھ میں تھما دیتی تھی۔ یار! جھوٹ نہیں بولوں گا۔ روزِ قیامت کے دن حشر کے میدان میں اللہ میاں کے علاوہ والد صاحب کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اب تجھ سے کیا پردہ۔ میں کوئی پیر پیمبر تو ہوں نہیں۔ گوشت پوست کا انسان ہوں۔ اور جیسا کہ مولوی حشمت اللہ کہتے ہیں، انسان خطائے نسوان کا پتلا ہے۔ تو یار! واقعہ یہ ہے کہ نیم کی ٹہنی مجھے بھی لہرانی پڑی۔ میٹھا رس بھی نہیں لگا تھا۔ ستر ہواں چل رہا تھا کہ فضیحتا ہو گیا۔ پر یقین جانو، تمیزن ایک نمبر اشراف عورت تھی۔ ایسی ویسی نہیں۔ بیاہی تیاہی تھی۔ پڑوس میں رہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے جوانی اور پڑوسی کے گھر میں ایک ساتھ ہی قدم رکھا۔ عمر میں مجھ سے بیس نہیں تو پندرہ برس ضرور بڑی ہو گی۔ پر بدن جیسے کسی کسائی ڈھولک۔ ہوا بھی چھو جائے تو بجنے لگے۔ میں اس کے مکان کی چھت پر پتنگ اڑانے جایا کرتا تھا۔ وہ مجھے آتے جاتے کبھی گزک، کبھی اپنے ہاتھ کا حلوہ کھلاتی۔ جاڑے کے دن تھے۔ اس کا میاں جو اس سے عمر میں بیس نہیں تو پندرہ برس

---

[۱] نچلے درجے کہ کسبی جو ٹکھیائی کہلاتی تھی، کیوں کہ اس کے پاس جو آتے تھے دہ ٹکے سے زیاد کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ گویا اصل وجہ تضحیک و تذلیل پیشہ نہیں، قلیل اُجرت ہے

[۲] چھچھوندر: ایک قسم کی چھوٹی سی آتشبازی جو فرش پر گھوم گھوم کر بڑی بے قراری سے چلتی ہے۔

بالضرور بڑا ہو گا، اولاد کا تعویذ لینے فرید آباد گیا ہوا تھا۔ کھی کھی کھی کھی۔ میں چار پتنگیں کٹوا کر چرخی بغل میں دبائے چھت پر سے اترا تو دیکھا کہ وہ چھدرے بانوں کی چرپائی کی آڑ کر کے نہار ہی ہے۔ آنکھوں میں اب تلک بان کی جالیوں کے پیچھے کا سماں بسا ہوا ہے۔ مجھے آتے دیکھ کر ایک دم الف کھڑی ہو گئی۔ یار تجھے کیا بتاؤں۔ میری رگ رگ میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ گھڑی بھر میں موزے کی طرح اُلٹ کے رکھ دیا۔ گزک کی خاصیت گرم ہوتی ہے"۔

"میرے مرض کا بھانڈا پھوٹا تو والد صاحب، اللہ ان کی بال بال مغفرت کرے، آپے سے باہر ہو گئے۔ جوتا تان کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے تو میرا نطفہ نہیں میرے سامنے سے ہٹ جا۔ نہیں تو بھی گردن اڑا دوں گا۔ حالاں کہ تلوار تو در کنار گھر میں بھونٹی (کند) چھری تک نہ تھی جس سے نکٹے کی ناک کٹ سکے۔ پھر میں ان سے قد میں ڈیڑھ بالشت بڑا تھا! پر ان کا اتنا رُعاب تھا کہ میں اپنے رنگین تہمد میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ماں میرے اور ان کے درمیان ڈھال بن کے کھڑی ہو گئی۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔ بیچ بچاؤ کرانے میں چوڑیاں ٹوٹنے سے ماں کی کلائی سے خون ٹپکنے لگا۔ دن رات محنت مزدوری کرتی تھی۔ جہاں تک میری چھُٹپن کی یاد داش کام کرتی ہے میں نے اس کے چہرے پر ہمیشہ جھرّیاں ہی دیکھیں۔ آنسو اس کی جھرّیوں سے ریکھ ریکھ

بہہ رہے تھے۔ مجھے آج بھی ایسا لگتا ہے جیسے ماں کے آنسو میرے گالوں پر بہہ رہے ہیں۔ وہ کہنے لگی "اللہ قسم! میرے لال پر دشمنوں نے بہتان لگایا ہے۔ میں نے والد صاحب سے بہتر کہا کہ پرانے باجرے کی پکی اور پال کے آم کھانے سے گرمی چڑھ گئی ہے۔ سینے تو سہی۔ مُشکی گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر چڑھنے سے مجھے یہ موذی مرض لگا ہے۔ تکھ مریاں[1] اسے حدت نکل جائے گی"۔ پر وہ بھلا ماننے والے تھے۔ کہنے لگے "اب تکھ مریاں کے بچ! میں نے گڑیں نہیں کھیلی ہیں۔ تو نے نائیوں کی عزت خاک میں ملادی۔ بزرگوں کی ناک کٹوادی"۔ ماں کے سوا کسی نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔ چھوٹے بھائی روز مجھے جھگڑنے لگے، اس لیے کہ ماں نے ان کے اور والدہ کے آم اور گھی میں تر تراتی باجرے کی کھچڑی بند کر دی تھی۔ یار فقیر! کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر اللہ میاں کو اپنے بندوں سے اتنی بھی محبت ہوئی جتنی میری اَن پڑھ ماں کو مجھ سے تھی تو اپنا بیڑا پار جانو۔ حشر کے دن سارے گناہ بخش دیے جائیں گے اور مولویوں کی چُوری اور آم بند ہو جائیں گے انشاء اللہ!

---

[1] تکھ مریاں: تخمِ ریحاں۔ گرمیوں میں فالودے میں ڈال کر پیتے تھے۔

”خیر۔ اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا، پر میرے فرشتوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ تمیزن پر میرے چچا جان قبلہ کسی زمانے میں مہربان رہ چکے ہیں۔ جوانی قسم! ذرا بھی شک گزرتا تو میں اپنا دل مار کے بیٹھ رہتا۔ بزرگوں کی شان میں گستاخی نہ کرتا۔ یار! جوانی میں یہ حالت تھی کہ نبض پہ اُنگلی رکھو تو ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتی تھی۔ شکل بھی میری اچھی تھی۔ طاقت کا یہ حال کہ کسی لڑکی کی کلائی پکڑ لوں تو اُس کا چھڑانے کو جی نہ چاہے۔ خیر وہ دن ہوا ہوئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ علاج مرض سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا۔ بعد کو گرمی چھانٹنے کے لیے مجھے دن میں تین دفعہ قدحے کے قدحے ٹھنڈائی اور دھنیے کے عرق اور کتیرا گوند کے پلائے جاتے۔ اور دو وقتہ پھیکی روٹی، کو تھمیر (ہرا دھنیہ) کی بے نمک مرچ کی چٹنی کے ساتھ کھلائی جاتی۔ اسی زمانے سے میرا نام بھیّا کو تھمیر پڑ گیا۔ والد صاحب کو اس وقوعے سے بہت صدمہ پہنچا۔ شکی مزاج آدمی تو تھے ہی۔ کبھی خبر آتی کہ شہر میں فلاں جگہ ناجائز بچّہ پڑا ملا ہے، تو والد صاحب مجھی کو آگ بھبھوکا نظروں سے دیکھتے۔ اُنھیں محلے میں کوئی لڑکی تیز تیز قدموں سے جاتی نظر آجائے تو سمجھو کہ ہو نہ ہو میں درپے آزار ہوں۔ اُن کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ دشمنوں نے مشہور کر دیا کہ تمیزن نے ایک ہی رات میں داڑھی سفید کر دی۔ خود اُن کا بھی یہی خیال تھا۔ اُنھوں نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے ریلوائی گارڈ کی

جھنڈی سے بھی زیادہ لہولہان رنگ کا تہمد بندھوایا اور ٹہنی کے بجائے نیم کا پورا گُدّا___ میرے قد سے بھی بڑا____ مجھے تھما دیا۔ میں نے شکرات کے دن اُس سے آٹھ پتنگیں لوٹیں۔ لڑکپن بادشاہی کا زمانہ ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں کوئی مجھے حضرت سلیمان کا تخت بمعہ ہدہد اور ملکہ سبا بھی دے دیتا تو وہ خوشی نہیں ہوتی جو ایک پتنگ لوٹنے سے ہوتی تھی۔ یار! کسی دن تلے مکھانے تو کھلا دے۔ مدّتیں ہوئیں۔ مزہ تک یاد نہیں رہا۔ ماں بڑے مزے کے بناتی تھی۔ فقیرا میں نے اپنی ماں کو بڑا دُکھ دیا"۔

خلیفہ اپنی ماں کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گیا۔

بزرگوں کا قتلِ عام

خلیفہ اپنے موجودہ منصب اور فرائض کے لحاظ سے کچھ بھی ہو، اُس کا دل ابھی تک گھوڑے میں اٹکا ہوا تھا۔

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی اسپِ مشکی کی ا

ایک دن وہ دکان کے مینیجر مولانا کرامت حسین سے کہنے لگا کہ "مولانا ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ جس بچّے کے چپت اور جس سواری کے چابک نہ مار سکو وہ روزِ قیامت کے دن تلک قابو میں نہیں آنے کی۔ نادر شاہ بادشاہ تو اسی واسطے ہاتھی کے ہودے سے کود پڑا اور جھونجل میں آ کے قتلِ عام کرنے لگا۔ ہمارے سارے بزرگ قتلِ عام میں گاجر مولی کی طرح کٹ گئے۔ گود کے بچّوں تک کو بلّم سے چھید کر ایک طرف پھینک دیا۔ ایک مرد زندہ نہیں چھوڑا"۔ مولانا نے ناک کی نوک پر رکھی ہوئی عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے پوچھا "خلیفہ! پچھلے پانچ سو سال میں کوئی لڑائی ایسی نہیں ہوئی جس میں تم اپنے بزرگوں کو چن چن کر نہ مروا چکے ہو۔ جب قتلِ عام میں تمہارا بیج ہی مارا گیا، جب تمہارے سارے

---

[1] یہ مصرع دراصل گھوڑے سے نہیں، معشوق سے متعلق تھا۔ ہم نے صرف اتنا تصرّف کیا ہے کہ "زلفِ مشکیں" کے بجائے اسپِ مشکی جڑ دیا۔ اس سے غزل کی لچک، بتانِ ہزار شیوہ کی ترفگی اور وزن سے ہماری ناواقفیت ثابت ہوتی ہے۔ بے شمار اشعار ہماری نظر سے ایسے گزرے ہیں کہ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ ممدوح کون ہے تو خیال ادبدا کر گھوڑے کی طرف جاتا ہے، جب کہ وہ معشوق کے بارے میں ہوتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

بزرگ ایکو ایک قتل کر دیے گئے تو اگلی نسل کیوں کر پیدا ہوئی''؟ بولا ''آپ جیسے اللہ لوگ کی دعاؤں سے!''

بزرگوں میں سب سے زیادہ فخر وہ اپنے دادا پر کرتا تھا، جس کی ساری زندگی کا واحد کارنامہ یہ معلوم ہوا تھا کہ پچاسی سال کی عمر میں سوئی میں تاگا پرو لیتا تھا۔ خلیفہ اس کارنامے سے اس درجہ مطمئن بلکہ مرعوب تھا کہ یہ تک نہیں بتاتا تھا کہ سوئی پرونے کے بعد دادا اس سے کیا کرتا تھا۔

کار کی کایا پلٹ

ایک دن رابسن روڈ کے تراہے کے پاس رسالہ افکار کے دفتر کے قریب کار کا بریک ڈاؤن ہوا۔ اُسی وقت اس میں گدھا گاڑی جوت کر لارنس روڈ لے گئے۔ اس دفعہ مستری کو بھی رحم آ گیا۔ کہنے لگا ''آپ شریف آدمی ہیں۔ کب تک برباد ہوتے رہیں گے۔ اوچھی پونجی بیوپاری کو اور منحوس سواری، مالک کو کھا جاتی ہے۔ کار تلے آ کر آدمی مرتے تو ہم نے ھی سنے تھے۔ لیکن یہ ڈائن تو اندر بیٹھے آدمی کو کھا گئی! میرا کہنا مانیں۔ اس کی باڈی کٹوا کر ٹرک کی باڈی فٹ کروالیں۔ لکڑی لانے لے جانے کے کام آئے گی۔ میرے سالے نے باڈی بنانے کا کارخانہ

نیا نیا کھولا ہے۔ آدھے داموں میں آپ کا کام ہو جائے گا۔ دو سو روپے میں انجن کی reboring میں کر دوں گا۔ اوروں سے پونے سات سو لیتا ہوں۔ کایا پلٹ کے بعد آپ پہچان نہیں سکیں گے۔

اور یہ اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ نئی باڈی فٹ ہونے کے بعد کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ ہے کیا۔ ملزموں کو عدالت لے جانے والی حوالاتی ویگن؟ کتّے پکڑنے والی گاڑی؟ مذبح خانے سے تھلتھلاتی راسیں لانے والا خونی ٹرک؟ اس شکل کی یا اس سے دور پرے کی مشابہت رکھتی ہوئی کوئی شے انہوں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ مستری نے یقین دلایا کہ آپ اسے دو تین مہینے صبح و شام مسلسل دیکھتے رہیں گے تو اتنی بری معلوم نہیں ہو گی۔ اس پر مرزا بولے کہ تم بھی کمال کرتے ہو۔ یہ کوئی بیوی تھوڑا ہی ہے! سابق کار یعنی موجودہ ٹرک کی پشت پر تازہ پینٹ کی ہوئی ہدایت " چل رے چھکڑے تینوں رب دی آس " پر انہوں نے اسی وقت بچارا پھروا دیا۔ دوسرے فقرے پر بھی انہیں اعتراض تھا۔ اس میں جگت یار یعنی "پپو یار" کو ہدایت کی گئی تھی کہ تنگ نہ کرے۔ چودھری کرم دین پینٹر نے سمجھوتے کے لہجے میں کہا کہ جناب عالی، اگر آپ کو یہ نام پسند نہیں تو بے شک اپنی طرف کا کوئی دل پسند نام لکھوا لیجئے۔ اسی طرح انہوں نے اس رسوائے زمانہ شعر پر بھی سفیدہ پھروا دیا

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

اس حذف و اصلاح کے بعد بھی جو کچھ باقی رہ گیا وہ خدا کو منظور ہو تو ہو، انہیں قطعاً منظور نہیں تھا۔

لیکن بے ہنگم باڈی سے قطع نظر، ری بورنگ کے بعد جب وہ چلی تو ساری کوفت دور ہو گئی۔ اب وہ اسٹارٹ ہونے اور چلنے میں ایسی غیر ضروری اور بے محل پھرتی اور نمائشی چستی دکھانے لگی جیسے ریٹائرڈ لوگ ملازمت میں توسیع سے پہلے یا بعض بڈھے دوسری شادی کے بعد دکھاتے ہیں۔ باتھ روم میں بھی جاگنگ کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ زینے پر دو دو سیڑھیاں پھلانگتے چڑھتے ہیں۔ پہلے دن صبح نو بجے سے شام کے چھ بجے تک اس ٹرک نما کار یا کار نما ٹرک سے لکڑی کی ڈلیوری ہوتی رہی۔ کار کی دن بھر کی آمدن یعنی ۴۵ روپے (جو آج کے ۴۵۰ روپے کے برابر تھے) کو پہلے انہوں نے ۳۰ دن اور بعد میں ۳۶۵ سے ضرب دیا تو حاصل ضرب ۱۶۴۲۵ روپے نکلا۔ دل نے کہا "جب کہ کار کی کل قیمت ۳۲۸۳ روپلی ہے! پگلے! اسے حاصل ضرب نہ کہو، حاصل زندگی کہو!" وہ بڑی دیر تک پچھتایا کئے کہ کیسی حماقت کی، اس سے بہت پہلے کار کو ٹرک میں کیوں نہ

تبدیل کروالیا۔ مگر ہر حماقت کا ایک وقت معین ہے۔ معاً ”وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے“ ان کے ذہن میں آیا اور وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔

میرا ابھی تو ہے!

تین چار ہفتے گاڑی لشتم پشتم چلی گو کہ کرائے کا وہ رُوح کو انشراح بخشنے والا اوسط نہ رہا۔ نو دس مرتبہ ورکشاپ بھیجنی پڑی۔ مستری نے پورے ایک مہینے کی گارنٹی دی تھی۔ البتہ گدھا گاڑی کا کرایہ خود دینا پڑتا تھا۔ گدھا گاڑی والا روزانہ صبح دریافت کرنے آتا تھا کہ آج کہاں اور کس وقت آؤں۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ بشارت نے اس پر دو گاہکوں کی خریدی ہوئی سات ہزار روپے کی لکڑی لدوا کر خلیفہ کو دس بجے ڈلیوری کے لیے روانہ کر دیا۔ کوئی دو بجے ہوں گے کہ وہ ہانپتا کانپتا آیا۔ بار بار انگوچھے سے آنکھیں پونچھ کر ناک سے سُڑ سُڑ کر رہا تھا۔ کہنے لگا ”سرکار! میں لُٹ گیا۔ برباد ہو گیا۔ اللہ مجھے اٹھالے“۔ بشارت سمجھ گئے کہ اس کی دائم المرض بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اسے تلقین کرنے لگے کہ ”مشیت ایزدی میں کس کا دخل ہے، صبر سے کام لو۔ وہی ہوتا ہے جو۔۔“۔ لیکن جب اس نے کہا کہ ”کُوک کروں تو جگ ہنسے، چپکے لاگے گھاؤ۔ سرکار! میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے“۔ تو بشارت کا تردد کچھ کم ہوا کہ جو شخص انتہائی حزن و غم کے موقع پر

بھی شعر اور محاورے کے ساتھ گریہ کرے وہ آپ کی ہمدردی نہیں، اپنی زباں دانی کی داد چاہتا ہے۔ جب خلیفہ انگوچھا منہ پر ڈال زور زور سے بکھان کر کے رونے لگا تو انہیں دفعتاً خیال آیا کہ نقصان اس حرامخور کا نہیں میرا ہوا ہے! کہنے لگ "ابے کچھ تو بول۔ اس دفعہ میرا کیا نقصان ہوا ہے؟"

بناوٹی سسکیوں کے درمیان اس نے "میرا بھی تو ہے؟" اس طرح کہا میرے حبیب بینک کے اشتہار میں جب ہر عمر اور ہر صوبے کا آدمی اپنے لہجے میں حبیب بینک کو اپنا چکتا ہے تو ایک بچہ تتلا کر کہتا ہے "میلا بھی تو ہے!" پھر اس نے ساری روداد بیان کی۔ گاڑی بہت "اوورلوڈ" تھی۔ فرسٹ گیئر میں بھی بار بار دم توڑ رہی تھی۔ سڑک کے موڑ تک وہ جیسے تیسے لونڈوں کے دھکوں اور وظیفے کے زور سے لے گیا۔ لیکن چوراہے پر اسپرنگ جواب دینے لگے۔ اس نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آدھی لکڑی اتار کر مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بڑے قرینے سے چُن دی۔ اور بقیہ مال کی ڈلیوری دینے ناظم آباد نمبر ۳ چلا گیا۔ وہاں پلاٹ پر کوئی موجود نہیں تھا۔ ڈلیوری دیئے بغیر واپس مسجد آیا تو لکڑی غائب! "سرکار میں دن دہاڑے لُٹ گیا برباد ہو گیا؟"

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

اب انھیں خود اپنی حماقت پر بھی افسوس ہونے لگا کہ ساڑھے تین ہزار کی کھٹارا کار میں دُگنی مالیّت یعنی سات ہزار کا مال بھیجنا کہاں کی دانائی ہے۔ کاش! چور لکڑی کے بجائے کار لے جاتا۔ جان چھوٹتی۔ انھیں یقین تھا کہ خلیفہ عادت سے باز نہیں آیا ہوگا۔ بھری گاڑی کھڑی کر کے کہیں حجامت بنانے، ختنہ کرنے یا کسی ججمان سے شادی بیاہ کی بدھائی وصول کرنے چلا گیا ہوگا۔ بارہا ایسی حرکت کر چکا تھا۔ جبل گردد، جبلّی نہ گردد (پہاڑ کا ٹلنا ممکن ہے، عادت کا بدلنا ممکن نہیں) والی کہاوت معاً اُن کی زبان پر آئی۔ اور یہ بھی یاد آیا کہ یہ کہاوت اپنے حوالے سے اُنھوں نے پہلی مرتبہ ماسٹر فاخر حسین سے سنی تھی۔ کلاس میں شرارت کرنے پر ماسٹر فاخر حسین نے اُن کو بوُزنہ قرار دینے کے بعد اسی فارسی ضرب المثل کی صلیب پر اُلٹا لٹکا دیا تھا۔ بوزنہ کہنے کا جب اُن پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تو ماسٹر صاحب نے اُن سے بوُزنہ کے معنی پوچھے۔ پھر باری باری سب لڑکوں سے پوچھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھے۔ لہٰذا ساری کلاس کو بنچ پر کھڑا کر کے کہنے لگے۔

”نالائقو میرا نام ڈبوؤ گے۔۔۔۔ بوزنہ۔۔۔۔

ب۔۔۔۔ و۔۔۔۔۔ ز۔۔۔۔ ن۔۔۔۔۔۔ ہ۔۔۔۔۔ ہائے ہائے والی ہ ۔۔۔۔۔ حلوے اور حرام خور والی ح نہیں۔ بوزنہ بندر کو کہتے ہیں۔ سمجھے؟" ہائے! کیسے زمانے اور کیسے اُستاد تھے! لغو سے لغوبات کے بھی لغوی معنی بتاتے تھے۔ طیش میں بھی تعلیمی تقاضوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ فقط گالی ہی نہیں دیتے تھے، اُس کا املا اور مطلب بھی بتاتے تھے۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد بشارت کہنے لگے "اور ہاں! خوب یاد آیا۔ ایک دفعہ اُنھوں نے اُردُو کے گھنٹے میں املا لکھوایا۔ میں نے ایک جملہ کچھ اس طرح لکھا:

علماء وفُضلہ کو ہمارے یہاں سر انکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔

ماسٹر فاخر حسین بڑی دیر تلک ہاتھ سے پیٹ پکڑ کے ہنستے رہے۔ پھر اسی ہاتھ سے میرا کان پکڑ کے حکم دیا کہ بلیک بورڈ پر لڑکوں کو لکھ کر دکھاؤ کے تم نے فاضل کی جمع فضلا کیسے لکھی ہے۔ میں لکھ چکا تو پانچ فٹ لمبے پائنٹر کی نوک فضلہ کی ہ پر رکھ کر فرمایا، برخوردار! آج تمھیں بنچ پر کھڑا نہیں کروں گا۔ اس واسطے کہ تم لڑکپن ہی میں علماء کی کُنہہ تک پہنچ گئے ہو۔ صاحب! بات کی تہ تک پہنچنے اور حقیقت کو کنہہ کہنا میں نے ماسٹر فاخر حسین ہی سے سیکھا"۔

۶

------- قصور اپنا نکلا آیا

وہ سیدھے بولٹن مارکیٹ پولیس اسٹیشن رپٹ لکھوانے گئے۔ افسر انچارج نے کہا، یہ تھانہ نہیں لگتا۔ آپ جہاں سکونت رکھتے ہیں اس کے متعلقہ تھانے میں ایف آئی آر درج کرائیے۔ وہاں پہنچے تو جواب ملا کہ جنابِ عالی! جرم کی رپٹ آپ کی جائے سکونت والے تھانے میں بے شک درج کی جاسکتی ہے بشر طیکہ جرم آپ نے کیا ہو۔ آپ رپٹ جائے واردات کے تھانہ متعلقہ میں لکھوائیے۔ وہاں پہنچے تو کہا گیا کہ جائے واردات دو تھانوں کے سنگم پر واقع ہے۔ مسجد کی عمارت بے شک ہمارے تھانے میں ہے لیکن اس کی سیڑھیوں کی تلیٹی کا علاقہ ملحقہ تھانے میں لگتا ہے۔ ملحقہ تھانے پہنچے تو وہاں کسی کو نہ پایا سوائے ایک شخص کے جس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ میں کمپاؤنڈ فریکچر تھا اور بائیں آنکھ سوج کر بند ہو چکی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ میں دفعہ ۳۲۴ کی رپٹ لکھوانے آیا ہوں۔ دو گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں۔ اندھیر ہے۔ سول اسپتال والے کہتے ہیں کہ جب تک تھانے والے ایف ائی آر درج کر کے پرچہ نہ کاٹ دیں ہم تمہارا

آپریشن نہیں کر سکتے۔ مجروح بڑے فاتحانہ انداز سے وہ چھینا ہوا آلۂ ضرب یعنی شام چڑھی لاٹھی پکڑے بیٹھا تھا جس سے اُس کا سر پھاڑا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کا چچا تھا جو کسی وکیل دیوانی کا منشی تھا۔ وہ بھتیجے کو دلاسہ دے رہا تھا کہ ملزم نے لاٹھی اور قانون اپنے ہاتھ میں لے کر ثانی الذکر اور تمہارے کاسۂ سر کو بیک ضرب توڑا ہے۔ اس حرام زادے کو ہتھکڑی نہ پہنوادوں تو مجھے نطفہ بے تحقیق سمجھنا۔ اُس نے تو خیر سنگین جرم کیا ہے۔ میں نے تو کئیوں کو بغیر جرم کے جیل کی ہوا کھلوادی ہے! اُس نے بشارت کو قانونی مشورہ دیا کہ آپ کو دراصل اُس تھانے سے رجوع کرنا چاہیے جس کی حدود میں سرقہ کرنے والے یعنی چور کا مکان مسکونہ واقع ہوا ہے۔ دیوانی مقدّمات میں اسی طرح نالش داغی جاتی ہے۔ بشارت اُس سے اُلجھنے لگے۔ دورانِ بحث معلوم ہوا کہ اس وقت SHO کی دُخترِ نیک اختر کی منگنی کی رسم ہو رہی ہے۔ بیشتر عملہ وہیں تعینات ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آئیں گے۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر دوپہر سے سڑک پر حفاظتی ڈیوٹی اور اسکول کی لڑکیوں کو جمع کر کے سڑک پر دورویہ کھڑا کرنے میں لگا ہے، اس لیے کہ پرائم منسٹر ایک دفتر سے دوسرے دفتر جارہا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل دَوِش پر نکلا ہوا ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد ایس ایچ او نے ایک وکیل کی کار میں نزولِ اجلال فرمایا۔ وکیل کا بریف کیس جس پر خاکی زین کا غلاف چڑھا تھا ایک ملزم نما موکل اُٹھائے ہوئے تھا۔ خود وکیل کے ہاتھ میں منگنی کی مٹھائی کے ڈبّے تھے جو اُس نے عملے میں تقسیم کیے۔ ایک ڈبّا بشارت کو بھی دیا۔ ایس ایچ او کے آتے ہی سارا عملہ نہ جانے کہاں کہاں سے بھاگم بھاگ نکل کر اکٹھا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب تمام وقت یہیں سر جھکائے اپنے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ ایس ایچ او نے بشارت سے سرسری روداد سن کر کہا، آپ ذرا باہر انتظار کیجیے۔ اصل رپورٹ کنندہ ڈرائیور ہے۔ اُس سے استفسار کرنا ہے۔ گھنٹے بھر تک اُس سے نہ جانے کیا اُلٹی سیدھی تفتیش کرتا رہا۔ خلیفہ باہر نکلا تو اُس کا صرف منہ ہی لٹکا ہوا نہیں تھا، وہ خود سارا کا سارا لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے بعد ایس ایچ او نے بشارت کو اندر بلایا تو اُس کے تیور بالکل بدلے ہوئے تھے۔ کرسی پر بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ سوالوں کی بھرمار کر دی۔ تھوڑی دیر کے لیے تو بشارت کو خیال ہوا کہ شائد اُسے مغالطہ ہوا ہے اور وہ اُنھیں ملزم سامجھ بیٹھا ہے۔ لیکن جب اُس نے کچھ ایسے چبھتے ہوئے سوال کیے جو صرف انکم ٹیکس افسر کو کرنے چاہییں تو اُن کا اپنا مغالطہ دور ہو گیا۔ مثلاً جب آپ نے مسروقہ چوب عمارتی بیچی تو روکڑ بہی میں اندراج کیا یا بالا ہی بالا کیش ڈکار گئے؟ ڈرائیور کو جو تنخواہ دیتے ہیں تو رسید اتنی ہی رقم کی لیتے ہیں

یا زیادہ کی؟ گودام سے لکڑی بغیر ڈیلیوری آرڈر کے نکلتی ہے! آپ خود بغیر Learner's Licence کے ٹرک کیسے چلاتے ہیں؟ لکڑی کے تختے جب مبینہ ٹرک میں ناظم آباد لے جانے کے لیے رکھے گئے تھے تو کیا آپ نے حسبِ قانون مجریہ سن اُنیس سو کچھ پیچھے سرخ جھنڈی لگائی تھی؟ اور ہاں ناظم آباد پر یاد آیا کہ میرا مکان پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی میں "پلنتھ لیول" تک آ گیا ہے۔ کتنے فٹ لکڑی درکار ہو گی؟ تخمینہ لگا کر بتائیے۔ چھ سو گز کا ویسٹ اوپن کارنر پلاٹ ہے۔ آپ کے ہاں جو ریڈیو ہے اُس کا لائسنس آپ نے بنوایا؟ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کی فرم میں آپ کے پچھتر سالہ والد اور دودھ پیتا بیٹا بھی پارٹنر ہیں؟ لکڑی جب لی مارکیٹ سے ناظم آباد لے جائی تھی تو رنچھوڑ لائن کا طواف کرنے کی حاجت کیوں پیش آئی؟ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں اور ہارمونیم بجاتے ہیں؟ (جواب میں بشارت نے وضاحت کی کہ نماز میں پڑھتا ہوں۔ ہارمونیم والد صاحب بجاتے ہیں۔ اس جواب پر ایس ایچ او نے دیر تک ہتھکڑی بجائی اور پہلی بار مسکراتے ہوئے بولا ہوں! سنا منشی جی؟ گویا عذرِ گناہ لذیذ تراز گناہ!) لکڑی مبیّنہ طور پر عین مسجد کے دروازے پر رکھی گئی! تو کیا اس سے نمازیوں کی آزمائش منظور تھی؟ ڈرائیور سے آپ کا سارا ٹبّر حجامت بنواتا ہے۔ قورمہ پکواتا ہے۔ اُس نے آپ کے جونیئر پارٹنر کے ختنے بھی کیے۔ میری مراد

آپ کے نومولود صاحبزادے سے ہے۔ آپ نے اُس سے گھوڑا تانگہ بھی چلوایا۔ یہی آپ کے گھوڑے اور والد کا بالترتیب کھریرا اور مالش کرتا تھا۔ یہ لیبر لاز کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ کچھ عرصے پہلے ایک آرا کش کی آنکھ میں لکڑی کی چھپٹی اچٹ کر پڑنے سے بینائی جاتی رہی تو آپ نے اسپنسر آئی ہاسپٹل سے اُس کی پٹّی کرواکے گھر بھیج دیا؟ کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ اور آپ نے دُگنی قیمت پر لکڑی کیسے بیچی؟ اندھیر ہے۔ مجھے اپنے مکان کے لیے آدھے داموں مل رہی ہے! کھلے بھاؤ۔

تعزیرات وضابطہ فوجداری سے چھیڑ خانی

جب بشارت ہر سوال کا غیر تسلی بخش جواب دے چکے تو ایس ایچ او نے کہا، میں اسی وقت معائنہ موقع کروں گا۔ کل اتوار ہے۔ تھانے نہیں آؤں گا۔ سواری ہے؟ بشارت نے کہا، ہاں! ہے گی۔ اور اسے گاڑی تک لے آئے۔

"مگر یہ ہے کیا"۔ ایس ایچ او نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"اسی میں لکڑی گئی تھی"

"مگر یہ ہے کیا"

اس نے چوری سے بچ جانے والے ان تختوں کو چھو چھو کر دیکھا جو اس میں چنے ہوئے تھے۔ پھر گاڑی کے گرد چکر لگا کر ان کی لمبائی کا تخمینہ لگایا۔ اس کے بعد وہ یک لخت بپھر گیا۔ کیسی جائے واردات اور کیسا معائنہ موقع۔ الٹے دھر لیے گئے۔ ایس ایچ او بکتا جھکتا واپس تھانے میں لے گیا۔ جیسے ہی وہ اپنے کڈھب سوال سے انہیں چاروں خانے چت کرتا، ویسے ہی اس کا خوشامدی اسسٹنٹ اپنے سینگوں پر اٹھا کر دوبارہ زمین پر پٹخ دیتا۔ ایک سوال ہو تو۔ پسنجر کار کو کس کی اجازت سے ٹرک میں تبدیل کیا گیا۔ جس گلی سے اس کا گزرنا بیان کیا جاتا ہے وہ توون وے ہے! اس کی انشورنس پالیسی تو کبھی کی lapse ہو چکی۔ وہیل ٹیکس ایک سال سے نہیں بھرا گیا۔ آپ کے ڈرائیور نے ابھی خود اقبالِ جرم کیا ہے کہ بریک نہ ہونے کے سبب گاڑی گیئر کے ذریعے روکتا ہے۔ اسی وجہ سے چند روز پہلے گارڈن ایسٹ کی جھگیوں کے سامنے ایک مرغی کار کے نیچے آگئی، جس کا ہرجانہ خلیفہ کے پاس نہیں تھا۔ جھگی والوں نے رات بھر کار impound کیے رکھی اور مرغی کے بدلے خلیفہ کو یرغمال بنا لیا، ہر چند کہ وہ چیختا رہا کہ قصور کار کا نہیں۔ مرغی خود اُڑ کر اُس کے نیچے آئی تھی۔ طلوعِ آفتاب کے بعد خلیفہ نے بطور تاوان مرغی کے مالک کے ڈیڑھ دو درجن بیٹوں، بھتیجوں اور دامادوں اور دور نزدیک کے پڑوسیوں کی حجامت بنائی۔ تب کہیں جا کر گلو خلاصی ہوئی۔ ایک

پڑوسی تو اپنے پانچ سالہ بیٹے کو گوٹے والی ٹوپی پہنا کر لے آیا کہ ذرا اس کے ختنے کر دو۔ اس مشقّت سے فارغ ہو کر ڈیڑھ دو بجے آپ کے پاس پہنچا تو اس کا صلہ آپ نے یہ دیا کہ اُس پر الزام لگایا کہ تم کار کے ٹول بکس میں قینچی اور اُسترا رکھے حجامتیں بناتے پھرتے ہو۔ اور ایک دن کی تنخواہ کاٹنے کی دھمکی دی۔ خیر، یہ ایک علاحدہ تفتیش طلب مسئلہ ہے۔ لیکن یہ بتایئے کہ آپ کی کار چمنی کی طرح دھواں کیوں دیتی ہے؟ سڑک پر ہر کہیں کھڑی ہو جاتی ہے۔ منشی جی! اماں سُن رہے ہیں منشی جی؟ شارعِ عام پر رُکاوٹ پیدا کرنے کی کے مہینے کی ہے؟ محض؟ یا بامشقّت؟ اور جنابِ والا! اگر یہ صحیح ہے تو اس میں آپ کا پورا خاندان کچر گھان کیوں ٹنگا پھرتا ہے؟ اور منشی جی! ان کو؟ ذرا اوور لوڈنگ کی دِفعہ تو پڑھ کر سُنا دیجیے۔

مختصر یہ کہ تعزیراتِ پاکستان اور ضابطۂ فوجداری کی کوئی دِفعہ ایسی نہیں بچی جسے توڑ کر وہ اُس وقت رنگے ہاتھوں نہ پکڑے گئے ہوں۔ اُن کا ہر فعل کسی نہ کسی دِفعہ کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔ اور اُنھیں ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کی ساری زندگی تعزیراتِ پاکستان اور ضابطہ فوجداری سے چھیڑ خانی میں گزری ہے۔ پہلے تو اُنھیں اس پر حیرت ہوئی کہ ایس ایچ او کو ان کی تمام قانونی شکنیوں کا القا کیسے

ہوا۔ پھر وہ بار بار خلیفہ کو کچّا چبا جانے نظروں سے دیکھنے لگے۔ جیسے ہی آنکھیں چار ہوتیں خلیفہ جھٹ سے ہاتھ جوڑ لیتا۔

اتنے میں ایس ایچ او نے آنکھ سے کچھ اشارہ کیا اور ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر خلیفہ کے ہتھکڑی ڈال دی۔ ہیڈ کانسٹیبل بشارت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُنھیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ''پہلے آپ کے خلاف پرچہ کٹے گا۔ از بسکہ محولہ بالا vehicle خود ناجائز ہے، لہٰذا بمعہ مال محمولہ، بشمول چوبِ مسروقہ، قابلِ ضبطی ہے۔ منشی جی! سپرد نامہ تیار کیجیے۔ شکایت کنندہ سے خود بہت سے ارتکابات ہوئے ہیں، لہٰذا۔۔۔۔''۔

بشارت کو چکر آنے لگا۔ وہ اس وقت مال بردار ٹرک محولہ بالا، مالِ محمولہ، چوب مشمولہ اور مسروقہ میں کوئی تمیز نہیں کر سکتے تھے۔

کچھ احوال حوالات کا

تھانے کی حوالات یا جیل میں، آدمی چار گھنٹے بھی گزار لے تو زندگی اور حضرتِ انسان کے بارے میں اتنا کچھ سیکھ لے گا کہ یونیورسٹی میں چالیس برس رہ کر بھی نہیں سکتا۔ بشارت پر چودہ طبق سے بڑھ کر بھی کچھ روشن ہو گیا اور وہ دہل کر رہ

گئے۔ سب سے زیادہ تعجب اُنھیں اس زبان پر ہوا جو تھانوں میں لکھی اور بولی جاتی ہے۔ رپٹ کنند گان کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن منشی جی ایک شخص کو (جس پر نابالغ لڑکی کے ساتھ زبردستی نکاح پڑھوانے کا الزام تھا) عقد بالجبر کنندہ کہہ رہے تھے۔ عملے کی آپس کی گفتگو سے اُنھیں اندازہ ہو کہ تھانا ہذا نے بنی نوع انسان کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک وہ جو سزا یافتہ ہیں۔ دوسرے وہ جو نہیں ہیں، مگر ہونے چاہییں۔ مُلک میں اکثریت غیر سزا یافتہ لوگوں کی ہے اور یہی بِنائے فتور و فساد ہے۔ گفتگو میں جس کسی کا بھی ذکر آیا، وہ کچھ نہ کچھ "یافتہ" یا "شدہ" ضرور تھا۔ "حجرہ مزاج پُرسی" میں جو شخص وقفے وقفے سے چیخیں مار رہا تھا وہ سابق سزا یافتہ اور مچلکے شدہ تھا۔ شارعِ عام پر بوس و کنار کے الزام میں جن دو عورتوں کو گرفتار کیا گیا تھا، اُن میں سے ایک کو اے ایس آئی شادی شدہ اور دوسری کو محض شدہ یعنی گئی گزری بتا رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل جو خود انعام یافتہ تھا، کسی وفات یافتہ کا بیانِ نزعی پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ ایک پرچے میں کسی غنڈے کے غیر قابو یافتہ چال چلن کی تفصیلات درج تھیں۔ ایک جگہ آتش زدہ مکانِ مسکونہ کے علاوہ علاوہ برباد شدہ اسباب اور تباہ شدہ شہرت کے بھی حوالے تھے۔ اے ایس آئی ایک رپورٹ کنندہ سے دورانِ تفتیش پوچھ رہا تھا کہ شخص مذکورہ الصّدر کی وفات شدگی کا علم تمہیں کب ہوا۔ یہاں ہر فعل

فارسی میں ہو رہا تھا۔ مثلاً سمن کی تعمیل بذریعہ چسپاند گی، متوفی کی وجہِ فوتید گی، عدم استعمال اور زنگ خورد گی کے باعث جملہ رائفل ہائے تھانا ہذا بمعہ کارتوس ہائے پارینہ کی مُرورِ ایّام سے خلاص شُد گی اور عملے کی حیرانگی!

اس تھانے میں ہتھیار کی صرف دو قسمیں تھیں۔ دھار دار اور غیر دھار دار۔ جس ہتھیار سے گواہ استغاثہ کے سرُین پر نیل پڑے اور کاسئہ سر متورم ہوا، اس کے بارے میں روزنامچے میں مرقوم تھا کہ ڈاکٹری معائنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ گواہ مذکور کو بیچ بازار میں غیر دھار دار آلے سے مضروب کیا گیا۔ مراد اس سے جوتا تھا! رات کے دس بجے "حجرۂ مزاج پُرسی" میں ایک شخص سے جوتے کے ذریعے سچ بلوایا جارہا تھا۔ معلوم ہوا کہ جوتے کھا کر ناکردہ جرم کا اقبال کرنے والے کو سُلطانی گواہ کہتے ہیں۔ وہ شخص بڑی دیر سے زور زور سے چیخے جارہا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہنوز جوتے کھانے کو جھوٹ بولنے پر ترجیح دے رہا ہے۔ جوتے کے اس extra-curricular (بالائے نصاب) استعمال کو پنجابی میں چھترول کہتے ہیں۔ تھانے میں آمدورفت کچھ کم ہوئی تو تین کانسٹیبل صبح درج کیے ہوئے زنا بالجبر کے کیس کے ایک عینی گواہ کو آٹھویں دفعہ لے کر بیٹھ گئے جو اس وقت اس واقعے کو اس طرح بیان کر رہا تھا جیسے بچّے اپنے والدین کے دوستوں کو اِترا اِترا کر نرسری رہائم سُناتے ہیں۔ ہر دفعہ وہ نئی جزئیات سے اس

واردات میں اپنی مجرمانہ حسرتوں کا رنگ بھرتا چلا جاتا۔ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔ تینوں کانسٹیبل سر جوڑے اس اچھے شعر کی طرح سُن رہے تھے۔ اور بیچ بیچ میں ملزم کو رشک بھری داد اور داد بھری گالیاں دیتے جاتے۔ صبح جب بند کمرے میں مستغیثہ کے اظہار لیے جا رہے تھے تو سب کے ____ حتّٰی کہ حوالات میں بند ملزموں کے بھی ____ کان دیوار سے لگے تھے۔

یہاں ہر واردات مبیّنہ طور پر ہو رہی تھی۔ مثلاً "ملزم اپنی جائے رہائش سے نکل کر گواہانِ استغاثہ پر جھپٹا اور اپنے آگے کے دندان سے مسماۃ نذیراں کے مبیّنہ عاشق مسمّی شیر دل خاں کی ناک بقدر دو انچ بقیہ جسم سے علاحدہ کر دی اور مبیّنہ طور پر ExhibitA یعنی موجودہ ناک کے غائب شدہ حصّے کو نگل گیا۔ منحرف گواہ مسماۃ نذیراں بنتِ نامعلوم نے پہلے تو اے ایس آئی صاحب کے مواجہ میں ب۔ س۔ ص۔ ت کرنے سے انکار کر دیا لیکن بعد ازاں بلا تخویف، نشانِ انگشت چُپ سے ب۔ س۔ ص۔ تکرنے پر رضامند ہو گئی"۔ یہ مخفف تھا: "بیان سُن کر صحت تسلیم کی"۔ نو بجے ایک شام کے اخبار کا جرائم رپورٹر آیا جس کے اخبار کا سرکولیشن کسی طرح بڑھ کر نہیں دے رہا تھا۔ اے ایس آئی سے کہنے لگا "اُستاد! دو ہفتوں سے خالی جا رہا ہوں۔ یہ تھانا ہے یا گورِ غریباں۔ تمہارے علاقے کے سبھی غنڈے یا تو تائب ہو گئے ہیں یا پولیس میں بھرتی ہو گئے۔

چندے یہی حال رہا تو ہم دونوں کے گھروں میں چوہے قلابازیاں کھائیں گے"۔
اُس نے جواب دیا "جانِ من! بیٹھو تو سہی۔ آج ایک گلے میں گھنٹی باندھ دی ہے۔ ایسا اسکوپ برسوں میں نصیب ہوتا ہے۔ بغل والے کمرے میں عینی گواہ دسویں دفعہ آموختہ سُنا رہا ہے۔ تم بھی جا کے سُن لو۔ اور یار! چار دن سے تو نے میرے تبادلے کے خلاف ایک بھی لیٹر ٹو دی ایڈیٹر نہیں چھپوایا۔ ہمیں جب نہ ہوں گے تو تجھے کون ہتھیلی پہ بٹھائے گا؟ اوئے بشیرے! دو چاء سلیمانی۔ فٹافٹ۔ لبالب۔ بلائی (بالائی) ایسی دبا دب ڈلوائیو کہ چاء میں پینسل کھڑی ہو جائے۔ اور بھائی فیروز دین! اس حجرے والے انقلابیے کو چپکا کرو۔ سرِ شام ہی سے سالے کے دردیں اُٹھنے لگیں۔ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ چیختے، ڈکراتے گلا بیٹھ گیا ہے۔ جنابِ عالی! مرد کے رونے سے زیادہ ذلیل چیز دُنیا میں نہیں۔ سالا خود کو حسن ناصر سے کم نہیں سمجھتا۔ میں نے پانچ بجے اسے آئس کولڈ بیئر کے چار مگ پلا دیے۔ بہت خوش ہوا۔ تیسرے مگ کے بعد مجھے، جی ہاں مجھے، "ستونِ دار پہ رکھے چلو سروں کے چراغ" کا مطلب سمجھانے لگا! چوتھا پی چکا تو میں نے ٹوائلٹ جانے کی مناہی کر دی۔ چنانچہ تین دفعہ کھڑے کھڑے پتلون میں ہی چراغ جلا چکا ہے۔ جنابِ عالی! ہم تو حکم کے تابع ہیں۔ ابھی تو لاہور کے شاہی

قلعے میں اس کی آرتی اُترے گی۔ وہ سب کچھ قبلوا لیتے ہیں۔ اس سالے کی ٹریجیڈی یہ ہے کہ اس کے پاس قبولنے کو کچھ ہے نہیں۔ لہذا زیادہ پِٹے گا۔

شاملِ واردات

تازہ واردات کی خبر سُن کر رپورٹر کی باچھیں کِھل گئیں۔ اس خوشی میں اُس نے ایک سگریٹ اور دو میٹھے پانوں کا آرڈر دے دیا۔ جیب سے پیپر منٹ اور نوٹ بُک نکالی۔ بڑی مدّت بعد ایک چٹ پٹی خبر ہاتھ لگی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کیس کا پلاٹ اپنے افسانہ نویس دوست سلطان خاور کو بخش دے گا جو روز ''رئیل لائف ڈرامہ'' کا تقاضہ کرتا ہے۔ آبرو ریزی کے اس کیس کی تفصیلات سُننے سے پہلے ہی ذہن میں سُرخیاں سنسانے لگیں۔ اب کی دفعہ سُرخی میں ہی کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دوں گا۔ اُس نے دل میں تہیّہ کیا۔ ''ستّر سالہ بوڑھے نے سات سال کی لڑکی سے منہ کالا کیا''۔ یہ سُرخی جمانے کی خاطر پچھلے سال اسے لڑکی کی عمر سے دس سال نکال کر بوڑھے کی عمر میں جوڑنے پڑے تھے تاکہ اسی تناسب سے جرم میں سنگینی اور قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہو جائے۔ مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ سیدھے سادے اور سپاٹ لفظ rape کے جتنے بھی مترادفات ہمارے ہاں رائج ہیں، اُن میں ایک

بھی ایسا نہیں جس میں خود لذّتیت کا عنصر نہ ہو۔ کوئی سُرخی، کوئی سا فقرہ اُٹھا کر دیکھ لیجیے، جنسی لذّت کشی کا فشردہ نظر آئے گا۔ "ملزم نے خوبرو دوشیزہ کا دامنِ عصمت تار تار کر دیا"۔ "ستّر سالہ بوڑھا رات کی تاریکی میں منہ کالا کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا"۔ "پینسٹھ سالہ بوڑھا شب بھر کمسن دوشیزہ کی عصمت سے کھیلتا رہا"۔ گویا اصل اعتراض پینسٹھ برس پر ہے، جس میں ملزم کا کوئی قصور نہیں۔ (دراصل اس سُرخی میں اخلاقیات، استعجاب، کرید اور حسد کی بحصّہ مساوی آمیزش ہے۔ مطلب یہ کہ اخلاقیات صرف ۱/۴)۔ "چاروں ملزموں نے نوخیز حسینہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا"۔ "درندہ صفت ملزم وقفے وقفے سے پستول دکھا کر عصمت پر ڈاکہ ڈالتا رہا۔ پولیس کے آنے تک دھمکیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا"۔ یہ سُرخیاں اور عبارتیں ہم نے اخبارات سے حرف بحرف نقل کی ہیں۔ بعض بیانیہ اصطلاحیں اور فقرے کے فقرے، جنھیں ہم نقل کرنے سے بوجوہ قاصر ہیں، ایسے ہوتے ہیں جن سے لگتا ہے کہ بیان کرنے والا voyeur[1] خود بنفسِ حریص شاملِ واردات ہونا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پڑھنے والے کی قانونی ہمدردیاں دوشیزہ کے ساتھ مگر دل ملزم کے ساتھ ہوتا ہے ۔

---

[1] محض جنسی نظارہ بازی سے لذّت لینے والا۔ Peeping Tom

سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

کوئلے کی اس کان سے مزید نمونے برآمد کرنا چنداں ضروری نہیں کہ ہاتھ کالے کرنے کے لیے یہی کافی ہیں۔ مختصراً اتنا عرض کر دیں کہ ذرا کھرچیے تو آپ کو جنسی جرائم سے متعلق کوئی فقرہ لذّت اندوزی سے خالی نہیں ملے گا۔ ہر لفظ سسکی اور ہر فقرہ چسکی لیتا دکھائی دے گا۔ انگریزی میں اس اسلوب کی بہترین مثال روسی نژاد مصنف نابوکوف کے ہاں ملتی ہے جو ہر لفظ کے غبارے کو رال میں لتھڑے ہوئے ہونٹوں میں دبا کر آخری نقطۂ تلذّذ تک بُھلا بُھلا کر دیکھتا اور پھر اپنے قاری پر چھوڑتا چلا جاتا ہے۔

کتّا کیوں کاٹتا ہے

کافی دیر تک تو بشارت کو یقین نہیں آیا کہ یہ سب سچ ہو سکتا ہے۔ کراچی ہے کوئی رجواڑہ تو نہیں۔ اچھی خاصی farce معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب رات کے نو بج گئے تو معاملہ سچ مچ گھمبیر نظر آنے لگا۔ اے ایس آئی نے کہا ”آج رات اور کل کا دن اور رات آپ کو حوالات میں گزارنے پڑیں گے۔ کل اتوار پڑ گیا۔ پرسوں سے پہلے آپ کی ضمانت نہیں ہو سکتی“۔ اُنھوں نے پوچھا ”کس بات کی

ضمانت؟" جواب ملا "یہ عدالت بتائے گی"۔ اُنھیں فون بھی نہیں کرنے دیا۔ اِدھر حوالات کی کوٹھری میں جس کے جنگلے سے پیشاب کی کھراہند بھک بھک آرہی تھی، خلیفہ وقفے وقفے سے ہتھکڑی والا ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتا اور ہی ہی، ہی ہی کر کے اس طرح روتا کہ ہنسی کا گُمان ہوتا۔ بشارت کا غصّہ اب ایک اپاہج اور گونگے کا غصّہ تھا۔ اتنے میں تھانے کے منشی جی چٹائی کی جانماز پر عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اُن کے پاس آئے۔ سُوکھ کر بالکل ٹڈّا ہو گئے تھے، مگر عینک تلے آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ لہجے میں شفقت اور مٹھاس گھلی ہوئی۔ ایک بوتل لیمونیڈ کی اپنے ہاتھ سے گلاس میں اُنڈیل کر پلائی۔ اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی ڈبیا سے پان نکال کر کھلایا۔

منشی جی نے بڑے نرم اور پُر خلوص لہجے میں کہا کہ ہمارے سرکار (ایس ایچ او) بڑے بھلے آدمی ہیں۔ شریفوں کے ساتھ شریف اور بدمعاشوں کے حق میں ہلاکو۔ یہ میری گارنٹی ہے کہ آپ کا چوری شدہ مال تین دن میں برآمد کرا دیا جائے گا۔ سرکار انتڑیوں میں سے کھینچ کر نکال لاتے ہیں۔ علاقے کے ہسٹری شیٹر ان کے نام سے تھر تھر کانپتے ہیں۔ وہ ریڈیوگرام، زیورات اور ساریاں جو اس کمرے میں آپ نے دیکھیں، ان کی بازیابی آج صبح ہی ہوئی ہے۔ معروضہ یہ ہے کہ حضور کی گاڑی میں جو لکڑی پڑی ہے، وہ سرکار کے پلاٹ پر ڈلوا دیجیے۔

آپ کی اسی مالیّت کی مسروقہ لکڑی سرکار تین دن میں برآمد کروادیں گے۔ گویا آپ کی گرہ سے تو کچھ نہیں گیا۔ میں نے ابھی ان سے ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے سُن کر خفا ہو جائیں۔ بس یوں ہی آپ کا عندیہ لے رہا ہوں۔ سرکار کی صاحبزادی کا رشتہ خُدا خُدا کر کے طے ہوا ہے۔ بٹیا تیس سال کی ہو گئی۔ بہت نیک اور سگھڑ ہے۔ آنکھ میں خفیف سی کجی ہے۔ لڑکے والے جہیز میں کار، فرنیچر، ریڈیو گرام اور ویسٹ[1] اوپن پلاٹ اپر بنگلہ مانگتے ہیں۔ کھڑکی کے دروازے عمدہ لکڑی کے ہوں۔ بَر چوک جائے تو پھر یہ سب کچھ بھوگنا بھگتنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہمارے سرکار اس قسم کے آدمی نہیں۔ آج کل بہت پریشان اور چڑچڑے ہو رہے ہیں۔ یہ تو سب دیکھتے ہیں کہ باؤلا کتّا ہر ایک کو کاٹتا پھرتا ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ اپنی مرضی سے باؤلا تھوڑا ہی ہوا ہے۔ آپ نے خود دو چار فقروں سے اندازہ کر لیا ہو گا کہ سرکار نے کیسی شگفتہ اور موزوں طبیعت پائی ہے۔ تین برس پہلے تک شعر کہتے تھے۔ شام کو تھانے میں شاعروں کا ایسا اژدھام ہوتا تھا کہ بعض اوقات حوالات میں کُرسیاں ڈلوانی پڑتی تھیں۔ ایک شام بلکہ رات کا ذکر ہے۔ گھمسان

---

[1] ویسٹ اوپن: کراچی میں کیونکہ شام کو ٹھنڈی ہوا سمندر یعنی مغرب کی سمت سے چلتی ہے، اس لیے مغربی رویہ مکانوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

کا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ سرکار ترنّم سے تازہ غزل پڑھ رہے تھے۔ سارا عملہ داد دینے میں جُٹا ہوا تھا۔ مقطعے پر پہنچے تو سنتری زردار خان نے تھری ناٹ تھری رائفل چلا دی۔ حاضرین سمجھے شاید قبائلی طریقے سے داد رہا ہے۔ مگر جب وہ واویلا مچانے لگا تو معلوم ہو کہ دورانِ غزل جب مشاعرہ اپنے شباب پر پہنچا تو ڈکیتی کیس میں ماخوذ ایک ملزم جو حوالات کا جنگلہ بجا بجا کے داد دے رہا تھا، بھاگ گیا۔ شاعروں نے اس کا تعاقب کیا۔ مگر اسے تو کیا پکڑ کے لاتے، خود بھی نہیں لوٹے۔ اللہ جانے پولیس کانسٹیبلان نے پکڑنے میں تساہل برتی یا ملزم نے "پکڑائی" نہیں دی مگر سرکار نے ہمت نہیں ہاری۔ راتوں رات اسی نام کے بستہ الف کے ایک چُھٹے ہوئے بدمعاش کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔ کاغذات میں مفرور ملزم کی ولدیت بدل دی مگر اس کے بعد شعر نہیں کہا۔ تین برس سے سرکار کی ترقی اور شعر کی آمد بند ہے۔ عدم صاحب سے یاری ہے۔ پچھلے برس اپنے معصوم بچوں کے حلق پہ چھری پھیر کر حکام بالا کو ڈیڑھ لاکھ کی نذر گزرائی تو "لائن حاضری" سے چھٹکارا ملا اور اس تھانے میں تعیناتی ہوئی۔ اب سرکار کوئی ولی اللہ تو ہیں نہیں کہ سلام پھیر کر جا نماز کا کونا الٹ کر دیکھیں تو ڈیڑھ لاکھ کے نوٹ از غیبی دھرے ملیں۔ دودھ تو آخر تھنوں ہی سے نکالنا پڑتا ہے۔ بھینس دستیاب نہ ہو تو کبھی کبھی چوہیا ہی کو پکڑ دوہنا پڑتا ہے"۔

بشارت کو نقصانِ مایہ سے زیادہ اس ذلت آمیز مثال پر غصہ آیا۔ بکری بھی کہہ دیتا تو غنیمت تھا (گو کہ چھوٹی ہے ذات بکری کی) لیکن صورتحال کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی۔ انہوں نے کہا، میں اپنی رپٹ واپس لیتا ہوں۔ اے ایس آئی نے جواب دیا کہ "دن دہاڑے سرقہ ناقابلِ راضی نامہ جرم ہے یعنی قابل دستِ اندازی پولیس ہے۔ آپ رپٹ واپس لینے والے کون ہوتے ہیں؟ اگر آپ نے واپس لینے پر اصرار کیا تو جھوٹی رپٹ درج کرانے پر آپ کا یہیں آن دی سپاٹ چالان کر دوں گا۔ عزت کے لالے پڑ جائیں گے۔ اگر آپ کا وکیل بہت لائق فائق ہوا تو تین مہینے کی ہو گی۔ ایس ایچ او صاحب پیر کو فیصلہ کریں گے کہ آپ کن کن دفعات کے تحت ماخوذ ہیں"۔

انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا ہر فعل، ان کی ساری زندگی قابل دست اندازی ہی نہیں، قابلِ دست درازی پولیس رہی ہے۔ اور یہ سراسر پولیس کی غفلت کا نتیجہ تھا کہ وہ اب عزت آبرو سے بسر کر رہے تھے۔

انہوں نے طیش میں آکر دھمکی دی کہ مجھے حبس بے جا میں رکھا گیا ہے۔ یہ غیر قانونی حراست ہے۔ میں ہائی کورٹ میں Habeas Corpus Petition پیش کروں گا۔ اے ایس آئی بولا، آپ پٹیشن کیا پیش کریں گے، ہم خود آپ کو

ہتھیلی پہ دھر کے عدالت میں پیش کریں گے۔ دھڑلے سے دس دن کا جسمانی ریمانڈ لیں گے۔ دیکھتے جایئے۔

آپ بیتی لکھنے کی خاطر جیل جانے والے

ای ایس آئی یہ دھمکی دے کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد اس کا باس ایس ایچ او بھی اپنا ڈنڈا بغل میں دبائے اہم عہم عاحم کھانستا کھنکارتا اپنے گھر چلا گیا۔ عین اسی وقت مٹھائی والا وکیل نہ جانے کہاں سے دوبارہ آن ٹپکا۔ رات کے گیارہ بجے بھی اس نے کالا کوٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ وکیلوں کا مخصوص کلف دار سفید کالر بھی لگائے ہوئے تھا۔ کہنے لگا، برادر! ہر چند کہ میرا اس مقدمے سے کوئی تعلق نہیں، محض انسانی ہمدردی کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ آپ متعدد جرائم میں ملوث کیے جاسکتے ہیں۔ خدانخواستہ ابھی دفعہ ۱۶۴ ضابطۂ فوجداری کے تحت آپ کے ڈرائیور کا اقبالِ جرم قلم بند ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ آپ صورت سے بال بچّے دار آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ لیڈر تو ہیں نہیں جو سیاسی کیریئر بنانے اور سوانح عمری لکھنے کے لالچ میں جیل جائیں۔ پارٹیشن سے پہلے کی بات اور تھی۔ لیڈر باغیانہ تقریر کرکے جیل جاتا تھا تو جناب والا! سارا ملک انتظار

میں رہتا تھا کہ دو تین سال بعد چھوٹیں گے تو کوئی تفسیر، کوئی آپ بیتی، کوئی تصنیف مکمل کر کے نکلیں گے۔ بد قسمتی سے انگریزوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو جیل سے قبل از وقت رہا کر دیا تو تفسیر ادھوری رہ گئی۔ بہر حال، وہ زمانے اور تھے۔ آج کل والا حال نہیں تھا کہ تقریر کرنے سے پہلے ہی دھر لیے گئے اور چھوٹے تو جیل کے دروازے پر کوئی ہار پھول پہنانے والا تک نہیں۔ نہ چراغے، نہ گلے والا مضمون! بخدا! میں یہ بحث نہیں کر رہا کہ آپ مجھے وکیل کر لیں، گو کہ میں آپ کو منع بھی نہیں کر سکتا۔ محض آپ کے بھلے کو کہہ رہا ہوں۔ مجھے پریکٹس کرتے پچیس سال ایک مہینہ ہوا۔ میں نے آج تک کوئی قانونی گتھی ایسی نہیں دیکھی جسے نانواں (روپیہ) نہ سلجھا سکے۔ سارے سم سم اسی سے کھلتے ہیں۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔ البتہ اتنا فوڈ فار تھاٹ (Food for thought) شب گزاری کے لیے چھوڑے جاتا ہوں کہ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجا چاہتے ہیں۔ آپ نے ان آٹھ گھنٹوں میں پولیس کا کیا بگاڑ لیا جو آئندہ آٹھ گھنٹوں میں بگاڑ لیں گے۔ کل اتوار ہے۔ آپ اسی طرح حوالات میں اکڑوں بیٹھے اپنے کانسٹی ٹیوشنل رائٹس اور ضابطہ فوجداری کے حوالے دیتے رہیں گے۔ عدالت زیادہ سے زیادہ یہی تو تیر مارلے گی کہ آپ کو پیر کے دن رہا کر دے گی۔ سو ہم تو جناب والا پیر سے پہلے ہی آپ کو اس چوہے دان کے باہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ

زیر حراست ہیں۔ اچھا۔ بہت رات ہو گئی۔ شب بخیر! منشی جی کو میرے گھر کا فون نمبر معلوم ہے۔

وکیل کے جانے کے بعد ہیڈ کانسٹیبل ایک چٹائی، ایلومینیم کا لوٹا اور کھجور کا دستی پنکھا لے آیا اور خلیفہ والی حوالات کی طرف اشارہ کر کے بشارت سے کہنے لگا "دن بھر بیٹھے بیٹھے آپ کی کمر تختہ ہو گئی ہو گی۔ اب آپ یہ بچھا کر وہاں لیٹ جایئے۔ مجھے جنگلے میں تالا لگانا ہے۔ مچھر بے پناہ ہیں۔ یہ کمبل اوڑھ لیجیے گا۔ زیادہ گرمی لگے تو یہ پنکھا ہے۔ رات کو استنجا آئے تو بے شک وہیں۔۔۔۔۔ بارہ بجے کے بعد حوالات کا تالا نہیں کھولا جاسکتا"۔ اُس نے بتیاں بجھانی شروع کر دیں۔

مگر قاردرہ کچھ اور کہتا ہے!

بتیاں بجھنے لگیں تو خلیفہ زور زور سے "سرکار! سرکار!" کر کے رونے لگا۔ حوالات کی دیواروں پر کھٹملوں کی قطاریں رینگنے لگیں۔ اور چہرے کے گرد خون کے پیاسے مچھروں کا پالہ گردش کرنے لگا۔ اس مرحلے پر منشی جی دفعتاً پھر نمودار ہوئے۔ اور ملباری ہوٹل سے منگوایا ہوا قیمہ، جس میں پڑی ہوئی ہری مرچوں اور

ہرے دھنیے کی الگ سے خوشبو آ رہی تھی۔ اور تنور سے اُترتی نان بشارت کے سامنے رکھی۔ گرم نان سے اشتہا کو باؤلا کر دینے والی وہ لپٹ آ رہی تھی جو ہزارہا سال قبل انسان کو آگ دریافت کرنے کے بعد گیہوں سے آئی ہو گی۔ اسے کھانے سے انکار کرنے کے لیے بشارت نے کچھ کہنا چاہا تو کہہ نہ سکے کہ بھوک سے بُرا حال تھا اور سارا منہ رال سے بھر گیا تھا۔ ہاتھ کے ایک لجلجے سے اشارے سے انکار کیا اور ناک دوسری طرف پھیر کر بیٹھ گئے۔ اس پر منشی جی بولے، قسم خُدا کی! میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ اس کا عذاب آپ کی گردن پر۔ تین بجے ایک "بن" چاء میں ڈبو کے کھایا تھا۔ بس۔ ڈاکٹر آنتوں کی ٹی بی بتاتا ہے۔ مگر پیر الٰہی بخش کالونی والے حکیم شفاء الملک کہنے لگے کہ یہ بیماری زیادہ کھانے سے ہوتی ہے۔ لو اور سُنو! میں نے کہا، حکیم صاحب! میرا جُثہ جسامت تو دیکھیے۔ بولے، مگر قارورہ کچھ اور کہتا ہے!

یکبارگی منشی جی نے بات کا رُخ موڑا۔ بشارت کے گُھٹنے چُھو کر کہنے لگے، میں آپ کے پیروں کی خاک ہوں۔ پر دُنیا دیکھی ہے۔ آپ عزت دار آدمی ہیں۔ مگر معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ قاردرہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں آپ کے خُسر کا محلّے دار اور ادنیٰ نیاز مند رہ چکا ہوں۔ دیکھیے، عزت کا صدقہ مال ہوتا ہے۔ لکڑی دے دلا کے رفع دفع کیجیے۔ کلہم دو تین ہزار کی تو بات ہے۔ یہ تو دیکھیے

آپ ہیں کہاں! پھر یہ غور فرمایئے کہ ساڑھے تین ہزار کی اس لکڑی کے عوض آپ کو ساڑھے تین ہزار کی دوسری لاٹ مل جائے گی۔ پھر جھگڑا کس بات کا؟ سرکار شیر کے منہ سے شکار ہی نہیں چھینتے، اُس کے دانت بھی اُکھاڑ لاتے ہیں۔ علاقے میں کہیں کوئی واردات ہو، سرکار کو گویا القا ہو جاتا ہے کہ کس کا کام ہے۔ بعضے بعضے کو تو محض قیافے پر ہی دھر لیتے ہیں جیسا کہ، معاف کیجیے، حضور کے ساتھ ہوا۔ پچھلے سال انھی دنوں کی بات ہے۔ سرکار نے ایک شخص کو گالی گلوچ سے شارع عام پر رُکاوٹ پیدا کرنے پر گرفتار کیا۔ بظاہر ذرا سی بات تھی۔ مگر قاردرہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ سب کو تعجب ہوا۔ مگر دو گھنٹے بعد سرکار نے اس کے گھر سے وہائٹ ہارس وہسکی کی تین سو بوتلیں، دو گھوڑا بوسکی کے تھان، مسروقہ زیورات، درجنوں ریڈیو گرام اور دنیا بھر کا چوری کا مال برآمد کر لیا۔ گھر میں ہر چیز چوری کی تھی۔ ایک چیز بھی ذاتی نہیں نکلی۔ سوائے والد کے جس نے کہا کہ میں اس ناخلف کو عاق کرتا ہوں۔ مگر ہمارے سرکار دل کے بہت اچھے ہیں۔ پچھلے سال اسی زمانے میں میری بیٹی کی شادی ہوئی۔ سارے اخراجات سرکار نے خود برداشت کیے۔ انھی میں کا ایک ریڈیو گرام بھی جہیز میں دیا۔ میں اس کی گارنٹی دیتا ہوں کہ مسروقہ لکڑی اور ٹرک کی رجسٹریشن بک آپ کو تین دن کے اندر اندر دُکان پر ہی ڈلیور ہو جائے گی۔ میری مان جایئے۔ ویسے بھی بیٹی کی

شادی کے لیے رشوت لینے اور دینے کا شمار نیگ نیوتے میں کرنا چاہیے۔ آپ سمجھ رہے ہیں؟

روٹی میری کاٹھ دی، لاون میری بھکھ[1]

اب پیاز کے سب چھلکے ایک ایک کر کے اُتر چکے تھے۔ بس آنکھوں میں ہلکی ہلکی سوزش باقی رہ گئی تھی۔ خواری کا اصل سبب سمجھ میں آجائے تو جھنجھلاہٹ جاتی رہتی ہے۔ پھر انسان کو چپ لگ جاتی ہے۔ منشی جی اب انھیں اپنے ہی آدمی لگنے لگے۔

"منشی جی! یہاں سبھی؟"

"حضور! سبھی"

"وکیل صاحب بھی"

"منشی جی! پھر آپ ــــــ؟"

---

[1] میری روٹی کاٹھ کی ہے اور بھوک میری لگاون۔ بابا فرید۔

”حضور میرے سات بچّے ہیں۔ بڑا بیٹا انٹر میں ہے۔ بیوی کو ٹی بی بتائی ہے۔ دن میں دو تین دفعہ خون ڈالتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے مری یا کوئٹہ کے سینی ٹوریم لے جاؤ۔ تنخواہ اس سال کی ترقّی ملا کر اٹھائیس روپے پانچ آنے بنتی ہے[1]“۔ ”بشارت نے ٹرک میں لدی ہوئی لکڑی ایس ایچ او کو نذر کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ آدھی رات اِدھر، آدھی رات اُدھر، بارہ بجے خلیفہ کی ہتھکڑی کُھلی تو وہیں یعنی موری کے منبع و مخرج کے درمیان سجدے میں چلا گیا۔ شُکرانے کے سجدے سے ابھی پوری طرح نہیں اُٹھا تھا کہ ہاتھ پھیلا کر ہیڈ کانسٹیبل سے بیڑی مانگ کر پی۔ ادھر بشارت کو بھی کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت ملی۔ منشی جی نے مبارک باد دی اور اپنی پیتل کی ڈبیا سے نکال کر دوبارہ پان کی کترن یہ کہہ کر پیش کی کہ یہ گلوریاں آپ کی بھابی نے صُبح بطورِ خاص بنائی تھیں۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بشارت کو علاحدہ لے جا کر مبارک باد دیتے ہوئے کہا ”خوشی کا موقعہ ہے۔ منشی جی کو پچیس روپے دے دیجیے۔ غریب عیال دار، ایمان دار آدمی ہے۔ اور جنابِ عالی! اب ہم سب کا منہ میٹھا کرائیے۔ ایسے خوشی کے موقعے بار بار تھوڑا

---

[1] کانسٹیبل کی تنخواہ اُس زمانے میں سترہ روپے ہوتی تھی۔ اور ASI کی ستر روپے جو بینک کے چپراسی کی تنخواہ کے برابر تھی۔

ہی آتے ہیں۔ آپ بے شک گھر پر فون کر لیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ سرکار اب تک کیوں نہیں لوٹے۔ ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا۔ ڈھنڈیا مچ رہی ہو گی۔ اسپتالوں کے کیژولٹی وارڈ میں ہر مُردے کی چادر ہٹا ہٹا کے دیکھ رہے ہوں گے اور مایوس لوٹ رہے گے"۔ بشارت نے سو روپے جیب سے نکال کر مٹھائی کے لیے دیے۔ تھوڑی دیر بعد ایس ایچ او کے کمرے سے وہی وکیل صاحب مٹھائی کے ویسے ہی چار ڈبّوں کا مینار گود میں اُٹھائے اور ٹھوڑی کی ٹھونگ سے اسے بیلنس کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اُنھوں نے بھی بڑی گرم جوشی سے مبارک باد دی اور اُن کی معاملہ فہمی اور سمجھ داری کو سراہا۔ تین ڈبّے عملے میں تقسیم کیے اور چوتھا بشارت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے، یہ ہماری طرف سے بھابی صاحبہ اور بچّوں کو دے دیجیے گا۔ ڈبّا حوالے کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنا کلف دار کالر اُتار دیا اور سیاہ کوٹ اُتار کر ہاتھ پر لٹکا لیا۔

بھکاری کون؟

وکیل صاحب نے مشورہ دیا کہ لگے ہاتھوں لکڑی ایس ایچ او صاحب کے پلاٹ پر ڈالتے جایئے۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ایک رائفل بردار کانسٹیبل خلیفہ کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے اس دفعہ "پدر سوختہ" کہہ کر ایک ہی گالی

سے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ کوئی بہت پڑھا لکھا یا معزز آدمی پاس بیٹھا ہو تو وہ گاڑی کو فارسی میں گالی دیتا تھا۔ گالی دیتے وقت اُس کے چہرے پر ایسا ایکسپریشن آتا کہ گالی کا مفہوم مصوّر ہو کر سامنے آجاتا۔ تھانے والوں نے ایک گیس کی لالٹین ساتھ کر دی تاکہ اندھیرے میں پلاٹ پر مال اُتروانے میں آسانی رہے۔ گاڑی کے پچھلے حصّے میں لکڑی کے تختوں پر لالٹین ہاتھ میں لیے بشارت بیٹھ گئے۔ جھٹکوں سے مینٹل جھڑ جانے کے ڈر سے اُنھوں نے لالٹین ہاتھ میں اُدھر اُٹھا رکھی تھی۔ خلیفہ ایسا بن رہا تھا جیسے گاڑی ہمیشہ اتنی ہی آہستہ چلاتا ہے۔ کانسٹیبل نے جھنجھلاتے ہوئے اُسے دو دفعہ ڈانٹا ”ابے ٹرک چلا رہا ہے یا اپنی زوجہ کے جنازے کا جلوس نکال رہا ہے؟“ بشارت کی آنکھیں نیند سے بند ہو چلی تھیں، مگر کراچی کی سڑکیں جاگ رہی تھیں۔ سینما کا آخری شو ابھی ختم ہوا ہی تھا۔ کاروں کے شیشوں پر اوس کے ریلے بہہ رہے تھے اور اُن کی قمیض بھیگ چلی تھی۔ پیلس سینما کے پاس بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک جوان نیم برہنہ پاگل عورت اپنے بچّے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بچّے کی آنکھیں دُکھنے آئی ہوئی تھیں اور سُوجن اور چیپڑوں سے بالکل بند ہو چکی تھیں۔ ننگی چھاتیوں پر بچّے نے دودھ ڈال دیا تھا جس پر مکھیوں نے چھاؤنی چھا رکھی تھی۔ ہر گزرنے والا ان حصّوں کو جو مکھیوں سے بچ رہے تھے نہ صرف غور سے دیکھتا بلکہ مُڑ مُڑ کے ایسی نظروں سے گُھورتا

چلا جاتا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا دراصل بھکاری کون ہے۔ پاس ہی ایلومینیم کے بے دُھلے پیالے میں منہ ڈالے ایک کُتّا اُسے زبان سے چاٹ چاٹ کر صاف کر رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک سات آٹھ سال کا لڑکا ابھی تک موتیا کے گجرے بیچ رہا تھا۔ اُنھوں نے ترس کھا کر ایک گجرا خرید لیا اور کانسٹیبل کو دے دیا۔ اُس نے اُسے رائفل کی نال پر لپیٹ لیا۔ بشارت سر جھکائے، خیالات میں گُم، بندر روڈ، عید گاہ، صدر اور نرسری ہوتے ہوئے پی ای سی ایچ ایس پہنچے تو ایک کا عمل ہو گا۔ اُنہوں نے لالٹین گاڑی کے بونٹ پر رکھ دی اور اُس کی روشنی میں وہ لکڑی جو چوری سے بچ گئی تھی، اپنے ہاتھوں سے تھانے دار کے پلاٹ پر ڈال آئے۔

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

طوطے کی پیش گوئی

ڈھائی بجے رات جب وہ گھر پہنچے تو وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اس آٹو میٹک چھکڑے کو اونے پونے ٹھکانے لگا دیں گے۔ گھر، گھوڑے، گھر والی، سواری اور انگوٹھی کے پتھر کے معاملے میں وہ سعد اور نحس کے قائل تھے۔ اُنھیں یاد آیا کہ

۱۹۵۳ء میں موٹر سائیکل رکشا کے حادثے میں زخمی ہونے کے بعد جب وہ بندر روڈ پر میونسپل کارپوریشن کے سامنے بیٹھنے والے نجومی کے پاس گئے تو اُس نے اپنے سُدھائے ہوئے طوطے سے ایک لفافہ نکلوا کر پیش گوئی کی تھی کہ تمھاری قسمت میں ایک بیوی اور تین حج ہیں۔ تعداد کی ترتیب اس کے برعکس ہوتی تو کیا اچھا ہوتا، اُنھوں نے دل میں کہا۔ ویسے بھی حج زندگی میں ایک ہی دفعہ فرض ہے۔ ثواب لوٹنے کے معاملے میں وہ لالچی بالکل نہیں تھے۔ نجومی نے زائچہ بنا کر اور ہاتھ کی لکیریں محدّب شیشے سے دیکھ کر کہا کہ دو تین اور چار پہیّوں والی گاڑیاں تمھارے لیے نحس ثابت ہوں گی۔ یہ بات وہ زائچے اور محدّب شیشے کے بغیر، صرف اُن کے ہاتھ اور گردن پر بندھی ہوئی پٹیاں دیکھ کر بھی کہہ سکتا تھا۔ بہر حال اب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ایک یا پانچ پہیّوں کی گاڑیاں ایجاد نہ ہو، انھیں اپنی ٹانگوں پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس گاڑی کو خریدنے کا اصل مقصد لکڑی کو چوروں اور ایس ایچ او تک بحفاظت تمام پہنچانا تھا جو بحمد اللہ بغیر رُکاوٹ کے تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

ے

بنگال ٹائیگر گیا، ببّر شیر آگیا

صبح جب اُنھوں نے خلیفہ کو مطلع کیا کہ اب وہ اس کی خدمات سے استفادہ کرنے کے لائق نہیں رہے تو وہ بہت رویا گایا۔ پہلے تو کہا، میں گاڑی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ پھر کہنے لگا، کہاں جاؤں؟ بعد ازاں اُس نے آقا اور ملازم کے اٹوٹ رشتے اور نمک کھانے کے دُوررس نتائج پر تقریر کی جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اور جو بھاری نقصان اُن کو پہنچا ہے، اس کی تلافی وہ اس طرح کرنا چاہے گا کہ سال بھر میں ان کی حجامت کی جو اُجرت بنتی ہے، اس میں سے وہ لکڑی کی رقم مجرا کرلیں۔ اس پر وہ چیخے کہ خلیفے! تو سمجھتا ہے کہ میں ساڑھے تین ہزار سالانہ کی حجامت بنواتا ہوں؟ خلیفہ نے دوبارہ اپنی غلطی کا خندہ پیشانی سے اعتراف کیا اور ساتھ ہی گاڑی کو گشتی ہیئر کٹنگ سیلون بنانے کی پُر حماقت تجویز پیش کی جو اتنی ہی حقارت سے رد کر دی گئی۔ زچ ہو کر اس نے یہاں تک کہا کہ وہ تمام عمر۔۔۔۔یعنی گاڑی کی یا اس کی اپنی عمرِ طبعی تک، جو بھی پہلے دغا۔۔۔۔۔ بالکل مفت ڈرائیوری کرنے کے لیے تیار ہے۔ گویا جو نقصان پہلے تنخواہ لے کر پہنچاتا تھا۔۔۔لا تنخواہ پہنچائے گا۔ غرض کہ خلیفہ دیر تک اسی قسم کی تجویزوں سے اُن کے زخموں پر پھٹکری چھڑکتا رہا۔

وہ کسی طرح نہ مانے تو خلیفہ نے ہتھیار ڈال دیے، مگر اُسترا اُٹھالیا۔ مطلب یہ کہ آخری خواہش یہ ظاہر کی کہ اس قطعِ تعلق کے باوجود، اسے کم از کم حجامت کے لیے آنے کی تو اجازت دی جائے، جو بشارت نے صرف اس شرط پر دی کہ اگر میں آئندہ کوئی سواری۔۔۔۔ کسی بھی قسم کی سواری۔۔۔۔۔۔ رکھوں تو حرام خور تم نہیں چلاؤ گے۔

کچھ دن بعد خلیفہ یہ خبر دینے آیا کہ صاحب جی! یوں میرے دل میں اُچنگ ہوئی کہ ذرا تھانیدار صاحب بہادر کے پلاٹ کی طرف ہوتا چلوں۔ میں تو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اپنی رشوت میں دی ہوئی لکڑی کے پاس اپنی چوری شدہ لکڑی پڑی ہے! پہلو بہ پہلو! ہمارا مال ایک شیر دوسرے شیر کے منہ میں سے نکال کر ڈکار گیا۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے کہ دھاری دار شیر (Bengal Tiger) چلا گیا اور ببّر شیر آگیا۔ میرا اعتبار نہیں تو خود جا کے ملاحظہ کر لیجیے۔ خلیفہ ہنسنے لگا۔ اُسے اپنی ہی بات پر بے محل، بے اختیار اور مسلسل ہنسنے کی بُری عادت تھی۔ سانس ٹوٹ جاتا تو ذرا دم لے کر پھر سے ہنسنا شروع کر دیتا۔ وہ ہنسی الاپتا تھا۔ دَم لینے کے وقفے میں آنکھ مار جاتا۔ سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور بالکل کلاؤن معلوم ہو رہا تھا۔

ٹرک ہذٰا ابکاؤ ہے

گاڑی ایک مہینے تک بیکار کھڑی رہی۔ کسی نے جھوٹوں بھی دام نہ لگائے۔ تضحیک وتوہین کے پہلو سے بچنے کی خاطر ہم نے اسے گاڑی کہا ہے۔ بشارت بے حد حسّاس ہو گئے تھے۔ کوئی اسے کار کہتا تو اُنھیں خیال ہوتا کہ طنز کر رہا ہے اور ٹرک کہتا تو اس میں توہین کا پہلو نظر آتا۔ وہ خود Vehicle کہنے لگے تھے۔ وہ مایوس ہو چلے تھے کہ دفعتاً ایک ایک دن کے وقفے سے اکٹھی تین ''آفرز'' آ گئیں۔ پڑوس میں سیمنٹ کے ڈپو کے مالک نے اس ترپال کے جو کبھی گاڑی پر چڑھا رہتا تھا، تیرہ روپے لگائے، جب کہ ایک گدھا گاڑی والے نے بارہ روپے کے عوض چاروں پہیّے نکال کر لے جانے کی آفر دی۔ اُنھوں نے اس جاہل کو بُری طرح لتاڑا کہ یہ بھی ایک ہی رہی۔ تیرا خیال ہے کہ یہ گاڑی پہیّوں کے بغیر چل سکتی ہے! اُس نے جواب دیا، سائیں! یہ پہیّوں کے ہوتے ہوئے کون سی چل رہی ہے! رقم کے لحاظ سے تیسری آفر سب سے اچھی تھی۔ یہ ایک ایسے شخص نے دی جو حلیے سے اسمگلر لگتا تھا۔ اُس نے گاڑی کی نمبر پلیٹ کے دو سو روپے لگائے۔

ان اہانت آمیز آفرز کے بعد بشارت نے گاری پر ترپال چڑھا دیا اور توبہ کی کہ آئندہ کبھی کار نہیں خریدیں گے۔ آگے چل کر مالی حالت اور طبیعت کی چونچالی بحال ہوئی تو اس توبہ میں اتنی سی ترمیم کر لی کہ آئندہ کسی آنجہانی گورے کی گاڑی نہیں خریدیں گے خواہ اُس کی بیوہ میم کتنی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو۔ مرزا نے مشورہ دیا کہ اگر تمھاری کسی سے دُشمنی ہے تو گاڑی اُسے تحفتہً دے دو۔ بشارت نے کہا، نذر ہے۔ چند روز بعد اُنھوں نے ترپال اُتار دیا اور ایک گتّے پر "برائے فروخت" نہایت خوشخط لکھوا کر گاڑی پر ٹانگ دیا۔ دو تین دن میں گاڑی اور گتّے پر گرد اور آرا مشین سے اُڑتے ہوئے بُرادے کی دبیز تہیں چڑھ گئیں۔ مولانا کرامت حسین نے جو اَب فرم کے مینجر کہلاتے تھے، ونڈ اسکرین کی گرد پر انگلی سے "خوش آمدید" اور "ٹرک ہٰذا بکاؤ ہے" لکھ دیا جو دور سے نظر آتا تھا۔ روزانہ ظہر کے وضو کے بعد حروف پر گیلی انگلی پھیر کر اُنھیں روشن کر دیتے۔ نمازِ باجماعت کے بعد مسجد سے آکر گاڑی پر دَم کرتے۔ فرماتے تھے، ایسا جلالی وظیفہ پڑھ رہا ہوں کہ جس چیز پر بھی پھونک ماردی جائے وہ یا تو چالیس دن کے اندر اندر بِک جائے گی، ورنہ وظیفہ پڑھنے والا خود اندھا ہو جائے گا۔ دن میں تین چار دفعہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہاتھ کی کبھی دو کبھی تین یا چار انگلیاں دائیں بائیں گھماتے۔ یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ بینائی جاتی تو نہیں رہی۔ وظیفے

کے بعد مسجد سے دُکان تک، راستے بھر جلالی پھونک کو اپنے منہ میں بڑی احتیاط سے بھرے رکھتے کہ "لیک" ہو کر غلطی سے کسی اور چیز پر نہ پڑ جائے۔

۸

حاجی اورنگ زیب خاں

سوداگران و آڑھتیان چوب ہائے عمارتی

پتلا شوربہ اور سُوجی کا حلوہ

ابھی مولانا کرامت حسین کے وظیفے کو چالیس دن نہیں ہوئے تھے کہ بشارت ایک اور قضیے میں اُلجھ گئے، جو کچھ اس طرح تھا کہ حاجی اورنگ زیب خان، آڑھتیان و سوداگران چوب ہائے عمارتی، پشاوران سے رقم وصول کرنے آدھمکے۔ اُنھوں نے کوئی ایک سال قبل اعلیٰ درجے کی لکڑی پنجاب کے ایک آڑھتی کی معرفت بشارت کو سپلائی کی تھی۔ یہ داغدار نکلی۔ جب یہ سال بھر تک نہیں بکی تو بشارت نے گھاٹے سے سات ہزار میں فروخت کر دی۔ یہ وہی لکڑی تھی، جس کی چوری، بازیابی اور غتربود ہونے کا حال ہم پچھلے صفحات میں بیان کر

چکے ہیں۔ بشارت کا موقف تھا کہ میں نے یہ لکڑی سات ہزار میں گھاٹے سے بیچی ہے۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ آپ کی آدھی لکڑی تو چور لے گئے۔ آدھی پولیس والوں نے ہتھیالی۔ آپ اسے بیچنا کہتے ہیں۔ اس کے لیے تو پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔

بشارت کے تخمینے کے مطابق لکڑی کی مالیّت کسی طرح سات ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ ادھر حاجی اورنگ خان اصولی طور پر ایک پائی بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ بشارت بقیہ رقم یعنی ۳-۹-۲۵۷۳ روپے اپنی گرہ سے بھریں۔ (یہ رقم آج کے پندرہ ہزار روپے کے برابر تھی) خان صاحب کہتے تھے کہ آپ نے مال بیچنے میں شیطانی عجلت سے کام لیا۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ "صیب! یہ لکڑی تھی، بالغ لڑکی تو نہیں جس کی جلد از جلد رُخصتی کرنا کارِثواب ہو"۔" ایک مدّت سے اس رقم کے بارے میں خط و کتابت ہو رہی تھی۔ ایک دن خان صاحب کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ قانونی نوٹس کی رجسٹری کرائی اور پشاور جنرل پوسٹ آفس سے سیدھے گھر آئے۔ سامان باندھا اور نوٹس سے پہلے خود کراچی پہنچ گئے۔ نوٹس ان کی آمد کے تین دن بعد ان کی موجودگی میں اس طرح موصول ہوا کہ رجسٹری خود انھوں نے ڈاکیے کے ہاتھ سے چھین کر کھولی۔ نوٹس نکال کر پھاڑ دیا اور لفافہ بشارت کو تھما دیا۔ قیام بھی

انہی کے ہاں کیا۔ اُس زمانے میں دستور تھا کہ آڑھتی یا تھوک بیوپاری آئے تو اُسے گھر پر ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔ یوں بھی بشارت کی خان صاحب سے خوب بنتی تھی۔ بشارت خان صاحب کے خلوص و مدارات کے گرویدہ اور خان صاحب ان کی لچھے دار باتوں کے دلدادہ۔

دن بھر ایک دوسرے کے ساتھی جھائیں جھائیں کرنے کے بعد، شام کو خان صاحب بشارت کے ساتھ اُن کے گھر چلے جاتے، جہاں اُن کی اس طرح خاطر مدارات ہوتی جیسے دن میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ گھر والے ان کی خاطر داریاں کرتے کرتے تنگ آچکے تھے۔ اس کے باوجود خان صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں پتلے شوربے کا سالن کھا کھا کے میری نظر کمزور ہو گئی ہے۔ قدرے لنگڑا کر چلنے لگے تھے۔ فرماتے تھے، گھٹنوں میں شوربہ اُتر آیا ہے رات کے کھانے کے بعد سُوجی کا حلوہ ضرور طلب کرتے۔ فرماتے تھے، حلوہ نہ کھاؤں تو بزرگوں کی روحیں خواب میں آ آ کر ڈانٹتی ہیں۔ اکثر اُن سالم رانوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے جو اُن کے دستر خوان کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ ان کا پیٹ اعلیٰ نسل کے بروں (دُنبوں) کا قبرستان تھا، جس کے وہ مجاور تھے۔ بشارت نے دوپہر کو ان کے لیے فرنٹیئر ہوٹل سے ران اور چپلی کباب منگانے شروع کیے۔ مرزا نے کئی مرتبہ کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ ۳۔۹۔۲۵۷۳ روپے دے کر اپنا پنڈ چھڑاؤ۔

یہ پھر بھی سستا پڑے گا۔ مگر بشارت کہتے تھے کہ سوال روپے کا نہیں، اصول کا ہے۔ خان صاحب بھی اسے اپنی انا اور اصول کا مسئلہ بنائے ہوئے تھے۔

اولیا اللہ جس یکسوئی اور استغراق سے مراقبہ اور خدا کی عبادت کرتے ہیں، خان صاحب اس سے زیادہ یکسوئی اور استغراق غذا پر صَرف کرتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ نماز، نیند، کھانے اور گالی دینے کے دوران کوئی مخل ہو جائے تو اُسے گولی مار دوں گا۔ کسی اجنبی یا دشمن یا ناقابلِ اعتبار دوست سے ملنے جاتے تو گلے میں ۳۸ بور کا ریوالور حمائل کر لیتے۔ مشہور تھا کہ خانہ کعبہ کے طواف کے دوران بھی ریوالور احرام میں چُھپا رکھا تھا۔ واللہ اعلم۔ دس سیر سُوجی روئے دار بطورِ سوغات کراچی لائے تھے۔ اسی کا حلوہ بنوا بنوا کر کھا رہے تھے۔ بشارت روز سُوجی کی بوری دیکھتے اور دہل جاتے اس لیے کہ ابھی تو اس کے ختم ہونے میں بہت دیر تھی۔ خان صاحب فرماتے تھے کہ اگلی دفعہ مردان شوگر ملز سے تازہ گُڑ کی بوری لاؤں گا۔ سفید چینی کھانے سے خون پتلا پڑ جاتا ہے۔ ایک دن بشارت نے اندیشہ ہائے قریب سے گھبرا کر باتوں باتوں میں ٹوہ لینا چاہی۔ پوچھا ”خان صاحب! گُڑ سے کیا کیا بناتا ہے؟“ سُوجی کے حلوے کا گولہ حلق میں پھنساتے ہوئے بولے ”بھابی سے پوچھ لینا۔ اس وقت دماغ حاضر نہیں۔ بات یہ ہے کہ گھاٹے اور جھگڑے سے، اور گُڑ سے۔۔۔۔۔ اور روزے سے

بھی۔۔۔۔۔۔ ہمارے دماغ کو ایک دم گرمی چڑھ جاتا ہے۔ ہم صرف رمضان میں ہاتھا پائی کرتا ہے۔ اس واسطے کہ روزے میں گالی دینا منع ہے"۔

ٹانگیں اور پائے

خان صاحب کے اپنے دستر خوان اور خاطر مدارات کا کیا کہنا۔ بشارت کو پشاور میں ان کے ہاں مہمان رہنے کا اتفاق ہوا۔ ہر کھانے پر بکری یا دُنبے کی مسلّم ران سامنے رکھ دیتے۔ ناشتے اور چائے پر البتہ مرغی کی ٹانگ پر اکتفا کرتے۔ ان کے دستر خوان پر ران اور ٹانگ کے سوا کسی اور حصّے کا گوشت نہیں دیکھا۔ نہ کبھی سبزی یا مچھلی دیکھی، جس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی تھی کہ بینگن اور مچھلی کی ٹانگیں نہیں ہوتیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ پیرس کے Folies Bergere اور Lido کی کورس گرلز کا Leg Show دیکھ کر خان صاحب پشتو میں کیا ارشاد فرماتے، لیکن اتنا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انھیں ایسی ٹانگوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جنھیں روسٹ کر کے وہ کھا اور کھلا نہ سکیں۔

ٹانگ کے گوشت سے رغبت کے باوجود خان صاحب کو کراچی کی بونگ کی نہاری اور سری پایوں سے سخت چڑ تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا: مجھ سے تو مواشی کے

گندے، گوبر میں بسے ہوئے کھروں کا آبِ جوش نہیں کھایا جاتا۔ ہمارے فرنٹیئر میں تو کوئی بڈھا کسی کچی عمر کی دوشیزہ سے شادی کرلے تو حکیم اور پڑوسی اُسے ایسا ہی آتش گیر مادّہ کھلاتے ہیں۔ اس سے وہ انتڑیوں کی بیماری میں مبتلا ہو کر وفات پا جاتا ہے۔ سنا ہے ولایت میں تو کھروں سے سالن کے بجائے سریش بناتے ہیں۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں! بکری کے پائے، بھیڑ کے پائے، دُنبے کے پائے، گائے کے پائے، بیل کے پائے، بھینسے کے پائے، میں تو جانوں چارپائی کے پائے آپ محض اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ صاف ہوتے ہیں۔

پچھلی صدی کا اسٹیچو

خان صاحب وجیہہ اور بھاری بھرکم آدمی تھے۔ اُن کی لغوبات میں بھی وزن محسوس ہوتا تھا۔ قد تقریباً ساڑھے چھ فٹ، جسے کلاہ اور طرّے سے ساڑھے سات فٹ بنا رکھا تھا، مگر آٹھ فٹ کے لگتے تھے اور یہی سمجھ کر بات کرتے تھے۔ صحت اور کاٹھی اتنی اچھی کہ عمر کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ تن و توش کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہتھے والی کرسی پر جیسے تیسے ٹھُس کر بیٹھ تو جاتے، لیکن جب اُٹھتے تو کرسی بھی ساتھ اُٹھتی۔ سنہری مونچھیں اور ہلکی براؤن آنکھیں۔ بائیں رخسار پر زخم کا ہلالی نشان جو اگر نہ ہوتا تو چہرہ ادھورا دکھائی دیتا۔ انگشتِ

شہادت دوسری پور سے کٹی ہوئی۔ کسی نابکار کو خبر کرنا ہو یا آسمان کو کسی قضیے میں اپنا گواہ بنانا مقصود ہو (جس کی ضرورت دن میں کئی بار پڑتی تھی) تو یہ نیم انگشتِ انتباہ اُٹھا کر خطاب کرتے۔ ان کی کٹی انگلی بھی ہماری ثابت انگلی سے بڑی تھی۔ پاس اور دور کی نظر خاصی کمزور تھی، لیکن عینک لگاتے سے حتٰی الامکان احتراز کرتے۔ صرف چیک پر دستخط کرنے اور گالی دینے کے بعد معتوب کے چہرے پر اس کے اثرات دیکھنے کے لیے پاس کی عینک لگا لیتے اور اتارنے سے پہلے جلدی جلدی اسی سے دور کی چیزیں دیکھنے کی کوشش کرتے۔ یہ معلومات ان کی دن بھر کی جغرافیائی ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ آنکھوں میں شوخی کی ہلکی سی تحریر۔ کھل کر ہنستے تو چہرہ انار دانہ ہو جاتا۔ چہرے پر ہنسی ختم ہونے کے بعد اس کی اندرونی لہروں سے پیٹ دیر تک ہچکولے کھاتا رہا۔ اصلی زری کی کلاہ پر پگڑی کا ہاتھ بھر اونچا کلف دار طرہ زخمی انگوٹھے کی طرح ہمہ وقت کھڑا ہی رہتا تھا۔ گہرا براؤن ٹرکش کوٹ، ''تلے'' کا پشاوری چپل جس میں ہمارے دونوں پر آگے پیچھے آ جائیں۔ لامتناہی گھیر کی سفید شلوار۔ خان صاحب نہایت بارعب جامہ زیب پچھلی صدی کے آدمی دکھلائی دیتے تھے۔ قصیدے، کیری کیچورا اور

---

[1] : caricature ہم اس کا ترجمہ مسخاکہ کریں گے یعنی مسخ خاکہ

اسٹیچو (مجسمہ) کے لیے یہ از بس لازم ہے کہ کم از کم ڈیوڑھے ہوں۔ لائف سائز نہ ہوں۔ خان صاحب اپنا اسٹیچو آپ تھے۔

واسکٹ کی جیب میں جو طلائی گھڑی رکھتے تھے اس کی زنجیر دو فٹ لمبی ضرور ہو گی۔ اس لیے کہ واسکٹ کی ایک جیب سے دوسری جیب کا فاصلہ اتنا ہی تھا۔ جتنی دیر میں خان صاحب کی شلوار میں کمر بند ڈلتا، اتنی دیر میں آدمی حیدر آباد ہو کر آ سکتا تھا۔ اعصاب اس حد تک مضبوط تھے کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تھے ہی نہیں۔ معمولی تکلیف اور ناراحتی کا ان کو احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دھوبی نے ان کی میلی شلوار کے نیفے میں سے پنسل کے ٹکڑے برآمد کیے۔ پُرخور تھے۔ دورانِ طعام، کلام سے پرہیز کرتے اور پانی نہیں پیتے تھے کہ خواہ مخواہ جگہ گھیرتا ہے۔ دال کو ہندوانہ بدعت اور سبزی کھانے کو مویشیوں کی صریح حق تلفی سمجھتے تھے۔

کڑاہی گوشت کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کڑاہی گوشت کھائیں گے بلکہ کڑاہی بھر کر کھائیں گے۔ خیریت گزری کہ اس زمانے میں بالٹی گوشت کا رواج نہیں تھا ورنہ وہ یقیناً بالٹی کو کڑاہی پر ترجیح دیتے۔ تیتر بٹیر کی ہڈیوں، انگور، مالٹے اور تربوز کے بیج تھوکنے کو زنانی نزاکتوں میں شمار کرتے تھے۔ اپنے تن

توش اور ہیت کذائی (جسے ہیبتِ غذائی کہنا بہتر ہو گا) سے خود عاجز تھے۔ گھومنے پھرنے اور چہل قدمی کے شوقین، مگر اس شرط پر کہ ہر چالیس قدم کے بعد سستانے اور کچھ پیٹ میں ڈالنے کے لیے توقف فرمائیں گے تاکہ تازہ دم ہو کر آگے بڑھیں۔ یعنی اگلے چالیس قدم۔ مانا کہ خان صاحب میں اتنی پھرتی اور چلت پھرت نہ تھی کہ بڑھ کر دشمن پر حملہ کر سکیں لیکن ہنگامِ قتال اگر وہ اس پر صرف گر پڑتے تو وہ پانی نہ مانگتا۔ ہاتھ پاؤں مارے بغیر وہیں دم گھٹ کے ڈھیر ہو جاتا۔ کراچی اگاہی کے لیے تشریف لاتے تو کارتوسوں کی پیٹی نہیں باندھتے تھے۔ فرماتے تھے اس کے بغیر ہی کام چل جاتا ہے۔ سینے اور پیٹ پر پیٹی کے نشان سے ایک ڈایاگنل (اریب لکیر) بن گئی تھی جو دھڑ کو دو مساوی مثلثوں میں آڑا تقسیم کرتی تھی۔ فرماتے تھے، جہاں کوہستانی ہوائیں اور بندوق کی آواز نہ آئے وہاں مردوں کو نیند نہیں آتی۔

ان کی کٹی ہوئی انگشتِ شہادت کا قصّہ یہ ہے کہ ان کا لڑکپن تھا، لڑکوں میں لیمونیڈ کی گولی والی بوتل کو انگلی سے کھولنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ خان صاحب نے اس کی گولی پر انگشتِ شہادت رکھ کر دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت سے مکا مارا جس سے فی الفور بوتل اور ہڈی ٹوٹ گئی۔ بوتل کی گردن ان کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی کی طرح پھنس کر رہ گئی۔ ہتھوڑے سے توڑنی پڑی۔ انگلی سیپٹک ہو گئی۔

دو ہفتے بعد کٹوانی پڑی۔ کلوروفارم سونگھنے کو وہ مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے لہذا بغیر کلوروفارم کے آپریشن کرایا۔ آپریشن سے پہلے کہا کہ میرے منہ پر کس کے ڈھاٹا باندھ دو۔

اپنی دانست میں کوئی بہت عالمانہ نکتہ بیان کرنا ہوتا تو بات میں وزن اور وقار پیدا کرنے کی غرض سے پہلے اپنی ٹھوڑی پر اس طرح ہاتھ پھیرتے گویا وہاں ٹیگور جیسی داڑھی ہے جو منت پذیر شانہ ہے۔ پھر نیم بریدہ انگشتِ شہادت سوئے فلک اٹھاتے اور پڑھنے کی عینک لگا کر جملہ شروع کرتے لیکن گمبھیر اور گنجلک جملے کے ادھ بیچ میں کوئی شوخ بات یا چنچل فقرہ اچانک ذہن میں کوند جاتا تو اسے ادا کرنے سے پہلے آنکھ مارتے اور آنکھ مارنے سے پہلے عینک اتار لیتے تاکہ دیکھنے والوں کو صاف نظر آئے۔

ان کی ہنسی کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے زور سے ایک لمبا قہقہہ لگانا چاہتے ہیں مگر بوجوہ اسے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نتیجۃً ان کے منھ سے بڑی دیر تک ایسی آواز نکلتی رہتیں جیسے بیٹری خلاص ہونے کے بعد کار کو بار بار سٹارٹ کرنے سے نکلتی ہیں۔ ہنسنے سے پہلے بالعموم اپنی واسکٹ کے بٹن کھول دیتے تھے، کہتے تھے پردیس میں روز روز کس سے بٹن ٹکواؤں۔

شادی ایک ہی کی۔ یک گیر و محکم گیر کے قائل تھے۔ بیوی نے عاجز آکر کئی بار ان سے کہا کہ دوسری کرلو تاکہ اوروں کو بھی تو چانس ملے۔

لنگڑے کا کروچ سے شیخ سعدی تک

آپ چاہیں تو خان صاحب کو اَن پڑھ کہہ سکتے ہیں مگر اَن گھڑ یا جاہل ہرگز نہیں۔ رچی بسی طبیعت، بلا کی سُوجھ بوجھ اور نظر رکھتے تھے جو فوراًبات کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔ صحیح معنوں میں شائستہ حیات تھے کہ انھوں نے انسان اور زندگی کو ہر رنگ میں سہا اور برتا تھا۔ کتاب کے مسخائینے[1] اور آرٹ کے آرائشی فریم میں نہیں دیکھا تھا۔ خود زندگی جو کچھ دکھاتی، سکھاتی اور پڑھاتی ہے وہ سیدھا دل پر رقم ہوتا ہے:

نظیر سیکھے سے علمِ رسمی بشر کی ہوتی ہیں چار آنکھیں
پڑھے سے جس کے ہوں لاکھ آنکھیں وہ علم دل کی کتاب میں ہے

---

[1] مسخائینہ: مسخ کرنے والا آئینہ Distoring Mirror کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

عرفی نے اپنے آپ کو "آموز گار خود" کہا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہا تھا۔ خان صاحب مدرسئہ حیات کے منتہیوں اور فارغین میں سے تھے۔

خان صاحب برسوں چیک پر انگوٹھا لگاتے رہے۔ لیکن جس دن اُن کا بینک بیلنس ایک لاکھ ہو گیا، اُنھوں نے اُردُو میں دستخط کرنے سیکھ لیے۔ فرماتے تھے، انگوٹھا لگا لگا کے سُود خور بینکوں سے اوور ڈرافٹ لینے میں تو کوئی حرج نہیں، پر حلال کی کمائی کی رقم سوچ سمجھ کر نکالنی چاہیے۔ دستخط کیا تھے، لگتا تھا کوئی لنگڑا کاکروچ دوات میں غسل کر کے کاغذ پر سے گزر گیا ہے۔ دستخط کے دوران ان کا ہاتھ ایسی توڑا مروڑی سے گزرتا اور ہر چھوٹا بڑا دائرہ بناتے وقت ان کے کھلے ہوئے منہ کی گولائی اس طرح گھٹی بڑھتی کہ ایک ہی دستخط کے بعد ان کے ہاتھ اور دیکھنے والے کی آنکھ میں باؤٹا آ جاتا! اس زمانے میں خان صاحب کا اکاؤنٹ مسلم کمرشل بینک، چوک یادگار برانچ میں تھا، جہاں اُردُو میں دستخط کرنے والوں کو اسٹامپ کاغذ پر یہ توہین آمیز indemminty (ضمانت) دینی پڑتی تھی کہ اگر ان کے اکاؤنٹ جعلی دستخطوں کے سبب کوئی فراڈ ہو جائے تو بینک ذمہ دار نہ ہو گا۔ بلکہ اگر اس کے نتیجے میں بینک کو کوئی نقصان بالواسطہ یا بلاواسطہ پہنچے تو اُسے بھی وہی بھریں گے۔ خاں صاحب کو جب اس کا مطلب پشتو میں سمجھایا گیا تو مشتعل ہو گئے۔ اُردُو بولنے والے اکاؤنٹنٹ سے کہنے لگے کہ ایسی بیہودہ شرط

ماننے والے کے لیے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے، ہمارا دل بہت خفا ہے۔ بکتے جھکتے بینک کے منیجر مسٹر اے میکلین (جو راقم الحروف کا باس رہ چکا تھا) کے پاس احتجاج کرنے گئے۔ کہنے لگے کہ میرے دستخط اتنے خراب ہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی بنا ہی نہیں سکتا۔ جب میں خود اپنے دستخط اتنی مصیبت سے کرتا ہوں تو دوسرا کیسے بنا سکتا ہے؟ آپ کے سٹاف میں دو درجن آدمی تو ہوں گے۔ سب کے سب شکل سے چور، اُچکّے اور نوسرباز لگتے ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی میرے دستخط بنا کر دکھا دے تو فوراً ایک ہزار انعام دوں گا۔ پھر گولی سے اُڑا دوں گا۔ مسٹر میکلین نے کہا کہ میں بینک کے قوانین نہیں بدل سکتا۔ گرنڈلیز بینک میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ ہم نے سارے فارم اسی سے نقل کیے ہیں۔ نقل کیا، مکھی پہ مکھی ماری ہے۔ بلکہ اس فارم پر تو پرنٹر کی لاپروائی سے نام بھی گرنڈلیز بینک ہی کا چھپا ہے۔ خان! تم ورناکیولر کے بجائے انگریزی میں دستخط کرنے سیکھ لو تو اس جھمیلے سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ اپنے حکم میں التجا کا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے اُس نے خان صاحب چائے اور پیسٹری سے تواضع کی۔ بامتثالِ امر، خان صاحب دو مہینے تک انگریزی دستخطوں کی مشق کرتے رہے۔ جب بالکل رواں اور پختہ ہو گئے تو چق اُٹھا کر سیدھے مسٹر میکلین کے کمرے میں داخل ہوئے اور روبرو دستخط کر کے دکھائے۔ وہ اس

طرح کہ پہلے ہاتھ اونچا کر کے چار پانچ دفعہ ہوا میں دستخط کیے اور پھر یکلخت کاغذ قلم پر رکھ کر فراٹے سے دستخط کر دیے۔ اس نے ترنت ایک سلپ پر اکاؤنٹنٹ کو حکم دیا کہ ان کی انڈمنٹی منسوخ تصوّر کی جائے۔ میں ان کے انگریزی دستخط کی جو انھوں نے میری موجودگی میں اس کارڈ پر کیے ہیں تصدیق کرتا ہوں۔

ہوا صرف اتنا تھا کہ خان صاحب نے ان دو مہینوں میں اپنے اُردُو دستخط کو دائیں سے بائیں کرنے کے بجائے بائیں سے دائیں کرنے کی مشق و مہارت بہم پہنچائی جس کے دوران نقطے اور مرکز غائب ہو گئے۔ مسٹر میکلین کے سامنے انھوں نے یہی دستخط بائیں سے دائیں کیے اور تمام عمر اسی انگلش روش پر قائم رہے۔ چیک اور کاروباری کاغذات پر اسی طرح دستخط کرتے۔ لیکن اگر کسی دوست یا رشتہ دار کو خط لکھواتے یا کوئی حلف نامہ داخل کرواتے جس میں سچ بولنا ضروری ہو تو آخر میں اُردُو میں دستخط کرتے۔ مطلب یہ کہ قلم دائیں سے بائیں چلتا۔ خان صاحب کو دستخط کرنے کے فن پر اب اتنی قدرت حاصل ہو گئی تھی اگر جاپانی میں دستخط کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ اسی لیٹے ہوئے کاکروچ کو مونچھیں پکڑ کے سر کے بل کھڑا کر دیتے۔

خان صاحب کو کبھی بعجلت اتمام حجت کرنا مقصود ہوتا، یا مخالف و مخاطب کو محض بوجھوں مارنا ہوتا تو فرماتے کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ ۔۔۔۔۔ وہ اپنے تمام زریں و غیر زریں اقوال سے شیخ سعدی کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ شیخ سعدی اگر ان اقوال کو سُن لیتے تو وہ خود بھی دستبردار ہو جاتے۔

بات کتنی ہی غیر متعلق اور چھوٹی سی ہو، خان صاحب اس کی پچ میں بڑے سے بڑا نقصان اٹھا کے لیے تیار رہتے تھے۔

درگزر اور سمجھوتے کو اُنھوں نے ہمیشہ شیوہ مردانگی کے خلاف جانا۔ اکثر فرماتے تھے کہ جو شخص خون خرابہ ہونے سے پہلے ہی سمجھوتہ کر لے، اُس کے لیے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔ اس خرخشے کے بعد بشارت کو ایک مرتبہ بنّوں میں ان کے آبائی گاؤں میں ٹھہرنے کا اتفّاق ہوا۔ دیکھا کہ خان صاحب کسی گھمسان کے بحث مباحثے میں جیت جاتے یا کسی خوشگوار واقعے پر بہت خوش ہوتے تو فوراً باہر جا کر گھوڑے پر چڑھ جاتے اور اپنے کسی دشمن کے گھر کا چکر لگا کر واپس آ جاتے۔ پھر ملازم سے اپنے سر پر ایک آفتابہ ٹھنڈے پانی کا ڈلواتے کہ غرور اللہ کو پسند نہیں۔

خان صاحب نے اپنے حال پر مگرمچھ کے آنسو بہائے

خان صاحب دن میں دو تین مرتبہ بشارت کو یہ دھمکی ضرور دیتے کہ "ایک پائی بھی نہیں چھوڑوں گا۔ خواہ مجھے ایک سال تمہارے ہاں مہمان رہنا پڑے"۔ وقتاً فوقتاً یہ بھی کان میں ڈالتے رہتے کہ قبائلی آدابِ میزبانی کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اگر آپ عزیز مہمان سے یہ پوچھ بیٹھیں کہ تم کب جاؤ گے اور اس پر وہ آپ کا خون نہ کر دے تو اس کی شرافت، پختوا[1] اور ولدیت میں شبہ ہو گا۔

صبح سے شام تک دونوں بارہ سنگھے اپنے سینگ پھنسائے پھنکاریں مارتے رہتے۔ خوش معاملگی کا واسطہ، بیوپار بیوہار کی رِیت رسم، رحم کی اپیل اور ایک دوسرے کو ظلم اور دھاندلی سے باز رکھنے کی وارننگ کے علاوہ کوئی اوچھا ہتھیار نہ تھا جو اس جھگڑے میں بے دریغ استعمال نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً خان صاحب اپنے بے پڑھے لکھے ہونے کا واسطہ دیتے۔ جواب میں بشارت خود کو دیدہ عبرت نگاہ سے دکھواتے کہ میں شاعر ہوں۔ بی اے ہوں۔ فارسی پڑھی ہے اور لکڑی بیچ رہا ہوں! خان صاحب اپنے بزنس میں گھاٹے کا ذکر کرتے تو بشارت کہتے، ارے

---

[1] پختوا: غیرت۔ آن

صاحب یہاں تو سرے سے بزنس ہی نہیں۔ گرہ کا کھا رہے ہیں۔ بشارت تو خیر بیوہ میم کے ساتھ اپنی فرضی مسکینی، کثیر الاولادی اور مفلوک الحالی کا ریہرسل کر چکے تھے، لیکن خان صاحب بھی بوقتِ ضرورت اپنے حال پر مگرمچھ کے آنسو بہا سکتے تھے۔ ایک دن تو ان کی ایکٹنگ اتنی مکمل تھی کہ سیدھی آنکھ سے ایک سچ مچ کا آنسو سری لنکا کے نقشے کی طرح لٹک رہا تھا۔ سائز بھی وہی۔ ایک دفعہ خان صاحب نے اپنی فرضی مظلومیت کا ٹُرپ پھینکا کہ میرے حصّے کی نصف زمینوں پر چچا نے نصف صدی سے قبضہ کر رکھا ہے۔ بشارت نے اس کو اس طرح کاٹا کہ اپنے پیٹ کے السر پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہا کہ وہ اتنی ہی مدّت سے ضعفِ معدہ میں مبتلا ہیں۔ غذا نہیں پچتی۔ پیٹ میں دوا اور ہوا تک نہیں ٹھہرتی۔ خان صاحب بولے، اوہو ہو! پچاس سال سے پیٹ خراب ہے۔ آپ تو پوتڑوں کے مریض نکلے! ویسے ان چونچوں میں بالعموم بشارت ہی کا پلّہ بھاری رہتا۔ لیکن ایک دن جب خان صاحب نے نیم آبدیدہ[1] ہو کر کہا کہ میرے تو والد بھی فوت ہو چکے ہیں تو بشارت کو اپنے بزرگوار پر بہت غصّہ آیا کہ انھیں بھی اسی وقت جینا تھا۔

---

[1] نیم آبدیدہ اس لیے کہ اُن کی دوسری آنکھ مسکرا رہی تھی

لفظوں کی جنگ میں فتح کسی بھی فریق کی ہو، شہید صرف سچائی ہوتی ہے

خان صاحب کسی طرح رقم چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بشارت نے عاجز آکر یہاں تک کہا کہ کون صحیح ہے، کون غلط، اس کو بھول جائیے۔ یہ دیکھیے کہ آپ کا ہمارا بیوپار بیوہار آئندہ بھی رہے گا۔ پھر کبھی کسر نکال لیجیے گا۔ خدانخواستہ یہ آخری سَودا تو ہے نہیں۔ اس پر خان صاحب بولے کہ خان سنگِ مرجان خان نے مجھے نصیحت کی تھی کہ دوست سے ملو تو اس طرح ملو جیسے آخری ملاقات ہے۔ اب کے بچھڑے پھر نہیں ملیں گے۔ اور کسی سے سَودا کرو تو یہ سمجھ کے کرو کہ آخری سَودا ہے۔ دوبارہ یہ "دلا" نہیں آنے کا! شیخ سعدی کہتے ہیں کہ باؤلے سے باولا کتّا بھی یہ اُمید نہیں رکھ سکتا کہ جسے اُس نے کاٹا ہے وہ خود کو پھر کٹوانے کے لیے دوبارہ سہ بارہ آئے گا۔

ایک دفعہ بشارت کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا اور اُنھوں نے بار بار "خان صاحب! خان صاحب" کہہ کر لعن طعن کی تو کہنے لگے، دیکھو صیب! گالی گُفتار کرنی ہے تو مجھے

خان صاحب مت کہو۔ حاجی صاحب کہہ کے گالی دو، تاکہ مجھے اور تمھیں دونوں کو کچھ غیرت تو آئے۔

بشارت نے اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر پیشانی چوم لی۔

عرب پتی اور کراچی کی پانچ سوغاتیں

ڈوبی ہوئی رقموں کی وصولی کے سلسلے میں کراچی کے پھیروں نے خان صاحب کو ہفت زبان بنا دیا تھا۔ ہمارا مطلب ہے اُردُو، فارسی اور گجراتی کے علاوہ چاروں علاقائی زبانوں میں رَوانی سے گالی دے سکتے تھے۔ حتیٰ الدشنام، اپنے معتوب کے درجات اُسی کی مادری زبان میں بلند کرتے۔ البتہ کہیں عجزِ بیان یا جھول محسوس فرماتے یا مخاطب زیادہ بے حیا ہوتا تو آخر میں اُس کے تابوت میں پشتو کی میخ ایسی ٹھونکتے کہ کئی پُشتوں کے آرپار ہو جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ جیسی کوک شاستر گالیاں ہمارے ہاں رائج ہیں، ان کے سامنے انگریزی اور دیگر زبانوں کی گالیاں پھولوں کی چھڑیاں اور بچّوں کی غاؤں غاؤں معلوم ہوتی ہیں ان سے کچّے دودھ کی بُو آتی ہے۔ آر کے نرائن کے ناول انگلینڈ اور امریکہ کے پڑھنے والوں کے لیے جو خاص دلکشی رکھتے ہیں، اس میں ان دیسی گالیوں کو بھی

دخل ہے جن کا وہ انگریزی میں لفظی ترجمہ کر کے ڈائیلاگ میں بارودی سُرنگیں بچھاتا چلا جاتا ہے۔ ہماری گالیوں میں جو ندرتِ بیان، زور آوری، جغرافیائی تصویر کشی اور جنسی آرزومندی کوٹ کوٹ کر، بلکہ ثابت وسالم بھری ہے اس کا صحیح اندازہ ہمیں ۱۹۷۵ میں دبئی میں ہوا۔ وہاں کے گلّے داری برادران کا شمار عرب امارت اور مشرقِ وسطیٰ کے ارب پتیوں میں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ امیر ترین ارب پتیوں میں ہوتا تھا، کیوں کہ ارب پتی تو وہاں سبھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہماری تجویز ہے کہ ارب پتی کا املا بدل کر عرب پتی کر دینا چاہیے۔ عبدالوہاب گلّہ داری اور عبداللطیف گلّہ داری جو عرب ہیں اور جن کی مادری زبان عربی ہے، بہتر تعلیم اور بدتر تربیت کے سلسلے میں کچھ عرصے کراچی رہ چکے ہیں۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ وہ کسی سے خفا ہوتے ہیں، یا کسی عرب سے اُن کا جھگڑا ہوتا ہے ـــــ اور کوئی عرب ایسا نہیں ہے جس سے ان کا جھگڑا نہ ہوا ہو ـــــ تو عربی بولتے بولتے اُردو میں گالی دینے لگتے ہیں جو عربی کے مقدّس سیاق وسباق میں اور بھی غلیظ لگتی ہے۔ وہ پہلے عرب ہیں جو بیک وقت ع، ح، ض، ڈ، ڈھ اور ڑ صحیح مخرج سے ادا کرتے ہیں۔ عبداللطیف گلّہ داری کا قول ہے کہ کراچی کی پانچ چیزوں کا کم از کم اس دنیا میں تو جواب نہیں۔ جڑاؤ زیورات، قوّالی، بریانی، گالی اور عود کا عطر۔ ۱۹۸۳ء میں

جب ان کا بینک بزنس کا دوالا نکلا تو زیور، قوّالی، بریانی اور عود کا عطر تو دشمنوں کے حصّے میں آ گئے۔ اب صرف پانچویں چیز پر گزارا ہے۔ سو اس دولتِ دشنام کو زوال نہیں۔ جتنی دیتے ہیں لوگ اس کی سات گنی لوٹا دیتے ہیں۔

کباب پراٹھے اور وسیع حلقۂ دشمنی

خان صاحب مخلص، مجلسی اور محبتی آدمی تھے۔ بحث میں کتنی ہی گرما گرمی ہو جائے، دل میں ذرا میل نہیں رکھتے تھے۔ مذاق مذاق میں دوستوں کو چھیڑنے اور طیش دلانے میں انھیں بڑا مزہ آتا۔ ناشتے میں تین تر تراتے پراٹھے اور شامی کباب کھاتے اور لسّی کے دو گلاس پینے کے بعد دن بھر غنودگی کے عالم میں نیم باز آنکھوں سے دنیا اور اہلِ دینا کو دیکھتے رہتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آنکھوں کو محض چشم پوشی کے لیے استعمال کرتے اور کٹ حجتی کا جواب جماہی اور ڈکار سے دیتے۔ ایسے غشی آور ناشتے کے بعد آدمی مراقبہ کر سکتا ہے۔ ایبسٹریکٹ پینٹنگ کر سکتا ہے۔ اسٹریم آف کانشس نیس والا ناول لکھ سکتا ہے۔ حکومت کا پنج سالہ منصوبہ بنا سکتا ہے۔ لیکن دماغی کام نہیں کر سکتا۔ نہ ڈھنگ سے بحثا بحثی کر سکتا ہے۔ خان صاحب کو دوسرے دن یہ یاد نہیں رہتا کہ کل کیا کہا تھا۔ لہٰذا ازسرِ حجت کا آغاز کرتے۔ گویا اس سے پہلے اس مسئلے پر کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔

فیض کے دلآویز مصرعے میں "اُلفت" کی جگہ حجت جڑ دیں تو ان کے طریقہ واردات پر صادق آتا ہے:

وہ جب ملے تو اُن سے ہر بار کی ہے "حجت" نئے سِرے سے

کسی سے زیادہ دیر خفا یا کبیدہ خاطر نہیں رہ سکتے تھے۔ شاعری سے تنفّر کے باوجود اکثر یہ بیت پڑھتے، مگر بعض لفظوں کو اتنا کھینچ کر یا سُکیڑ کر پڑھتے کہ مصرع وزن اور بحر سے خارج ہو کر نثر بن جاتا:

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا

جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

اور اس پر اضافہ یہ فرماتے ہیں کہ مُسلمان سے کینہ رکھنا اُس پر ظلم ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔ یہ بھی فخریہ فرماتے کہ ہم تو آزاد قبائلی آدمی ہیں۔ اُردُو تو ہم نے ڈوبی ہوئی "رقوماتوں" کی وصولی کے لیے، کراچی کے بیوپاریوں سے لڑائی دنگے کے دوران سیکھ لی ہے۔ چنانچہ ان کی ساری Vocabulary (لفظیات) حالتِ امن میں بالکل نکمّی اور ناکارہ ہو جاتی تھی۔ رانا سانگا کے جسم کی طرح ان کی لڑاکا اُردُو پر بھی ۷۲ زخموں کے نشان تھے۔ ان

کی اُردُو کا تجزیہ کرنے سے پتا چلتا تھا کہ کہاں کہاں کے اور کس کس صوبے کے آدمی نے ان کی رقم دبائی ہے اور

کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

ان کی زبان سے گجراتی، حیدرآبادی اور دلّی کی کرختداری زبان کے ٹھیٹ الفاظ سُن کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے حلقۂ تکرار و تصادم کے ڈانڈے کہاں کہاں ملتے ہیں۔

لوک لہجہ

خان صاحب کے رابطے اور محیطے کی زبان پر تو خیر نادہندوں کی چھاپ تھی، لیکن بولتے اپنے ہی کھرے، کھنکتے پشتون لہجے میں تھے جو کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ اس کے مقابلے میں بشارت کو اپنا لہجہ بالکل سپاٹ اور بے نمک لگا۔ پشتون اُردُو لہجے میں ایک تنگ ایجاد اور تند و تیز مہکار ہے جو کسی مبہم اور ذو معنی بات کی روادار نہیں۔ یہ کوندتا، للکارتا لہجہ مشکوک سرگوشیوں کا لہجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پنجابی اُردُو لہجے میں ایک کشادگی، گرم جوشی اور گھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں میدانی دریاؤں کا پاٹ دار اور دھیرج اور دل دریا پار کمک ہے۔ اور سہج سہج راستہ

بنانے کے لیے اپنی لہری گگر کاٹ پر پورا اعتماد۔ بلوچ لہجے میں ایک ہوک سی، ایک ہمکتی پہاڑی گونج اور دل آویز خشمگیں کیفیت کے علاوہ ایک چوکنّا پن بھی ہے جو سنگلاخ کوہ اور دشتِ بے آب اپنے آزادوں کو بخش دیتے ہیں۔ سندھی اُردو لہجہ، لہراتا لیریکل (Lyrical) لہجہ ہے۔ ایک للک، ایک مہران موج جو اپنے آپ کو چوم چوم کر آگے بڑھتی ہے۔ اُردو کے علاقائی لہجوں میں وہ لوک ٹھاٹ، مٹھاس اور رَس جَس ہے جِس کا ہمارے گھسے پٹے ٹکسالی اور شہری لہجے میں دور دور شائبہ نہیں ملتا۔ لوک لہجے کی آمیزش سے جو نیا اُردو لہجہ اُبھرا ہے اس میں بڑی توانائی، تازگی، لوچ اور سمائی ہے۔

بھرے ہیں یہاں چار سمتوں سے دریا

شہرِ آشوب اور نیاز مندانِ بنّوں

بحث و تکرار کے انٹرول میں خان صاحب پیدل سیر کو نکل جاتے۔ کوہاٹ اور بنّوں کے دس پندرہ نیاز مند جو سارے دن واسکٹوں میں پستول رکھے، باہر انتظار میں بیٹھے ہوتے، ان کی اردلی میں چلتے۔ یہ خان صاحب کی حواری اور مصاحب تو تھے ہی، کمانڈوز بھی تھے جو اُن کی کٹی ہوئی انگلی کے نصف اشارے پر اپنی کمر

بارود باندھ کر آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ خان صاحب نے ان کے لیٹنے بیٹھنے اور تواضع کے لیے باہر تین چار پائیاں اور ایک کابلی سماوار رکھوا دیا تھا۔ اس میں دن بھر چائے اونٹتی رہتی، جس کے اخراج کے لیے بشارت کو ٹین کی نالی دار چادروں کا ایک عارضی کاکوس (ٹائلٹ) بنوانا پڑا۔ اس میں وہ استعمال شدہ بلاٹنگ پیپر رکھوا دیتے تھے۔ لوگوں نے کراچی کی کچی روشنائی کی شکایت کی تو اُنھوں نے گزشتہ دن کا ایک اخبار رکھوانا شروع کر دیا جو ہر حکومتِ وقت کا طرف دار رہا تھا۔ اب یہ ٹائلٹ پیپر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس میں کم از کم اخبار کے ساتھ زیادتی نہیں تھی۔ دن بھر گپیں، چہلیں اور وزن اُٹھانے کے مقابلے ہوتے رہتے۔ جوان اپنے روزگار، کھیل کود، مہنگائی، سنیما، کھانے پینے اور نشانہ بازی کی باتیں کرتے۔ جب کہ ادھیڑ عمر والے زیادہ چینی کی چائے اور فحش لطیفوں سے خود کو ری چارج کرتے رہتے۔ دونوں کی گرمی سے گھڑی بھر کے لیے گلابی بڑھاپے کی ٹھر دور ہو جاتی تو ٹھرک[1] اسر پہ چڑھ کے ایسی دوانی باتیں کرنے لگتے کہ جوان سُن کے شرما جاتے۔ جس کی

[1] ٹھرک: (پنجابی) "معذور ہوس کی آنکھوں میں دم تو ہے" والی منزل۔ ہوکا۔ ہُڑک اُٹھنا

مونچھ میں جتنے زیادہ سفید بال ہوتے، یا کمر جتنی زیادہ خمیدہ ہوتی، اس کا لطیفہ اتنا ہی دورمار اور سہ آتشہ ہوتا۔ اس پر مرزا نے ایک دفعہ پھبتی کسی

کماں چنداں کہ خم گردد خدنگش تیز تر گردد[1]

خان صاحب کو کبھی کوئی زیادہ ہی لذیذ حکایت سُنانی ہوتی تو کلّے میں گُڑ یا مصری کی ڈلی دبا کر سی سی کرتے ہوئے چائے پیتے جاتے۔ جھومتے ہوئے فرماتے، یارا جی! سمرقند اور فرغانہ میں اسی طرح پی جاتی ہے۔

فرصت کا تمام وقت خان صاحب کراچی اور کراچی والوں کو دیکھنے اور جو کچھ دیکھتے اس پر لاحول پڑھنے اور پڑھوانے میں گزارتے۔ فرماتے تھے "کراچی میں سانس لینے کے لیے بھی ذاتی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ قبائلی علاقے کی ہوا ہلکی اور شفاف ہوتی ہے۔ خود بخود گولی کی طرح اندر داخل ہو جاتی ہے، خصوصاً جاڑے میں۔ صبح کراچی ریڈیو کہہ رہا تھا کہ ہوا میں رطوبت کا تناسب ۹۰ فی صد ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کراچی کے دودھ والے ہوا میں صرف دس فی صد دودھ ملا کر دودھ بنا لیتے ہیں۔ آپ جن موقعوں پر نعرے، شعر اور وظیفے کا ورد کرنے لگتے ہیں وہاں ہم ٹھائیں سے گولی مار دیتے ہیں۔ میں اتنے دن سے یہاں

---

[1] کمان جتنی زیادہ خمیدہ ہوگی اُس کا تیر اُتنا زیادہ ہی تیز جائے گا۔

ہوں، شہر میں ایک آدمی کے ہاتھ میں بندوق نہیں دیکھی۔ ہمارے یہاں تو نکاح کے وقت بھی پستول ساتھ رکھتے ہیں کہ پتا نہیں مہر پر گولی کی نوبت آجائے۔ بعضی دُلہن کا والد اور رشتے دار ایک دم خبیث، خسیس اور دیوث نکلتا ہے۔ میں تو احتیاطاً چھوٹی مشین گن لے گیا تھا۔ اس سے میرے ماموں نے ۱۹۳۷ میں خیسورہ کے نزدیک کاطوری خیل علاقے میں ایک پہاڑی کھوہ کی کمیں گاہ سے تین گورے مار گرائے تھے، جن میں ایک کپتان تھا۔ اُس کی صورت بُل ڈاگ جیسی تھی۔ اُس خنزیر کے بچّے نے فقیرا پی کے بے شمار مرید شہید کیے تھے۔ ماموں نے اُس کے ناک اور کان کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دی۔ دوسرے گورے کی جیب سے جو معمولی سپاہی تھا اُس کی خمیدہ کمر ضعیف ماں اور ایک سال کی بڑی پیاری سی بچّی کے فوٹو نکلے۔ بچّی کے ہاتھ میں گُڑیا تھی۔ فوٹو دیکھ کر میرا ماموں بہت رویا۔ لاش کے ہاتھ پر سے جو سونے کی گھڑی اُس نے اُتار لی تھی وہ واپس باندھ دی۔ میّت کو سائے میں کر کے واپس جا رہا تھا کہ چند قدم بعد کچھ خیال آیا۔ وہ پلٹا اور اپنی چادر اُتار کر اُس پر ڈال دی۔

”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں ماموں کی مشین گن سے مسلح ہو کر گیا تھا۔ سوائے بچّوں، قاضی اور نائی کے اور کوئی نہتا نہیں تھا۔ عین نکاح کے وقت لڑکی والے پسر گئے۔ کہنے لگے مہر ایک لاکھ کا ہو گا۔ اس پر ماموں جھگڑا کرنے لگا۔ وہ شرعی

مہر یعنی پونے تین روپے بھر چاندی پر مُصر تھا، جس کے تیرہ روپے ساڑھے پانچ آنے سکّہ رائج الوقت بنتے تھے۔ قبیلے کے ایک دانا بزرگ نے تجویز پیش کی کہ کچھ لڑکی والے کم کریں، کچھ لڑکے والے مہر بڑھائیں۔ دونوں فریق درمیانی اوسط رقم پہ سمجھوتا کرلیں۔ اس پر ایک دوسرا دانا بولا، سردار! ہوش کرو۔ تیرہ روپے ساڑھے پانچ آنے اور ایک لاکھ کے درمیان کوئی اوسط رقم نہیں ہوتی۔ ایسے میں اوسط تلوار سے نکلتا ہے"۔

"راڑ رولا بڑھا تو میں نے سہرا ہٹا کر باآوازِ بلند کہا، میں تو پانچ لاکھ کا مہر باندھوں گا۔ اس سے کم میں میرے خاندان کی توہین ہوگی۔ یہ سُن کر ماموں سنّاٹے میں آگیا۔ میرے کان میں کہنے لگا، کیا تو آج پوست پی کے آیا ہے؟ پانچ لاکھ میں تو کلکتے کی گوہر جان اور ایک سو ایک رنڈیوں کا ناچ ہو سکتا ہے، میں نے کہا، ماموں! تو بیچ میں مت بول۔ تو نے زندگی میں بائیں آنکھ میچ کر، دائیں آنکھ سے رائفل کی شست باندھ کر فقط اپنے دشمن کو دیکھا ہے۔ یا پھر کلدار روپوں پر کوئن وکٹوریہ کا چہرہ دیکھا ہے۔ تو نے دنیا نہیں دیکھی۔ نہ تجھے مردوں کی 'پختو' کا کچھ خیال ہے۔ اگر مجھے نادہند ہی ہونا ہے تو بڑی رقم ماروں گا۔ چھوٹی چھوٹی رقم مارنا رذیلوں اور دیوثوں کا کام ہے"۔

”مجھے آئے ہوئے اتنے دن ہو گئے، کراچی میں ایک بھی دنگا فساد نہیں ہوا[1]۔ کیا یہاں رشتے دار نہیں رہتے؟ کیا یہاں سب ایک دوسرے کو یتیم، لاوارث سمجھ کے معاف کر دیتے ہیں؟ پرسوں کا واقعہ ہے۔ میں ایک دوست سے ملنے لانڈھی گیا۔ بس کنڈیکٹر نے میری ریزگاری نہیں لوٹائی۔ میں نے اُترتے وقت گالی دی تو سُنی ان سُنی کر گیا۔ میں نے دل میں کہا، بدبختا میں نے گالی دی ہے۔ نصیحت تو نہیں کی جو یوں ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دی“۔

اس لطیفے کے بعد بڑی دیر تک ان کے حلق سے کمزور بیٹری والی کار کو بار بار سٹارٹ کرنے کی آوازیں نکلتی رہیں اور جسم جیلی کی طرح تھلتھلاتا رہا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ خان صاحب کو کراچی قطعاً پسند نہیں آیا۔ فرماتے تھے، کراچی میں اگر کراچی والے نہ ہوں اور سمندر ڈیڑھ دو میل پرے ہٹ جائے تو ٹرک اور گھڑے دوڑانے کے لیے یہ شہر برا نہیں۔ کراچی کے کچھ حصّے انھیں بے حد پسند آئے۔ یہ کچی بستیوں کے وہ علاقے تھے جو تحصیل کوہاٹ سے مشابہت رکھتے تھے جہاں ایک زمانے میں اُن کی جوانی نے، بقول ان کے، پوری تحصیل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

---

[1] یہ بات پُرانی ہوئی۔ افسوس! کراچی کو اپنی ہی نظر لگ گئی

اے گُل بتو لُز سندم تو بوئے کسے واری

یار زندہ فضیحت باقی

بشارت اور خان صاحب کے مابین حجت و تکرار صرف میں دفتری اوقات میں یعنی نو سے پانچ بجے تک ہوتی، جو ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر کل تک لیے ملتوی ہو جاتی، تاکہ تازہ دَم ہو کر لڑ سکیں۔

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ

کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

سُنا ہے اگلے وقتوں میں پڑوسنیں اسی طرح لڑتی تھیں۔ لڑتے لڑتے گلا بیٹھ جاتا اور شام پڑتے ہی وہ مرد گھر لوٹنے لگتے جو دن بھر معرضِ دشنام میں آیا کیے تو دونوں مکانوں کی سرحد یعنی مشترکہ دیوار پر ایک ہانڈی اُلٹی کر کے رکھ دی جاتی تھی، جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اندھیرے کے سبب عارضی دشنام بندی ہو گئی ہے۔ کل پھر ہو گی۔ بات یہ ہے کہ جب تک فریق کا چہرہ نظر نہ آئے، گالی میں third dimension (ابعادِ ثلاثی) پیدا نہیں ہوتی۔ جس دکان میں ہمہ وقت جھگڑے اور دنگل کا سماں ہو اور باہر ایک فریق کے دس پندرہ مسٹنڈے حمایتی

سماوار کے گرد پڑاؤ ڈالے ہوں، اس کے گاہک بدکیں نہیں تو اور کیا کریں۔ بقول ہمارے اُستادِ اوّل، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے، جن کے "ریڈر" سے ہم نے دفاع اور آداب کا پہلا سبق سیکھا:

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ

اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

کوئی گاہک مارے باندھے ٹھہر بھی جاتا تو خان صاحب اس کے سامنے اپنی ڈوبی ہوئی رقم کو اس طرح یاد کرتے کہ وہ حسبِ توفیق خوف زدہ یا آبدیدہ ہو کر بھاگ جاتا۔ بحثا بحثی کا اثر خان صاحب کی تندرستی پر نہایت خوشگوار ثابت ہوا۔ ان کی زبان اور اشتہار روز بروز کھلتی جارہی تھی۔ وہ کسی طور لکڑی کی قیمت کم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے کہ انھیں گھر میں اتنے ہی کی پڑی تھی۔ ادھر بشارت بار بار کہتے کہ "اوّل، لکڑی داغی اور کَٹھل تھی۔ اس پر تیز سے تیز آری کَٹھل ہو گئی۔ دوم، سیزن بھی نہیں ہوئی تھی۔ کئی تختوں میں بَل آگیا تھا۔ کوئی بے داغ نہیں نکلا۔ سوم، چھیجت[1] بہت ہوئی۔ چہارم، جگہ جگہ کیڑا لگا ہوا تھا"۔

---

[1] چھیجت: کاٹ چھانٹ یا لادنے اور اُتارنے سے مال میں کمی واقع ہونا۔

خان صاحب نے لقمہ دیا "پنجم یہ لکڑی چوری ہو گئی۔ یہ بھی میرا ہی قصور ہے۔ ششم یہ کہ ہم نے آپ کو لکڑی دی تھی۔ لڑکی تو نہیں دی کہ آپ اُس کے جہیز میں ہزار کیڑے نکالنے بیٹھ جائیں۔ آپ تو پان کھا کھا کے بالکل زنانیوں کی طرح لڑنے لگتے ہیں"۔ بشارت نے "زنانوں" سُنا اور سمجھا۔ تڑ سے جواب دیا "آپ بھی تو کابلی والا سے کم نہیں"۔

"یہ کیا ہوتا ہے صیب؟"

بشارت نے کابلی والا کا مطلب بتایا تو وہ غضب ناک ہو گئے۔ کہنے لگے "ہمارے قبیلے میں آج تک کسی نے سُود لیا نہ سُود دیا۔ خنزیر برابر سمجھتے ہیں۔ جب کہ آپ علانیہ سُود دیتے بھی ہیں اور کھاتے بھی ہیں۔ آپ کے گھر کا تو شوربہ بھی حرام ہے۔ اس میں آدھا پانی، آدھی مرچیں اور آدھا سُود ہوتا ہے! اگر آئندہ یہ لفظ منہ سے نکالا تو ٹھیک نہ ہو گا"۔

یہ کہہ کر عالمِ غیظ میں میز پر اتنے زور سے مکّا مارا کہ اس پر رکھے ہوئے کپ، چمچے، پن اور تلے ہوئے مٹر ہوا میں ایک ایک بالشت اونچے اُچھلے اور میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔ پھر اُنھوں نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا، ٹرکش کوٹ کی جیب سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد نال

کا رُخ پھیر کر اپنی طرف کر لیا۔ بشارت سہم گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زہر میں بجھے ہوئے اس تیر کو جو نہ صرف کمان سے نکل چکا تھا، بلکہ مہمانِ عزیز کے سینے میں ترازو ہو چکا تھا، اب کیسے واپس لائیں۔ خان صاحب نے اسی وقت اپنے ایک کمانڈو کو حکم دیا کہ فوراً جا کر پشاور کا ٹکٹ لاؤ۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ بشارت منّت سماجت کرتے رہے۔ خان صاحب بار بار بپھر کر دفتر سے باہر جاتے مگر اس انداز سے کہ ہر قدم پر

مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

بشارت نے چار بجے اُن کے پیر پکڑ لیے تو وہ گھر چلنے کے لیے اس شرط پر رضامند ہوئے کہ پہلے اپنے ہاتھ سے مجھے پان کھلاؤ!

لیکن اس کے بعد خان صاحب کے رویّے میں ایک خوشگوار تبدیلی آ گئی۔ بشارت تو خیر اپنے کہے پر نادم تھے ہی، بلکہ انگریزی محاورے کے مطابق اپنے ہی عرق میں غرق ہوئے جا رہے تھے لیکن خان صاحب بھی اپنے شدید ردّ عمل پر کچھ کم خجل نہ تھے۔ طرح طرح سے تلافی اور اشک شوئی کی کوشش کرتے۔ مثلاً بشارت کبھی اداس یا مضمحل نظر آتے یا گھمسان کی بحث میں اچانک ایسے بزدلانہ طریقے سے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے کہ خان صاحب ڈان کیوٹے کی طرح

اکیلے ہوا میں تلوار چلاتے رہ جاتے، تو ایسے موقعے پر وہ ایک ادائے دلنوازی سے کہتے ''حضورِ والا! کابلی والا بعد ادائے آداب کے عرض کرتا ہے ہے کہ پان کی طلب ہو رہی ہے۔ پان کھلایئے''۔ اُنھوں نے اس سے پہلے پان کبھی چکھا بھی نہیں تھا۔ بشارت ندامت سے زمین میں گڑ جاتے۔ کبھی قدرے کھسیانے، کبھی mock- serious انداز (استہزائیہ سنجیدگی) سے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے، کبھی گھٹنے چھوتے۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ خان صاحب ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیتے۔

پلنگ زیب خاں

شام کو وہ کھلے صحن میں پلنگ بچھوا کر اس پر مچھر دانی لگواتے۔ کچھ دنوں سے کرسی پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ بشارت سے کہتے تھے کہ تم نے مہمان کی شلوار کے لیے کرسیوں کی کیلوں کو ننگا کر رکھا ہے۔ اپنے پلنگ سے مؤدب فاصلے پر ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے چار چارپائیاں مع مچھر دانی بچھواتے۔ فرماتے تھے کہ اگر فرنٹیر کے بچھوؤں کے پر لگ جائیں تو کراچی کے مچھر بن جائیں گے۔ ساری گفتگو اور بحث مباحثے مچھر دانیوں کے اندر بیٹھے بیٹھے ہوتے۔ البتہ کسی کو دورانِ تقریر جوش آجاتا تو وہ مچھر دانی اس طرح ہٹاتا جیسے دولہا نکاح کے بعد

سہرا اُلٹ دیتا ہے۔ کراچی کی دور دراز بستیوں سے ان کے پٹھان دوست، گرائیں اور معتقدین جوق در جوق ملنے آتے۔ اُن کی خاطر تواضع اس طرح کرتے گویا یہ سب کچھ اپنے ہی حجرے میں ہو رہا ہے۔ رات گئے تک تام چینی کی چیچک زدہ چینکیں اور حقّے گردش میں رہتے۔ چائے کے رسیا او نٹنی چورا چائے میں مردان کے گڑ کے علاوہ خشخاش کا چورا بھی ڈلواتے۔ جو بھی آتا خان صاحب کے لیے کچھ نہ کچھ نذر ضرور لاتا۔ اخروٹ، چلغوزے، پشاور کے کالے گلاب جامن، شہد کے چھتّے، تلا گنگ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کا سفید تمبا کو، قراقلی اور جوان اصیل مرغ[1] جنھیں خان صاحب بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ دن بھر گھر میں درجنوں اصیل مُرغ چھپتے پھرتے۔ سرخ سیمنٹ کے فرش پر سبز بیٹ اور بھی کَھلتی تھی۔ (کَھلتی کو زیر کے ساتھ پڑھیں تب بھی مزہ دے گی) جو مُرغ

---

[1] اصیل مُرغ: سرخُ مائل گہرے براؤن رنگ کا مُرغ۔ بہت لڑاکا اور خونخوار ہوتا ہے۔ اس کا گوشت بہت مقوی سمجھا جاتا تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ "دنیا میں اصیل مُرغ سے زیادہ بہادر کوئی جانور نہیں ہے۔ مُرغ کی سی بہادری در حقیقت شیر میں بھی نہیں۔ وہ مر جاتا ہے مگر لڑائی سے منہ نہیں موڑتا"۔ ان کی تحقیق کے مطابق اس کی نسل عرب سے ہندوستان امپورٹ کی گئے جب کہ "بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا"۔ معلوم ہوتا ہے بٹیر بازی سے متعلق مولانا نے کوئی ضعیف روایت نقل کر دی۔ ہم نے تو آج تک اہلِ پنجاب کو بٹیروں کو ایک دوسرے سے لڑوا کر بے رحمی سے زخمی یا ہلاک کرواتے نہیں دیکھا۔ اپنے ہاتھ سے حلال کر کے کھاتے ہیں۔

بے وقت یا زیادہ سے زیادہ اذان دیتا، اُسے خان صاحب سب سے پہلے ذبح کرتے۔ صبح جب سب مُرغ با جماعت اذان دیتے تو سارے محلّے کو کلغی پہ اُٹھا لیتے۔ ایک دن ایک مہمند نوجوان غلطی سے مُرغی دے گیا۔ اُس دن مُرغ آپس میں بڑی خونخواری سے لڑے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مُرغ کسی واضح اور معقول مقصد کی خاطر لڑے، ورنہ روزانہ بے مقصد اور بلاوجہ ایک دوسرے بلکہ تیسرے پر بھی جھپٹتے اور کٹتے مرتے رہتے۔ کوئی انھیں لڑنے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا، اس لیے کہ جب وہ آپس میں نہیں لڑتے تھے تو گھر والوں کو کاٹنے لگتے تھے۔ اکلوتی مُرغی پر لڑ لڑ کر وہ ایسے لہولہان ہوئے کہ صبح اذان دینے کے لائق بھی نہ رہے۔ دڑبے میں چپکے پڑے ملا کی اذان سُنا کیے۔

خان صاحب اتوار کو سارے دن پلنگ پر نیم دراز ہو کر قبائلی تنازعوں اور کوہاٹ کی زمینوں کے فیصلے کرتے۔ اب وہ اورنگ زیب خان کے بجائے پلنگ زیب خان زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ رات کو البتہ فرش پر سوتے تھے کہ اس سے تکبّر اور کمر کا درد دور ہاتا ہے۔ ہمارے فرنٹیر میں جاڑے میں شوقین لوگ پیال (باریک خشک گھاس) پر سوتے ہیں۔ پیال سے رات بھر جنگلوں اور پہاڑوں کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ جس آدمی کو جنگل کی خوشبو آتی اور بھاتی رہے وہ کبھی کسی کی غلامی اور محکومی قبول نہیں کرے گا۔

اُس دن یعنی اتوار کو لنچ کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے۔ اگر کھانا بدمزہ ہو یا مرچیں زیادہ ہوں تو موڈ بگڑ جاتا۔ نماز قضا کر دیتے۔ فرماتے کہ دل کا حال جاننے والے کے سامنے مجھ سے تو جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ کس دل سے بارہ مرتبہ الحمد للہ کہوں؟ کمرے میں محفلِ تکرار و غیبت بدستور گرم رہتی اور وہ تنہا ایک کونے میں جانماز بچھا کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ مگر کان اسی طرف لگے رہتے۔ دورانِ نماز کوئی شخص آپس میں ایسی بات کہہ دیتا جو خان صاحب کے مزاج یا مؤقف کے خلاف ہوتی تو فوراً۔۔۔ عین سجدے کی حالت میں ہوں تب بھی۔۔۔۔ نیت توڑ کر اُسے پشتو میں گالی دے دیتے اور پھر سے نیت باندھ کر اور اسی طرف کان لگا کر نماز پڑھنے لگتے۔

نماز کے بعد کُرتا اُتار کر اجلاس فرماتے۔ بیشتر بنیانوں میں بڑے بڑے چھید ہو گئے تھے۔ فرماتے تھے، کیا کروں، میرے سائز کا بنیان صرف روس سے اسمگل ہو کے آتا ہے۔ کبھی کبھار لنڈی کوتل میں مل جاتا ہے تو عیش آجاتے ہیں۔ کوئی کوئی بنیان تو اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ کُرتے کے اوپر پہننے کو جی چاہتا ہے۔ خان صاحب گہرا سانس لیتے یا ہنسی کا دورہ پڑتا تو چونّی برابر سُوراخ پھیل کر پنگ پانگ کی گیند کے برابر ہو جاتے۔ ان پھیلتی سُکڑتی جھانکیوں میں سے فربہ بدن گھٹتے بڑھتے پھوڑوں کی طرح اُبلا پڑتا تھا۔ کیسی بھی گرمی ہو، کُرتا اُتارنے

کے بعد بھی کلاہ نہیں اُتارتے تھے۔ فرماتے تھے، جب تک کلاہ سر پر ہے بندہ خود کو ننگا اور بے حیا محسوس نہیں کرتا۔ انگریز اسی لیے تو عورتوں کو دیکھتے ہی ہیٹ اُتار دیتے ہیں۔

ایک رات حاضر باشوں کی چارپائی اوور لوڈنگ کے سبب دس بارہ سواریوں سمیت زمیں بوس ہو گئی۔ پانچ چھ منٹ تک خوانین مچھر دانی اور بانون کے جال سے خود کو آزاد نہ کرا سکے۔ اُس کے اندر ہی مچھلیوں کی طرح ایک دوسرے پر اُچھلتے پھدکتے کلبلاتے رہے۔ چارپائی کا ایک پایہ اور پٹی اور ایک کوہاٹی خان کی کلائی ٹوٹ گئی۔ جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ کلائی ٹوٹ گئی ہے اس کوہاٹی خان نے شکر ادا کیا کہ خدا نے بڑی خیر کی۔ گھڑی بچ گئی۔ دوسرے دن اورنگ زیب خان نے اپنے کمرے میں چاندنی بچھوا دی اور اپنے بستر کو گول کر کے گاؤ تکیہ بنا لیا۔ یہ چاندنی اُن مشاعروں کے لیے مخصوص تھی جو بشارت کے ہاں اتوار کے اتوار بڑی پابندی سے ہوتے تھے۔ خان صاحب بھی دو مشاعروں میں شریک ہوئے۔ شعر میں ذرا بھی اینچ پینچ ہوتا تو پاس بیٹھنے والے سے دریافت فرماتے کہ یہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ وہ سرگوشیوں میں مطلب بیان کر دیتا تو باآواز بلند فرماتے، لاحول ولا قوۃ !

پھٹی چاندنی اور اضافت خور

دوسرے مشاعرے کے بعد خان صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا، کیا یہاں ہر دفعہ یہی ہوتا ہے؟ جواب ملا، اور کیا! بولے، خدا کی قسم! اس چاندنی پر اتنا جھوٹ بولا گیا ہے کہ اس پر نماز جائز نہیں! ایسے جھوٹے شاعروں کی میّت کو تو حقّے کے پانی سے غسل دینا چاہیے تاکہ قبر میں کم از کم تین دن تک تو منکر و نکیر نہ آئیں۔ چاندنی ہر جہاں جہاں شعرائے کرام نے سگریٹ بجھائے تھے وہاں چھوٹے چھوٹے سُوراخ ہو گئے تھے، جنھیں بعد میں فکرِ شعر اور دادِ سُخن کے دوران اُنگلی ڈال ڈال کر بڑا کیا گیا تھا۔ چاندنی کئی جگہ سے پھٹ بھی گئی تھی۔ خان صاحب نے اس پر نماز کا مسئلہ چھیڑا تو مرزا نے ایک اور ہی فتویٰ دیا۔ کہنے لگے، دریدہ دامن یوسف پر تو صرف زلیخا ہی نماز پڑھ سکتی ہے! اس پر خان صاحب بولے کہ زلیخا کے خاوند کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ خان صاحب کے لیے شاعروں کا اتنا بڑا اجتماع ایک عجوبہ سے کم نہ تھا۔ کہنے لگے، اگر قبائلی علاقے میں کسی شخص کے گھر کے سامنے ایسے مجمع لگے تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو اس کے چال چلن پر جرگہ بیٹھا ہے۔ یا اس کا والد فوت ہو گیا ہے۔

کبھی کوئی شعر پسند آجائے، گو کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، تو ''وئی'' کہہ کر فرطِ سرور سے آنکھیں بند کر لیتے اور جھومنے لگتے، شاعر وہ شعر مکرر پڑھنے لگتا تو اسے ہاتھ کے درشت اشارے سے روک دیتے کہ اس سے ان کے لطف میں خلل واقع ہوتا ہے۔

ایک دن ایک نوجوان شاعر نے دوسرے سے باز پُرس کی کہ تم نے میری زمین میں غزل کیوں کہی؟ اُس نے کہا، سودا کی زمین ہے۔ تمہارے باپ کی نہیں! اُس شاعر پہ یہ الزام بھی لگایا کہ وہ اضافت بہت کھاتا ہے۔ اس پر دونوں میں کافی تلخ کلامی ہوئی۔ شروع میں تو خان صاحب کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ جھگڑا کس بات کا ہے۔ اگر زرعی زمین کا تنازعہ ہے تو زبانی کیوں لڑ رہے ہیں؟ ہم نے جب ردیف، قافیے اور اضافت کا مطلب سمجھایا تو خان صاحب دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے ''لاحول ولا میں تو جاہل آدمی ہوں۔ میں سمجھا اضافت خور شاید رشوت یا خنزیر کھانے والے کو کہتے ہیں۔ پھر سوچا نہیں۔ باپ کو گالی دی ہے، اس پر لڑ رہے ہیں۔ فرضی زمینوں پر جو تم پیزار ہوتے ہم نے آج ہی دیکھی! کیا یہ اپنی اولاد کے لیے یہ ہی زمینیں ترکے میں چھوڑ کے مریں گے کہ برخوردارو! ہم تو چلے۔ اب تم ان آبائی مربعوں کی چوکیداری کرنا۔ ان میں قافیوں کی پنیری لگانا اور اضافتوں کا مربّا بنا بنا کے کھانا! پشتو میں اس کے لیے بہت برا لفظ ہے''۔

نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

اُنھیں خوشی کے عالم میں بارہا، گاتے گنگناتے بھی دیکھا۔ لہراتی، کُٹکری لیتی آواز میں طُبورے کے تار کا سا کھرج کا ایک اچل (قائم) سُر بھی تھا جو کانوں کو بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اپنے زمانے میں ٹنگ ٹیگورا[1] کے رسیارہ چکے تھے۔ مطلب یہ کہ اس حد تک موسیقی میں درک کہ بخوبی جانتے تھے کہ خود بھی بے سُرا گاتے ہیں۔ اکثر فرماتے کہ ہمارے ہاں شرفا میں اچھے گانے کو عیب سمجھا جاتا ہے۔ میں بگاڑ کے گاتا ہوں۔ بے نقص گائیکی کو صرف گویّوں، طوائف، میراثی اور لختئی[2] کے کیس میں قابلِ معافی سمجھے جاتے تھے۔ انھیں بے شمار ٹپّے یاد تھے۔ مگر ایک پشتو گیت ان کا فیورٹ تھا جس کا روزِ اَبر و شبِ ماہتاب میں خون کرتے تھے۔ اس کا مکھڑا کچھ اس طرح تھا کہ دیکھ دلدارا! میں نے تیری محبّت میں رقیب کو ننگی تلوار سے قتل کر ڈالا۔ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر "یا قُربان" کے الاپ کے بعد جس والہانہ انداز سے وہ گاتے تھے اس سے تو یہی ٹپکتا تھا کہ موصوف کو جو لذّت قتل میں ملی، وصل میں اُس کا عشرِ عشیر بھی نہ ملا۔ اس بول کی ادائیگی

---

[1] ٹنگ ٹکور: (پشتو) راگ رنگ

[2] لختئی: ناچنے والے خوبصورت لڑکے

میں وہ ایسے پہلوانی جوش اور اندھا دھند وارفتگی سے کرتے کہ شلوار میں ہَوا بھر بھر جاتی۔

فرماتے تھے کہ دُشمنی اور انتقام کے بغیر مرد کی زندگی بے مقصد، لاحاصل اور مہمل ہو کر رہ جاتی ہے۔ گویا

زیست مہمل ہے اسے اور بھی مہمل نہ بنا

ایک نہ ایک دُشمن ضرور ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ دُشمن نہ ہو گا تو انتقام کس سے لیں گے؟ پھر برسوں منہ اندھیرے ورزش کرنے، بالٹیوں دودھ پینے اور تکیے کے نیچے پستول رکھ کر سونے سے کیا فائدہ؟ سارے آبائی اور قیمتی ہتھیار بے کار ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ کہ شیر دلیر لوگ باعزّت موت کے بجائے دمے اور قے و دست میں فوت ہونے لگیں گے! عمرِ طبیعی تک تو صرف کوّے، کچھوے، گدھ گدھے اور وہ جانور پہنچتے ہیں جن کا کھانا شرعاً حرام ہے! خان صاحب یہ بھی فرماتے کہ جب تک آپ کا کوئی بزرگ بے دردی سے قتل نہ ہو، آپ انتقام کی لذّت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ صرف منگتوں، ملّاؤں، زنانوں، میراثیوں، لاولدوں اور شاعروں کو کوئی قتل نہیں کرتا۔ اگر آپ کا دشمن آپ کو لائقِ قتل نہیں گردانتا تو اس سے زیادہ نے عزّتی کی بات نہیں ہو سکتی۔ اس پر تو خون ہو

جاتے ہیں۔ ایمان سے! ایسے بے غیرت آدمی کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ وَپشتو کا نڑے پہ اوبو کے نہ ورستیدی (پشتو کا پتھر پانی میں نہیں گھستا۔)

گھوڑا، غلیل اور انکسار

"یوں میرا دادا بڑا جلالی تھا۔ اُس نے چھ خون کیے۔ اور چھ ہی حج کیے۔ پھر قتل سے توبہ کر لی۔ کہتا تھا اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب مجھ سے بار بار حج نہیں ہوتا۔ وہ پچانوے سال کی عمر میں برضاورغبت فوت ہوا۔ جب تک آخری دشمن فوت نہیں ہو گیا، اُس نے خود کو فوت نہیں ہونے دیا۔ کہتا تھا، میں کسی دُشمن کو اپنے جنازے کو کندھا نہیں دینے دوں گا۔ نہ میں اپنی زوجہ کا سُہاگ لُٹتے دیکھ سکتا ہوں۔ دادا واقعی بڑے ڈیل ڈول اور رعب داب کا آدمی تھا۔ پیدل بھی چلتا تو یوں لگتا جیسے گھوڑے پر آرہا ہے۔ وہ بڑا جہاں دیدہ اور دانا تھا۔ اس وقت وہ مجھے گھوڑے کے ذکر پر یاد آیا۔ وہ کہتا تھا کہ سب سے اعلیٰ سواری اپنی ٹانگیں ہیں۔ گھوڑے کی ٹانگوں کا استعمال صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ اوّل، میدانِ جنگ میں دُشمن پر تیز رفتاری سے حملہ کرنے کے لیے۔ دوم۔ حملہ ناکام ہو تو میدانِ جنگ سے دگنی تیز رفتاری سے بھاگنے کے لیے! مذاق اپنی جگہ، میرا دادا قازقستانی شہسواروں کی طرح تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کی زین کو چھوڑ کر

اس کے پیٹ کے گرد چکر لگاتا ہوا دوسری طرف سے دوبارہ زین پر بیٹھ جاتا تھا! میرے پاس اُس کی تلوار اور مرصّع پیش قبض ہے۔ ان میں وہی فولاد استعمال ہوا ہے جس سے نادر شاہ کی تلوار ڈھالی گئی تھی۔ ہمارے خاندان میں سو سال کے عرصے میں، میں پہلا آدمی ہوں جس نے قتل نہیں کیا۔۔ کم از کم اب تک۔ الحمدللہ میرے تایا نے بھی قتل نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ جوانی میں ہی قتل کر دیا گیا"۔

"خان صاحب گھوڑوں سے بے پناہ شغف رکھتے تھے۔ سیاہ گھوڑا اُن کی کمزوری تھی۔ بنّوں میں پانچ چھ گھوڑے اصطبل میں بیکار کھڑے کھاتے تھے۔ سب مشکی۔ کسی کا تحفتہً دیا ہوا ایک اعلیٰ نسل کا سمندِ سیاہ زانو، (بادامی رنگ کا گھوڑا جس کی دم اور زانو سیاہ ہوں) بھی تھا۔ لیکن اسے صرف زانوں اور دُم کی حد تک پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اکثر فرماتے، ہمارے قبیلے میں جس مرد کا نشانہ خطا ہوتا ہو، یا جس کے شجرہ نسب میں صرف مقتولین ہوں، یا جس کو گھوڑا بار بار زمین پر پٹخ دیتا ہو، اس سے نکاح جائز نہیں۔ گھوڑا میں نے ہمیشہ رکھا۔ اُس زمانے میں بھی بے انتہا تنگی تھی اور میں بغیر بریک کی سائیکل پر آتا جاتا تھا، باہر ایک مشکی کھڑا ہنہناتا رہتا تھا"۔ کسی نے پوچھا "اس میں کون سی تک تھی، خان صاحب؟" فرمایا "اوّل تو اپنے گاوں میں گھوڑے پر ٹنگے ٹنگے پھرنا غرور و نخوت

کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ دویم، گھوڑا ضعیف تھا۔ والد صاحب کی آخری نشانی۔ مجھے میرے دادا نے پالا۔ وہ تکبر اور رعونت کے بہت خلاف تھا۔ کہتا تھا ہمیشہ گردن جھکا کر چلو۔ یہی کھرے پختونوں کا شیوہ ہے۔ میری اُٹھتی جوانی، گرم خون تھا۔ ایک دن میں سینہ تانے، اور گردن کو اتنا اکڑائے کہ صرف آسمان نظر آتا تھا۔ اس کے سامنے سے گزرا تو اُس نے مجھے روک لیا۔ میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے غلیل چھین کر اُس نے دوشاخے کو میری گدّی میں پیچھے سے پھنسا کر گردن کو اتنا جھکایا کہ مجھے اپنی ایڑی نظر آنے لگی۔ میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی گردن اکڑا کے نہیں چلوں گا۔ پھر غلیل گردن سے علاحدہ کر کے بھائی کو واپس کرنا چاہی تو دادا نے سختی سے منع کر دیا کہنے لگا، اسے سنبھال کے رکھ لے۔ کام آئے گی۔ بڑھاپے میں اسے دوسری طرف سے استعمال کرنا۔ تھوڑی کے نیچے لگا کر گردن کھڑی کر لینا“۔

اہلِ خانہ بدوش

خان صاحب اپنے اہالی موالی کی معیت میں جب کچی آبادیوں اور پٹھان بستیوں کا دورہ کرتے اور راستے میں کوئی بھاری پتھر پڑا نظر آجاتا تو کِھل اُٹھتے۔ وہیں رک جاتے۔ جوانوں کو اشارہ کرتے کہ اسے اُٹھا کر دکھاؤ تو جانیں۔ اگر کسی سے نہ

اُٹھتا تو آستین چڑھا کر آگے بڑھتے اور یا علی! کہہ کر سر سے اونچا اُٹھا کر دکھاتے۔ راہ چلتے لوگ اور محلے کے بچّے تماشہ دیکھنے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کراچی کی خوش حال اور صاف ستھری بستیوں، مثلاً پی ای سی ایچ ایس، باتھ آئی لینڈ اور کے ڈی اے ون، سے سواری بادِ بہاری گزرتی تو افسوس کرتے کہ خا! یہ کیسی جھاڑو پھری خانہ خراب بستی ہے کہ ایک پتھر پڑا نظر نہیں آتا جسے کوئی مرد بچّہ اُٹھا سکے۔ میرے بچپن میں گاوں میں جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں پڑی ہوتی تھیں جن پر کھڑے ہو کر آپ دُشمن کو گالی دے سکتے تھے۔ ٹیک لگا کر سستا سکتے تھے۔ انھی پتھروں پر جاڑے میں بڑے بوڑھے سلیٹی رنگ کا کمبل اس طرح اوڑھ کے بیٹھتے تھے کہ صرف دو آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ دھوپ سینکنے کے بہانے وہ ان آنکھوں سے نوجوانوں کے چال چلن پر نظر رکھتے تھے۔ ادھر جب کنواری لڑکیاں جن کے سفید بازو اُتھلے پانی کی مچھلیوں کی مانند کسی طرح گرفت میں نہیں آتے، گودر (پنگھٹ) سے اپنے سروں پر گھڑے اُٹھائے گزرتیں تو انھی پتھروں پر بیٹھے گبرو جوان اپنی نظریں اُٹھائے بغیر فقط چال سے بتا دیتے تھے کہ کس کا گھڑا لبالب بھرا ہے اور کس کا آدھا خالی۔ اور کون گھونگھٹ میں مسکرا رہی ہے۔ کوئی لڑکی موٹی چادر کے نیچے پھنسا پھنسا کُرتا پہن کر یا دانتوں پر اخروٹ کا تازہ دنداسہ لگا کر آتی، تب بھی چال میں فرق آ جاتا تھا۔

جوان لڑکی کی ایڑی میں بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ چلتی ہے تو اُسے پتا ہوتا ہے کہ پیچھے کون کیسی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ گاؤں کے چوحدّے پر ملک جہانگیر خان کی بُرجی کے پاس ایک تکونا سا پتھر آدھا زمین میں دھنسا، آدھا دیو کے پنجے کی طرح باہر نکلا تھا۔ اُس پر ابھی تک اُن گولیوں کلے نشان ہیں جو پچاس سال پہلے عید کے دن میں نے نشانہ بازی کے دوران چلائی تھیں۔ ایک گولی کا ٹکڑا پتھر سے ٹکرا کر اچٹتا ہوا نصیر گل کی ران میں پیوست ہو گیا۔ وہ کچی عمر کا خوش شکل لڑکا تھا۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ اُس کا باپ کہنے لگا کہ منحوس کے بچّے! میں تیری دونوں ٹانگوں میں گولی سے ایسا درّہ کھولوں گا کہ ایک لحاف کی روئی سے بھی موسلا دھار خون بند نہیں ہو گا۔ گاؤں میں کبھی سنّاٹے میں فائر ہوتا تو زمین دیر تک کانپتی رہتی اور دل دہل جاتے۔ عورتیں اپنے مرد کے لیے خیر کی دعائیں کرتی تھیں کہ خدا خیر سے لوٹائے"۔

محبّت اور نفرت دونوں کا اظہار خان صاحب "ویٹ لفٹنگ" سے کرتے۔ مطلب یہ کہ بحث میں ہار جائیں تو حریف کو اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیتے۔ اور اگر مدّت کے بچھڑے دوست مل جائیں یا ہم جیسے ناقابلِ رشک قدو قامت والے نیاز مند سلام کریں تو معانقے کے دوران ہمیں اس طرح ہلاتے اور جھنجھوڑتے جیسے پھل دار درخت کی شاخ کو جھڑ جھڑاتے ہیں۔ پھر فرطِ محبّت سے ہمیں

زمین سے ادھر اُٹھا لیتے۔ ہماری پیشانی کو اپنی lip level تک لاتے اور چوم کر وہیں ہوا میں نیوٹن کے سیب کی مانند گرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

اسی طرح ان کے ایک دل پسند ٹپّے سے جو اکثر گاتے اور گنگناتے تھے یہی ترشَح ہوتا تھا کہ محبوب بھی انھیں صرف اسی لیے بھاتا ہے کہ اسے دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر گھڑے کی طرح سر پر رکھا جا سکتا ہے :

راشہ زماذ ملیگ منگے شہ

چہ و سینہ پہ لار دے سر تہ خیرہ ومہ

مطلب یہ کہ ”جاناں آ میرے پہلو کا گھڑا بن جا کہ تجھے سینے کے راستے سے سر پر چڑھا لوں“۔ گاتے میں کٹی انگلی سے اپنے سینے پر گداز گھڑے کے عمودی سفر کا ایسا نقشہ کھینچتے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے سر پہ ہے

محبوب کا وزن کے علاوہ ہیئت کذائی میں بھی گھڑے سے مشابہ ہونا اگرچہ لازمی شرط نہیں، لیکن اضافی کوالیفیکیشن ضرور معلوم ہوتی تھی۔ گھڑے کو اپنے گرمائے ہوئے پہلو سے جدا کر کے سر پر رکھ لینے سے غالباً عفتِ نگاہ و نکاح کا یہ

پہلو دکھانا مقصود تھا کہ خوبصورت گھڑے کو ہمہ وقت سر پر اُٹھائے پھرنے والا اہلِ خانہ بدوش خود کبھی اس کا پانی نہیں پی سکتا۔ اس دکھیا کی ساری عمر گھڑے کو سر پر بیلنس کرنے اور لونڈوں کی غلیل سے بچانے میں ہی گزرے گی۔

آداب عرض!

سچار

سچ بات کہنے میں خان صاحب اتنے ہی بے بس تھے جتنے نے ہم آپ چھینک کے معاملے میں۔ منہ پر آئی ہوئی بات اور ڈکار کو بالکل نہیں روکتے تھے۔ اگر ان کی کسی بات سے دوسرا آزردہ یا مشتعل ہو جائے تو انھیں پوری طرح اطمینان ہو جاتا تھا کہ سچ بولا ہے۔ انھیں سچ اس طرح لگتا تھا جیسے ہُما شُما کو ہچکی یا شاعروں کو تازہ غزل لگتی ہے۔ اِترا اِترا کر لکھنے والوں کو لِکھار اور کُھل کھیلنے والی کو کھلاڑ کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بات بے بات سچ بولنے والے کو سندھی میں "سچار" کہتے ہیں۔ خان صاحب اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً ایک دفعہ خان صاحب سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ چھوٹتے ہی پوچھنے لگے "ایسی مونچھیں رکھ کر آپ کیا ثابت

کرنا چاہتے ہیں؟" وہ صاحب برامان گئے تو کہنے لگے "معاف کرنا! میں جاہل آدمی ہوں۔ یوں ہی اپنا علم بڑھانے کے لیے پوچھ لیا تھا"۔ خلیل احمد خان رند سے دریافت فرمایا "معاف کرنا، آپ کی صحت پیدائشی خراب ہے یا بقلم خود خراب کی ہے؟ کیا آپ کے والد بھی نام کے آگے خان لکھتے تھے؟" وہ صاحب کہ روہیل کھنڈ کے اکھڑ پٹھان تھے، سچ مچ بگڑ گئے۔ کہنے لگے "کیا مطلب؟" بولے "ہم نے تو ویسے ہی پوچھ لیا۔ اس واسطے کہ بارہ سنگھا ماں کے پیٹ سے سینگوں کے جھاڑ سمیت پیدا نہیں ہوتا"۔ ایک دفعہ بشارت سے پوچھا "آپ ریشمی ازاربند استعمال کرتے ہیں۔ کھل کھل جانے کے علاوہ اس کے اور کیا فوائد ہیں؟" ایک اور موقعے پر تین چار دوستوں کی موجودگی میں بشارت کو بڑی سختی سے ٹوکا "یاراجی! معاف کرنا۔ میں تو جاہل آدمی ہوں۔ مگر یہ آپ دن بھر، آداب عرض! آداب عرض! تسلیمات عرض ہے! کیا کرتے رہتے ہیں۔ کیا السّلام وعلیکم کہنے سے لوگ برامان جائیں گے؟"

غارِ ہرا اس پر غارِ حرا کا گمان

اس سے پہلے بشارت نے اس پہلو پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ادھر ہمارا ابھی خیال ہی نہیں گیا تھا۔ بشارت نے اپنے والد کو ہمیشہ آداب، تسلیمات ہی

کہتے سُنا تھا۔ اور اس میں انھیں بڑی ملائمت اور نفاست محسوس ہوتی تھی۔ خان صاحب نے دوسری مرتبہ بھری محفل میں ٹوکا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اب جو پلٹ کر پیچھے دیکھا تو نظروں کے سامنے ایک منظر کے بعد دوسرا منظر آتا چلا گیا۔

1۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مغل تاجداروں نے کلاہِ تیموری اور تاشقندی عمامے اُتار پھینکے اور راجپوتی کھڑکی دار پگڑیاں پہن لیں۔ ظلِ سبحانی ماتھے پہ تلک لگائے فتح پور سیکری کے عبادت خانے میں بیٹھے فیضی سے فارسی رامائن کا پاٹ سُن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پنڈتوں اور ملاؤں کے مناظرے میں وہ شوروغوغا ہوا کہ یوں لگتا تھا جیسے مست خچر بھڑوں کے چھتے چبا رہے ہیں۔ اکبرِاعظم مذہب سے اتنا مایوس اور بیزار ہوا کہ ایک نیا مذہب ایجاد کر ڈالا۔ وہ اپنی رعایا کو جلد از جلد خوش اور رام کرنے کی غرض سے بھی اپنے آبائی دین سے بیزاری اور لاتعلقی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بایں جاہ و حشم و شریعت سے برگشتہ، ملاؤں سے مایوس اور اپنی رعیّت کی اکثریت سے خوف زدہ تھا۔ رفتہ رفتہ دیں پناہ کو

اپنے غارِ ہر اس پر غارِ حرا کا گمان ہونے لگا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا[1] جس پر اس کی اپنی ملکہ جودھا بائی اور ملّا دوپیازہ تک ایمان نہ لائے۔ اُس نے سب کو خوش کرنے لیے سب مذاہب کا ایک کاک ٹیل بنایا جسے سب نے اسی بنا پر ٹھکرا دیا۔

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

2۔ پھر دیکھا کہ سمندِ شب رنگ کی ننگی پیٹھ پر شباشب منزلیں مارنے اور ملکوں ملکوں جھنڈا گاڑنے والے مغل سورما اب جمنا کنارے راجپوتی طرز کے درشن جھروکے میں اور لال عماری اور پچ رنگ مستک والے فیلِ گراں ڈیل پر براجمان نظر آتے ہیں۔ لُو کے تھپیڑوں نے فرغانہ کے فرغل اُتروا دیے۔ ململ کے ہوادار انگرکھوں نے زرّہ بکتر کی جگہ لے لی۔ رفتہ رفتہ فاتحین نے اپنی مادری زبانیں عربی، ترکی اور فارسی ترک کر کے ایک نئی زبان اُردو وضع کی جو ابتداً خود ان کے لیے بھی اتنی ہی بدیسی اور اجنبی تھی جتنی ہندوؤں کے لیے فارسی یا

---

[1] اسلام کے پانچ ارکان ہیں۔ دینِ الٰہی میں اخلاصِ چار گانہ کی شمولیت کی شرط تھی۔ یعنی ترکِ ال، ترکِ جان، ترکِ دین اور ترکِ ناموس۔ اس دین میں پانچواں رکن اس لیے نہیں تھا کہ چوتھے یعنی ترکِ ناموس کے بعد کچھ رہ نہیں جاتا۔

ترکی۔ مکمل عسکری فتح کے بعد حکمران قوم نے اپنی اصل زبان سے دست بردار ہو کر خوش دلی سے ایک نوع کی ثقافتی شکست مان لی، تاکہ ہارنے والے یہ نہ سمجھیں کہ وہ اپنے سکّے کے ساتھ اپنی مادری زبان بھی مستقلاً رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مسجدوں اور خانقاہوں کے دروازوں اور محرابوں پر ہندوؤں کے مقدّس پھول ۔۔۔ کنول سے منبت کاری ہونے لگی۔ معرکہ آراؤں کی محفلوں میں تاجکستانی رقص کا وفور و خروش اور سمرقند و بخارا کے شعلہ ور گلو نغمے پھر کبھی سُنائی نہ دیے کہ وقت نے لَے ہی نہیں، نَے و نغمہ بھی بدل کے رکھ دیے۔ ماورائے ہند کے صاحبِ کمال رامش گر اور اقصائے فارس کے نادر نوازندگان سبک دست اپنے بربط و چنگ و رباب بغلوں میں دبائے مدّتیں گزریں رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے پر نہ آسمان رویا نہ ہمالیہ کی چھاتی شق ہوئی کہ ان کے قدردانوں نے اب ستار، سارنگی اور مردنگ پر ہندی راگ راگنیوں سے دلوں کو گرمانا سیکھ لیا تھا۔

گنگا جمنی کام

3۔ لکھنے والی انگلی جو لکھتی چلی جاتی ہے، ثقافتی سمجھوتے کے مرقع کا ایک اور ورق پلٹ کر دکھاتی ہے۔ دریائے گومتی کے روپ کنارے رہس کا رسیا، اودھ کا

آخری تاجدار پیروں میں گھنگرو باندھے اسٹیج پر اپنی ہی بنائی ہوئی ہندی دُھن پر نرت بھاؤ بتا رہا ہے۔ ایک ورق اور پلٹئے تو جمنا کنارے ایک اور ہی منظر نگاہ کے سامنے آتا ہے چند متّقی، پرہیز گار اور باریش بزرگ مسند کی ٹیک لگائے اسبابِ زوالِ امّت، احیائے دین اور ضرورتِ جہاد پر عربی اور فارسی میں رسالے تحریر کر رہے ہیں، لیکن جب سلام کرنا ہو تو دہرے ہو ہو کر ایک دوسرے کو کورنش، آداب و تسلیمات، بندگی اور مجرا بجالاتے ہیں۔ السّلام و علیکم کہنے سے احتراز کرتے ہیں کہ یہ رواج (جو بارہ سو سال سے مسلمانوں کا شعار اسی طرح رہا تھا جیسے "شلوم" امّتِ موسوی کی یا "جے رام جی کی" اور "نمسکار" اہلِ ہنود کی پہچان رہی ہے) اب بالکل متروک ہو چکا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ خانوادے نے بھی السّلام و علیکم کہنا ترک کر دیا۔ مؤلف امیر الروایات لکھتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے لوگ جب سلام کرتے تھے تو کہتے تھے عبد القادر[1] تسلیمات عرض کرتا ہے۔ رفیع الدین[2] تسلیمات عرض کرتا ہے۔ جب حضرت سیّد احمد بریلوی بیعت کے لیے حضرت

---

[1] حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمت اللہ علیہ۔

[2] حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمت اللہ علیہ۔

شاہ ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ پہلے شخص تھے جس نے اُنھیں السّلام وعلیکم کہا![1]

یہ سب ثقافتی سمجھوتے تسخیر و تالیفِ قلوب کی خاطر قرن بہ قرن ہوا کیے، مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ دل کو سمجھانے والی بات تھی۔ آداب عرض اور آہنگِ خسروی آنے والی رستاخیز میں کسی کی جان ومال کو۔۔۔۔۔ حتٰی کہ خود سمجھوتے کی زبان کو بھی۔۔۔۔ نہ بچا سکے۔ وقت نے ایسے تمام دل خوش کن اور آرائشی سمجھوتوں کو خونا بہ برد کر دیا۔ مخمل و کمخواب کے غلاف گرتی ہوئی دیواروں کو گرنے سے نہیں روک سکتے۔ چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ زبانِ یار تو قلم کر دی جائے، اخلاص و رواداری کا پرچم سرنگوں ہو جائے، مگر کلچر کا کام کار و فتح یاب ہو۔

بشارت اکثر کہتے ہیں کہ میں یہ کبھی نہیں بھولوں گا کہ پشاور کے ایک اَن پڑھ پٹھان کے طعنے نے چار پُشتوں کا پالا پوسا آداب چھڑوا دیا!

[1] حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ ان کے السّلام وعلیکم کہنے سے بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ آئندہ سلام بطریقِ مسنون کیا جائے۔ (امیر الروایات)

کراچی والے کسی چوزے کو مُرغا نہیں بننے دیتے

خان صاحب بحث کے دوران ہر بات اور ہر صورتِ حال کے عموماً دو سبب بتاتے تھے، جن میں سے ایک کی حیثیت محض پخ کی ہوتی تھی۔ مثلاً ایک دن بشارت نے شکایت کی "کراچی کی صُبح کیسی گدلی گدلی اور مضمحل ہوتی ہے۔ خود سورج کو نکلنے میں آلکسی آتی ہے۔ صُبح اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بدن ایسا دُکھتا ہے جیسے کسی باکسر نے رات بھر اس پر مشق کی ہو۔ میں کانپور میں مُرغ کی پہلی ہی اذان پر اس طرح اُٹھ بیٹھتا تھا گویا کسی نے اسپرنگ لگا دیا ہو"۔ خان صاحب اپنی بریدہ انگشتِ شہادت ان کے گھٹنے کی طرف اُٹھاتے ہوئے بولے کہ "اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ کراچی والے کسی چوزے کو مُرغا نہیں بننے دیتے۔ اذان دینے سے پہلے ہی اُس کا قصّہ تمام کر دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ آپ کے اسپرنگ کو گٹھیا ہو گئی ہے۔ چالیس دن تک دانہ میتھی کی بھجیا کھاؤ اور بوڑھے گھٹنے پر گودر (پنگھٹ) کے پودے کا لیپ لگاؤ۔ ہمارا پشتو شاعر کہہ گیا ہے کہ پنگھٹ کا ہر پودا دوا ہوتا ہے، کیوں کہ کنواریوں کے پلّو اسے چھوتے رہتے ہیں۔ میں تو جب بھی کراچی آتا ہوں، حیران پریشان رہتا ہوں۔ جس سے ملو، جس سے بولو، کراچی سے کچھ نہ کچھ گلہ ضرور رکھتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اپنے شہر پر فخر کرتا ہو۔

اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ یہاں فخر کے لائق کوئی چیز نہیں۔ دوسرا یہ کہ۔۔۔۔۔۔۔"۔

دیوارِ گریہ

دوسرا سبب بتانے کے لیے اُنھوں نے اپنی انگشتِ شہادت ابھی سُوئے فلک بلند کی ہی تھی کہ مرزا عبدالودود بیگ بیچ میں کود پڑے۔ کہنے لگے "صاحب! دوسرا سبب یہ کہ مہاجر، پنجابی، سندھی، بلوچ، پٹھان۔۔۔۔ سب اپنے رب کا فضل تلاش کرنے کے لیے یہاں آ آکر آباد ہوئے۔ کڑی دھوپ پڑ رہی تھی۔ سب کے سروں پر کراچی نے مادرِ مہربان کی طرح اپنی پھٹی پرانی چادر کا سائبان تان دیا۔ اُن پر بھی جو بسر کرنے کے لیے فقط ٹھیا ٹھکانہ مانگتے تھے۔ پھر پسرتے چلے گئے۔ لیکن سب شاکی، سب آزردہ خاطر، سب برہم۔ مہاجر ہی کو لیجیے۔ دلّی، لکھنؤ، بمبئی، بارہ بنکی، جوناگڑھ حد یہ کہ اُجاڑ جھجھنوں (جے پور۔ راقم الحروف کی طرف اشارہ) کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے۔ اسے یہ احسا نہیں کہ جنھیں یاد کر کر کے وہ خود پر دائمی رقّت طاری کیے رہتا ہے وہ چھوڑا ہوا شہر نہیں، بلکہ اُس کی رُوٹھی جوانی ہے جو لوٹ کر نہیں آسکتی۔ ارے صاحب! اصل رونا جغرافیہ کا نہیں جوانی اور بیتے سَمے کا ہے جو آبِ حیاتِ امروز میں زہر گھول دیتا ہے۔ پنجابی

جنھیں سب سے پہلے سر سیّد احمد خان نے "زندہ دلانِ پنجاب" کا لقب دیا تھا، جنّت میں پہنچ کر بھی "لہور لہور اے" پکاریں گے۔ نئیں ریساں شہر لہور دیاں۔ انھیں کراچی ذرا نہیں بھاتا۔ وہ سندھ کے چتی دار کیلے، چیکو اور پپیتے میں ملتان کے آم اور منٹگمری کے مالٹے کا مزہ نہ پا کر سچ مچ اُداس ہو جاتے ہیں۔ فرنٹیر کا گل زمان خان چوکیدار شیر شاہ کالونی کے جونگڑہ[1] میں اپنے وطن کے کوہ و دشت و دریا مانگتا ہے۔

کوئی نہیں جو اُٹھا لائے گھر میں صحرا کو

وہ صبح دلّی کی نہاری کھاتا ہے۔ سہ پہر کو سیٹھ کی کوٹھی کے ایک اوجھل کونے میں مکئی کے بے موسم پودے کو بڑے لاڈ سے پانی دیتا ہے۔

پردے وطن پہ ہر چا غم دی

ماپہ پردی وطن کرلی دی گلونہ[2]

[1] جونگڑہ (پشتو) جھونپڑی۔ جھگی

[2] مطلب یہ کہ یوں تو پردیس میں ہر شخص غمگین ہوتا ہے، مگر مجھے دیکھو کہ میں نے پرائی زمین میں اپنے پھول کھلا دیے ہیں۔

وہ دن بھر پشتو لہجے میں بمبئیا اُردُو بولنے کے بعد شام کو ٹرانزسٹر پر پشتو گانوں سے دل پشوری کرتا ہے اور رات کو پشاور ریلوے اسٹیشن کو آنکھوں میں بھر کے سڑک کے کنارے جھگی میں سو جاتا ہے۔ سڑک پر رات بھر پٹاخے چھوڑتی موٹر سائیکل رکشائیں اور دھڑ دھڑاتے ٹرک گزرتے رہتے ہیں۔ پر اسے خواب میں ڈھول سُرنا اور رباب گھڑے پر ٹپّے سُنائی دیتے ہیں۔ ادھر کوئٹہ اور زیارت سے آیا ہوا بلوچ کراچی کا نیلا سمندر دیکھتا ہے اور بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں اور ان فربہ دُنبوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتا ہے جن کے وہ بڑے خستہ سجی کباب بنا سکتا تھا۔ اب رہا پرانا سندھی، تو وہ غریب اُس زمانے کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے جب یہ چاروں حضرات کراچی تشریف نہیں لائے تھے“۔

اس مرحلے پر بھی آخری کیل خان صاحب ہی نے ٹھونکی۔ کہنے لگے، خا! اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ شیخ سعدی کہہ گئے ہیں کہ جس گاؤں کا ہر باشندہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کسی دوسرے گاؤں کی یاد میں تڑپتا رہے، اُس گاؤں کا خانہ خراب ہووے ہی ہووے۔ ہمارے ”ملک“ میں اگر کوئی دوسری شادی کے بعد اپنے پہلے خاوند کو اس طرح یاد کرے تو دوسرا خاوند دونوں کی ناک کاٹ کے ایک دوسرے کی ہتھیلی پہ رکھ دے گا۔ ملّا کرم علی کہتا تھا کہ جو عورت اپنے پہلے

خاوند کو بہت یاد کرے اُسے حنانہ کہتے ہیں۔ ایسی عورت کے دوسرے خاوند کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔

خان صاحب دقیق مسائل اور زندگی کی گتھیوں کو کبھی کبھی اپنی ناخواندہ سوجھ بوجھ سے اس طرح پانی کر دیتے:

کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی توں ہی دھری رہی

اصولوں کے مُرغے اور جنگِ زرگری

معاف کیجئے بیچ میں یہ صفحہ ہائے معترضہ آن پڑے۔ لیکن ان سے فریقین کا مزاج اور قضیے کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہو گی جو اب اتنا طول کھینچ گیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے دلائل کا آموختہ سُناتے ہوئے کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔ اب یہ کوئی معمولی کاروباری جھگڑا نہیں رہا تھا۔ دونوں فریق اپنے اپنے اصولوں کو منطق کی پالی میں مُرغوں کی طرح لڑا رہے تھے۔ اس شرط کے ساتھ کہ جس کا مُرغا جیت جائے گا اُسے ذبح کر کے دونوں مل کے کھائیں گے یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ خان صاحب اکثر فرماتے تھے کہ ہارا ہوا مُرغا کھانے سے آدمی اتنا بودا ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ہر بات درست معلوم ہونے لگتی

ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ خان صاحب محض تفننِ طبع اور خوش وقتی کے لیے معاملے کو طول دے رہے ہیں، وگرنہ وہ سیر چشم، دوست نواز، وسیع القلب اور فراخ دست آدمی تھے۔ بشارت کو اس کا بخوبی احساس تھا۔ اور اس کا بھی کہ خان صاحب انھیں جی جان سے چاہتے ہیں اور ان کی بذلہ سنجی سے بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔ دو سال قبل بھی وہ بشارت سے پشاور میں کہہ چکے تھے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو سامنے بٹھا کر اسی طرح مہینوں آپ کی باتیں سنتا رہوں۔ بشارت خود بھی خان صاحب کے گرویدہ تھے۔ دہکتے سرخ انگارہ فولاد سے چنگاریاں اُڑتی دیکھنے میں انھیں بہت مزہ آتا تھا۔

ایک طرف تو خان صاحب کی حساب فہمی کی یہ انتہا کہ ایک پائی چھوڑنے میں ان کی پختو پر حرف آتا تھا۔ دوسری طرف محبّت و پاس داری کا یہ عالم کہ جہاں بشارت کا پسینہ گرے وہاں اُن کے دُشمن کا خون بہانے کے لیے تیار۔ بشارت کی دُکان سے ایک ایکسائز انسپکٹر چار سال قبل دس ہزار روپے کی لکڑی اُدھار لے گیا اور ہنوز رقم دبائے بیٹھا تھا۔ تین سال ہوئے ایک پرونوٹ (تمسک) لکھ دیا تھا۔ مگر اب کہتا تھا کہ جاؤ نہیں دیتے۔ نالش کر کے دیکھ لو۔ پرونوٹ کبھی کا خارج المعیاد ہو چکا۔ بشارت نے منجملہ اپنی اور پریشانیوں کے اس نقصان کا بھی ذکر کیا۔ دوسرے دن شام کو بعد مغرب خان صاحب اپنے پچیس تیس کمانڈو کی

نفری لے کر اُس کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھٹکھایا۔ انسپکٹر نے کھولا اور سببِ نزول دریافت کیا تو خان صاحب نے کہا کہ ہم وہ کھڑکی دروازے اُکھاڑ کر لے جانے کے لیے آئے ہیں جن میں ہمارے بشارت بھائی کی لکڑی استعمال ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے ایک ہی جھٹکے سے دروازے کو قبضے، اسکرو اور ہینڈل سمیت اُکھاڑ کر اس طرح بغل میں دبا لیا جیسے مکتب کے بھگوڑے لڑکے تختی بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ دیوار پر سے انسپکٹر کے دادا مرحوم کا فوٹو جس کے بارے میں اُنھیں شبہ گزرا کہ اس فریم میں وہی لکڑی استعمال ہوئی ہے، کیل سمیت نوچ کر اپنے ایک لیفٹیننٹ کو تھما دیا۔ انسپکٹر ایک گھاگ تھا۔ موقعے کی نزاکت سمجھ گیا۔ کہنے لگا، خان صاحب! بندہ ایک معروضہ گوش گزار کرنا چاہتا ہے۔ خان صاحب بولے، زہ پرہ![1] اب وہ کسی خرگوش کے گوش گزار کرنا۔۔۔ معروضہ شعروضہ کبھی کا خارج المعیاد ہو چکا۔ بھرا ہوا پیٹ فارسیاں بولتا ہے۔ ہوش میں آؤ۔ رقم نکالو۔

رات کے بارہ بجنے میں ابھی چار پانچ منٹ باقی تھے کہ خان صاحب نے دس ہزار کے نئے نوٹوں کی دس گڈیاں لا کر بشارت کے حوالے کر دیں۔ ان میں سے

---

[1] زہ پرہ (پشتو) چھوڑو بھی یار گولی مارو

سات پر ولیکا ٹیکسٹائل ملز کی مہر تھی جو اس انسپکٹر کے حلقۂ رشوت ستانی میں پڑتا تھا۔ یہی نہیں، اُنھوں نے اس سے اپنے پہلوان کمانڈوز کی رکشاؤں کا کرایہ اور دودھ کے پیسے بھی بحساب ایک سیر فی کس وصول کر لیے۔

خان صاحب گھر والوں میں ایسے گھل مل گئے کہ اکثر شام کو بچّوں کے لیے جو انھیں چچا کہنے لگے تھے، مٹھائی، کپڑے اور کھلونے لے کر جاتے۔ سب سے چھوٹے کو بہلانے کے لیے، پلنگ پر چت لیٹ جاتے اور پیٹ کو دھونکنی کی طرح پھلا اور پچکا کر اس پر بچّے کو اُچھالتے۔ پڑوس کے بچّے انھیں دیکھتے ہی ان کے پیٹ کے لیے مچلنے لگتے اور ماؤں کے سر ہو جاتے۔ خان صاحب نے اب بشارت کے ساتھ ان کے رشتے داروں کی شادی بیاہ، غمی اور سالگرہ کی تقریبوں میں بھی جانا شروع کر دیا۔ لیکن بشارت نے کچھ عرصے بعد اس سلسلے کو یکلخت بند کر دیا، اس لیے کہ انھیں خارجی ذرائع سے معلوم ہوا کہ ان کے (بشارت کے) رشتے داروں کی تمام تر ہمدردیاں خان صاحب کے ساتھ ہیں! اور ایک دن تو وہ یہ سُن کر بھونچکے رہ گئے کہ ایک ایسے شرّی رشتے دار نے خان صاحب کو بالا بالا مدعو کیا ہے، جس سے ایک عرصے سے بشارت کے تعلقات کشیدہ بلکہ منقطع تھے۔

بشارت کو کسی مخبر نے یہ بھی خبر دی کہ خان صاحب دو تین دفعہ چوری چھپے تھانے بھی جا چکے ہیں۔ اور ایس ایچ او کو قراقلی ٹوپی، ایک بوری اخروٹ، اصلی شہد اور درّے کے بنے ہوئے بغیر لائسنس کے ریوالور کا تحفہ بھی دے آئے ہیں! وہ گھبرائے۔ اب یہ کوئی نیا پھڈا ہے۔ اس کے بھی دو سبب ہو سکتے ہیں اُنھوں نے سوچا۔

روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

خان صاحب نے اب خود شیو کرنا اور شلوار میں کمربند ڈالنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جیسا ہم پہلے کہیں بیان کر چکے ہیں، خلیفہ سائیسی، کوچوانی، ڈرائیوری، کھانا پکانا، بیرا گیری، حجامت، باغبانی، پلمبنگ۔۔۔۔۔ یہ کہیے کیا نہیں آتا تھا۔ اس فن میں بھی طاق تھا جو ان سب سے فائدہ مند ہے۔۔۔ مصاحبی اور خوشامد۔ جب سب ضمنی دھندے ٹھپ ہو جاتے تو خلیفہ اپنے بنیادی پیشے کی طرف رجوع کرتا۔ اپنے بیٹے کو جو آبائی پیشے سے متنفر و محجوب تھا، اکثر نصیحت کرتا تھا کہ بیٹا حجّام کبھی بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ حجّام کی ضرورت ساری دنیا کو رہے گی۔ تاوقتے کہ ساری دنیا سِکھ مذہب اختیار نہ کرلے! اور سِکھ یہ کبھی نہیں ہونے دیں گے۔ خلیفہ دن رات خان صاحب کی خدمت میں جُتا رہتا۔ شام کو ان کے دوستوں کا غول

کوہستانی ڈیرے ڈالتا تو لپک جھپک اندر سے قہوہ اور چلّم بھر بھر کے لاتا۔ ایک دفعہ اپنے گھر سے چار اصیل مُرغوں کی۔ جنھوں نے اذان دینی نئی نئی سیکھی تھی، بریانی بنا کر لایا۔ اُن کے متعلق اُس کا دعویٰ تھا کہ جب یہ پٹھے علی الصبح گردن پُھلا پُھلا کر اذان دیتے تو سارے محلّے کی مرغیاں بے قرار ہو کر باہر نکل پڑتی تھیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ جب وہ گورنر جنرل ہاؤس میں مالی کے عہدے پر فائز تھا تو اُس نے اپنی آنکھوں سے خواجہ ناظم الدین کو متوفّین کے والد کا روسٹ کھاتے دیکھا۔ پرائم منسٹر محمّد علی بوگرہ نے عالیہ سے (دوسری) شادی کے بعد متوفّی مُرغ کی سوگوار بیوگان کے انڈوں کا مقوی حلوہ بنا کر نوش کیا۔ ایک دن کوہاٹ کی اراضی کا ایک تنازع طے ہونے کی خوشی میں وہ فریقین کے لیے مسلّم بھیڑ روسٹ کر کے لایا۔ ثبوت میں بکرے کی کٹی ہوئی دُم بھی اُٹھا لایا تا کہ خان صاحب کو شبہ نہ گزرے کہ بکرے کی بجائے سستی بھیڑ بھون کے بھیڑ دی (اس رعایتِ لفظی پر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا) خان صاحب اُسے دیکھتے ہی بولے کہ اتنی چھوٹی ران والے بکرے کی اتنی بڑی دُم نہیں ہو سکتی! دُم کے اس پہلو پر خلیفہ کی نظر نہیں گئی تھی۔ چنانچہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر خان صاحب کے گھٹنے پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر ٹانگ دبانے لگا۔ اُنھوں

نے یہ کہہ کر چھُڑائی کہ بد بخت! گھٹنا پکڑتے پکڑتے اب میری ران کیوں ٹٹول رہا ہے؟

خان صاحب کو خلیفہ کے پکائے ہوئے کھانوں سے زیادہ اُس کی لچھے دار باتوں میں آتا تھا۔ فرماتے تھے، جس بات کو کہنے والا اور سُننے والا دونوں ہی جھوٹ سمجھیں، اُس کا گناہ نہیں ہوتا۔ وہ اس کی شیخی کو بڑھاوا دیتے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن، اُن کے تلوؤں پر روغنِ بادام کی مالش کرتا۔ کہتا تھا، اس سے دماغ کو تر واٹ پہنچتی ہے۔ ایک دن اچانک خان صاحب کو کچھ خیال آگیا۔ کہنے لگے، کیا تیرے خیال میں میرا مغز میرے تلوؤں میں اُتر آیا ہے؟ لیکن خلیفہ ٹھیک ہی کہتا تھا، اس لیے کہ سات آٹھ منٹ بعد ہی خان صاحب ریوالور تکیے کے نیچے رکھے، زور زور سے خرّوٹے لینے لگتے۔ ہر تین چار منٹ بعد چونکتے اور خرّاٹوں میں نیا سُر لگا کر پھر سے سو جاتے۔ ایک دن وہ بڑے اونچے سُر میں خرّاٹے لے رہے تھے کہ پیر دباتے دباتے خلیفہ کا ہاتھ نہ جانے کیوں اُن کی واسکٹ کی جیب پر پڑ گیا۔ آنکھیں کھولے بغیر کہنے لگے کہ بد بخت! نقدی تو میرے کوٹ کی جیب میں ہے!

دراصل وہ اُن کے منہ لگ گیا تھا۔ خدمت گار، درباری، چلّم بھرنے والا، حجّام، داستان گو، میر مطبخ، اردلی، گائیڈ، مخبر، مشیر۔۔۔۔۔وہ اُن کا سبھی کچھ تھا۔ تین چار دن سے آپس میں نہ جانے کیا مسکوٹ ہو رہی تھی۔ روزانہ شام کو بھی کسی نہ کسی بہانے سے بشارت کے ہاں آجاتا۔ ان کی بیگم نے دو تین دفعہ کہا کہ اس کا آنا مصلحت اور نحوست سے خالی نہیں۔

آدم خور شیر کو پہچاننے کی آسان ترکیب

ایک دن صبح اُٹھتے ہی خان صاحب نے اچانک یہ تجویز پیش کی کہ اب تک جو رقم آپ نے دی ہے اسی منہا کرنے کے بعد جو رقم واجب الادا بنتی ہے اس کے عوض یہ گاڑی جو عرصۂ دراز سے بیکار کھڑی ہے مجھے دے دیجیے۔ بشارت نے کہا، لکڑی کی اصل مالیت کسی طرض سات ہزار سے زائد نہیں، جبکہ اس گاڑی کی قیمت، مع نئی باڈی اور نئے پرزوں کے کسی طرح نو ہزار سے کم نہیں۔ مزید برآں جس انگریز کی سواری میں یہ رہتی تھی اُسے سر کا خطاب ملنے والا تھا۔ خان صاحب نے جواب دیا، آپ کی گاڑی بہت سے بہت پانچ ہزار کی ہو گی، جبکہ میری لکڑی نو ہزار کی تھی۔ آپ نے تو پٹرول اور پنکچر جوڑنے کا تمام خرچہ، خلیفہ کی تنخواہ اور اُس کی زوجہ کا دین مہر بھی کار کی قیمت میں جوڑ دیا۔ بہت کچھ

بحثا بحثی اور "گھڑ سودے بازی" کے بعد واجب الادار قم کا فرق گھٹ کر وہیں آ گیا جہاں سے قضیہ شروع ہوا تھا۔ یعنی ۳۔۹۔۲۵۱۳ اب خان صاحب اس کلیم کے عوض یہ گاڑی چاہتے تھے۔

"خان صاحب آپ بزنس کر رہے ہیں یا بارٹر (birter) "بشارت نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"یہ کیا ہوتا ہے صیب؟"

"وہی جو آپ کرنا چاہتے ہیں"۔

"پشتو میں اس کے لیے بہت برا لفظ ہے"۔

وہ جب پشتو کا حوالہ دے دیں تو پھر کسی کی ہمّت نہیں ہوتی تھی کہ اصل یا ترجمے کی فرمائش کرے۔ اکثر فرماتے تھے کہ پشتو منّت و زاری اور فریاد وفغاں کی زبان نہیں۔ نر آدمی کی للکار ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ڈنکے کی چوٹ پر بات کرنے، کچھار میں غافل سوتے ہوئے شیر کی مونچھیں پکڑ کر جگانے اور پھر اس سے ڈائیلاگ بولنے کی زبان ہے۔ مرزا اُس زمانے میں کہتے تھے کہ خان صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جو شیر کی مونچھیں اُکھاڑنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُس

کے منہ میں اپنا سر دے کر یہ علمی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ویجی ٹیرین ہے یا آدم خورا۔

"وٹّہ سٹّہ"

بشارت نے خان صاحب کی آسانی کے لیے بارٹر کہ تبادلۂ جنس کہنا شروع کر دیا۔ پھر اس کا مفہوم سمجھایا۔ طول طویل تشریح سُن کر بولے "یارا جی! تو پھر سیدھا سیدھا وٹّہ سٹّہ کیوں نہیں کہتے جس میں ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہا"۔

اور یہی بھونڈی مثال برہانِ قاطع ثابت ہوئی۔ اسی پر تصفیہ ہو گیا۔ خان صاحب نے بڑی بڑی خوشی اور فخر سے اعلان کیا کہ وہ "جنسی تبادلے" کے لیے تیار ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور اس طرح گلے ملے جس طرح دو دکھیارے ملتے ہیں جو ایک دوسرے کے بہنوئی بھی ہوتے ہیں۔ اور سالے بھی۔

لیکن بشارت دل ہی دل میں خوش تھے کہ کھٹارا گاڑی سات ہزار میں بک گئی۔ خان صاحب اب سے بھی زیادہ خوش کہ دلدز لکڑی کے عوض نو ہزار کی کار ہتھیالی۔ دونوں فریق اس صورتِ حال کو حق کی فتح سمجھ رہے تھے، حالانکہ ہم

سے دل کی بات پوچھیں تو باطل نے باطل کو پچھاڑا تھا۔ اور کوڑے کرکٹ کا تبادلہ کوڑے کرکٹ سے ہوا تھا۔ خان صاحب کار کو چمکارتے ہوئے کہنے لگے ”ہم اس کو طورخم لنڈی کوتل کا سیر کرائے گا۔ اخروٹ کے درخت کے سائے میں کھڑا کرے گا۔ اس میں کابل سے قراقلی، قالین اور چلغوزے بھر کے لائے گا۔ کابل کے شمال کے ایک چلغوزے میں، ایمان سے، نکاح کے دس چھوہاروں کے برابر طاقت ہوتا ہے!“

تصفیہ ہوتے ہی خان صاحب نے تازہ تازی سیکھی ہوئی لکھنوی اُردو اور کانپوری لہجے کے شکنجے سے خود کو ایک ہی جھٹکے میں آزاد کرالیا۔ چرب زبان دشمن پر فتح پانے کے بعد ”کیموفلاژ“ کی ضرورت نہ رہی۔

ازبس کہ خان صاحب کے نزدیک مشکی سے بہتر دنیا بلکہ پل صراط پر بھی کوئی سواری نہیں ہو سکتی تھی، وہ اس کار کو جو اب اُن کی ہو چکی تھی، مشکی کہنے لگے تھے۔

تاریخِ بالو شاہی

بشارت نے چوری چھپے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ مگر خان صاحب سے اپنی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ وہ ہرچند رائے روڈ پر سے گزرتے ہوئے تانگوں کے گھوڑں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ یہ لمحہ غلبہ و نصرت کا تھا۔ دشمن کے گھر کے چوگرد گھوڑے پر شہ گام[1] نکلنے کی گھڑی تھی۔ ضبط نہ ہو سکا تو سرِ دست مشکی کے زانو یعنی کار کے مڈ گارڈ کو تھپتھپا کر دل کے حوصلے نکالے۔ انجن کی تھوتھنی پر ہاتھ رکھ کر شاباشی دی۔ اُن کا بس چلتا تو اُسے گھاس دانہ کھلا کر اپنے ہاتھ سے کھریرا کرتے۔ کچھ دیر بعد جیسے ہی ایک تانگے والے نے اسپنسر آئی ہسپتال کے سامنے درخت کے سائے میں گھوڑا کھولا، وہ لپک کر اُس پر جا چڑھے۔ اور بشارت کی دکان کے دو چکر لگائے۔ پھر

---

[1] شہ گام: بھٹی مختار مسعود صاحب نے کہ صاحبِ طرز انشا پرواز ہونے کے علاوہ شہ سواری میں بھی پائے طولی رکھتے ہیں، ہمیں بتایا کہ یہ وہ باوقار اور cerermonial چال ہے جو گھوڑا اُس وقت چلتا ہے جب بادشا اس پر سوار ہو۔ پیٹ کا (بادشاہ کے) پانی نہیں ملنے پاتا۔ ہمارے جن نوجوان پڑھنے والوں نے کبھی کوئی بادشاہ، شاہی گھوڑا یا خود جناب مختار مسعود کی چال نہیں دیکھی وہ "آواز دوست" میں ان کے الوب قلم کا طرزِ خرام ملاحظہ فرمائیں۔ اس پر سوار لیلِ معنی کے پیٹ کا پانی نہیں ہلنے دیتے۔ البتہ قاری گھنٹوں ہلتا رہتا ہے

بشارت ہی سے ٹھنڈا پانی منگوایا اور سر پر اس کے تریڑوں کے بعد سات سیر بالو شاہی منگوا کر تقسیم کی۔ بشارت کے تین رشتے داروں کے حصّے لگا کر خود پہنچوائے۔ بشارت دنگ رہ گئے۔ حد ہو گئی۔ انتہائی بد گُمانی کے عالم میں بھی انھیں کبھی ان تینوں پر شبہ نہیں گزرا تھا ایسے متفنّی اور منافق نکلیں گے۔ در پردہ خان صاحب سے مل جائیں گے۔ بہر کیف بالو شاہی کے ذریعے منافقت کا بھانڈا پھوٹنے کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی۔ ہمارا مطلب ہے بالو شاہیوں کی تاریخ میں!

نیاز مندانِ بنّوں نے رائفلیں چلا چلا کر اعلانِ صلح کیا۔ ایک پڑوسی دکاندار دوڑا دوڑا بشارت کو مبارک باد دینے آیا۔ وہ یہ سمجھا کہ ان کے ہاں ایک اور بیٹا ہوا ہے۔

ایک ٹرک ڈرائیور سے جو دکان پر پڑتل لکڑی کی ڈلیوری لینے آیا تھا، خان صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ ذرا ہمیں ہماری کار میں گوردھن داس مارکیٹ تک سیر تو کروادو۔ تمھارے چائے پانی کا بندوبست ہو جائے گا۔ کچھ دیر بعد لوٹے تو کار کی کارکردگی سے بے انتہا خوش تھے۔ کہنے لگے خدا کی قسم! بالکل والد کے مشکی کی طرح ہے!

ایک پینٹر کو بلا کر راتوں رات کار پر سیاہ اسپرے پینٹ کروایا تا کہ عادات کے علاوہ شکلاً بھی مشکی سے مشابہت مکمل ہو جائے۔

"Et, tu, Brute!"

دوسرے دن بشارت دکان کے شٹر بند کروا رہے تھے کہ سامنے ایک ٹرک آکر رکا جس میں ڈرائیور کے پہلو میں تھانے کے منشی جی بیٹھے تھے اور پیچھے ان کی چوری شدہ لکڑی کے علاوہ رشوت میں پیش کردہ لکڑی بھی لدی تھی۔ تختوں پر وہی رائفل بردار کانسٹیبل ٹنگا تھا۔ خان صاحب نے ایک ڈی ایس پی کے توسط سے جو بنّوں کا رہنے والا، ان کا گرائیں تھا، نہ صرف سارا مال شیر کے منہ سے نکلوا لیا تھا بلکہ اُس کے دانت بھی تبرکاً نکال لائے تھے۔ ٹرک کے پیچھے پیچھے ایک ٹیکسی میں (جو شارع عام پر اپنی عقب میں مقررہ مقدار سے زیادہ دھواں خارج کرنے کی بنا پر ابھی ابھی پکڑی گئی تھی) وکیل صاحب پہنچے، تاکہ باہمی صلح صفائی ہو جائے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر وہی ملزم نما موکل ایک ہاتھ میں ان کا بریف کیس تھامے اور دوسرے میں قانون کی کتابیں اُٹھائے پیچھے چل رہا تھا۔ وکیل صاحب کے ہاتھ میں مٹھائی کے دو ڈبّے

تھے۔ ایک خان صاحب کو پیش کیا اور دوسرے کے بارے میں بشارت سے فرمایا کہ میری جانب سے بھابی اور بچّوں کو دے دیجیے گا۔

تھانے کے منشی جی نے پوچھا ہمارا خلیفہ کہاں ہے؟ بشارت کو یہ معلوم کر کے بڑا شاک ہوا کہ پولیس لاک اپ میں رات گزارنے کے بعد سے خلیفہ مہینے دو بار تھانے جاتا رہا ہے۔ اور ایس ایچ او سے کر زیرِ حراست ملزموں تک کی حجامت بناتا رہا ہے! تھانے کے اسٹاف میں یا کسی حوالاتی ملزم کے ہاں مستقبلِ قریب یا بعید میں ولادت ہونے والی ہو، یا تھانے کے نواحی علاقے کی جھگیوں میں کوئی عورت بھاری قدموں سے چھلتی ہوئی نظر آجائے تو اُس سے پکّا وعدہ کر لیتا کہ اگر لڑکا ہوا تو ختنے میں کروں گا۔ اس کے والد مرحوم کی وصّیت تھی کہ بیٹا اگر تم بادشاہ بھی بن جاؤ تو اپنے آبائی پیشے کو نہ چھوڑنا۔ دوم جس کسی سے ملو اس کو ہمیشہ کے لیے اپنا کر رکھو یا اُس کے ہو رہو۔ سو وہ غریب سب کا ہو رہا۔

خان صاحب رات کے دو بجے تک قرضوں اور ”پولا“ توڑ کر کھیتوں کو پانی دینے کے سرسری مقدّمات، جن میں گالی گلوچ کی آمیزش سے پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، نمٹاتے رہے۔ اثنائے سماعت و انفصالِ مقدّمات میں لوگ جوق در جوق ان کو خدا حافظ کہنے آتے رہے۔ عدالت ہر ایک کو میلمہ راغلے پخیر کہہ کر چائے،

چلّم، چلغوزے اور بالو شاہی سے تواضع کرتی رہی۔ صبح چار بجے سے خان صاحب نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ فجر کی اذان کے بعد ایک اصیل مُرغ کو قبلہ رو کر کے قربانی کی۔ اُس کا سر بلّی اور باقیات گھر والوں کو ناشتے پر کھلائیں۔ دل خود چبایا۔ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کسی بڑے موذی پر فتح حاصل ہو تو ہمارے قبیلے کا دستور ہے کہ گائے ذبح کرتے ہیں۔ دشمن گیا گزرا ہو تو دُنبے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ناشتے پر ہی اعلان کیا کہ مشکی، مال گاڑی سے نہیں جائے گی بلکہ میں اسے پنجاب کی سیر کراتا، دریاؤں کا پانی پلاتا، "بائی روڈ" لے کر جاؤں گا۔ بچّے ان کے جانے سے بہت اُداس تھے۔ اُنھوں نے خود بھی اقرار کیا کہ میرا بھی جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں، لکڑی کا کاروبار وہیں ہے۔ اگر کراچی میں جنگلات ہوتے تو خدا کی قسم تم لوگوں کو چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا۔ پھر اُنھوں نے ڈھارس بندھائی کہ انشاءاللہ دو مہینے بعد پھر آؤں گا۔ ایک بوہری سیٹھ سے وصولی کرنی ہے۔ اکیلا آدمی ہوں۔ ایک وقت میں ایک ہی بے ایمان سے نمٹ سکتا ہوں۔

بشارت کو مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرا دیے۔ ارشاد فرمایا، کراچی میں اُدھار پر بزنس بیوپار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کماد (گنّے) کے کھیت میں کبڈّی کھیلنا، جتنا بڑا شہر

ہو گا اُتنا ہی بڑا گھپلا اور پھڈّا ہو گا۔ جس کی چھت زیادہ بڑی ہے اُس پر برف بھی زیادہ گرے گی۔

پھر سب سے چھوٹے بچّے کو بہلانے کے لیے چارپائی پر لیٹ گئے۔

چلتے وقت اُنھوں نے بشارت کی بیٹی منیزہ کو جو اُن کی چہیتی ہو گئی تھی پانچ سو روپے دیے۔ یہ اُس کی پانچویں سالگرہ کا تحفہ تھا جو آٹھ دن بعد منائی جانے والی تھی۔

۳۔۹۔۳۷ روپے نوکروں میں تقسیم کیے۔ اس سے قبل، گزشتہ شب وہ ایک پٹھان نوجوان گل داؤد خان کو دو ہزار روپے دے چکے تھے تاکہ وہ اپنے چچا پر جس نے اُس کی زمینوں پر قبضہ غاصبانہ کر رکھا تھا کوہاٹ جا کر فوجداری مقدّمہ دائر کرے اور اس دلّے کو یتیموں کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی ایسی سزا دلوائے کہ سب چچاؤں کو عبرت ہو۔ ان تینوں رقموں کا حاصل جمع ۳۔۹۔۳۷۵۲ بنتا ہے۔ اور یہی وہ رقم تھی جس کا سارا جھگڑا تھا اور جس کی وصولی کے لیے اُنھوں نے اپنے کمانڈوز اور بہیر و بنگاہ سمیت لشکر کشی کی تھی۔ بلکہ بقول مرزا، غنیم کے قلعے کے قلب میں تمبو تان کر بھنگڑا ڈال رکھا تھا۔

اس قضیے کو تیس سال پونے کو آئے۔ ہماری ساری عمر حساب کتاب، میں ہی گزری ہے۔ مگر ہم آج بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ درحقیقت کس کی کس پر کتنی رقم نکلتی تھی اور آخر میں جیت کس کی رہی۔ ہماری ہی سمجھ کا قصور تھا۔ جنھیں ہم حریف سمجھے، وہ دراصل حلیف اور دوست نکلے اور۔۔۔ حسابِ دوستاں درِ دل۔[1]

خان صاحب نوکروں کو دے دلا کر بشارت کے والد کو خدا حافظ کہہ رہے تھے کہ بشارت کیا دیکھتا ہے کہ ٹھیک نو بجے ایک شخص چلا آ رہا ہے جس کا صرف چہرہ خلیفہ سے ملتا ہے۔ تنگ موری کے پاجامے، ململ کے کُرتے اور مخمل کی ٹوپی کی بجائے ملیشیا کی شلوار اور کُرتا۔ سر پر زری کی کلاہ پر مشہدی پگڑی، کامدار واسکٹ۔ پیر میں ٹائر کے تلے والی پشاوری چپل۔ واسکٹ اور کلاہ بالترتیب تین سائز بڑی اور چھوٹی تھی۔ کوٹ کی آستین پر امام ضامن۔ ہاتھ میں بلبن[2] گھوڑے کی لگام۔ خان صاحب نے مطلع کیا کہ بلبن بھی ایک ٹرک میں بنّوں جا

[1] مرزا عبدالودود بیگ کہ دوستوں کو قرض دے دے کر رقم اور دوست دونوں سے بار بار ہاتھ دھو چکے ہیں۔ قدرے تصرّف کے ساتھ حسابِ دوستاں دردِ دل کہتے ہیں۔

[2] بلبن: ملاحظہ ہو "اسکول ماسٹر کا خواب"

رہا ہے۔ اُن کے اصطبل میں جہاں پانچ گھوڑے بیکار کھڑے ہنہنا رہے ہیں وہاں ایک اور سہی۔ ہر جانور اپنے حصّے کا رزق ساتھ لاتا ہے۔

خان صاحب نے اعلان کیا کہ مشکی کو خلیفہ ڈرائیو کر کے پشاور لے جائے گا اور تا قیامت واپس نہیں آئے گا، جس کے دو سبب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اس کے بزرگ قندھار سے براہِ پشاور واردِ ہندوستان ہوئے تھے۔ زادِ سفر میں ننگی تلوار کے سوا کچھ نہ تھا۔ سو یہ بھی کثرتِ استعمال سے گِھس گِھسا کر اُسترا بن گئی! دوسرا یہ کہ اُنھوں نے اس نمک حلال کو ملازم رکھ لیا ہے۔

بشارت کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔

"خلیفے! تم۔۔۔۔۔۔!"

"سرکار!۔۔۔" اُس نے اس انداز سے ہاتھ جوڑ کر گھگیاتے ہوئے کہا کہ کسی عذر و وضاحت کی ضرورت نہ رہی۔ اس میں خجالت بھی تھی۔ لجاجت بھی۔ اور بہر طور روٹی کما کھانے کا حوصلہ بھی۔

۱۴

جب عمر کی نقدی ختم ہوئی

خان صاحب کے جانے کے کوئی چھ سات ہفتے بعد ان کا املا کرایا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ بفضلِ خداوندی یہاں ہر طرح سے خیریت ہے۔ دیگر احوال یہ کہ میں نے اپنے دورانِ قیام میں آپ کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ناحق آپ تردّد کرتے اور صحبت کا سارا لطف کرکرا ہو جاتا۔ پشاور سے میری روانگی سے تین ہفتے پیشتر ڈاکٹروں نے مجھے جگر کا سروسس بتایا تھا۔ دوسرے درجے میں، جس کا کوئی علاج نہیں۔ جناح ہسپتال والوں نے بھی یہی تشخیص کی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہر وقت اپنا دل پشوری کرتے رہو۔ خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو جن کی صحبت تمھیں بشاش رکھے۔ بش یہی تمہارا علاج اور خاب ژوند (میٹھی زندگی) کا نسخہ ہے۔ یارا جی! میں بچّہ نہیں ہوں۔ جو اُنھوں نے کہا وہ میں سمجھ گیا اور جو نہیں کہا وہ بھی بخوبی سمجھ گیا۔ یہ مشورہ تو کوئی طبلہ بجانے والا بھی مفت دے سکتا تھا۔ اس کے لیے ایم آر سی پی اور ایف آر سی ایس ہونے اور جگہ بے جگہ ٹونٹی لگا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

میں نے لنڈی کوتل سے لانڈھی تک نگاہ ڈالی۔ آپ سے زیادہ محبّتی، خود خرسند رہنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ نظر نہیں آیا۔ چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آ گیا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ طبیعت کی زنگ اُتارنے کا بہانہ تھا۔ جتنے دن آپ کے ساتھ گزرے اتنے دنوں سے میری زندگی بڑھ گئی۔ خدا کو اسی طرح شادمان اور مجھ پر مہربان رکھے۔ آپ کو میری وجہ سے جو تکلیف ہوئی اُس کی معافی مانگنا لکھنوی تکلّفات میں شامل ہو گا، جو مجھ جیسے جاہل کے بس کا کام نہیں۔ مگر دوستی میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ میرا دادا کہتا تھا کہ فارسی میں ایک مثل ہے کہ یا تو ہاتھی ولوں سے دوستی مت کرو۔ اور اگر کر لی ہے تو پھر اپنا مکان ایسا بنواؤ جو ہاتھیوں کی ٹکر سہہ سکے۔

ایک ٹرک والے کے ہمراہ مردان کا دس سیر تازہ گُڑ جس میں نئی فصل کے اخروٹوں سے مغز کاری کی گئی ہے، سوات کے شہد کے تین چھتّے قدرتی حالت میں بمعہ مومِ اصلی۔ مگسِ مردہ اور ایک صراحی دار گردن والی ٹوکری میں بیس فضلی بٹیرے روانہ کر رہا ہوں۔ یوسفی صاحب کے لیے اُن کا پسندیدہ پشاور کینٹ والی دُکان کا دو سیر تازہ پنیر اور پنڈی کا ہنٹر زبیف ایک نازک سی ہوادار ٹوکری میں ہے۔ چلتے وقت اُنھوں نے گندھارا تہذیب کے دو تین اعلیٰ نمونوں کی فرمائش کی تھی۔ کچھ تو روانگی کی افراتفری تھی پھر میں جاہل آدمی۔ یہاں اپنے ہی

جیسے دو تین دوستوں سے پوچھا۔ اُنھوں نے مجھے گندھارا کے دفتر بھیج دیا۔ وہ بولے ہم تو نہایت اعلیٰ ٹرک اور genuine پارٹس بیچتے ہیں۔ تمھیں کس کا نمونہ درکار ہے؟ دوشنبہ کو ایک ٹھیکے دار کا مشی چار سنگ۔ سیاہ کی مورتیاں، نہایت خوبصورت تخت بھائی مردان کی کھدائی سے چادر میں چھپا کر لایا تھا۔ مگر ایک جاننے والے نے جو قدِ آدم سے بھی بڑی مورتیاں اسمگل کر کے امریکہ بھیجتا رہتا ہے، مجھے بتایا کہ یہ بدھ کی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے چیڑ قنات (اس کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے) چیلوں چانٹوں کی ہیں۔ بدھ اتنا تکڑا کبھی تھا ہی نہیں۔ افواہاً سنا ہے، نروان کے بعد بدھ کی صحت اور پسلیاں یوسفی صاحب جیسی ہو گئی تھیں۔ بہرحال تلاش جاری ہے۔ بعد سلام اُن سے عرض کیجیے گا کہ اس سے تو بہتر ہو گا کہ دیوار پر کابلی والا کا فوٹو ٹانگ لیں [1]۔

اس بیماری کا خانہ خراب ہو۔ عمر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی چھلکا جا رہا ہے۔ خط لکھوانے میں بھی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ ڈر کے مارے ٹھیک سے کھانس بھی نہیں سکتا۔ آپ کی بھابی رونے لگتی ہے۔ مجھ سے چھپ کر وقفے وقفے سے گرم چمک کے ساتھ اشک باری کرتی ہے۔ بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ بختاور! جب تک

---

[1] تیس سال بعد وصیت کی تعمیل کر رہا ہوں۔ نگار خانۂ دل میں جو تصویر وہ آویزاں کر گئے اُس کا دھندلا سا عکس پیشِ خدمت ہے۔

بالکل بے ہوش نہ ہو جاؤں، میں بیماری سے ہار ماننے والا آدمی نہیں۔ بشارت بھائی! ایسے آدمی کے لیے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ گزشتہ ہفتے یونیورسٹی روڈ پر ایک نیا مکان بنوانا شروع کر دیا ہے۔ دالان میں پشاور کے پچاس یا کراچی کے سو مشاعروں کے دوزانو بیٹھنے کی گنجائش ہو گی۔

باقی سب خیریت ہے۔ خلیفہ دست بستہ سلام عرض کرتا ہے۔ میں نے اسے مسلم کمرشل بینک میں چپراسی لگوا دیا ہے۔ روزانہ شام کو اور چھٹی کے دن مشکی وہی چلاتا ہے۔ بہت چنگا ہے۔ مشکی کو پشتو میں روانی سے گالی دینے لگا ہے۔ مگر ابھی پشتو مذکر مونث کی تمیز پیدا نہیں ہوئی۔ سننے والے ٹھٹھے لگاتے ہیں۔ کل ہی میں نے اسے گُر بتایا ہے کہ جسے تو ہمیشہ مذکر سمجھتا آیا ہے اب اسے مونث بول، پھر تجھے پشتو آ جائے گی۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام، دعا، پیار اور ڈانٹ ڈپٹ۔

آپ کا چاہنے والا

کابلی والا

مکرر آنکہ، یہاں آ کر پرانے حسابات دیکھے تو پتا چلا کہ ابھی متفرق مدات میں کچھ لینا دینا باقی ہے۔ مجھے سفر منع ہے۔ آپ کسی طرح فرصت نکال کر یہاں شتابی آ جائیں تو حسابِ دوستاں بیباک (لکھنے والے نے اسی طرح لکھا تھا اور کیا

خوب لکھا تھا) ہو جائے اور آپ کے کابلی والا کو تھوڑی سی زندگی اور ادھار مل جائے۔

نیز، اب نئے مکان اور دالان کا انتظار کون کرے۔ میں نے آپ کے لیے سرِ دست ایک عدد بے چھید چاندنی اور پانچ شاعروں کا انتظام کر لیا ہے۔ والسلام۔

بشارت پہلی ٹرین سے پشاور روانہ ہو گئے۔

شہر دو قصّہ [1]

کھنڈر میں چراغاں

کم و بیش پینتالیس برس کا ساتھ تھا۔ نصف صدی ہی کہیے۔ بیوی کے انتقال کے بعد بشارت بہت دن کھوئے کھوئے سے، گُم صُم رہے۔ جیسے انہوں نے کچھ گم نہ کیا ہو، خود گم ہو گئے ہوں۔ جوان بیٹوں نے میت لحد میں اتاری، اس وقت بھی وہ صبر و ضبط کی تصویر بنے، تازہ کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر خاموش کھڑے دیکھا کیئے۔ ابھی ان کے بٹوے میں مرحومہ کے ہاتھ کی رکھی ہوئے الائچیاں باقی تھیں۔ اور ڈیپ فریزر میں اس کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کی تہیں لگی تھیں۔ کروشیے کی جو ٹوپی وہ اس وقت پہنے ہوئے تھے وہ اس جنتی بی بی نے چاند رات کو دو بجے مکمل کی تھی تاکہ وہ صبح اسے پہن کر عید کی نماز پڑھ سکیں۔ سب مٹھی بھر بھر کے مٹی ڈال چکے اور قبر گلاب کے پھولوں سے ڈھک گئی تو انہوں نے مرحومہ کے ہاتھ کے لگائے ہوئے موتیا کی چند کلیاں جن کے کھلنے

---

[1] (A Tale of Two Cities) کی الٹ۔ یعنی قصّہ دو کہانیوں والے شہر کا

میں ابھی ایک پہر باقی تھا، کُرتے کی جیب سے نکال کر انگارہ پھولوں پر بکھیر دیں۔ پھر خالی خالی نظروں سے اپنا مٹی میں سنا ہوا ہاتھ دیکھنے لگے۔ اچانک ایک ایسا سانحہ ہو جائے تو کچھ عرصے تک تو یقین ہی نہیں آتا کہ زندگی بھر کا ساتھی یوں آناً فاناً بچھڑ سکتا ہے۔ نہیں۔ اگر وہ سب کچھ خواب تھا تو پھر یہ بھی خواب ہی ہو گا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی یہیں کسی دروازے سے مسکراتی ہوئی آ نکلے گی۔ رات کے سناٹے میں کبھی کبھی تو قدموں کی مانوس آہٹ اور چوڑیوں کی کھنک تک صاف سنائی دیتی۔ اور وہ چونک پڑتے کہ کہیں آنکھ تو نہیں جھپک گئی تھی۔ کسی نے ان کی آنکھیں نم نہیں دیکھیں۔ اپنوں بیگانوں سبھی نے ان کے صبر و استقامت کی داد دی۔ پھر اچانک ایک واشگاف لمحہ آیا کہ یکلخت یقین آ گیا۔ پھر سارے پندار پشتے اور سارے آنسو بند اور تمام صبر فصیلیں ایک ساتھ ڈھے گئیں۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

لیکن ہر رنج رفتنی ہے اور ہر عیش گزشتنی۔ جیسے اور دن گزر جاتے ہیں یہ دن بھی گزر گئے۔ قدرت نے بقول لاروش فوکو کچھ ایسی حکمت رکھی ہے کہ انسان موت اور سورج کو زیادہ دیر ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھ سکتا۔ رفتہ رفتہ صدمے کی جگہ رنج اور رنج کی جگہ اداس تنہائی نے لے لی۔ میں جب میامی سے کراچی پہنچا تو وہ اسی دور سے گزر رہے تھے۔ بے حد اداس۔ بے حد تنہا۔ بظاہر وہ اتنے تنہا نہیں

تھے جتنا محسوس کرتے تھے۔ مگر آدمی اتنا ہی تنہا ہوتا ہے۔ جتنا محسوس کرتا ہے۔ تنہائی آدمی کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ جدھر نظر اٹھاتا ہے، آئینے کو مقابل پاتا ہے۔ اسی لیے وہ تنہائی یعنی اپنی ہی صحبت سے گریز کرتا اور ڈرتا ہے۔ تنہا آدمی کی سوچ اس کی انگلی پکڑ کے کشاں کشاں ہر چھوڑی ہوئی شاہراہ، ایک ایک پگڈنڈی، گلی کوچے اور چوراہے پر لے جاتی ہے۔ جہاں جہاں راستے بدلے تھے اب وہاں کھڑے ہو کر انسان پر منکشف ہوتا ہے کہ در حقیقت راستے نہیں بدلے انسان خود بدل جاتا ہے۔ سڑک کہیں نہیں جاتی۔ وہ تو وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ مسافر خود کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ راہ کبھی گم نہیں ہوتی۔ راہ چلنے والے گم ہو جاتے ہیں۔

پیری میں، پرانی ضرب المثل کے مطابق، صد عیب ہوں یا نہ ہوں، ایک عیب ضرور ہے جو سو عیبوں پر بھاری ہے۔ اور وہ ہے ناسٹلجیا۔ بڑھاپے میں آدمی آگے یعنی اپنی منزلِ نامقصود و ناگزیر کی جانب بڑھنے کے بجائے الٹے پیروں اس طرف جاتا ہے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ پیری میں ماضی اپنی تمام مہلک رعنائیوں کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ بوڑھا اور تنہا آدمی ایک ایسے کھنڈر میں رہتا ہے جہاں بھری دوپہر میں چراغاں ہوتا ہے اور جب روشنیاں بجھا کے سونے کا وقت آتا ہے تو یادوں کے فانوس جگمگ جگمگ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جیسے جیسے ان کی روشنی تیز ہوتی ہے، کھنڈر کی دراڑیں، جالے اور ڈھنڈار پن اتنے ہی زیادہ اجاگر ہوتے جاتے ہیں۔

سو ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔

ماضی تمنائی اور برزخِ گم گشتہ

کراچی میں اللہ نے انہیں اتنا دیا کہ خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اپنے مالوف و متروکہ دیار کانپور جانے کی انھیں کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ مگر اس سانحے کے بعد یکبارگی ایک ہوک سی اٹھی اور انہیں کانپور کی یاد بے تحاشا ستانے لگی۔ اس سے پہلے ماضی نے ان کے وجود پر یوں پنجے گاڑ کر قبضہ نہیں جمایا تھا۔ حال سے گریزاں، حاضر و موجود سے منحرف، مستقبل سے مستغنٰی۔ اب وہ صرف ماضی میں جی رہے تھے۔ حال میں کوئی خاص خرابی نہیں تھی۔ بجز اس کے کہ بوڑھے آدمی کے حال کی سب سے بڑی خرابی اس کا ماضی ہوتا ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔

اک عمر سے ہوں لذتِ نسیاں سے بھی محروم

ہر واقعے، بلکہ ساری زندگی کی فلم الٹی چلنے لگی۔ جٹادھاری برگد کرودھ میں آکر، پھننگ کے بل اپنی بھجنگ جٹائیں اور پاتال جڑیں آسمان کی طرف کر کے سیس آسن میں الٹا کھڑا ہو گیا۔ پینتیس برس بعد انہوں نے اپنے برزخِ گم گشتہ کانپور جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ گلیاں، بازار، محلے، آنگن، چارپائی تلے ادھورے چھڑکاؤ سے رات گئے تک جوان پنڈے کی طرح سلگتی چھتیں۔ وہ دوانی خواہشیں جو رات کو خواب بن بن کے آئیں اور وہ خواب جو دن میں سچ مچ خواہش بن جاتے۔ سب ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ حد یہ کہ وہ اسکول بھی جنت کا ٹکڑا معلوم ہونے لگا، جس سے بھاگنے میں اتنا مزہ آتا تھا۔ سب مزوں، سب یادوں نے یکبارگی یورش کر دی۔ دوستوں سے چرچرائی چارپائیاں اور ہری بھری نبولیوں سے لدے پھندے نیم کی چھاؤں، آموں کے بور اور مہوے کی مہکار سے بوجھل پروا، املی پر گدرائے ہوئے کتارے اور انہیں للچائی نظروں سے دیکھتی لڑکیاں اور انہیں ویسی ہی نظروں سے دیکھتے ہوئے لڑکے، ہرنوں سے بھرے جنگل، چھرے سے زخمی ہو کر دو تین سو فٹ کی بلندی سے گد سے گرتی ہوئی مرغابی، خس کی ٹٹیاں، سنگھاڑوں سے پٹے تالاب، گلے سے پھسلتا مخمل فالودہ، مولسری کے گجرے، گرمیوں کی دوپہر میں جامن کے گھنے پتوں میں چھپے ہوئے گرگٹ کی لپلپاتی مہین زبان، اپنے چوکنے کانوں کو ہوا کے رخ کے

ساتھ ٹیون کیے ٹیلے پر تنہا کھڑا ہوا بارہ سنگھا، اڈ گھمڈ جوانی اور پہلے پیار کی گھٹا ٹوپ اداسی، وہ صندل باہیں جو سوتے جاگتے تکیہ تصور تھیں، تازہ کلف لگے دوپٹے کی کراری مہک، دھوم مچاتے دوست۔ ماضی کے کوہِ ندا سے ایسے بلاوے، ایسی صدائیں آنے لگیں کہ

ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھے پاؤں کی

وہ اب بچّے نہیں رہے تھے، ہمارا مطلب ہے ستر سے متجاوز تھے۔ لیکن انہیں ایک لحظے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ تمام رنگین اور رومینٹک چیزیں۔ جنہیں مرزا عبدالودود بیگ آلاتِ کشاورزی کی مناسبت سے "عہد شباب کے آلاتِ خلاف ورزی" کہتے ہیں۔ جنہیں یاد کر کر کے وہ سو سو decibel کی آہیں بھرنے لگے تھے، پاکستان میں نہ صرف بافراط بلکہ کہیں بہتر کوالٹی کی دستیاب تھیں۔ ہاں صرف ایک شے پاکستان میں مفقود تھی۔ اور وہ تھی ان کی جوانی۔ سو وہ بعد تلاشِ بسیار و بے سود کانپور میں بھی نہ ملی۔

یہ بچّے کتنے بوڑھے ہیں، یہ بوڑھے کتنے بچّے ہیں

انھوں نے اپنے نارتھ ناظم آباد والے گھر کے سامنے مولسری کا درخت لگانے کو تو لگا لیا، لیکن یادوں کی مولسری کی بھینی بھینی مہک، بچپن اور چھب چھاؤں کچھ اور ہی تھی۔ اب وہ انواع و اقسام کے پھول کہاں کہ ہر پھول سے اپنی ہی خوشبو آئے۔ ان پر بھی وہ مقام آیا جو بڑھاپے کے پہلے شب خون کے بعد ہر شخص پر آتا ہے، جب دفعتاً اس کا جی بچپن کی دنیا کی ایک جھلک۔ آخری جھلک۔ دیکھنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے کہ علم نہیں ہوتا کہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کوئی غیبی ہاتھ چپکے سے سو گنی طاقت کا magnifier (محدب عدسہ) رکھ دیتا ہے۔ دانا کبھی اس شیشے کو ہٹا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے ہٹتے ہی ہر چیز خود اپنا miniature (تصغیر) معلوم ہونے لگتی ہے۔ کل کے دیو بالکل بالشتیے نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر آدمی اپنے بچپن کے locale (جائے ورود و واردات) سے عرصہ دراز تک دور رہا ہے تو اسے ایک نظر آخری بار دیکھنے کے لیے ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ لیکن وہ جاتا ہے۔ وہ منظر اسے ایک طلسمی مقناطیس کی مانند کھینچتا ہے اور وہ کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ طفلِ طلسمات پر جہاں دیدہ آنکھ پڑ جائے تو سارے طلسم ٹوٹ جاتے

ہیں۔ بہروپ نگر کی ساری پریاں اُڑ جاتی ہیں اور شیش محل پر کالک پت جاتی ہے۔ اور اس جگہ تو اب مقدس خوشبوؤں کا دھواں ہی دھواں ہے۔ یہاں جو کام دیو کی دہکتی دھنک کمان ہوا کرتی تھی وہ کیا ہوئی؟

یہ دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے؟ وہ جو آگ تھی وہ کہاں کی تھی؟

آدمی کو کسی طرح اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ وہ رُوپ سُروپ کیا ہوا؟ وہ چہکار مہکار کہاں گئی؟ نہیں۔ یہ تو وہ اوراق مصور کوچے اور بازار نہیں جہاں ہر چیز اچنبھا لگتی تھی۔ یہ ہر چیز، ہر چہرے کو کیا ہو گیا؟

Was this the face that launch'd a thousand ships?

And burnt the topless towers of llium?

جس گھڑی یہ طلسم ٹوٹتا ہے، ماضی تمنائی کی خواب سراڈھے جاتی ہے۔ پھر اس شخص کا شمار نہ بچوں میں ہوتا ہے، نہ بوڑھوں میں۔ جب یہ مقام آتا ہے تو آنکھیں یکایک "کلر بلائینڈ" ہو جاتی ہیں۔ پھر انسان کو سامنے ناچتے مور کے صرف پیر دکھائی دیتے ہیں اور وہ انہیں دیکھ دیکھ کے روتا ہے، ہر سُو بے رنگی اور بے دلی کا راج ہوتا ہے۔

بے حلاوت اس کی دنیا اور مذبذب اس کا دیں

جس شہر میں بھی رہنا، اُکتائے ہوئے رہنا

سو اس طفل بزرگ نے کانپور جا کر بہت گریہ کیا۔ پینتیس برس تک تو اس پر رویا کیے کہ ہائے، ایسی جنت چھوڑ کر کراچی کیوں آ گئے۔ اب اس پر روئے کہ لاحول ولا قوۃ اس سے پہلے ہی چھوڑ کر کیوں نہ آ گئے۔ خواہ مخواہ عمر عزیز کی ایک تہائی صدی غلط بات پر رونے میں گنوا دی۔ رونا ہی ضروری تھا تو اس کے لیے ۳۶۵ معقول وجوہات موجود تھیں، اس لیے کہ سال میں اتنی ہی مایوسیاں ہوتی ہیں۔ اپنی ''ڈریم لینڈ'' کا چپہ چپہ چھان مارا، لیکن

وہ لہر نہ پھر دل میں جاگی، وہ رنگ نہ لوٹ کے پھر آیا

پینتیس برس پرانا ناسٹلجیا یکایک ٹوٹا تو ہر جگہ اجاڑ اور ہر شے کھنڈر نظر آئی۔ حد یہ کہ جس مگر مچھ بھرے دریا میں کہ جس کا اور نہ چھور، وہ فلک بوس برگد کی پھننگ سے بے خطر چھلانگ لگا دیا کرتے تھے، اب اسے جا کر پاس سے دیکھا تو ایک مینڈک بھر برساتی نالا نکلا۔ اور وہ جبر جنگ برگد تو نرا بونسائی پیڑ لگ رہا تھا۔

ماضی کے دشتِ بازگشت میں وہ اپنے ہمزاد کا خیمہ زنگار گوں نہ پہچان پائے۔

۲

کبوتر خانے کا چربہ

یونانی کورس (Greek Chorus) بہت فلسفہ چھانٹ چکا۔ اب اس کہانی کو خود اس کے ہیرو بشارت کی زبانی سنیے کہ اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے:

یہ افسانہ اگرچہ سرسری ہے

ولے اس وقت کی لذت بھری ہے

صاحب، میں تو اپنا مکان دیکھ کے بھونچکا رہ گیا کہ واللہ، ہم اس میں رہتے تھے، اور اس سے زیادہ حیرانی اس پر کہ بہت خوش رہتے تھے، مڈل کلاس غریبی کی سب سے قابلِ رحم اور لاعلاج قسم وہ ہے جس میں آدمی کے پاس کچھ نہ ہو لیکن اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ ماشاء اللہ سے ہم تلے اوپر کے نو بھائی تھے اور چار بہنیں۔ اور تلے اوپر تو میں نے محاورے کی مجبوری کے سبب کہہ دیا، ورنہ کھیل کود، کھانے اور لیٹنے بیٹھنے کے وقت اوپر تلے کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ سب کے نام ت پر ختم ہوتے تھے۔ عشرت، عترت، راحت، فرحت، عصمت، عفت وغیرہ۔ مکان خود والد نے مجھ سے بڑے بھائی کی سلیٹ پر ڈیزائن کیا تھا۔ سوسوا

سو کبوتر بھی پال رکھے تھے۔ ہر ایک کی نسل اور ذات جدا۔ کسی کبوتر کو دوسری ذات کی کبوتری سے مختلط نہیں ہونے دیتے تھے۔ لکڑی کی دکان تھی۔ ہر کبوتر کا خانہ اس کی جسامت، عاداتِ قبیحہ اور دُم کی لمبائی کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود بناتے تھے۔ صاحب، اب جو جا کے دیکھا تو مکان کے آرکی ٹیکچر میں سراسر ان کے اس شوق فضول کا عکس اور عمل دخل نظر آیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارا مکان دراصل ان کے کبوتر خانے کا بھونڈا سا چربہ تھا۔

والد بہت دور اندیش اور پریکٹیکل تھے۔ اس اندیشے سے کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی اولاد جائداد کے تقاسمہ پر جھگڑا کرے گی، وہ ہر بیٹے کے پیدا ہوتے ہی اس کا علیحدہ کمرا بنوا دیتے تھے۔ کمروں کی تعمیر میں خرابی کی ایک سے زیادہ صورتیں مضمر تھیں یعنی یہ حفظِ مراتب بھی تھا کہ ہر چھوٹے بھائی کا کمرہ اپنے بڑے بھائی کے کمرے سے لمبائی چھوڑائی میں ایک ایک گز چھوٹا ہو۔ مجھ تک پہنچتے پہنچتے کمرے کے حدود اربعہ تقریباً اکڑوں بیٹھ گئے تھے۔ پورے سات سال لگے مکان مکمل ہونے میں۔ اس عرصے میں تین بھائی اور پیدا ہو گئے۔ آٹھویں بھائی کے کمرے کی دیواریں اٹھائی گئیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ قدمچوں کی نیو رکھی جارہی ہے یا کمرے کی۔ ہر نومولود کی آمد پر سلیٹ پر سابقہ

نقشے میں ضروری ترمیم اور ایک کمرے کا اضافہ کرتے۔ رفتہ رفتہ سارا آنگن ختم ہو گیا۔ وہاں ہمیں ورثے میں ملنے والی کوٹھریاں بن گئیں۔

بورژوایت پر بوذریت کا گمان!

صاحب، کہاں کراچی کی کوٹھی اور اس کے ایئر کنڈیشنز اور قالین اور روبلیک پینٹ اور کہاں یہ ڈھنڈار کہ کھانس بھی دو تو واللہ پلستر جھڑنے لگے۔ چالیس برس سے رنگ سفیدی نہیں ہوئی۔ پھوپھی زاد بھائی کے مکان میں ایک جگہ ترپال کی چھت گیری بندھی دیکھی۔ کراچی اور لاہور میں تو کوئی چھت گیری اور نم گیرہ کے معنی بھی نہیں بتا پائے گا۔ چھت گیری پر تین جگہ نیل پالش سے ضرب کا نشان x بنا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے نیچے نہ بیٹھو۔ یہاں سے چھت ٹپکتی ہے۔ کانپور اور لکھنؤ میں جس دوست اور رشتے دار کے یہاں گیا اسے پریشان حال ہی پایا۔ آگے جو سفید پوش تھے وہ اب بھی ہیں۔ مگر سفیدی میں پیوند لگ گئے ہیں۔ اپنی عسرت اور خودداری پر کچھ زیادہ ہی فخر کرنے لگے ہیں۔ ایک نجی محفل میں، میں نے اس پر اچٹتا سا فقرہ کس دیا تو ایک جونیئر لیکچرار جو کیس مقامی کالج میں اقتصادیات پڑھاتے ہیں، بگڑ گئے۔ کہنے لگے ”آپ کی امیری امریکا اور عرب امارات کی دین ہے۔ ہماری غریبی ہماری اپنی غریبی

ہے۔ (اس پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے قرات سے الحمد للہ کہا) مقروضوں کے اللے تللے آپ ہی کو مبارک ہوں۔ عرب اگر تھرڈورلڈ کو عالم الفقیر کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے"۔ میں مہمان تھا۔ ان سے کیا الجھتا۔ دیر تک فقر و غنا، نانِ جویں اور خودداری اور مفلسی کے دیگر لوازمات کی مدح میں اشعار سناتے رہے۔ دو شعر حضرت ابوذر غفاری رح پر بھی سنائے۔ شرما حضوری میں نے بھی داد دی۔ مہمان جو ٹھہرا۔ ہندوستان ہو یا پاکستان، آج کل ہر انٹلکچویل کو اپنی بے زری اور بورژوایت پر بوذریت کا گمان ہونے لگا ہے۔

کوئی چیز ایسی نہیں جو ہندوستان میں نہ بنتی ہو۔ ایک کانپور ہی کیا، ہر شہر کارخانوں سے پٹا پڑا ہے۔ کپڑے کی ملیں، فولاد کے کارخانے، کار اور ہوائی جہاز کی فیکٹریاں، ٹینک بھی بننے لگے۔ ایٹم بم تو عرصہ ہوا ایکسپلوڈ کر لیا۔ سیٹلائٹ بھی خلا میں چھوڑ دیا۔ عجب نہیں چاند پر بھی پہنچ جائیں۔ ایک طرف تو یہ ہے۔ دوسری طرف یہ نقشہ بھی دیکھا کہ ایک دن مجھے انعام اللہ برملائی[1] کے ہاں جانا تھا۔ ایک پیڈل رکشا پکڑی۔ رکشا والا مدقوق سا تھا۔ بنیان میں سے بھی پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔ منھ سے بنارسی قوام والے پان کے بھبکے نکل رہے تھے۔ اس

[1] انعام اللہ ایک زمانے میں اس پر بہت فخر کرتے تھے کہ وہ ناگفتنی بات برملا کہہ دیتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کا لقب برملائی پڑ گیا۔

نے انگلی کا آنکڑا (ہُک) سا بنا کر پیشانی پر پھیرا تو پسینے کی تللی بندھ گئی۔ پسینے نے منھ اور ہاتھوں پر لسلسی چمک پیدا کر دی تھی جو دھوپ میں ایسی لگتی تھی جیسے ویسلین لگا رکھا ہو۔ ننگے پیر، سوکھی کلائی پر کلائی سے زیادہ چوڑی گھڑی۔ ہینڈل پر پروین بوبی ایکٹرس کا ایک سیکسی فوٹو۔ پیڈل مارتے میں دہرا ہو ہو جاتا اور پسینے میں تر پیشانی بار بار بوبی پر سجدہ ریز ہو جاتی۔ مجھے ایک میل ڈھو کے لے گیا۔ مگر گیس کیجیے کتنا کرایہ مانگا ہو گا؟ جناب، کُل پچھتر پیسے، خدا کی قسم، پچھتر پیسے، میں نے ان کے علاوہ چار روپے پچیس پیسے کا ٹپ دیا تو پہلے تو اسے یقین نہیں آیا۔ پھر باچھیں کھل گئیں۔ کدو کے بیجوں جیسے پان آلودہ دانت نکلے رہ گئے۔ میرے بٹوے کو حریص نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا "بابو جی آپ پاکستان سے آئے ہیں؟" میں نے کہا "ہاں۔ مگر پینتیس برس پہلے یہیں ہیرا من کے پردے میں رہتا تھا"۔ اس نے پانچ کا نوٹ انٹی سے نکال کر لوٹاتے ہوئے کہا "بابو جی، میں آپ سے پیسے کیسے لے سکتا ہوں۔ آپ سے تو محلے داری نکلی، میری کھولی بھی وہیں ہے"۔

غریب غرانے لگے

اور آبادی؟ الامان، الحفیظ، بارہ ماسی میلے کا سماں ہے۔ زمین سے ابلے پڑتے ہیں۔ بازار میں آپ دو قدم نہیں چل سکتے، جب تک کہ دائیں بائیں ہاتھ اور کہنیاں نہ چلائیں۔ خشکی میں کھڑی تیراکی کہیے جہاں کہنی مارنے کی بھی گنجائش نہ ہو وہاں لوگ ایک جگہ سے دوسرے جگہ محض بھیڑ کے دھکے سے پہنچ جاتے ہیں۔ لکھوکھا آدمی فٹ پاتھ پہ سوتے ہیں۔ وہیں ہر مرحلے سے گزر جاتے ہیں۔ مگر فٹ پاتھ پہ سونے والا کسی سے دبتا ہے نہ ڈرتا ہے۔ نہ حکومت کو برا کہنے سے پہلے مڑ کر دائیں بائیں دیکھتا ہے۔ ہمارے زمانے کے غریب واقع میں مسکین ہوتے تھے۔ اب غریب غراتے بہت ہیں۔ سائیکل رکشہ کو تو پھر بھی راستہ دے دیں گے، مگر کار کے سامنے سے ذرا جو ہٹ جائیں۔ عزیز الدین وکیل کہہ رہے تھے کہ ہمارے ہاں سیاسی بیداری بہت بڑھ گئی ہے۔ واللہ اعلم، میں نے تو یہ دیکھا کہ جتنی غریبی بڑھتی ہے اتنی ہی ہیکڑی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ بلیک کا پیسا وہاں بھی الغاروں ہے، مگر کسی کی مجال نہیں کہ امارت کی نمائش کرے۔ شادیوں میں کھاتے پیتے گھرانوں تک کی خواتین کو سوتی ساڑھی اور چپل پہنے دیکھا۔ مانگ میں اگر سیندور نہ ہو تو واللہ بیوہ کا گمان ہو۔ چہرے پر قطعاً کوئی میک اپ نہیں۔

جب کہ اپنے ہاں یہ حال کہ ہم مرغی کی ٹانگ کے بھی ہاتھ نہیں لگاتے جب تک اس پر رُوژنہ گا ہو، صاحب، آپ نے طارق روڈ کے لال بھبھوکا چکن تکّے دیکھے ہیں؟ کانپور میں میں نے اچھے اچھے گھروں میں دریاں اور بید کے صوفہ سیٹ دیکھے۔ اور بعض تو وہی ہیں جن پر ہم پینتیس سال پہلے اینڈا کرتے تھے۔ صاحب! رہن سہن کے معاملے میں ہندوؤں میں اسلامی سادگی پائی جاتی ہے!

جو ہونی تھی سو بات ہولی، کہارو!

کہنے کو تو آج بھی اُردُو بولنے والے اُردُو ہی بولتے ہیں۔ مگر میں نے ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ عام آدمی کا ذکر نہیں، اُردُو کے پروفیسروں اور لکھنے والوں تک کا لہجہ نہیں رہا جو ہم آپ چھوڑ آئے تھے۔ کرارا پن، کھڑا پن، وہ کڑی کمان والا کھٹکا جاتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے ڈھلک کر ہندی کے پنڈتائی لہجے کے قریب آ گیا ہے۔ singsong لہجہ You know what I mean یقین نہ آئے تو آل انڈیا ریڈیو کی اُردُو خبروں کے لہجے کا کراچی ریڈیو یا میرے لہجے سے موازنہ کر لیجیے۔ میں نے پائنٹ آوٹ کیا تو انعام اللہ برملائی سچ مچ آفنڈ ہو گئے۔ ارے صاحب وہ تو ذاتیات پر اتر آئے۔ کہنے لگے "اور تمھاری زبان اور لب و لہجے پر جو پنجاب دی چھاپ ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتی، ہمیں آتی ہے۔ تمہیں یاد ہو گا، ۳۰

اگست ۱۹۴۷ کو جب میں تمہیں ٹرین پر سی آف کرنے گیا تو تم سیاہ رامپوری ٹوپی، سفید چوڑی دار پاجامہ اور جودھپوری جوتی پہنے ہاتھ کا چلو بنا بنا کر آداب تسلیمات کر رہے تھے۔ کہو، ہاں، کلے میں پان، آنکھوں میں ممیرے کا سرمہ، ململ کے چنے ہوئے کرتے میں عطرِ گِل[1]، کہو ہاں، تم یہاں سے چائے کو چاء، گھاس کو گھانس اور چاول کو چانول کہتے ہوئے گئے۔ کہو ہاں، اور جس وقت گارڈ نے سیٹی بجائی، تم چنبیلی کا گجرا گلے میں ڈالے کوپ میں سے گرم چاء پرچ میں ڈال کے، پھونکیں مار مار کے سٹر سٹر پی رہے تھے۔ اس وقت بھی تم کراچی کو کرانچی کہہ رہے تھے۔ کہہ دو کہ نہیں۔ اور اب تین decades of decadence (عشرہ ہائے انحطاط) کے بعد سر پر سفید بالوں کا ٹوکرا رکھے ٹخنے تک حاجیوں جیسا جھابڑ جھلا کرتا پہنے، ٹانگوں پر گھر دار مشکیزے پھڑکاتے، کراچی کے کنکریٹ جنگل سے یہاں تیرتھ یاترا کو آئے ہو تو ہم تمہیں پنڈت پانڈے دکھلائی دینے لگے۔ بھول گئے تم؟ تم یہاں سے اماں، اور اے حضنت کہتے گئے تھے اور اب سائیں سائیں کہتے لوٹے ہو"۔ صاحب مہمان تھا بقول آپ کے اپنی بے عزتی خراب کروا کے چپکے سے اٹھ کر رکشا میں گھر آ گیا:

---

[1] عطرِ گِل بارش کے پہلے چھینٹوں سے بھیگی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا عطر جو اُترتی گرمیوں میں لگاتے تھے۔ اب جسم قبر میں پہنچ کر ہی زمین کی خوشبو میں نہاتے ہیں۔

جو ہونی تھی سو بات ہولی، کہارو

چلو لے چلو میری ڈولی، کہارو

ہم چُپ رہے ہم ہنس دیئے

لکھنؤ اور کانپور اُردُو کے گڑھ تھے۔ بے شمار اُردُو اخبار نکلتے تھے۔ خیر، آپ تو مان کے نہیں دیتے۔ مگر صاحب ہماری زبان سند تھی۔ اب یہ حال ہے کہ مجھے تو سارے شہر میں ایک بھی اُردُو سائن بورڈ نظر نہیں آیا۔ لکھنؤ میں بھی نہیں۔ میں نے یہ بات جس سے کہی وہ آہ بھر کے یا منہ پھیر کے خاموش ہو گیا۔ شامتِ اعمال، یہی بات ایک محفل میں دہرادی تو ایک صاحب بپھر گئے۔ غالباً ظہیر نام ہے۔ میونسپلٹی کے ممبر ہیں۔ وکالت کرتے ہیں۔ نجانے کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے ''للہ، ہندوستانی مسلمانوں پر رحم کیجیئے۔ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجیئے۔ پاکستان سے جو بھی آتا ہے، ہوائی جہاز سے اترتے ہی اپنا فارن ایکسچینج اچھالتا، یہی رونا روتا آتا ہے۔ جسے دیکھو، آنکھوں میں آنسو بھرے شہر آشوب پڑھتا چلا آرہا ہے۔ ارے صاحب، ہم نصف صدی سے پہلے کا کانپور کہاں سے لا کے دیں۔ بس جو کوئی بھی آتا ہے، پہلے تو ہر چیز کا موازنہ پچاس برس پہلے کے

ہندوستان سے کرتا ہے۔ جب یہ کر چکتا ہے تو آج کے ہندوستان کا موازنہ آج کے پاکستان سے کرتا ہے۔ دونوں مقابلوں میں چابک دوسرے گھوڑے کے مارتا ہے جتواتا ہے اپنے ہی گھوڑے کو"۔ وہ بولتے رہے، میں مہمان تھا، کیا کہتا، وگرنہ وہی (سندھی) مثل ہوتی کہ گئی تھی سینگوں کے لیے، کان بھی کٹوا آئی۔

لیکن ایک حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بد دیانتی ہو گی۔ ہندوستانی مسلمان کتنا ہی نادار اور پریشان روزگار کیوں نہ ہو، وہ مخلص، باوقار، غیور اور پُر اعتماد ہے۔

نشور واحدی سے لمبی لمبی ملاقاتیں رہیں۔ سراپا محبت، سراپا خلوص، سراپا نقاہت۔ ان کے ہاں شاعروں اور ادیبوں کا جماؤ رہتا ہے۔ دانشور بھی آتے ہیں۔ مگر دانشور ہیں، دانا نہیں۔ سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ اُردُو بہت سخت جان ہے۔ دانشوروں کو اُردُو کا مستقبل غیر تاریک دکھلائی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔ سنا ہے ایک مشاعرے میں تو تیس ہزار سے زیادہ سامعین تھے۔ صاحب مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کہ جو شعر بیک وقت پانچ ہزار آدمیوں کی سمجھ میں آ جائے وہ شعر نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور شے ہے۔ بے شمار سالانہ سمپوزیم اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ سنا ہے کئی اُردُو ادیبوں کو پدم شری اور پدم بھوشن کے خطاب مل چکے ہیں۔ میں نے کئیوں سے پدم اور بھوشن

کے معنی پوچھے تو جواب میں انہوں نے وہ رقم بتائی جو خطاب کے ساتھ ملتی ہے۔
آج بھی فلمی گیتوں، ذو معنی ڈائیلاگ، قوالی اور آپس کی مار پیٹ کی زبان اُردُو
ہے۔ سنسکرت الفاظ پر بہت زور ہے۔ مگر آپ عام آدمی کو سنسکرت میں گالی
نہیں دے سکتے۔ اس کے لیے مخاطب کا پنڈت اور وِدوان ہونا ضروری ہے۔
صاحب، بقل شخصے، گالی، گنتی، سر گوشی اور گندہ لطیفہ تو اپنی مادری زبان میں ہی
مزہ دیتا ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اُردُو والے کافی پُر امید ہیں۔ ثقیل ہندی
الفاظ بولتے وقت اندرا گاندھی کی زبان لڑکھڑاتی ہے تو اُردُو والوں کی کچھ آس
بندھتی ہے۔

کون ٹھہرے سمے کے دھارے پر

انشور واحدی اسی طرح تپاک اور محبت سے ملے۔ تین چار گھنٹے گپ کے بعد
جب بھی میں نے یہ کہہ کر اٹھنا چاہا کہ اب چلنا چاہیے تو ہر بار ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا۔
میرا جی بھی یہی چاہتا تھا کہ اسی طرح روکتے رہیں۔ حافظہ خراب ہو گیا ہے ایک
ہی نشست میں تین چار دفعہ آپ کے بارے میں پوچھا "کیسے ہیں؟ سنا ہے
مزاحیہ مضامین لکھنے لگے ہیں۔ بھئی حد ہو گئی"۔ منحنی اور روگی تو، آپ جانتے
ہیں، سدا کے تھے۔ وزن پچھتر پونڈ رہ گیا ہے۔ عمر بھی اتنی ہی ہو گی۔ چہرے پر

ناک ہی ناک نظر آتی ہے۔ مُنحنی پہ یاد آیا، کانپور میں چنُیا کیلے، اس سائز کے، اب بھی ملتے ہیں۔ میں نے خاص طور سے فرمائش کر کے منگوائے۔ مایوسی ہوئی۔ اپنے سندھ کے چتی دار کیلوں کے آس پاس بھی نہیں۔ ایک دن میرے منھ سے نکل گیا کہ سرگودھے کا مالٹا، ناگپور کے سنترے سے بہتر ہوتا ہے تو نشور تڑپ کے بولے، یہ کیسے ممکن ہے؟ ویسے نشور ماشاء اللہ چاق و چوبند ہیں۔ صورت بہت بہتر ہو گئی ہے اس لیے کہ آگے کو نکلے ہوئے لہسن کی پوتھی جیسے اوبڑ کھابڑ دانت سب گر چکے ہیں۔ آپ کو تو یاد ہو گا، ثریا ایکٹرس کیا قیامت گاتی تھی، مگر لمبے دانت سارا مزہ کرکرا کر دیتے تھے۔ سنا ہے ہمارے پاکستان آنے کے بعد سامنے کے نکلوا دیئے تھے۔ ایک فلمی رسالے میں اس کا حالیہ فوٹو دیکھا تو خود پر بہت غصہ آیا کہ کاہے کو دیکھا۔ پھر اسی ڈر کے مارے اس کے ریکارڈ نہیں سنے۔ اعجاز حسین قادری کے پاس اس زمانے کے سارے ریکارڈ مع بھونپو والے گراموفون کے ابھی تک محفوظ ہیں۔ صاحب یقین نہیں آیا کہ یہ ہمارے لیے جدید سائنس، موسیقی اور سامانِ عیش کی انتہا تھی۔ انھوں نے اس زمانے کے سرسنگیت سمراٹ سیگل کے دو تین گانے سنائے۔ صاحب، مجھے تو بڑا اشاک ہوا کہ آنجہانی کے ناک سے گائے ہوئے گانوں سے مجھ پر ایسا رومانی لرزہ کیسے طاری ہو جاتا تھا۔ موتی بیگم کا منھ جھریا کر بالکل کشمش ہو گیا ہے۔ نشور کہنے لگے،

میاں، تم اوروں پہ کیا ترس کھاتے پھرتے ہو۔ ذرا اپنی صورت تو ۴۷ کے پاسپورٹ فوٹو سے ملا کے دیکھو۔

کون ٹھہرے سمے کے دھارے پر

کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک

کوئی کل ہند مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا جس میں نشور نہ بلائے جائیں۔ غالباً کسی شاعر کو اتنا معاوضہ نہیں ملتا جتنا انہیں ملتا ہے۔ بڑی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ گھر میں فرنیچر بھی ہے۔ مگر اپنی دیرینہ وضع پر قائم ہیں۔ طبیعت معمول پر تھی۔ یعنی بہت خراب۔ میں ملنے جاتا تو بان کی کھری چارپائی پر لیٹے سے اُٹھ بیٹھتے اور تمام وقت بنیان پہنے تکیے پر اکڑوں بیٹھے رہتے۔ اکثر دیکھا کہ پیٹ پر چارپائی کے بانوں کا نالی دار ''پیٹرن'' بنا ہوا ہے۔ ایک دن میں نے کہا کہ پلیٹ فارم پر جب اناؤنسمنٹ ہوا کہ ٹرین اپنے نردھارت سمے سے ڈھائی گھنٹہ ولمبھ سے پرویش کر رہی ہے تو بخدا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹرین کیا کر رہی ہے۔ آ رہی ہے یا جا رہی ہے۔ یا ڈھائی گھنٹے سے محض کلیلیں کر رہی ہے۔ یہ سننا تھا کہ نشور بگڑ گئے۔ جوشِ بیاں میں تکیے پر سے بار بار پھسلے پڑتے تھے۔ ایک مشتعل لمحے میں زیادہ پھسل گئے تو بانوں کی جھری میں پیر کے انگوٹھے کو گھائی

تک پھنسا کے فٹ بریک لگایا اور ایک دم تن کے بیٹھ گئے۔ کہنے لگے ”ہندوستان میں اُردُو کو مٹانا آسان نہیں۔ پاکستان میں پانچ برس میں اتنے مشاعرے نہیں ہوتے ہوں گے جتنے ہندوستان میں پانچ مہینے میں ہو جاتے ہیں۔ پندرہ بیس ہزار کا مجمع تو گویا کوئی بات ہی نہیں۔ اچھا شاعر بآسانی پانچ سات ہزار پیٹ لیتا ہے۔ کرایہ ریل، قیام و طعام اور داد اس کے علارہ۔ جوش نے بڑی جلد بازی کی، ناحق چلے گئے۔ اب پچھتاتے ہیں“۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ جوش کو سات آٹھ ہزار ماہوار۔ اور کار۔ دو بینکوں اور ایک انشورنس کمپنی کی طرف سے مل رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے مشاہرہ اور مکان علیحدہ گو کہ اس کی نوعیت وظیفہ عتاب کی سی ہے۔

ترنم میں اب نشور کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ ٹھہر ٹھہر کی پڑھتے ہیں مگر آواز میں اب بھی وہی سوز اور گمک ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں وہی چمک۔ تیور اور لہجے میں کھرج اور نڈر پن جو صرف اس وقت آتا ہے جب آدمی زر ہی نہیں، زندگی اور دنیا کو بھی ہیچ سمجھنے لگے۔ دس بارہ تازہ غزلیں سنائیں۔ کیا کہنے، منھ پر آتے آتے رہ گئی کہ ڈینچر ز لگا کر سنایئے۔ آپ نے تو انہیں بارہا سنا ہے۔ ایک زمانے میں "یہ باتیں راز کی ہیں قبلہ عالم بھی پیتے ہیں“ والی غزل سے سارے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ مگر اب ”دولت کبھی ایماں لا نہ سکی، سرمایہ مسلماں ہو نہ

سکا" والے اشعار پر داد کے ڈونگے نہیں برستے۔ سننے والوں کا مزاج بدلا ہوا ہے۔ سکوتِ سامعین بھی ایک نوع کی بے صدا ہوٹنگ ہے۔ اگر استاد داغ یا نواب سائل دہلوی بھی آج اپنی وہ توپ غزلیں پڑھیں جن سے ستر اسی برس قبل چھتیں اُڑ جاتی تھیں تو سامعین کی بدذوقی سے تنگ آکر اٹھ کھڑے ہوں۔ مگر اب نشور کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ مشاعرے اب بھی لوٹ لیتے ہیں، سدا کے ملنگ ہیں۔ کہہ رہے تھے، اب کوئی تمنا، کوئی حسرت باقی نہیں۔ میں نے تو انہیں ہمیشہ بیمار، نحیف و نزار، مفلوک الحال اور مطمئن و مسرور ہی دیکھا۔ ان کے وقار و تمکنت میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اہلِ ثروت سے کبھی پچک کے نہیں ملے۔ صاحب، یہ نسل ہی کچھ اور تھی۔ وہ سانچے ہی ٹوٹ گئے جن میں یہ آشفتہ مزاج کردار ڈھلتے تھے۔ بھلا بتائیے اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی سے زیادہ مدمغ اور خودّدار اور کون ہو گا۔ وسیلہ معاش؟ عینکیں بیچنا، وہ بھی دکان یا اپنے ٹھیلے پر نہیں۔ جہاں بھی پیٹ کا دھندا لے جائے۔ نشور سے میری دوستی تو ابھی حال میں چالیس پچاس برس سے ہوئی ہے، ورنہ اس سے قبل دوسرا ہی رشتہ تھا۔ میں نے قصائیوں کے محلے میں واقع مدرسہ ضیاالاسلام میں فارسی ان ہی سے پڑھی تھی۔ اور ہاں اب اس محلے کے قصائی پوتھ کی اچکن اور سرخ

پیپٹنٹ لیدر کے پمپ شوز نہیں پہنتے۔ اس زمانے میں کوئی شخص اپنی برادری کا مروجہ لباس ترک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا حقّہ پانی بند کر دیا جاتا تھا۔

دوبارہ رشوت دینے کو جی چاہتا ہے۔

جانے پہچانے بازار اب پہچانے نہیں جاتے۔ پر ایسے خلیق دکاندار نہیں دیکھے۔ بچھے جاتے تھے۔ دکان میں قدم رکھتے ہی ٹھنڈی بوتل ہاتھ میں تھما دیتے۔ مجھے ایسی ظالم سیلز مین شپ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ بوتل پی کے دکان سے خالی ہاتھ نکلنا بڑی بے غیرتی کی بات معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ سیلز مینوں کی پسند کی چیزیں خریدتا چلا گیا۔ اپنی ضرورت اور فرمائش کی چیزیں خریدنے کے لیے پیسے ہی نہیں رہے۔ یقین نہیں آیا کہ جہاں اس وقت دھکم پیل، چیخم دھاڑ مچ رہی ہے اور بدبوؤں کے بگولے منڈلا رہے ہیں، یہ وہی کشادہ، صاف ستھری مال بلکہ دی مال ہے۔ صاحب انگریز نے ہر شہر میں دی مال ضرور بنائی۔ فیشن ایبل، اونچی دکانوں والی مال، زرداروں کی زر گزر کہیے۔ ابھی کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مال کے کنارے کافی دور تک ببول کی چھال بچھی ہوتی تھی، تاکہ کوتوال کے لونڈے کے گھوڑے کو دُلکی چلنے میں آسانی رہے۔ دائیں بائیں دو سائیس ننگے پیر ساتھ ساتھ دوڑتے جاتے کہ لونڈا اگر نہ جائے۔ وہ ہانپنے لگتے تو وہ ہنسی سے دہرا ہو ہو

جاتا۔ ہماری اس سے شناسائی ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ ہم پندرہ بیس دوستوں کو بہرائچ کے پاس اپنے گاؤں شکار پر لے گیا۔ ہر پانچ افراد کے لیے ایک علیحدہ خیمہ، خیموں کے عقب میں ایک مودب فاصلے پر شاگرد پیشہ کی چھولداری۔ ہم خیمے ہی میں شب باش ہوتے۔ کیا بتاؤں جنگل میں کیسے عیش رہے۔ ایک رات مجرا بھی ہوا۔ صورت اتنی اچھی تھی کہ بخدا غلط تلفّظ پر بھی پیار آنے لگا۔ پیشہ ور شکاری روزانہ شکار مار کے لے آتے تھے جسے باورچی لکڑیوں اور چھپٹیوں کی آگ پر بھونتے۔ ہمارے ذمے تو صرف ہضم کرنا اور یہ بتانا تھا کہ کل کون کس جانور کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ سانبھر کا گوشت پہلے پہل وہیں چکھا۔ آخری شام چار بھنے ہوئے سالم کالے ہرن دسترخوان پر سجا دیے گئے۔ ہر ہرن کے اندر ایک قاز اور قاز میں تیتر اور تیتر کے پیٹ میں مرغی کا انڈا۔ ہماری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کھاتے کیا خاک۔ کانپور کا وہ کوتوال حد درجہ لائق، معاملہ فہم، اور انتہائی خلیق اور اسی درجہ بے ایمان تھا۔ صاحب، آپ راشی، زانی اور شرابی کو ہمیشہ خوش اخلاق، ملنسار اور میٹھا پائیں گے۔ اس واسطے کہ وہ نخوت، سخت گیری اور بدمزاجی افورڈ کر ہی نہیں سکتا۔ اس لڑکے نے کچھ کر کے نہیں دیا۔ جگر کے سروس میں مرا۔ اس کا چھوٹا بھائی پاکستان آ گیا۔ لوگوں نے کہہ سن کے ماری پور کے اسکول میں ٹیچر لگوا دیا تھا۔ کوئی تین برس پہلے

میرے پاس آیا تھا۔ کہنے لگا میں بی ٹی نہیں ہوں۔ قلیل تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا۔ سعود آباد سے ماری پور جاتا ہوں۔ دو جگہ بس بدلنی پڑتی ہے۔ آدھی تنخواہ تو بس کے کرائے میں نکل جاتی ہے۔ اپنے ہاں منشی رکھ لیجیے۔ اس کی تین جوان بیٹیاں کنواری بیٹھی تھیں۔ ایک کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ وہ جل کر مر گئی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ خود اسے دو ہارٹ اٹیک ہو چکے تھے۔ جنہیں اس نے سکول والوں سے چھپایا، ورنہ وہ گئی گزری ملازمت بھی جاتی رہتی۔

کوتوال سارے شہر کا، غنڈوں سمیت، بادشاہ ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ جسے چاہے ذلیل کر دے۔ صاحب، مرزا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو سال کے پوست کندہ حالات پڑھنے کے بعد ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تین محکمے ایسے ہیں جو روزِ اوّل سے بے ایمان ہیں۔ اوّل پولیس، دوم پی ڈبلیو ڈی، سوم انکم ٹیکس۔ اب ان میں میرے طرف سے اینٹی کرپشن کے محکمے کا اضافہ کر لیجیے۔ یہ صرف رشوت لینے والوں سے رشوت لیتا ہے۔ رشوت ہندوستان میں بھی خوب چلتی ہے۔ مجھے بھی تھوڑا بہت ذاتی تجربہ ہوا۔ مگر صاحب، ہندو رشوت لینے میں بھی ایسی نمرتا (انکسار) ایسا اخلاق اور اعتدال برتتا ہے کہ واللہ دوبارہ دینے کو جی چاہتا ہے۔

اور صاحب، عجز و انکسار کا یہ حال کہ کیا ہندو کیا مسلمان، کیا بوڑھا کیا جوان، سب بڑی نمر تا سے ہاتھ جوڑ کر سلام پرنام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لیڈر تقریر سے پہلے اور تقریر کے بعد اور بڑے سے بڑا اسنگیت سمراٹ تھی پکے راگ گانے سے پہلے اور گانے کے بعد انتہائی عاجزی کے ساتھ سامعین کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے بگوش و بچشم خود ایک مشاعرے میں حضرت علی سردار جعفری کو دو بارہ طویل نظمیں سنانے کے بعد ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈائس سے اُترتے دیکھا۔ (خیر ایسی واردات کے بعد ہاتھ جوڑنے کی وجہ ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے)۔

۳

بازارِ حُسن پہ کیا گزری

اور صاحب، مول گنج دیکھ کے تو کلیجا منھ کو آنے لگا۔ یہاں بازارِ حُسن ہوا کرتا تھا۔ آپ بھی دل میں کیا کہتے ہوں گے کہ عجیب آدمی ہے۔ ڈبل حاجی، ماتھے پر گٹا، مگر ہر قصے میں طوائف کو ضرور کانوں میں گھسیٹتا ہے۔ کیا کروں۔ ہماری نسل تو ترستی پھڑکتی ہی بوڑھی ہو گئی۔ اس زمانے میں طوائف ادب اور اعصاب پر بری

طرح سوار تھی۔ کوئی جوانی اور کہانی اس کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ رنڈی واحد پرائی عورت تھی جسے نظر بھر کے دیکھ سکتے تھے۔ ورنہ ہر وہ عورت جس سے نکاح جائز ہو، منھ ڈھانکے رہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اب طوائفوں نے گرہستنوں کے سے شریفانہ لباس اور وضع قطع اپنا لی ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ نیک بختو، اسی چیز سے تو گھبرا کے دُکھیا تمہارے پاس آتے تھے۔ گرہستی، پاکیزگی اور یک رنگی سے اکتائے ہوئے لوگ اجنبی بدن سرائے میں رات برات بسرام کے لیے آجاتے تھے۔ سو یہ آسرا بھی نہ رہا۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مُول گنج میں بازارِ حسن ہوا کرتا تھا۔ زمانے بھر کی دُر دُر ہش ہش کے بعد طوائفوں نے اب روٹی والی گلی میں پناہ لی ہے۔ بازار کا ہے کو ہے۔ بس ایک گٹر ہے۔ یہاں سے وہاں تک۔ وہ جگہ بھی دیکھی جہاں پچاس برس قبل میں اور میاں تجمل حسین دیوار کر طرف منھ کر کے سیخ سے اترتے کباب کھایا کرتے تھے۔ جیسے چٹخارے دار کباب طوائفوں کے محلے میں ملتے تھے کہیں اور نہیں دیکھے۔ سوائے لکھنؤ کے مولوی محلے کے۔ گجرے بھی غضب کے ہوتے تھے۔ اور ہاں، آپ کے لیے اسلم روڈ کا ایک باکمال کبابیا ''ڈسکور'' کیا ہے۔ آپ کے لندن جانے سے پہلے بانگی پیش کروں گا۔ اور صاحب۔ کباب میں باہر کا اور پان ہمیشہ گھر کا کھایا۔ آپ نے کبھی طوائف کے ہاتھ کی گلوری کھائی

ہے؟ مگر آپ تو کہتے ہیں کہ اپنے ختنوں پر مجرے کے بعد آپ نے رنڈی کا ناچ ہی نہیں دیکھا۔ اور برسوں اسی امپریشن میں رہے کہ مجرا دیکھنے سے پہلے ہر دفعہ اس مرحلے سے گزرنا ضروری ہے، رنڈی کے ہاتھ کا پان کبھی نہیں رچتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بڈھوں، بھڑ بھڑیوں اور شاعروں کو پان نہیں رچتا۔ مگر آپ ناچیز کے ہونٹ دیکھ رہے ہیں۔ آداب، میاں تجمل گھر جانے سے پہلے رگڑ رگڑ کے ہونٹ صاف کرتے اور کباب اور پیاز کے بھبکے کو دبانے کے لیے جنتان کی گولی چوستے۔ حاجی صاحب (ان کے والد) چنیوٹ سے تازہ ولایت تھے اور سیخ کے کباب اور پان کو یوپی کی عیاشیوں میں شمار کرتے تھے۔ کہتے تھے، برخوردار، تمہیں جو کچھ کرنا ہے میرے سامنے کرو۔ لیکن بالفرضِ محال ان کے سامنے یہ شغل کیا جاتا تو کلہاڑی سے سر پھاڑ دیتے جو ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا کہ وہ ایک عرصے سے بطورِ ورزش روزانہ بعد فجر دس سیر لکڑی پھاڑتے تھے۔ آندھی پانی ہو تو مردانہ بیٹھک میں دس دس سیر کے رنگین مگدر گھما لیتے۔ وہ چنیوٹ سے تلاش معاش کے لیے نکلے تو ان کے والد یعنی میاں تجمل کے دادا نے انہیں راہ راست سے بھٹکنے سے باز رکھنے کے لیے ایک ہزار دانہ (تسبیح)، ایک جوڑی مگدر، کلہاڑی اور بیوی زادِ سفر میں ساتھ کر دی۔ اور کچھ غلط نہیں کیا۔ اس لیے کہ ان

آلات سے شغل کرنے کے بعد بدی تو ایک طرف رہی آدمی نیکی کرنے کے لائق بھی نہیں رہتا۔

مگر خدارا، آپ میری باتوں سے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیئے گا۔ بار بار طوائف اور کوٹھے کا ذکر آتا ہے۔ مگر "تمام ہو گئیں حل مشکلات کوٹھے پر" والا معاملہ نہیں۔ خدا گواہ ہے، بات کبھی پان اور کباب کھانے اور کوٹھے پر جانے والوں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے سے آگے نہ بڑھی۔ کبھی کبھی میاں تجمل بڑی حسرت سے کہتے کہ یار، یہ لوگ کتنے لکی ہیں، ان کے بزرگ یا تو فوت ہو چکے ہیں یا نابینا ہیں۔

بات یہ ہے کہ وہ زمانہ اور تھا۔ نئی پود پر جوانی آتی تو بزرگ نسل دوانی ہو جاتی تھی۔ سارے شہر کے لوگ ایک دوسرے کے چال چلن پر پہرہ دینا اپنا فرض سمجھتے تھے:

ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

بزرگ قدم قدم پر ہماری ناقابلِ استعمال جوانی کی چوکیداری کرتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہماری لغزشوں اور غلطیوں کو پکڑنے کے لیے اپنا بڑھاپا چوکنے وکٹ کیپر کر طرح حالتِ رکوع میں گزار دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر یہی کچھ ہونا تھا تو ہم جوان کاہے کو ہوئے تھے۔

صاحب، اپنی تو ساری جوانی دوانی ڈنڈ پیلنے اور بھینس کا دودھ پینے میں ہی گزر گئی۔ اب اسے دوانہ پن نہیں تو اور کیا کہیں ؟۔

کھلی آنکھوں سے گانا سننے والے

میرے والد، اللہ بخشے، تھیٹر اور گانے کے رسیا تھے۔ ایسے ویسے، جب موج میں ہوتے اور بیٹھک میں ہارمونیم بجاتے تو رستہ چلتے لوگ کھڑے ہو جاتے۔ بجاتے میں آنکھیں بند رکھتے۔ اس زمانے میں باذوق سننے والے بھی گانا سنتے وقت آنکھیں بند ہی رکھتے تھے تاکہ توجہ صرف سُر پر مرکوز رہے۔ البتہ طوائف کا گانا کھلی آنکھوں سے سننا جائز تھا۔ استاد بندو خان کی طرح والد کے منہ سے کبھی کبھی بے اختیار گانے کا بول نکل جاتا جو کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ ویسے باقاعدہ گاتے بھی تھے۔ مگر صرف اس کے سامنے جو خود بھی گاتا ہو۔ یہ اس زمانے کے شرفا کا دستور تھا۔ شاہد احمد دہلوی بھی یہی کرتے تھے۔ آپ نے تو والد کا بالکل آخری زمانہ دیکھا جب وہ صاحب۔ فراش ہو چکے تھے۔ جوانی میں ہیرا بائی کے گانے کے دلدادہ تھے۔ دادر کنٹھیا تھی، یعنی دوسروں میں قیامت ڈھاتی تھی۔ بیشتر مجرئی، میرا مطلب ہے بیٹھ کر گاتی تھی۔ سو میل کے دائرے میں کہیں اس کا گانا ہو، وہ سارا کام دھندا چھوڑ کر پہنچ جاتے۔ اتفاقاً کسی محفل میں نہ پہنچ پائیں تو وہ

خود بھی بے کیف سی رہتی۔ راجستھانی مانڈ اور بھیرو ٹھاٹھ صرف ان ہی کے لیے گاتی تھی۔ دھیوت اور رکھب سُروں کو لگاتے وقت ذرا تھم تھم کے انھیں جھلاتی تو ایک سماں باندھ دیتی۔ جیسی چونچال طبیعت پائی تھی ویسی ہی گائیکی تھی۔ درباری گاتے گاتے کبھی چنچل سُر لگا دیتی تو ساری محفل پھڑک اٹھتی۔ آپ کو تو بخوبی علم ہے۔ والد گھر کے رئیس نہیں تھے۔ عمارتی لکڑی کی چھوٹی سی دکان تھی۔ میری موجودہ دکان کی ایک چوتھائی سمجھیے۔ بس کام چلاؤ۔ لکڑ منڈی میں کسی کی دکان تین دن بند رہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ کسی قریبی رشتے دار کا انتقال ہو گیا ہے۔ چوتھے دن بند رہنے کا مطلب تھا کہ خود اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن والد صاحب کی دکان سات دن بھی بند رہے تو لوگ فکر مند نہیں ہوتے تھے۔ سمجھ جاتے کہ ہیرا بائی سے اپنے حسنِ سماعت کی داد لینے گئے ہیں۔ تاہم ان کے بندھے ہوئے گاہک لکڑی انھی سے خریدتے تھے۔ ہفتے ہفتے بھر واپسی کا انتظار کرتے۔ بلکہ آخر آخر تو یہ ہوا کہ تین چار گاہکوں کو بھی چاٹ لگا دی۔ وہ بھی ان کی اردلی میں ہیرا بائی کا گانا سننے جانے لگے۔ جب انھیں پوری طرح چسکا لگ گیا تو سواری کا انتظام، سہرا گانے پر بیل اور ہر اچھے شعر پر روپیہ دینے کے فرائض بھی انھیں ہی تفویض کر دیے۔ ہیرا بائی روپیہ اُن سے لیتی، سلام والد کو کرتی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ ان دکھیاروں کو موسیقی کی بھی

کچھ سوجھ بوجھ پیدا ہوئی یا نہیں، لیکن آخر میں وہ لکڑی خریدنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ ایک نے تو دوالا نکالنے کے بعد ہارمونیم مرمت کرنے کی دکان کھول لی۔ دوسرا اس لائق بھی نہ رہا۔ قرض خواہوں سے آبرو بچا کر بمبئی چلا گیا جہاں بغیر ٹکٹ کے روز تھیٹر دیکھتا اور مختار بیگم اور ماسٹر نثار کا گانا سنتا تھا۔ مطلب یہ کہ تھیٹر میں پردہ کھینچنے کے آنریری فرائض انجام دینے لگا۔ دن میں تُرکی ٹوپی کے پھندنے بیچتا تھا۔ سنا ہے اس زمانے میں داؤد سیٹھ بھی بمبئی میں پھندنے بیچا کرتا تھا۔ حالانکہ اس نے تو ہیرابائی کا گانا بھی نہیں سنا تھا۔

اور یہ جو آپ ٹھمری، دادرے اور خیال میں ناچیز کا ورک اور شغف دیکھ رہے ہیں، یہ باوا ہی کا فیضان ہے۔ اقبال بانو، ثریا ملتانیکر اور فریدہ خانم اب میری صورت پہچاننے لگی ہیں۔ مگر میاں تجمل کہتے ہیں کہ صورت سے نہیں، تمہارے سفید بالوں سے پہچانتی ہیں۔ ارے صاحب، گزشتہ سال جو ڈانس ٹروپ آیا تھا، اس کے شو میں خدا جھوٹ نہ بلوائے ہزار آدمی تو ہوں گے۔ میاں تجمل کا ٹکٹ بھی مجھی کو خریدنا پڑا۔ تیسرا حج کرنے کے بعد انھوں نے اپنے پیسے سے ناچ گانا اور سینما دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ کہنے لگے "اس جمِ غفیر و پُر تقصیر میں ایک آدمی بھی تم جیسا نہیں"۔ میں نے شکریہ ادا کیا "آداب !"، بولے "میرا مطلب ہے تمھاری طرح جُھڑوس نہیں۔ ایک آدمی نہیں جس کے تمام بال اور بھویں تک

تمھاری طرح سفید ہوں۔ بھائی میرے، یا تو انہیں کالے کرلو یا ڈانس مجرے سے توبہ کرلو"۔ میں نے کہا "بھائی تجمل، روسیاہی کے لیے تمھارے ساتھ اس کوچۂ ملامت کا طواف میرے لیے کافی ہے۔ میں بیک وقت اپنا منھ اور بال کالے نہیں کرنا چاہتا"۔

کوئی نماز اور مجرا قضا نہیں کیا

ویسے آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ والد نیک طینت، پابند صوم و صلوٰۃ اور پاکباز آدمی تھے۔ بحمد اللہ، ہم سب بھائی بہن پنج وقتہ نمازی ہیں۔ یہ بھی انہی کا فیضان ہے۔ انھوں نے کبھی کوئی نماز اور مجرا قضا نہیں کیا۔ ۲۳۔۱۹۲۲ کا ذکر ہے۔ جب ایک پارسی تھیٹریکل کمپنی پہلے پہل کانپور آئی تو ایک مہینے تک ایک ہی کھیل روزانہ۔ بلاناغہ۔ اس طرح دیکھا گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ چند ہی روز میں تھیٹر والوں سے ایسے گھل مل گئے کہ ڈائیلاگ میں تین چار جگہ حسبِ منشا تبدیلی کرائی۔ ایک موقعے پر داغ کے بجائے استاد ذوق کی غزل راگ ایمن کلیان میں گوائی۔ بِبو کو سمجھایا کہ تم ڈائیلاگ کے دوران بیک وقت آنکھیں بھی مٹکاتی ہو اور کمر اور کولھے بھی۔ موقعے کی مناسبت سے تینوں میں سے صرف ایک مہلک ہتھیار کا انتخاب کرلیا کرو۔ دو مرتبہ ہیرو کو سٹیج پر پہننے کے لیے اپنا

صاف پاجامہ دیا۔ مینجر کو آگاہ کیا کہ تم نے جس شخص کو لیلیٰ کا باپ بنایا ہے، اس کی عمر مجنوں سے بھی کم ہے۔ مصنوعی داڑھی کی آڑ میں وہ لیلیٰ کو جس نظر سے دیکھتا ہے اسے پدرانہ شفقت ہر گز نہیں کہا جا سکتا۔ ایک دن پیٹی ماسٹر دردِ گردہ سے نڈھال ہو گیا تو ہمارے باوا ہارمونیم بجانے بیٹھ گئے۔ عطرِ حنا میں بسا ریشمی رومال سر پر ڈال لیا۔ اور فرض کر لیا کہ کوئی نہیں پہچانے گا۔ سرخی مائل سپید رنگ، سپید چمکدار دانت، پتلے ہونٹ، کم ہنستے تھے، مگر جب ہنستے تو رخساروں پر سرخی اور آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگتے۔ ہر لباس ان پر پھبتا تھا۔ چنانچہ شیریں بات تو فرہاد سے کرتی، لیکن نظریں ہمارے باوا پر ہی جمائے رکھتی تھی۔

تھیٹر سے ان کا یہ شغف والدہ کو شاق گزرتا تھا۔ ہم بہن بھائی سیانے ہو گئے تو ایک دن والدہ نے ان سے کہا کہ "اب تو یہ شوق چھوڑ دیجیے۔ اولاد جوان ہو گئی ہے"۔ کہنے لگے "بیگم، تم بھی کمال کرتی ہو، جوان وہ ہوئے ہیں اور نیک چلنی کی تلقین مجھے کر رہی ہو"۔

انہیں یہ شوق جنون کی حد تک تھا۔ آغا حشر کاشمیری کو شیکسپیئر سے بڑا ڈراما نگار سمجھتے تھے۔ اس موازنے میں دانستہ ڈنڈی مارنے یا تعصّب کو ذرا دخل نہ تھا۔ انہوں نے سرے سے شیکسپیئر کو پڑھا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح ایک دفعہ اپنے

دوست پنڈت سورج نرائن شاستری سے اس بات پر لڑ مرے کہ داغ دہلوی کالی داس سے بڑا شاعر ہے۔ دورانِ موازنہ، دلیل میں زور پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کالی داس کو ایک ناقابل بیان گالی بھی دی جس کا پنڈت جی پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور انہوں نے (پنڈت جی نے) نواب سائل دہلوی جانشینِ داغ تک کو کالی داس سے بڑا تسلیم کرنے کے لیے از خود آمادگی ظاہر کی۔ جس دن آغا حشر کاشمیری کے انتقال کی خبر آئی تو والد کی جیبی گھڑی میں صبح کے دس بج رہے تھے۔ دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا، مگر اسی وقت دکان میں تالا ڈال کے گھر آ گئے۔ دن بھر منھ اوندھے پڑے رہے۔ پنڈت جی پرسا دینے آئے تو چادر سے منھ نکال کے بار بار پوچھتے پنڈت جی مختار بیگم اکا کیا بنے گا؟ پہاڑ سی جوانی کیسے کٹے گی؟ آخر کے تیئں پنڈت جی نے جواب دیا، خاں صاحب (وہ والد کو نہ جانے کیوں ہمیشہ خاں صاحب ہی کہتے تھے) ہر پہاڑ کو کوئی نہ کوئی تیشہ بردار فرہاد مل جاتا ہے۔ کلا کا سہاگ بھی کبھی اجڑا ہے؟ اس کی مانگ تو سدا سیندور اور ستاروں سے بھری رہے گی۔ والد جیسے ہی صبح گھر میں غم زدہ اور دل گرفتہ داخل ہوئے،

---

[1] جو آغا حشر کی منظور نظر مغنّیہ تھیں

برآمدے کی چقیں ڈال دیں اور والدہ سے کہا "بیگم ہم لُٹ گئے۔ آج گھر میں چولہا نہیں جلے گا"۔ سرِ شام ہی قلاقند کھا کے سو گئے۔

پنڈت جی موسیقی سے قطعاً نابلد تھے۔ لیکن بلا کے اداشناس اور اتنے ہی غمگسار۔ دوسرے دن صبح تڑکے والد صاحب سے بھی زیادہ دل گرفتہ اور غم زدہ صورت بنائے، آہیں بھرتے آئے۔ شیو بھی بڑھا ہوا تھا۔ گھر سے حلوہ پوری اور کاشی پھل کی ترکاری بنوا کر لائے تھے۔ والد کو ناشتہ کروایا۔ ہمیں تو اندیشہ ہو چلا تھا کہ والد کے ڈر کے مارے پنڈت جی کہیں بھدرا انہ کروالیں۔

آسمان سے اُترا، کوٹھے پہ اٹکا

معاف کیجیے، یہ قصّہ شاید میں پہلے بھی سنا چکا ہوں۔ آپ بور تو نہیں ہو رہے؟ ہر بار تفصلات میں کچھ فرق آجائے تو حافظے کا قصور ہے۔ غلط بیانی مقصود نہیں۔ باوا سے کبھی ہم ناٹک دیکھنے کی فرمائش کرتے تو وہ منیجر کو رقعہ لکھ دیتے کہ بچوں کو بھیج رہا ہوں۔ اگلی سیٹوں پر جگہ دیجیے۔ بعد کو تو میں خود ہی رقعہ لکھ کے باوا کے دستخط بنا دیتا تھا۔ یہ بات ان کے علم میں تھی۔ اس لیے کہ ایک دن جھنجھلا کر

---

[1] ہندو رسم کے مطابق قریبی عزیز کے کریا کرم کے بعد سر کے بال، بھویں، داڑھی اور مونچھ منڈانا

کہنے لگے ”جعلی دستخط بناتے ہو تو بناؤ، کم از کم املا کی غلطیوں سے تو مجھے رسوانہ کرو۔ صحیح لفظ ’براہِ کرم‘ ہے ’برائے کرم‘ نہیں۔ ہمیشہ میٹنی شو میں بھیجتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میٹنی شو میں کھیل کا مخرب اخلاق اثر، ٹکٹ کی قیمت کی طرح آدھارہ جاتا ہے۔ سب مجھے بچہ سمجھتے تھے، مگر اندر قیامت کی کھَدبَد مچی تھی۔ مُنّی بائی جب سٹیج پر گاتی تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ یہ وہ داغ والی مُنّی بائی حجاب نہیں۔ جس پر انہوں نے پوری مثنوی لکھ ڈالی۔ غضب کی آواز، بلا کی خوبصورت، پلک جھپکنے، سانس بھی لینے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے بھی خلل واقع ہوتا تھا۔ کیا شعر ہے وہ اچھا سا؟ ”وہ مخاطب بھی ہیں، قریب بھی ہیں“۔ آپ کو تو یاد ہو گا۔

(لقمہ) اُن کو دیکھوں کہ اُن سے بات کروں

شکریہ، صاحب، حافظہ بالکل چوپٹ ہو گیا ہے۔ محفل میں اوّل تو شعر یاد نہیں آتا۔ اور آ بھی جائے تو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ بالکل بے محل تھا۔ جیسا کہ اس وقت ہوا۔ دونی خِفّت ہوتی ہے۔ اس وقت دراصل ”نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے“ والا شعر پڑھنا چاہتا تھا۔ خیر، پھر کبھی۔ اس دن آپ نے برے تجربے کی بات کہی کہ بچپن کے بعد صرف ایک مصرعے پر قناعت کرنی

چاہیے۔ تو صاحب جس وقت مُنّی بائی استاد داغ کی غزل گاتی تو نہ اسے ہوش رہتا، نہ سننے والوں کو:

اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

مانا کہ داغ بحثیت عاشق، نرا رند شاہد باز ہے اور اس کا معشوق زنِ بازاری۔ لیکن پیرایہ اظہار بازاری نہیں۔ زبان جمنا میں دُھلی قلعۂ معلّیٰ کی ہے۔ محاورہ اور روز مرہ داغ کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مگر غضب یہ کیا کہ بچھانے کی چیز کو اوڑھ کر بستر صلائے عام پر دراز ہو گئے۔ حضرتِ داغ جہاں لیٹ گئے لیٹ گئے۔ بقول آپ کے مرزا عبدالودود بیگ کے، کلامِ داغ آسمانِ فصاحت سے اُترا، کوٹھے پہ اٹکا۔ وہاں سے پھسلا تو کولھے پہ آ کے مٹکا۔ لیکن فراق گورکھپوری کی سراسر زیادتی ہے کہ "اس شخص نے حرمزدگی کو genius کا مقام عطا کر دیا"۔ آپ نے تو خیر وہ زمانہ نہیں دیکھا، مگر آج بھی۔ کسی بھی محفلِ موسیقی میں۔ داغ کی غزل پِٹ نہیں سکتی۔ دیکھنے والوں نے داغ کی مقبولیت کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب مولانا عبدالسلام نیازی جیسے عالمِ بے بدل کو شاعری کا شوق چرایا تو داغ کے شاگرد ہو گئے۔ عقیدت کا یہ عالم کہ کوئی استاد کو شعر پڑھتا تو سبحان اللہ کہہ کر وہیں سجدے میں چلے جاتے، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ "زہرِ عشق" میں مُنّی بائی نے داغ

کی پانچ غزلیں گائیں۔ پانچوں لاجواب اور پانچوں کی پانچ بے محل۔ صاحب، سن ۴۷ء کے بعد رنڈیاں تو ایسی گئیں جیسے کسی نے لوکا لگا دیا ہو۔ اب ویسی شائستہ طوائفیں کہاں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اب ویسے قدرداں بھی نہیں رہے۔ نہ وہ غزنوی میں مذاق۔ الخ۔ ارے صاحب، آپ سے اس کم بخت الخ کا مطلب پوچھا تھا۔ آج تک بتا کے نہ دیا۔ اور یہ جو آپ کہتے ہیں کہ آپ کو فارسی بالکل نہیں آتی، تو یہ واقع میں سچ ہے یا محض رسمی کسرِ نفسی؟

چاندی کا کُشتہ اور چنیوٹ کی چلم

خوب یاد آیا۔ ہمارے ایک جاننے والے تھے، میاں نذیر احمد، چنیوٹ برادری سے تعلق تھا۔ چمڑے کے کاروبار کے سلسلے میں اکثر بمبئی جاتے رہتے تھے۔ وہاں ریس کا چسکا لگ گیا۔ گھوڑوں سے جو کمائی بچ رہتی، اس میں غریبامئو گزر بسر کرتے۔ گلنار طوائف کے ساتھ دو بول پڑھوا لیے تھے۔ حجِ بیت اللہ کے بعد خود تائب ہوئی سو ہوئی، میاں نذیر احمد کو بھی بہت سی علّتوں سے توبہ کروادی۔ اور ان کے دن بھی پھِر گئے۔ وہ جو ادھیڑ عمر میں طوائفوں کی صورت پہ پھٹکار برسنے لگتی ہے اور آواز پھٹا بانس ہو جاتی ہے وہ کیفیت قطعی نہیں تھی۔ میلاد شریف خوب پڑھتی تھی۔ آواز میں غضب کا سوز تھا۔ جب سفید دوپٹے سے سر

ڈھانکے لہک لہک کر جامی کی نعت یا انیس کا مرثیہ پڑھتی تو لحن میں ہزار حلاوتیں،
ہزار عقیدتیں گھول دیتی۔ ہم چھُپ چھُپ کر سنتے۔ محرم میں کالے کپڑے اس
پر کھِلتے تھے۔ پاکستان آگئی تھی۔ برنس روڈ پر ادیب سہارنپوری کے فلیٹ سے
ذرا دور چھوٹا سا تین کمروں کا فلیٹ تھا۔ میاں صاحب جاڑوں میں بھی ململ کا کرتا
پہنتے اور صبح ٹھنڈے یَخ پانی سے غسل کر کے لسّی پیتے تھے۔ مشہور تھا کہ فوری
طاقت کے ہوکے میں ڈھیر سارا رُوپ رس یعنی چاندی کا ادھ کچا کشتہ کھا بیٹھے
تھے۔ گلنار کی چھوٹی بہنیں مُنّی اور چُنّی بھی آفت کی پرکالہ تھیں۔ آپ نے بھی
تو ایک دفعہ کسی چھوٹی الائچی اور بڑی الائچی کا ذکر کیا تھا۔ بس کچھ ویسا ہی نقشہ
تھا۔ افسوس اب کھانوں میں بڑی الائچی کا استعمال ختم ہوتا جارہا ہے۔ حالانکہ
اس کی مہک، اس کا ذائقہ ہی اور ہے۔ آپ تو خیر بڑی الائچی سے چڑتے ہیں۔
مجھے تو کسی طرف سے بھی کاکروچ جیسی نہیں لگتی۔ تو صاحب مُنّی بیگم کا چہرہ اور
بھرے بھرے بازو کچھ ایسے تھے کہ کچھ بھی پہن لے، ننگی ننگی سی لگتی تھی۔ یو
نو واٹ آئی مین، چُنّی بیگم فارسی غزلیں خوب گاتی تھی۔ لوگ بار بار فرمائش
کرتے۔ وہ بھی عموماً بیٹھ کر گاتی تھی۔ کبھی داد کم ملتی یا یوں ہی ترنگ آتی تو یکایک

اٹھ کھڑی ہوتی۔ دونوں سارنگیئے اور طبلچی ا بھی اپنے اپنے زرین پٹکے کس لیتے اور استادہ ہو کر سنگت کرتے۔ محفل میں دو تین چکر رقصاں لگاتی۔ پھر قلبِ بساط پر کھڑے ہو کر ایک ہی جگہ پھر کی کی مانند تیزی سے گھومنے لگتی۔ زردوزی کی لشکارامارتی پشواز ہر چکر کے بعد اونچی اٹھتے اٹھتے تابۂ کمر پہنچ جاتی۔ یوں لگتا جیسے جگنوؤں کا ایک ہالہ رقص میں ہے۔ لے اور گردش تیز، اور تیز ہوتی، کرن سے کرن میں آگ لگتی چلی جاتی۔ پھر ناچنے والی نظر نہ آتی۔ صرف ناچ نظر آتا تھا۔

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلہ پُر پیچ و تاب

اور جب یکایک رکتی تو پشواز سڈول ٹانگوں پر امر بیل کی طرح ترچھی لپٹتی چلی جاتی۔ ساز ندے ہانپنے لگتے اور کھِرن [2] پر طبلچی کی تناتی ہوئی انگلیوں سے لگتا خون اب ٹپکا کہ اب ٹپکا۔

---

[1] اس زمانے میں سارنگی اور طبلہ بجانے والے کو سارنگیا اور طبلچی کہتے تھے۔ یعنی طبلہ بجانا ہی کہا جاتا تھا۔ طبلہ بجانے والا اپنے ہنر سے شرمندہ نہیں تھا۔ طبلے کو "نوازنے" اور طبلہ نواز کہلانے کی ضرورت ابھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

[2] وہ سیاہ حلقہ جو طبلے پر ہوتا ہے

دیکھیے میں پھر بھٹک کر اسی لعنت مارے بازار میں جا نکلا۔ آپ نے نوٹس لینے بند کر دیئے۔ بور ہو گئے؟ یا میں واقعات کو دہرا رہا ہوں؟ وعدہ ہے، اب کسی طوائف کو، خواہ وہ کتنی ہی آفتِ جاں کیوں نہ ہو، اپنے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہونے دوں گا۔ صاحب، ہماری تو باتیں ہی باتیں ہیں۔

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا

پرسوں آپ لندن چلے جائیں گے۔ میر ہی نے بے ثباتی پر اپنے ایک شعر میں مجمعِ یاران کو "مجلسِ رواں" کہا ہے کہ یہاں ہر یار سفری اور ہر صحبت گزراں ہے۔ تو صاحب، ذکر میاں نذیر احمد کا ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کانپور کے ۱۰۴ ڈگری ٹمپریچر سے گھبرا کر مئی کا مہینہ بڑی پابندی سے چنیوٹ کی ۱۰۴ ڈگری میں گزارتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ چنیوٹ کی لُو کانپور کی لُو سے بہتر ہوتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں شیکسپیئر کے گیت کی درگت بناتے تھے:

Blow, blow thou Chiniot "loo",

Thou art not so unkind,

As local specimens of mankind,

میاں صاحب اکثر فرماتے کہ قدرت کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ چنیوٹ
کی گرمی میں سال بھر کے جمع شدہ فاسد خیالات پسینے کی راہ خارج ہو جاتے ہیں۔
روزے کبھی ریس اور بیماری کی حالت میں بھی نہیں چھوڑے۔ مئی جون میں
بھی ایک ڈلی لاہوری نمک کی چاٹ کر حقّے کے معدے تک اُتر جانے والے کَش
سے افطار کرتے۔ پہلے تین چار مرتبہ یوں ہی امتحاناً گڑگڑاتے۔ جیسے سنگت
کرنے سے پہلے ستار بجانے والے مضراب سے تاروں کی کساوٹ کو اور طبلچی
ہتھوڑی سے طبلے کے رگ پٹھوں کو ٹھونک بجا کے ٹیسٹ کرتا ہے۔ پھر ایک ہی
سسکی بھرے کش میں سارے تمباکو کا انس (ست۔ جان) نکال لیتے۔ بلکہ اپنی
جان سے بھی گزر جاتے۔ س س س سوع سوع، سو سو وووو۔۔۔ووو، ہاتھ پیر
ڈھیلے پڑ جاتے، ٹھنڈے پسینے آنے لگتے، پُتلیاں اُوپر چڑھ جاتیں۔ پہلے بے
ست، پھر بے سدھ ہو کر وہیں کے وہیں پڑے رہ جاتے۔ گلنار انہیں شربت انار
پلا کر نماز کے لیے کھڑا کرتی۔ حقّے کی نےَ پر چنبیلی کے ہار اور نیچہ پر خَس لپٹی
ہوتی۔ تمباکو تیز اور کڑوا، بے پناہ پسند کرتے تھے۔ قوام لکھنؤ سے منگواتے۔
چاندی کے مُنھال دلّی کے ایک سادہ کار سے گھڑوائی تھی۔ مٹی کی چلم اور توا(

مٹی کو گول ٹکیا جو تمبا کو اور انگاروں کے درمیان رکھتے ہیں) ہمیشہ چنیوٹ سے آتا تھا۔ فرماتے تھے بادشاہو، اس مٹی کی خوشبو الگ سے آتی ہے۔

لاہور میں آج بسنت ہے

میاں نذیر احمد شنکرات کے دن کڑکڑاتے جاڑے میں ململ کا کُرتا پہنے ننگے سر چھت پر پتنگ ضرور اڑاتے۔ یہ بھی ان کا بھولپن ہی تھا کہ ململ کے کُرتے کو جوانی کا سرٹیفکیٹ اور اشتہار سمجھ کر پہنتے تھے۔ ہم تین چار لڑکے چوری چھپے ان کی خوشبودار مرواریدی معجونیں فقط مٹھاس کے لالچ میں کھاتے، مگر دل ہی دل میں ان کے معجزانہ اثرات کے ہفتوں منتظر رہتے۔ میاں صاحب لحاف صرف اس وقت اوڑھتے جب ہلہلا کے جاڑے سے بخار چڑھتا۔ یو پی کے جاڑے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حقارت سے کہتے "بادشاہو، یہ بھی کوئی سردی ہے"۔ دراصل لاہور کے جاڑے کے بعد وہ صرف ملیریا کے جاڑے کے قائل تھے۔ آپ کے مرزا عبدالودود بیگ بھی تو یہی الزام لگاتے ہیں نا، کہ یو پی کے کلچر میں جاڑے کو رَج کے celebrate کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ جب کہ پنجاب میں گرمی کے اس طرح چونچلے اور غمزے نہیں اٹھائے جاتے جس طرح یوپی میں۔ صاحب، یوپی میں جاڑے اور پنجاب میں گرمی کو محض سالانہ سزا کے

طور پر برداشت کیا جاتا ہے۔ کم و بیش اسی نوع کا فرق برسات میں نظر آتا ہے۔ پنجاب میں بارش کو فقط اس لیے انگیز کرتے ہیں کہ اس کے بغیر فصلیں نہیں اُگ سکتیں۔ جب کہ یو پی میں ساون کا واحد مقصد و مصرف یہ نظر آتا ہے کہ کڑھائی چڑھے گی۔ درختوں پر آم اور جھولے لٹکیں گے۔ اور جھولوں میں کنواریاں بالیاں۔ پنجاب میں درختوں پر آم یا کچھ اور لٹکنے کی ایسی خوشی صرف طوطوں کو ہوتی ہے۔

اور انگلینڈ میں بارش کا فائدہ جو سال ۳۴۵ دن ہوتی ہے (بقیہ بیس دن برفباری ہوتی ہے) آپ یہ بتاتے ہیں کہ اس سے شائستگی اور خوش اخلاقی فروغ پاتی ہے۔ مطلب یہ کہ جو گالیاں انگریز بصورتِ دیگر ایک دوسرے کو دیتے وہ اب موسم کو دیتے ہیں۔

شنکرات کے دن میاں نذیر احمد پیچ و پیچ تو کیا خاک لڑاتے، بس چھ سات پتنگیں کٹوا اور ڈور لٹوا کر اپنا۔ اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا۔ جی خوش کر لیتے تھے۔ ہر پتنگ کٹوانے کے بعد لاہور کے مانجھے کو بے تحاشا یاد کرتے۔ ارے صاحب، پتنگ کٹتی نہیں تو اور کیا۔ پیچ کانپور میں لڑاتے اور قصّے لاہور کے بسنت کے رنگ رنگیلے آسمان کے سناتے جاتے۔ نظر بھی خاصی کمزور ہو چلی تھی۔ لیکن عینک

صرف نوٹ گننے اور مچھلی کھاتے وقت طوعاً و کرعاً لگا لیتے تھے۔ عینک نہ لگانے کا ایک ضمنی نتیجہ یہ نکلتا کہ جس پتنگ کو وہ حریف کی پتنگ سمجھ کر بے تحاشا "کھینچ" کرتے، وہ دراصل ان کی اپنی ہی پتنگ نکلتی جو چند لمحوں بعد پہلے ہی مخالف رگڑے سے کٹ کر ہوا میں لالچی کی نیّت کی طرح ڈانواں ڈول ہونے لگتی۔ ڈور یکایک لجلجی پڑ جاتی تو انہیں پتہ چلتا کہ کٹی پتنگ تیری، ڈور اب سمیٹا کر۔ میاں صاحب اکثر فرماتے کہ پتنگ اور کنکوّے بنانے میں تو بے شک لکھنؤ والوں کا جواب نہیں، لیکن بادشاہو، ہوا لاہور ہی کی بہتر ہے۔ سچ پوچھو تو پتنگ لاہور ہی کی ہوا میں پیٹا چھوڑے (جھول کھائے) بغیر ڈور پہ ڈور پیتی اور زور دکھاتی ہے۔ پتنگ کے رنگ اور مانجھے کے جوہر تو لاہور ہی کے آسمان میں کھلتے اور نکھرتے ہیں۔ کانپور میں "وہ کاٹا" اس طرح کہتے ہیں جیسے معذرت، بلکہ تعزیت کر رہے ہوں۔ لاہور کے "بو کاٹا" میں پچھڑے ہوئے پہلوان کی چھاتی پر چڑھے ہوئے پہلوان کا نعرہ سنائی دیتا ہے۔ بلکہ پسینے میں شرابور جسم سے چمٹی ہوئی اکھاڑے کی مٹی تک نظر آتی ہے۔

میاں صاحب کی چرخی لاہور ہی کے ایک زندہ دل پکڑتے جو حلیم کالج کانپور میں لیکچرار تھے۔ عبدالقادر نام تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ دونوں مل کر پتنگ کو مبالغے کا مانجھا اور یادوں کی الجھی سلجھی تل چانولی (دو رنگی) ڈور ایسی پلاتے کہ

چرخیاں کی چرخیاں خالی ہو جاتیں اور پتنگ آسمان پہ تارا ہو کے لاہور کی چوبرجی پہ جا نکلتی، جس نے ان کے وہ دن دیکھے تھے جب کوئی شے سادہ و بے رنگ نظر نہیں آتی:

غبار گلگوں ہے، آب رنگیں، زمیں ہے سرخ اور ہوا شہابی [1]

(یہاں بشارت کا بیان ختم اور خوابِ نیم روز شروع ہوتا ہے۔)

خواب نیم روز

اب یہ چڑھی پتنگ جو کچھ راوی پار دیکھتی، اس کا حال کچھ ان دونوں زندہ دلانِ لاہور کی، کچھ بشارت اور رہا سہا اس عاجز داستاں و پاستان طراز کی زبانی سنیے:

لاہور میں آج بسنت ہے۔ آیا بسنت پالا اُڑنت۔ جاتی رُت نے عجب سماں باندھا ہے۔ بسنتی لباس اور رخساروں پر اُترتے جاڑے کی سرخی غضب ڈھا رہی ہے۔ کھیتوں میں چار سُو سرسوں پھولی ہے۔ گلاب اور دیر سے کھلنے والے گل داؤدی

---

[1] ہوا شفق پوش، باغ و صحرا محیط ہے رنگِ لالہ و گل۔ (سراج اورنگ آبادی) اس پر مرزا کہتے ہیں کہ نوجوانی میں زیبرا بھی ملٹی کلرڈ دکھائی دیتا ہے۔

کی اپنی الگ بہار ہے۔ سرسوں، پتنگ، تتلی، پیرہن، پھول، رخسار۔۔۔ ایک گلستاں نظر آتا ہے گلستاں کے قریب۔

ہاں، لاہور میں آج بسنت ہے۔ رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں۔ بسنت اور برسات میں لاہور کا آسمان آپ کو کبھی بے رنگ، اکتایا ہوا اور نچلا نظر نہیں آئے گا۔ لاڈلے بچّے کی طرح چیخ چیخ کے ہمہ وقت اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ کہ ادھر دیکھو۔ اس وقت مجھے ایک اور شوخی سوجھی ہے۔ کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ کبھی تاروں بھرا۔ بچوں کی آنکھوں کی مانند جگمگ جگمگ۔ کبھی نوری فاصلوں پر کہکشاں کی افشاں۔ اور کبھی اودی گھٹاؤں سے زرتار باراں۔ کبھی تانبے کی طرح تپتے تپتے ایکا ایکی امرت برسانے لگا اور خشک کھیتوں اور اداس آنکھوں کو جل تھل کر گیا۔ ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہے۔ گھڑی بھر کو قرار نہیں۔ کبھی مہرباں، کبھی قہرِ بداماں۔ پل میں اگن کنڈ، پل میں نیل جھیل۔ ذرا دیر پہلے تھل، بیہڑ، صحراؤں کا غبار اٹھائے، لال پیلی آندھیوں سے بھرا بیٹھا تھا۔ پھر آپی آپ دھرتی کے گلے میں بانہیں ڈال کے کھل گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ سمندر جھاگ بادلوں کے بجرے پگھلے نیلم میں پھر تیرنے لگے۔ کل شام ڈھلے جب شفق پھولی تو یوں لگا جیسے زمین اور آسمان کا وہ ملگجا سنگم جو دہکتے سورج کو نگل گیا، اب سدا یوں ہی

تمتماتا رہے گا۔ پھر گرم ہوا ایکا ایکی تھم گئی۔ ساری فضا ایسے دم سادھے کھڑی تھی کہ پتا نہیں ہلتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بادل گھر آئے۔ اور پچھلے پہر تک بجلی کے ترشول آسماں پر لپکتے، لہراتے رہے۔ پر آج سہ پہر نہ جانے کیا دل میں آئی کہ اچانک ایسا مور پنکھی نیلا ہوا کہ دیکھے سے رنگ چھوٹے۔ پہر رات گئے تک اپنی شفاف نیلاہٹیں راوی کی چاندنی میں گھولتا رہا۔

لاہور کے آسمان سے زیادہ خوب صورت اور زیادہ خوش رنگ و شوخ ادا تو صرف ایک چیز ہے۔ وہ ہے لاہور کی گل زمین۔ چار سو برس پہلے بھی یہ زمین فلک رنگ ایسی ہی تھی۔ جبھی تو نور جہاں نے کہا تھا:

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم

جاں دادہ ایم جنتِ دیگر خریدہ ایم

سو نور جہاں نے تو جان کے عوض جنتِ لاہور میں دو گز زمین خرید لی۔ مگر زندہ دلانِ لاہور نے اس جاندادہ ہوائے لاہور کو یاد رکھنے کی طرح یاد نہ رکھا۔ نور جہاں کے قطعہ جنت میں اب ابابیلوں کا بسیرا ہے۔

لیکن صاحبو، دھنک کے اس پار وہ خوابوں کا شہر تو اب شہر دو قصّہ ہو گیا اور اس کی تلاش میں جو شہزادہ چوتھی کھونٹ نکل گیا تھا وہ کبھی کا دو لخت ہوا۔ اب یہ

بستی اور، زمین اور ہے۔ یہ ہر کس و ناکس پر گئے دنوں کے رُوپ سروپ کے بھید بھاؤ اور لبھاؤ نہیں کھولتی۔ انہیں دیکھنے کے لیے پیری کی آنکھ اور بچپن کی رنگین دوربین[1] چاہیے۔ یہ ہوں تو پھر ہر شہر، شہر دو قصّہ دکھلائی دیتا ہے۔

خواب نیم روز ختم ہوا۔ اب بقیہ کہانی بشارت کی زبانی انھی کے داستاں در داستاں انداز میں سنیے۔ طول دینا ہی مزہ ہے قصّہ کوتاہ کا۔ جہاں تک قلم اور یادداشت ساتھ دے گی، ہم ان کا مخصوص محاورہ اور لہجہ۔۔۔ اور لہجے کی للک اور لٹک ۔۔۔ جوں کی توں برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک دفعہ کہانی شروع کر دیں تو ان کا جملہ معترضہ اور غیر متعلق جزئیات بھی الگ اپنی کہانی سنانے لگتے ہیں۔ ہنکارا بھرنے کی مہلت بھی نہیں دیتے۔ مرزا ایسے شکنجے میں جکڑے جانے کو کہانی کاٹھ کہتے ہیں۔ کولرج کے Ancient Mariner نے جب اپنی آپبیتی کہانی شروع کی تو شادی کے جشن اور دعوت میں جانے والا مہمان ایسا مسحور ہوا کہ شادی وادی سب بھول گیا۔ مبہوت کھڑا سنتا رہا۔ بس کچھ ایسا ہی احوال ہمارا بھی ہوا:

[1] Kaleidoscope اسے بچپن کی حیرت بین یا دھنک درشن کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس میں کانچ کے رنگ برنگے ٹکڑے ہوتے ہیں جو ہر جنبش کے ساتھ طرح طرح کے رنگ، شکلیں اور پیٹرن اختیار کرتے چلے جاتے ہیں

He holds him with his glittering eye

Guest stood still۔The wedding

And listens like a three year's child

The Mariner hath his will

۴

میں ابنِ بطوطہ، میرا لکھا مخطوطہ

تو صاحب، میاں نذیر احمد کا مکان بھی دیکھنے گیا۔ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں، اس مکان سے، مگر اب پہچانا نہیں جاتا۔ خاصی فیس ''لفٹنگ'' ہوئی ہے۔ تین ایئر کنڈیشنر چل رہے تھے۔ بر آمدے میں ایک سن رسیدہ سردار جی کنگھا ہاتھ میں پکڑے جوڑا باندھ رہے تھے۔ صرف یہی ایسا مکان ہے جو پہلے سے بہتر حالت میں نظر آیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور غایتِ آمد بیان کی تو خوشی خوشی اندر لے گئے۔ بڑی خاطریں کیں۔ دیر تک اپنی جنم بھوم گوجرانوالہ کا حال احوال پوچھتے رہے۔ میں گھڑ گھڑ کے سناتا رہا۔ اور کیا کرتا؟ ایک سال پہلے منی بس میں گوجرانوالہ سے گزرا تھا۔ اس ایک اسٹیپ شاٹ کو انلارج کر کے اُردُو کا بیسٹ

سیلر سفر نامہ بنا دیا۔ خیر، آپ تو ایسے سفر نامے چٹخارے لے کر پڑھتے ہیں۔ یہ تو مانا کہ بقول آتش:

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

لیکن اس سفر نویسوں کی رال سے رقم کی ہوئی داستانوں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بس آدمی ایک دفعہ اپنی منکوحہ سے پِنڈ چھڑا کے گھر سے نکل پڑے، پھر عیش ہی عیش ہیں۔ قدم قدم پہ شجر سایہ دار، ہر شجر میں ہزار ہا شاخیں اور ہر شاخ پر چار چار عفیفائیں اس انتظار میں لٹکی پڑ رہی ہیں کہ جیسے ہی ڈان جو آن نیچے سے گزرے اس کی جھولی میں ٹپک پڑیں:

ہزار ہا زنِ امیدوار راہ میں ہے

گویا دیس دیس اور شہر شہر ہی نہیں، بلکہ "خانہ بخانہ، در بدر، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو" اس نا سفر جنسی فتوحات کی Odyssey بن جاتا ہے، جس میں مسافر ہر روز ہر عورت کو جو اس کا راستہ کاٹے اس کے کیفر (بد) کردار تک۔ یعنی اپنی آغوش تک۔ پہنچا کر دم لیتا ہے۔

روز اک تازہ سراپائے تفصیل کے ساتھ

پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم اے، ہر صفحے پر اسٹرپ ٹیز کرتی ہوئی ان مخدّراتِ عصمت آیات کے تذکرے کو ہرزہ سرائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہرزن سرائی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ آپ نے بہت اچھا کیا، اپنے پندرہ بیس ملکوں اور ایک ہزار صفحوں پر محیط سفر نامے کے نوٹ اپنے سرد خانے بلکہ مسترد خانے میں ڈال دیے۔ ارے صاحب، عجب ہوا چلی ہے۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدتے ہی، خواہ وہ دبئ اور سری لنکا ہی کا کیوں نہ ہو، ہر ادیب اپنے آپ کو ابنِ بطوطہ، اپنی تحریر کو مخطوطہ اور حسینوں سے اپنے خیالی مکالمے کو "ملفوظہ" سمجھنے لگتا ہے۔ مجھے آپ کی اس تجویز سے اتفاق ہے کہ جہاں حکومتِ پاکستان پاسپورٹ جاری کرنے سے پہلے یہ حلف نامہ لیتی ہے کہ درخواست دہندہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کاذب نبی سمجھتا ہے، وہاں ادیبوں سے ایک اور حلف نامہ بلکہ مچلکہ لینا چاہیے کہ واپس آکر سفر نامہ نہیں لکھیں گے اور خود پر بد چلنی کے الزام نہیں لگائیں گے۔

گوجرانوالہ، گوجرانوالہ ہے

سردار جی کرید کرید کے بڑے اشتیاق سے پوچھتے رہے اور میں بڑے وثوق سے گوجرانوالہ کا جھوٹا سچا حال سناتا رہا۔ انہوں نے آواز دے دے کے اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کو بلایا کہ ”ادھر آؤ۔ بشارت جی کو سلام کرو۔ یہ نومبر میں اپنے گوجرانوالہ ہو کے آئے ہیں“۔ ادھر میری یہ مصیبت کہ میں نے لاہور کے علاوہ پنجاب کا صرف ایک قصبہ یعنی ٹوبہ ٹیک سنگھ قریب سے دیکھا ہے۔ وہاں میرا ایک خورد، اکھن خالہ کا پوتا، ایگری کلچرل بینک میں تین مہینے کی ملازمت کے بعد گیارہ مہینے سے معطل پڑا تھا۔ بس اسی قصبے کے جغرافیے پر گوجرانوالہ کو قیاس کر کے ان کی تشنگی رفع کرتا رہا۔ حیرت اس پر ہوئی کہ سردار جی میری فرضی تفصیلات سے نہ صرف مطمئن ہوئے، بلکہ ایک ایک کی تصدیق کی۔ میں نے اس نہر کی موجودہ حالت کا بھی خیالی نقشہ کھینچ دیا جس میں سردار جی پُل پر سے چھلانگ لگا کے کنواری بھینسوں کے ساتھ تیراکی کرتے تھے۔ میں نے ان کے ضمنی سوال کے جواب میں یہ بھی اقرار کیا کہ پُل کی دائیں طرف کنال کے ڈھلوان پر جس ”ٹاہلی تھلے“ وہ اپنی ہر کولیز سائیکل اور کپڑے اتار کر رکھتے تھے وہ جگہ میں نے دیکھی ہے۔ یہاں سے ایک مرتبہ چور ان کے کپڑے اٹھا کے

لے گیا مگر سائیکل چھوڑ گیا۔ اس واقعے کے بعد سردار جی نے بہ نظر احتیاط سائیکل لانے چھوڑ دی۔ میں نے جب یہ ٹکڑا لگایا کہ وہ شیشم اب بالکل سوکھ گیا ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ بوڑھے تنے پر نیلامی آرا چل جائے تو سردار جی پر رقت طاری ہو گئی۔ حالانکہ ان کا اپنا حال اس شیشم سے کچھ بہتر نہ تھا۔ ان کی منجھلی بہو نے جو بہت شوخ اور خوش شکل تھی مجھ سے کہا کہ "بابو جی کو ابھی پچھلے مہینے ہی ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ آپ انہیں مت رلائیں، انکل"۔ اس کا انکل کہنا مجھے ذرا اچھا نہیں لگا۔ اور یہ تو مجھے آپ ہی سے معلوم ہوا کہ نہر میں بھینس نہیں تیر سکتی، خواہ وہ کنواری ہی کیوں نہ ہو۔

سردار جی میری کسی بات یا شوخ فقرے پر خوش ہوتے تو میرے زانو پر زور زور سے ہاتھ مارتے اور اندر سے لسّی کا ایک گلاس اور منگوا کر پلاتے۔ تیسرے گلاس کے بعد میں نے ٹائلٹ کا پتا پوچھا۔ اپنے زانو کو ان کے دستِ ستائش کی زد سے بچایا اور گفتگو میں حد درجہ احتیاط برتنی شروع کر دی کہ کہیں بے دھیانی میں کوئی شگفتہ فقرہ منھ سے نہ نکل جائے۔ سردار جی کہنے لگے کہ "ادھر اپنا ٹرانسپورٹ کا بڑا شاندار بزنس ہے۔ سارا ہندوستان گھوما ہوں۔ پر گوجرانوالہ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں کی مکئی اور سرسوں کے ساگ میں وہ سواد وہ سگندھ نہیں۔ اور گُڑ تو بالکل پھیکا پھوک ہے۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ یہاں کے پانی

میں پانی بہت ہے۔ جب کے گوجرانوالہ کے پانی میں شراب کی تاثیر ہے۔ اس سے ان کی مراد تھی، پانی میں طاقت ہے۔ وہ ہر مفیدِ صحت چیز کر شراب سے تشبیہ دیتے تھے۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے کہا، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف فرمائیے۔ بولے ''تو پھر کسی آتے جاتے کے ہاتھ لاہوری نمک کے تین چار بڑے سے ڈلے بھیج دینا''۔ ان کی تمنّا تھی کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ اپنے بیٹوں، پوتوں کو ساتھ لے کر گوجرانوالہ جائیں اور اپنے مڈل سکول کے سامنے کھڑے ہو کر فوٹو بنوائیں۔ تحفے میں مجھے انڈین raw سلک کا چھوٹا تھان دیا۔ چلنے لگا تو منجھلی بہو نے مجھے آداب کیا۔ اس دفعہ انکل نہیں کہا۔

عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

سردار جی نے مجھے سارا گھر دکھایا۔ بہوؤں نے لپک جھپک بکھری ہوئی چیزیں بڑے قرینے سے غلط جگہ پہ رکھ دی تھیں۔ جو چیزیں عجلت میں رکھی نہ جا سکیں انہیں سمیٹ کر بیڈ پر ڈال دیا اور اوپر صاف چادر ڈال دی۔ چنانچہ گھر میں جہاں جہاں صاف چادر نظر آئی، میں تاڑ گیا کہ نیچے کاٹھ کباڑ دفن ہے۔ صاحب، curiosity بھی بری بلا ہے۔ ایک کمرے میں، میں نے نظر بچا کر چادر کا کونا سرکایا تو نیچے سے سردار جی کے ماموں کیس کھولے ایک نہایت مختصر کچھنا پہنے

برآمد ہوئے۔ ان کی داڑھی اتنی لمبی اور گھنگھور تھی کہ اس تکلف کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ گھر کا نقشہ کافی بدل گیا ہے۔ گلنار جس محراب دار دریچے کی چق کے پیچھے سے مقیش کا جھلمل دوپٹہ اوڑھے جھانکا کرتی تھی۔ اب اسے تیغا کر دیا ہے۔ دیکھیے، آپ پھر مسکرانے لگے۔ صاحب، کیا کروں پرانے لفظ اور محاورے ابھی تک زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کیس محراب یا روزن کو اینٹ گارے سے بند کرنے کو تیغا کرنا کہتے تھے۔ صحن اب پختہ کروالیا ہے۔ چنبیلی کی بیل اور امرود کا پیڑ نظر نہیں آیا۔ یہاں میاں صاحب شام کو دو مشکوں سے چھڑکاؤ کرواکے مونڈھے بچھوادیا کرتے تھے۔ اپنے لیے خراد پر بنے ہوئے چنیوٹ کے رنگین پایوں والی چارپائی ڈلواتے۔ وطن کی یاد زیادہ ستاتی تو ہمیں مقامی گنڈیریاں کھلاتے۔ ان کا گلا لائل پور کی گنڈیریوں کو یاد کر کے رندھ جاتا۔ چاندنی راتوں میں اکثر ڈرل ماسٹر کی آواز میں ”مرزا صاحباں“ اور جگنی چمٹا بجا کے سناتے۔ خود آبدیدہ ہوتے، ہمیں بھی آبدیدہ کرتے۔ کو کہ ہماری ”آبدیدگی “کی وجہ کچھ اور ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد خود ہی اپنے بے سرے پن کا احساس ہوتا تو چمٹا بڑی حقارت سے صحن میں پھینک کر فرماتے کہ بادشاہو کانپور کے چمٹے گانے کی سنگت کے لیے نہیں، چلم بھرنے کے لیے سوٹ ایبل ہیں۔ میاں صاحب ایک زمانے میں خاصے رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ مدتوں سے کانپور

میں آباد تھے۔ مگر کبھی پان کھایا، نہ تسلیمات، آداب عرض کہا۔ اور نہ کبھی کوئی شعر پڑھا۔ کوٹھے پر بھی نہیں، جہاں ان تینوں کے بغیر گزر اور گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔

سردار جی سے جھوٹ سچ بول کر باہر نکلا تو سارا ناسٹلجیا جسے آپ یادش بخیریا کہتے ہیں، ہرن ہو چکا تھا۔ پرانا مکان دکھانے کے بہانے مجھے انعام اللہ برملائی لے گئے تھے۔ واپسی میں ایک گلی کے نکڑ پر مٹھائی کی دکان کے سامنے رک گئے۔ کہنے لگے، رمیش چند اڈوانی ایڈووکیٹ کے ہاں بھی جھانکتے چلیں۔ جیکب آباد کا رہنے والا ہے۔ سترّ کا ہے مگر لگتا نہیں اسّی کا لگتا ہے۔ جب سے سنا ہے کہ کراچی سے کوئی صاحب آئے ہیں، ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ جیکب آباد اور سکھر کی خیر خیریت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ستار پر تمھیں کافیاں بھی سنائے گا۔ اگر تم نے تعریف کی تو مزید سنائے گا۔ نہ کی، تب بھی مزید سنائے گا کہ ”یہ ان سے بہتر ہیں، شاید آپ کو پسند آئیں“۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا رسالو زبانی یاد ہے۔ ہندی سیکھ لی ہے، مگر جوش میں آتا ہے تو عجیب جناتی زبان میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔ کھسکا ہوا ہے مگر ہے دلچسپ۔

تو صاحب، اڈوانی سے بھی گفتگو رہی۔ گفتگو کیا monologue ، کہیے۔ ''کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے'' والا مضمون ہے۔ اس نے یہ تصدیق چاہی کہ جیکب آباد اب بھی ویسا ہی حسین ہے یا نہیں جیسا وہ جوانی میں چھوڑ کر آیا تھا؟ یعنی کیا اب بھی چودویں کو پورا چاند ہوتا ہے؟ کیا اب بھی دریائے سندھ کی لہروں میں لَش لَش پلّا مچھلیاں دور سے للچاتی ہیں؟ موسم ویسا ہی حسین ہے؟ (یعنی ۱۵ اڈگری گرمی پڑتی ہے یا اس پر بھی زوال آ گیا ہے؟) اور کیا اب بھی خیرپور سے آنے والی ہوائیں لُو سے پکتی ہوئی کھجوروں کی مہکار سے بوجھل ہوتی ہیں؟ سِبّی[1] میں سالانہ دربار اور میلا مویشیاں لگتا ہے کہ نہیں؟ میں نے جب اسے بتایا کہ میلا مویشیاں میں اب مشاعرہ بھی ہوتا ہے اور دور دور سے شاعر بلائے جاتے ہیں تو وہ دیر تک میلے کی بے توقیری پر افسوس کرتا رہا اور پوچھنے لگ، کیا اب سندھ میں اچھے مویشی اتنے کم ہو گئے؟ اسے گنگا جمنی میدان ذرا نہیں بھاتا۔ کہنے لگا، ''سائیں، ہم سیدھے، کھردرے، ریگ مال ریگستانی لوگ ہیں۔ اپنے رشتے، پیار اور سمبندھ پر کائی نہیں لگنے دیتے۔ آپ صفا سپاٹ آگروا اور دلدلی میدانوں کے رہنے والے، آپ کیا جانیں کہ ریگستان میں گرم ہوا ریت پر کیسی

---

[1] سندھی۔ دو آب

چلبلی لہریں، کیسے کیسے چِترا بنا بنا کے مٹاتی اور مٹا مٹا کے بناتی ہے۔ سائیں، ہمارا سارا sandscape[1] شہ زور آندھیاں تراشتی ہیں۔ جھولو[2] کے چھکڑ اور جیٹھ کے مینار بگولے سارے ریگستان کو متھ کر رکھ دیتے ہیں۔ آج جو ریگ وادی ہے وہاں سے کل لال آندھی کی دھوم سواری گزری تھی۔ جلتی دوپہر میں بھوبل دھول برساتی ریت پہاڑیاں، پچھلے پہر کی سرداتی مخمل بالو پہ دھیمی دھیمی پون پکھاوج، جوان بلوان بازوؤں کی مچھلیوں سمان ریت کی ابھرتی پھڑکتی لہریں۔ ایک لہر دوسری لہر جیسی نہیں۔ ایک ڈب[3] دوسرے ٹیلے سے اور ایک رات دوسری رات سے نہیں ملتی۔ برسات کی راتوں میں جب تھوتھے بادل سندھ کے ریگ ساگر کے اوپر سے آنکھ مچولی کھیلتے گزرتے ہیں تو اداس چاندنی ہر آن عجب طلسمات کھیلتی ہے۔ جس کو سارا ریگستان ایک ساں لگتا ہے، اس کی آنکھ نے ابھی دیکھنا ہی نہیں سیکھا۔ سائیں، ہم تمھارے پیروں کی خاک، ہم ریت مہا ساگر کی مچھلی ٹھہرے، آدھی رات کو بھی ریت کہ تہوں میں انگلیاں گڑو کے ٹھیک

---

[1] تصویر، نقش و نگار

[2] سندھی۔ گرم ہوا، لُو

[3] سندھی۔ ٹیلا

ٹھیک بتا دیں گے کہ آج پو چھانڈوا کہا تھا۔ (یعنی ٹیلے کا وہ کون سا حصہ ہے جہاں صبح سویرے سورج کی پہلی کرن پڑی)، دوپہر کو ہوا کا رُخ کیا تھا اور ٹھیک اس سمے شہر کی گھڑیوں میں کیا بجا ہو گا۔ دھرتی نے ہمیں پھول، پھل اور ہریالی دیتے سمے ہاتھ کھینچ لیا تو ہم نے دھنک کے سارے چنچل رنگوں کی پچکاری اپنی اجرکوں، رِلیوں، اوڑھنیوں، شلوکوں، چولیوں اور آرائشی ٹاہلوں پر چھوڑ دی"۔

وہ اپنی آنسو دھار پچکاری چھوڑ چکا تو میں نے باہر آ کر انعام اللہ برملائی سے کہا "بھائی میرے بہت ہو چکی۔ یہ کیسا ہندو ہے جو گنگا کنارے کھڑا ریگستان کے سپنے دیکھتا ہے؟"

کہیں دل اور کہیں نگری ہے دل کی

یہ ساری عمر کا بن باس دیکھو

ایسا ہی ہے تو اسے اونٹ پر بٹھا کر بیکانیر میں کسی ٹیلے یا کانٹوں بھرے کیکر کے ٹھنٹھ پر بٹھا آؤ کہ اوپر چھاؤں نہیں اور نیچے ٹھاؤں نہیں۔ اب کے تم نے مجھے کسی ماضی میں مبتلا آدمی سے ملایا تو قسم خدا کی لوٹا، ڈور، چٹائی، کلیاتِ نظیر اکبر

[1] سندھی لفظ ہے، اس کا مترادو عربی میں ہو تو ہو

آبادی اور فروٹ سالٹ بغل میں مار بیابان کو نکل جاؤں گا۔ اور کان کھول کر سن لو۔ اب میں کسی ایسے شخص سے ہاتھ ملانے کا بھی روادار نہیں جو میرا ہم عمر ہو"۔ صاحب، مجھے تو اس کہولت اور یبوست سے، یعنی اپنے آپ سے ــ آنے لگی۔ آپ کے مرزا صاحب نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا کہ اپنے ہم عمر بڈھوں سے محض ہاتھ ملانے سے آدمی کی زندگی ہر مصافحے کے بعد ایک سال گھٹ جاتی ہے۔

مُلا عاصی بھکشو

کانپور میں جی بھر کے گھوما۔ ایک ایک سے ملا۔ ایک زمانہ آنکھوں سے گزر گیا۔ مگر حاصلِ سفر مُلّا عاصی عبد المنّان سے ملاقات رہی۔ ایسے ہی ہمدمِ دیرینہ سے ملاقات کے بارے میں ذوق نے کہا ہے:

بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

عبد المنان کے نانا خطوں میں اپنے دستخط کے سے پہلے عاصی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے اُچک لیا اور ساتویں کلاس سے اپنا نام عاصی عبد المنّان لکھنا شروع کر دیا۔ آٹھویں کلاس میں ہی داڑھی نکل آئی تھی۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے مُلّا عاصی

کہلانے لگے۔ اور یہ ایسا چپکا کہ اب صرف اسی نام سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ تختی پر بھی Aasi A. Mannan لکھا ہے۔ طُرفہ تماشا ہیں۔ اکہرا گٹھا ہوا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، درمیانہ قد، بوزنہ دست یعنی غیر معمولی لمبوترے ہاتھ، جیسے بندر کے ہوتے ہیں، کوٹ، ہینگر کے سے ڈھلکے ہوئے کندھے، گھنے بال اب سفید ہو گئے ہیں مگر گھنگھرالا پن باقی ہے۔ باہر نکلی ہوئی مچھلی جیسی گول گول آنکھیں، دائیں آنکھ اور دہانے کے دائیں کونے میں بچپن سے tick تھا۔ اب بھی اسی طرح پھڑکتے رہتے ہیں۔ داڑھی نکلنے کے دس سال بعد تک ریزر نہیں لگنے دیا۔ سچ پوچھیے تو داڑھی سے بہت بہتر لگتے تھے۔ لمبی گردن، چھوٹا اور گول مٹول چہرہ، جس روز داڑھی منڈوا کر آئے تو ایسے لگے گویا نیچہ پہ چلم رکھی ہے۔ اس سے پہلے ہر مہینے چاند کی پہلی تاریخ کو نرخرے سے ملحق داڑھی کا تلا منڈوا کر آتے تو کہتے "کنٹھی بنوا کے آیا ہوں"۔ ادھر یہی اصطلاح رائج تھی۔ آپ نے بھی تو انٹر میڈیٹ میں باچھ سے باچھ تک مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ اگلی کتاب میں وہ والا فوٹو چھپوا دیں تو واللہ مزہ آجائے۔ مُلّا عاصی خود کہتے ہیں کہ "عاقل و بالغ ہونے کے بعد میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ البتہ کہیں نماز کے وقت پھنس جاتا اور لوگ اصرار کرتے تو نماز پڑھا دیتا تھا۔ داڑھی کا یہ بڑا ہینڈی کیپ تھا۔ آخر تنگ آ کے منڈوا دی"۔ جب سے انھوں نے بدھ ازم کا ڈھونگ

رچایا لوگوں نے مُلّا بھکشو کہنا شروع کر دیا۔ ابھی تک رے (ر) صاف نہیں بول سکتے۔ مگر ان کے منھ سے اچھا لگتا ہے۔ لہجہ مصر کی ڈلی۔ لا اُبالی اور سنکی جیسے جب تھے، اب بھی ہیں۔ بلکہ اپنے مدارج کچھ زیادہ ہی بلند کر لئے ہیں۔ قریب سے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ زندگی ایسے بھی گزاری جا سکتی ہے۔ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر سائے کی طرح ساتھ رہے۔ لطف آگیا۔ کیا بتاؤں، ایسی دریا محبت، ایسا برکھا پیار۔

یقین جانیے، سن ۴۷ء میں جیسا چھوڑ کے آئے تھے ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ پچھتر سے کچھ اوپر ہی ہوں گے۔ لگتے نہیں۔ میں نے پوچھا اس کا کیا راز ہے؟ بولے کبھی آئینہ نہیں دیکھتا۔ ورزش نہیں کرتا۔ کل کے بارے میں نہیں سوچتا۔ آخری دعوے میں انھوں نے قدرے کسرِ نفسی سے کام لیا۔ اس لیے کہ کل تو بعد کی بات ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ تو آج کے بارے میں بھی نہیں سوچتے۔ جس وضع سے زندگی شروع کی، اسی طرح گزار لے گئے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ سینے سے کیا لگایا، یکلخت twenties میں پہنچا دیا۔ ایسا لگا گویا اپنے ہی جوان ہمزاد سے ملاقات ہو گئی۔ ویسے مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے کہ بعض لوگ اس طرح سینے سے لگاتے ہیں کہ اس کے بعد آپ وہ نہیں رہتے جو اس سے پہلے تھے۔ لیکن آپ نے جس چِڑ قنات "بزرگ" کی مثال دی اس سے مجھے

قطعی اتفاق نہیں۔ دل نہیں ٹھکتا۔ آپ آج بھی مُلّا عاصی کو ہر ایک کا کام اور ہر طرح کا کام کرنے کے لیے تیار پائیں گے۔ سوائے اپنے کام کے۔ شہر میں ہر افسر سے ان کی یاد اللہ ہے۔ کسی کو آدھی رات کو بھی سفارش کی ضرورت ہو تو وہ ساتھ ہو لیتے ہیں۔ کوئی بیمار بے آسرا ہو تو دوا دارو، ہاتھ پیر کی خدمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ ہومیو پیتھی میں بھی درک رکھتے ہیں۔ ہومیو پیتھک دواؤں میں تاثیر ہو یا نہ ہو، ان کے ہاتھ میں شفا ضرور ہے۔ مریض گھیرے رہتے ہیں۔ بس مشورے اور دوا کا کچھ نہیں لیتے۔

جوانی میں بھی ایسے ہی تھے۔ الہ دین کے جن کی طرح ہر خدمت کے لیے حاضر۔ بلا کے منتظم۔ سن ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میاں تجمل حسین کو دُور کی سوجھی۔ کس لیے کہ ان کے والد کلکتے گئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے، یار مجرا دیکھے مدتیں ہوئیں۔ آخری مجرا جمال صاحب کے بیٹے کی شادی پر دیکھا تھا۔ سات مہینے ہونے کو آئے۔ دس بارہ جنے مل کے چندہ کر لیں گے۔ بس تم بلی کی گردن میں بلکہ پاؤں میں گھنگرو باندھ کے لوا لاؤ تو واللہ عیش آ جائیں۔

بولے، یار، کمال کر دیا پہلے کیوں نہ کہا؟ بس ایک جاجم کا بندوبست تم کر ہو، باقی سب میرے ذمہ داری۔ پر ایک بات ہے، چندے میں ہمیشہ خورد برد اور آپس

میں لڑائی جھگڑے کا احتمال رہتا ہے۔ خیر، نیک کام میں تو لڑائی جھگڑا بالکل روا ہے، اور رائج بھی۔ پر کارِ بد میں مکمل اعتماد اور اتفاقِ رائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یار و یہ تو بتاؤ، چندے کی رنڈی کس کس کو کورنش بجالائے گی؟

سنیچر کو دیکھا کہ عشاء کے بعد مُلّا عاصی سچ مچ اپنی "ذمہ داری" کو اِکّے میں بٹھائے لیے چلے آرہے ہیں۔ خود اِکّے کے پر (تختے کا باہر نکلا ہوا کنارہ) پہ ٹکے ہوئے تھے۔ پاندان، طبلے، سارنگی، چوراسی (گھنگھرو) اور ضعیف طبلچی کو اپنے ہاتھوں سے اتارا۔ میرے کان میں کہنے لگے کہ داڑھی کی وجہ سے طوائف کو میرے ساتھ آنے میں تامل تھا۔ روپیہ تو خیر ہم سب نے چندہ کر کے فراہم کیا، مگر باقی ماندہ سارا انتظام انھی کا تھا۔ اس میں شہر سے باہر اس سرکاری بنگلے کا انتخاب و حصول بھی شامل تھا جہاں یہ محفل برپا ہونی تھی۔ ڈپٹی کلکٹر سے ان کی یاری تھی۔ دستر خوان پر کھانا انھوں نے اپنے ہاتھ سے چُنا۔ کانپور کے خاص سرخ و سفید رس گلوں کے کُلّھڑ خود خرید کر لائے۔ زردے میں ملا کر کھانے کے لیے بالائی بطور خاص لکھنؤ سے منگوائی۔ ان کا کہنا تھا کہ گلوریاں بھی وہیں کی ایک طرحدار تمبولن کے ہاتھ کی ہیں۔ کرارے پان کی گلوری اس ترکیب سے بناتی ہے کہ کسی کے کھینچ کر ماریں تو بِلبِلا اٹھے۔ گلوری ٹکڑے ٹکڑے بھلے ہی ہو جائے، لیکن مجال ہے کہ کھل جائے۔ دستر خوان بچھانے سے ذرا پہلے اپنی نگرانی

میں تنوری روٹی پر گڑ اور اور نمک کا چھینٹا دلوایا۔ کانپور میں اسے چھینٹے کی روٹی کہتے تھے۔ دو تازہ قلعی کی ہوئی سِلفچیوں میں نیم کے پتے ڈال کر کونے میں رکھوا دیں۔ غرض کہ مجرے اور دعوت کا سارا انتظام کیا۔ سب دستر خوان پر بیٹھ گئے تو کسی نے پوچھا، مُلّا کہاں ہے؟ ڈھنڈیا پڑی۔ کہیں پتا نہ تھا۔ محفل تو ہوئی، مگر بے لطفی رہی۔ دوسرے دن ان سے پوچھا گیا تو تنک کر بولے، آپ نے مدعو کب کیا تھا؟ میرے سپرد تو بس انتظام کیا گیا تھا، سو میں نے کر دیا۔

کیا چھپکلی دودھ پلاتی ہے؟

مزاج کا بس ہمیشہ سے یہی رنگ رہا ہے۔ جو ٹیڑھ اور سنک جب تھی وہ اب بھی ہے۔ کچھ بڑھ ہی گئی ہے۔ ایک قصّہ ہو تو سناؤں۔ طالبِ علمی کا زمانہ تھا۔ وہ کوئی مافوق الفطرت کوڑھ مغز نہیں تھے۔ میرا مطلب ہے، اوسط درجے کے بالکل نارمل نالائق تھے۔ امتحان میں تین مہینے باقی رہ گئے تھے۔ دسمبر کا مہینہ، کڑکڑاتے جاڑے۔ انھوں نے کرسمس کے دن سے پڑھائی کی تیاریاں شروع کیں۔ وہ اس طرح کہ آنکھوں اور دماغ کو طراوت پہنچانے کے لیے سر منڈوا کے تیل سے سینچائی کی جو ایک میل دور سے پہچانا جاتا تھا کہ اصلی سرسوں کا ہے۔ پہلی ہی رات نزلہ ان کے عضوِ ضعیف یعنی سر پر گرا تو دوسرے دن چھکتے ہرے

رنگ کا روئی کا ٹوپا سلوایا جسے پہن کر پان کھاتے تو بالکل طوطا لگتے تھے۔ جمعرات کو علی الصبح سفید بکری کی کلیجی اور سری خرید کر لائے۔ سری پکوا کر شام کو فقیروں کو کھلائی۔ اس زمانے میں بے پردگی کے اندیشے سے محلے میں کسی مرد کو چھت پر چڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے باوجود چھت پر کھڑے ہو کر دیر تک "چیل، چیل، چیل" پکارا کیے۔ پھر ہوا میں اُچھال اُچھال کے چیلوں کو کلیجی کی بوٹیاں اور خود کو پردہ نشین گھروں کے مردوں کی گالیاں کھلوائیں۔ دوپہر کو بان کی چارپائی باہر نکالی اور اونٹتے پانی سے ان کھٹملوں کو جنھیں برسوں سے اپنا خون پلا پلا کے بڑا کیا تھا، آخری غسل دیا۔ پھر چارپائی گھر کے باہر دھوپ میں الٹی کر کے مرحومین و نیم مرحومین پر ڈھیروں گرم مٹی ڈالی۔ مچھر دانی کے بانس پر جھاڑو باندھ کے بھڑ کے چھتے اور جالے اتارے۔ رات کو مختلف اوقات میں چھت پر ٹارچ سے روشنی ڈال ڈال کر چھپکلیوں کی تعداد اور عاداتِ شبینہ و شنیعہ کا جائزہ لیا۔ ان میں تین چھپکلیاں غالباً چھپکلے تھے۔ "غالباً" کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ بقول مرزا، پرندوں، چھپکلیوں، مچھلیوں، punks اور اُردُو الفاظ میں نر مادہ کی تمیز کرنا انسان کے بس کا کام نہیں۔ پرندے، پنک، مچھلیاں اور چھپکلیاں تو پھر

بھی بشری تقاضوں ا سے مغلوب ہو کر اپنی اپنی مخالف جنس کو پہچان کر عمل و حمل پیرا ہوتے ہیں۔ لیکن اُردُو الفاظ کے کیس میں تو یہ سہولت بھی میسر نہیں۔ ان کی جنس بندی اور تذکیر و تانیث کی شناخت و ادراک صرف قدما و فصحا کا حصہ ہے۔ استاد جلیل نے کسی زمانے میں ایک محقّقِانہ رسالہ تذکیر و تانیث پر لکھا تھا جس میں سات ہزار الفاظ کے طبی معائنے کے بعد ہر ایک کے متعلق دو ٹوک فیصلہ کر دیا تھا کہ مذکر ہے یا مؤنث۔ ساتھ ہی ان الفاظ کی بھی نشان دہی کر دی جن کم مشکوک جنس کے بارے میں اہل لکھنؤ اور دلی والے ایک دوسرے کا سر پھاڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

دو تین رنگین مزاج چھپکلے جن کے ذکر سے یہ بات نکلی، ٹراتے بہت تھے۔ رات بھر ڈبل ڈیکر بنے چھت پر جُھٹے پھرتے تھے، جس سے پڑھائی اور ذہنی سکون میں کھنڈت واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔ ان سب بدذاتوں کو اپنے کیفر کردار کو پہنچانے کے لیے وہ ایک دوست سے ''ڈائنا'' ایئر گن مانگ کر لائے، مگر چلائی

[1] مرزا حیوانوں کی اس نوع کی حرکتوں اور کرتوتوں کے لیے بھی بشری تقاضوں ہی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

نہیں۔ کیونکہ بقول ان کے، لبلبی پر انگلی رکھتے ہی خیال آگیا کہ ان میں تو کئیوں کے دودھ پیتے بچّے ہیں۔

میں نے ٹوکا کہ یار، چھپکلی اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتی۔ بولے تو پھر جو کچھ پلاتی ہے وہ سمجھ لو۔ چھت کی جھاڑ پونچھ کے بعد دیوار کی باری آئی۔ لکھنے کی میز کے اوپر ٹنگی ہوئی مادھوری، کجن اور سلوچنا ایکٹرسوں کی تصویریں ہٹائی تو نہیں، مگر اُلٹی کر دیں۔ خود کو راہ راست پر رکھنے اور خدا کا خوف دلانے کی غرض ان کے بیچوں بیچ اپنے والد گرامی کا، جو بڑے جلالی اور ہتھ چُھٹ بزرگ تھے، فوٹو ٹانگ دیا۔ ڈریکولا کی طرح آئینے بھی کپڑے سے ڈھک دیے تاکہ چہرے پر امتحان کی وحشت دیکھ کر دہشت زدہ نہ ہو جائیں۔ ان کے دوست ہری پرکاش پانڈے نے امتحان کے زمانے میں نیک چلن رہنے اور برھمچریہ کا بڑی سختی سے پالن کرنے کی تاکید کی جو سراسر غیر ضروری تھی۔ اس لیے کہ ان کی اور ہماری نسل کے لیے بد چلنی پرابلم نہیں، دلی آرزو تھی۔ خود کو ٹھنڈا اور شانت رکھنے کا اس نے یہ گُر بتایا کہ من میں کوئی ایسی ویسی کامنا (خواہش) آجائے تو فوراً اپنے انگوٹھے میں پن چبھو لیا کرو۔ اور جب تک خواہش پوری طرح نکل نہ جائے، پِن بدستور چبھوئے رہو۔ مگر ہوا یہ کہ ان کے منھ سے بارہا چیخ نکل گئی، لیکن خواہش نہیں نکلی۔ پہلے ہی دن یہ نوبت آگئی کہ دونوں pin cushions یعنی دونوں

انگوٹھوں میں پِن چبھونے کی جگہ نہ رہی۔ پاؤں کے انگوٹھے استعمال کرنے پڑے۔ دوسرے دن جب وہ جوتے پہننے کے قابل نہ رہے تو پِن چبھونے کے بجائے صرف مسکرا دیتے اور کپڑا ہٹا کر آئینہ دیکھ لیتے تھے۔

ربر گوید کہ من شاہِ جہانم

بری عادتوں سے تائب ہو گئے۔ مطلب یہ کہ رات گئے تک غیر حاظر دوستوں کی غیبت، تاش، شطرنج، بائیسکوپ اور بری صحبت یعنی اپنے ہی جیسے دوستوں کی صحبت سے میعادی توبہ کی۔ یعنی کرسمس کے دن سے یومِ امتحان تک۔ اور دل میں both days inclusive کہہ کر مسکرا دیے۔ مثنوی ''زہر عشق'' جو یکے از کتب ممنوعہ تھی اور دس بارہ بدنام مثنویوں کے سراپا سے اقتباسات جن کا شمار اس زمانے میں porn میں ہوتا تھا، مقفل الماری سے نکالے۔ یہ سب ان کے ہاتھ کے قلمی نسخے تھے جو املا کی غلطیوں کے باوجود بلکہ، بسبب دونا مزہ دیتے تھے کہ ان میں کی بعض غلطیاں فاش اور فاحش ہی نہیں، فحش بھی تھیں۔ ان مخطوطات کو مع تاش کے دو پیک کے، جن میں سے ایک بالکل نیا تھا، نذرِ آتش کرنے صحن میں لے گئے۔ لالٹین سے تیل نکال کر ابھی پرانا پیک جلایا ہی تھا کہ بزرگوں کی ایک نصیحت یاد آگئی کہ کوئی بھی کام ہو، جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔

جلدی کا کام شیطان کا۔ لہٰذا کارِ شیطان پر لعنت بھیجی اور نیا پیک اور ''سراپے'' واپس لے آئے۔ پھر دو پنسلیں اور چھ ربر خریدے کہ ان کے ہاں ہر دو اشیا کے استعمال کا یہی تناسب تھا۔ آپ بھی تو پنسل سے لکھتے ہیں تاکہ مسودہ فیئر کرنے کی کھکھیڑ سے بچ جائیں۔ مگر دشمنوں کا خیال ہے، لکھتے کم، مٹاتے زیادہ ہیں۔ آپ نے پنسل کی لَت بچارے مختار مسعود کو بھی لگا دی۔ اب وہ بھی آپ کی طرح ربر سے لکھتے ہیں۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ نابوکوف بھی پنسل سے لکھتا تھا۔ افسوس کہ لفظ ''میٹنا'' اب متروک ہو گیا ہے۔ پھر مُلّا عاصی ''رف ورک'' کے لیے ردّی والے کے یہاں سے ریلوے کی بڑی رسیدوں اور بلٹیوں کی پانچ سیر کا پیاں ایک آنے میں خرید لائے۔ اس زمانے میں کفایت شعار لڑکے ان کی پشت پر ''رف ورک'' کرتے تھے۔ آدھ سیر سونف بھی لائے اور اس کے کنکر محلے کی ایک دوشیزہ سے بنوا کر ایک شیشی میں اس طرح محفوظ کر لیے جیسے بعض شیخی خورے مریض آپریشن کے بعد گردے اور پِتّے کی پتھریاں سجا کر رکھتے ہیں۔ مگر دوشیزہ کا علاحدہ قصّہ ہے۔ کبھی اور سہی۔ پھر سونف میں ایک پاؤ دھنیے کے بیج ملا کر دونوں کو مرتبان میں بھر دیا۔ ہری پرکاش پانڈے نے کہا تھا کہ دھنیے کی عرق کے دو قطرے مست سانڈ کے حلق یا بھڑکتے جوالا مکھی پہ ڈال دو تو سہمیں بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا۔ سونف سے آنکھوں کی جوت بڑھتی اور دماغ کو

تراوٹ پہنچتی ہے۔ چنانچہ ایک پھنکی نیند کے جھونکے سے پہلے اور ایک بعد میں مار لیتے تھے۔

جب مطالعے کے لیے مناسب ماحول بن گیا تو باخبر لڑکوں سے معلومات حاصل کر کے کورس کی کتابوں کہ فہرست بنائی۔ کچھ نئی، مگر بیشتر سیکنڈ ہینڈ خریدیں۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کو کم قیمت کی بنا پر نہیں بلکہ فقط اس لیے ترجیح دی کہ بعض نایاب ایڈیشن ایسے مل گئے جن میں فیل ہونے والوں کی دو تین تجربہ کار نسلوں نے یکے بعد دیگرے اہم حصوں پر نشان لگائے تھے۔ بعض نشان تو مثل لائٹ ہاؤس کے تھے جو ان خطرناک چٹانوں کی نشان دہی کرتے تھے جہاں علم کی تلاش میں نکلے ہوئے غافل طلبہ کی اداس نسلوں کا بیڑہ غرق ہوا تھا۔ ایک نادر نسخہ ایسا بھی ہاتھ لگا جس میں صرف غیر اہم حصے "انڈر لائن" کیے گئے تھے تاکہ انہیں چھوڑ چھوڑ کر پڑھا جائے۔ انہیں یقین تھا کہ کورس کی کتابوں کی فراہمی سے وہ ممتحن کے خلاف آدھی فتح تو حاصل کر ہی چکے ہیں۔ اسکے بعد وہ ہری پرکاش پانڈے کے گھر گئے جو گورنمنٹ کالج میں ہمیشہ فرسٹ آتا تھا۔ منت سماجت کر کے اس کی تمام کتابیں دو دن کے لیے مستعار لیں اور اِکّے میں ڈھو کر گھر لائے۔ پھر چھٹی کلاس کے ایک غریب لڑکے کو ایک آنے یومیہ کی دہاڑی پر اس کام پر تعینات کیا کہ ہری پرکاش پانڈے کی کتابوں میں جو حصے "انڈر لائن"

کیے ہوئے ہیں، انھی کے مطابق میری تمام کتابیں سبز پنسل سے انڈر لائن کر دو۔ پھر ایک ایک آنے میں ربر کی دو مہریں Important اور Most Important کی کھڑے کھڑے بنوائیں اور اپنی کتابوں کا سیٹ پانڈے کو دے آئے کہ جن جن حصوں کو تم امتحان کے لحاظ سے ہمارے توجہ کے لائق سمجھتے ہو، ان پر حسبِ اہمیت یہ مہریں لگاتے چلے جانا۔ پلیز۔

کتابوں کی قسمیں اور نکٹے دشمن

سب نشان لگ گئے تو انھوں نے غیر ضروری اور فالتو علم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے ایک اور ہنگامی تکنیک ایجاد کی جسے وہ selective study کہتے تھے۔ اُردُو مترادف تو مجھے معلوم نہیں۔ تفصیل اس کی یہ کہ جو سوال پچھلے سال آچکے تھے، ان کے متعلقہ ابواب پورے کے پورے قینچی سے کاٹ کے پھینک دیے کہ ان کی موجودگی سے توجہ distract ہوتی اور دل پر ضخامت سے خواہ مخواہ دہشت بیٹھتی تھی۔ یہی نہیں ان کی وہ بین السطور جڑیں جو دوسرے ابواب میں کینسر کی secondaries کی طرح پھیلی ہوئی جہاں تہاں نظر آئیں، کاٹ کر پھینک دیں۔ پھر وہ باب نکال پھینکے جن کے بارے میں ان کے مشیروں اور بہی خواہوں نے کہا کہ ان میں سے کوئی سوال آ ہی نہیں

سکتا۔ تھوڑا بہت اپنے کشف سے بھی کام لیا۔ آخر میں جی کڑا کر کے وہ ادق حصّے نکال پھینکے جنہیں وہ دو دفعہ پڑھتے تب بھی کچھ پلے نہ پڑتا۔ اس عملِ جراحی سے کتابیں چھٹ چھٹا کر ایک چوتھائی سے بھی کم رہ گئیں۔ ان میں سے تین کو شیرازہ تو ایسا بکھرا کہ ان کی باقیات کو کلپ سے دوسری کتابوں کے نیفے میں اُڑسنا پڑا۔ ایک کتاب کا صرف سرورق باقی رہ گیا۔ اس میں چند غیر ضروری صفحے محض شگون اور ممتحن کی دلجوئی کے لیے رکھ لیے۔ ان کا پروگرام تھا کہ زندگی اور بینائی نے اگر امتحان تک وفا کی تو ان منتخب اوراق کے چیدہ چیدہ حصوں پر ایک اچٹتی سے نظر ڈال لیں گے۔ آخر ہر کتاب ایک ہی انداز سے تو نہیں پڑھی جا سکتی۔ پھر ذہانتِ خداداد اور علمِ لَدُنّی بھی تو کوئی چیز ہے۔ رہا فیل ہونے کا خدشہ، سو وہ تو ہر صورت میں رہے گا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ بہر حال محنت کر کے اپنے زورِ بازو سے باعزت طریقے سے فیل ہونا نقل کر کے پاس ہونے سے بدرجہا بہتر ہے۔ کسی نے ان ہی کتابوں کے بارے میں بیکن کو مشہور مقولہ سنایا جو ان کے دل کو بہت بھایا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بیکن کا یہ انشائیہ ان کے کورس میں شامل تھا اور اسے انہوں نے فضول سمجھتے ہوئے کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ وہ ''کوٹے شن'' آپ کو تو یاد ہو گا، کچھ اس طرح ہے کہ بعض کتابیں صرف چکھی جانی چاہیں، کچھ کو نِگل جانا چاہیے، کچھ اس لائق

ہوتی ہیں کہ آہستہ آہستہ چبا چبا کے ہضم کی جائیں، اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں کسی عوضی سے پڑھوا کر خلاصہ بنوالینا چاہیے۔ ملا عاصی نے اس قولِ فیصل میں اتنی اصلاح اپنی طرف سے کی کہ اگر سب نہیں تو بیشتر کتابیں اس لائق ہوتی ہیں کہ سونگھ کر ایسوں کے لیے چھوڑ دی جائیں جو ناک نہیں رکھتے۔ صاحب، ناک پر آپ نے اس دن پیچ لگژری ہوٹل والے فنکشن میں کمال نظم "کوٹ" کی۔ مگر حاضرین میں مجھ جیسے دو چار ہی ہوں گے جو یہ سمجھ پائے کہ آپ کا ہدف و مخاطب کون ہے۔ ایسے حملے سے دشمن کا تو کچھ نہیں بگڑتا، اپنا جی خوش ہو جاتا ہے۔ یاد ہیں کچھ لائنز؟

They haven't got no noses

The fallen sons of Eve.

G.k. Chesterton)۔(The song of Qoodle

تاریخ کا کلیجہ

تاریخ کے مسئلے کو بھی انھوں نے پانی کر دیا۔ وہ اس طرح کہ ہری پرکاش پانڈے کو ہدایت کی کہ ممتحن کے نقطہ نظر سے جتنے سنہ اہم ہوں، ان سب کی

فہرست بنا کر مجھے دے دو تا کہ ایک ہی ہلے میں ان سے نمٹ لوں۔ لیکن بیس سے زیادہ نہ ہوں۔ اب تک وہ صرف پانچ چھ سنہ سے غریبا مئو کام چلا رہے تھے۔ ماسٹر فاخر حسین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تواریخ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، مجموعہ سنین کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے جواب میں جتنے زیادہ سن لکھو گے، اتنے ہی زیادہ نمبر ملیں گے۔ سن کی جمع سنین انہیں پہلی مرتبہ اسی مقولے سے معلوم ہوئی۔ لیکن جب ماسٹر فاخر حسین نے یہ کہا کہ ہمارے ہاں بڑے آدمیوں کا سنِ وفات ان کے سنِ پیدائش سے زیادہ اہم ہوتا ہے تو مُلّا عاصی کا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ پیدا ہونے، وفات پانے اور گدی پر بیٹھنے کے لیے انھوں نے متولد، متوفی، متمکن اور سریر آرائے سلطنت ہونے کی اصطلاحیں ماسٹر فاخر حسین ہی سے سیکھیں۔ ماسٹر صاحب نے یہ ٹِپ بھی دیا کہ ممتحن اپنا تاثر صرف تمہارے پہلے جواب کے پہلے پیراگراف سے قائم کر لیتا ہے۔ ان پندہائے سُود مند کے بعد دسویں جماعت کا جو ششماہی امتحان ہوا، اس میں مُلّا عاصی نے پہلے ہی سوال میں کاپی پہ تاریخ کا کلیجہ نکال کے رکھ دیا۔ مطلب یہ کہ پہلے صفحے کے پہلے پیراگراف کے کوزے میں وہ سارے سنہ بند کر دیئے جو وہ اپنی ہتھلی اور ”سوان اِنک“ کے ڈبے کے پیندے پر لکھ کر لے گئے تھے۔ ان سنوں یا سنین کا اصل سوال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ آپس میں بھی کوئی

تعلق نہیں تھا۔ اس سب کو ایک لڑی میں اس طرح پرو دینا کہ ماسٹر فاخر حسین پر اپنی نصیحت کے نتائج ہویدا ہو جائیں، صرف انہی کا کام تھا۔

سوال لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر آیا تھا۔ ان کو جواب مجھے حرف بحرف تو یاد نہیں، لیکن اس کا پہلا پیراگراف جس میں انہوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت سب بادشاہوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک کر موت کے گھاٹ اتارا، کچھ اس طرح تھا :

"اشوک اعظم (متوفی ۲۳۲ ق م) کے بعد سب سے بڑی سلطنت اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۸۰اء) کی تھی۔ جو ۱٦۵۸ء میں اپنے والد کا تختہ اُلٹ کر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس اثنا میں پانی پت میں گھمسان کی جنگ ہوئی، مگر طوائف الملوکی کا دور دورہ ختم نہ ہوا۔ حالانکہ اورنگ زیب نے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھائیوں کا سلوک کیا، یعنی یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتارا۔ اگر وہ یہ نہ کرتا تو بھائی اس کے ساتھ یہی کچھ کرتے۔ دراصل اکبر اعظم (متولد ۱۵۴۲ء، متوفی ۱٦۰۵ء) کی چوکس آنکھ بند ہوتے ہی انتزاعِ سلطنت کا آثار شروع ہو گئے جو متعدد شاہی اموات کے بعد ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے جنگ اور ۱۷۹۹ء میں سرنگا پٹم کی جنگ پر منتج ہوئے۔ اِدھر یورپ میں نپولین (

متوفی ۱۸۲۱ء) کا طوطی رک رک کر بولنے لگا تھا۔ (یہاں انہیں اچانک دو سنہ اور یاد آ گئے، چنانچہ انہیں بھی وفیات کی آگ میں جھونک دیا) یہ نہیں کہ فیروز تغلق (متوفی ۱۳۸۸ء) اور بلبن (متوفی ۱۲۸۷ء) بھی سلطنت کو استحکام نہ بخش سکے۔ یہاں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ایک سو سال کی مدت بنتی ہے۔۔۔"۔

سنہ کو بطور آلہ تسخیر ممتحن استعمال کرنے اور تاریخ کے صحیح تعین سے متعلق ماسٹر فاخر حسین کی نصیحت انھوں نے گرہ میں باندھ لی۔ انہیں اپنی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے خانے میں وہ بڑی دیانت داری سے "نامعلوم" لکھ دیا کرتے تھے۔ لیکن جس دن سے ماسٹر فاخر حسین نے کچوکا دیا کہ برخوردار ہمارے ہاں نامعلوم و ناتحقیق تو صرف ولدیت ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنی قیاس تاریخِ ولادت ۱۹۰۸ کے بعد A.D لکھنے لگے تاکہ تسامح نہ ہو۔ کوئی کوڑھ مغز التباساً B.C نہ سمجھ بیٹھے۔ اپنی فاش غلطی میں بھی عالمانہ شان پیدا کرنے کے لیے غلطی کو تسامح اور التباس کہنا ہم دونوں نے ماسٹر فاخر حسین ہی سے سیکھا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے ان کی یادداشت خراب ہو چلی تھی۔ کوئی بات یا جواب ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہ آئے تو "اس وقت استحضار نہیں ہے"

اس طرح کہتے کہ ہم خود اپنی نالائقی پر شرمندہ ہوتے کہ کیسے غلط وقت پر سوال کر بیٹھے۔ صاحب، اگلے وقتوں کے استادوں کی شان ہی کچھ اور تھی۔

امتحانی چالاکیوں سے متعلق ماسٹر فاخر حسین کا بتایا ہوا ایک نکتہ یاد آیا۔ فرماتے تھے کہ جہاں مشکل لفظ استعمال کر سکتے ہو وہاں آسان لفظ نہ لکھوا۔ تم طالبِ علم ہو۔ سادگی و سلاست صرف عالموں کو زیب دیتی ہے اور انھی کے یہاں مفقود ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی فرماتے کہ جس عربی یا فارسی لفظ کی جمع تمھیں معلوم ہو اس کو صیغہ واحد میں استعمال نہ کرو۔ چنانچہ مین نے اپنے دشمنوں کو ملاعین و طواغیت کہنا انھی سے سیکھا۔ صیغہ واحد۔ ملعون اور طاغوت۔ میں وہ بات کہاں۔

---

[1] ۱۹۸۹ء میں ایک دلچسپ اُلٹی لغت Reverse Dictionary شائع ہوئی تھی جس میں ہر آسان لفظ کے مشکل، اوق اور نامانوس مترادفات دیے گئے ہیں۔ یہ ڈکشنری ان طبقوں میں جن کا کام بات کر کھول کر عام فہم انداز میں بیان کرنا ہے، بے حد مقبول ہو رہی ہے۔ ہماری مراد پروفیسروں، نقادوں، پادریوں، حکومت کے ترجمانوں اور بزنس ایگزیکٹیوز سے ہے۔ ماسٹر فاخر حسین کی روح پُرفتوح پچاس سال بعد اپنی نصیحت پر عمل درآمد دیکھ کر کس قدر مسرور و مفتخر محسوس کر رہی ہو گی۔

مُلا عبد المنان اور نپولین

اسی طرح ان کے ایک خیر خواہ نے کسی زمانے میں ٹپ دیا تھا کہ اگر تین Essays اور تین تاریخی جنگیں رٹ لو تو انگریزی اور تاریخ میں فیل ہونا ناممکن ہے۔ بشرطیکہ ممتحن جوہر شناس اور نالائق نہ ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ہر ایک کے مشورے پر حرف بحرف عمل کر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ ہر دفعہ ایک مختلف طریقے سے فیل ہوتے اور ممتحن کی نالائقی پر رہ رہ کر افسوس کرتے۔ واٹرلو کی فیصلہ کُن جنگ جس میں ان کے ہیرو نپولین کو شکستِ فاش ہوئی، ان تین جنگوں میں جو انہوں نے نقشہ میدانِ جنگ سمیت رٹ لی تھی، ان کی "فیورٹ" تھی۔ دوستوں کو اپنے فیل ہونے کی اطلاع بھی اسی یادگار تاریخی حوالے سے دیتے تھے۔ جس میں طالبعلمانہ ندامت کی بجائے جرنیلی تکبر پایا جاتا تھا:

"I have met my Waterloo"

بعد میں اپنی زندگی کی دیگر ناکامیوں کا اعلان بھی انہی تاریخی الفاظ میں کرنے لگے۔ مگر صاحب، نپولین کی اور ان کی شکست میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

نپولین تو ایک ہی شکست میں ڈھیر ہو گیا تھا، جب کہ ان کے اعلانِ ہزیمت میں دوبارہ شکست کھانے کا آہنی عزم پایا جاتا تھا۔

تالا نہیں کھلتا

جب ممتحن کو زیرِ دام لانے کے تمام ہتھکنڈے اور "شارٹ کٹ" مکمل ہو گئے تو امتحان میں کل چار ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ شارٹ کٹ دراصل اس راستے کو کہتے ہیں جو ذہین مگر کاہل لوگ کم سے کم فاصلے کو زیادہ سے زیادہ وقت میں طے کرنے کے لیے دریافت کر لیتے ہیں۔ صاحب، فاصلے کو گز سے نہیں وقت سے ناپنا چاہیے۔ خیر، اب مُلّا عاصی سَچ مُچ پڑھائی میں جُٹ گئے۔ صبح سات بجے آٹھ پوریوں، پاؤ بھر کڑھائی سے اترتی جلیبیوں اور رات بھر تاروں کی چھاؤں میں بھیگے دس باداموں کی ٹھنڈائی کا ناشتہ کرنے کے بعد وہ خود کو کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا ڈلوا دیتے تاکہ اگر چاہیں بھی تو باہر نہ نکل سکیں۔ عشاء کے وقت تالا کھلتا تھا۔ دو ڈھائی ہفتے یہی معمول رہا۔ مگر امتحان میں نہیں بیٹھے۔ کہنے لگے، دماغ کا تالا نہیں کھلتا۔

اور صاحب تالا کھلتا بھی کیسے۔ امتحان سے چند روز قبل کہ معمول بنالیا کہ شام پڑتے ہی سائیکل لے کے نکل جاتے اور پو پھٹے لوٹئے۔ پرچے آؤٹ کرنے کی مہم میں لگے ہوئے تھے۔ جن جن پروفیسروں کے بارے میں انہیں ذرا بھی بدگمانی ہوئی کہ انہوں نے پرچہ بنایا ہوگا، ان کے چپراسیوں، خانساماؤں، مہتروں، حتیٰ کہ ان کے شیر خوار بچوں کو آیاؤں سمیت cultivate کررہے تھے[1]۔ اور جیسے ہی کہیں سے کوئی ہِنٹ ملتا یا گیس پیپر ہاتھ لگتا، اسے راتوں رات گھر گھر تقسیم کرتے۔ وہ مستحقین تک، یعنی شہر کے تمام نالائق طالبِ علموں تک پہنچ جاتا تو کسی دوسرے پرچے کو آؤٹ کرنے کی مہم پر سائیکل اور منھ اٹھائے نکل جاتے۔ ایک رات دیکھا کہ ایک پرنٹنگ پریس کے باہر جو کاغذ کی کترنیں،

---

[1] وہ اپنے استاد اور مرشد ماسٹر فاخر حسین کے پند سود مند پر عمل کر رہے تھے۔ موصوف اکثر سعدی کے حوالے سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم تیتر، چکور، کبوتر اور چڑیوں کو مستقل مزاجی سے دانہ ڈالتے رہو گے تو ایک دن ہما بھی تمہارے جال میں پھنس جائے گا۔

خورش دہ بہ دراج و کبک و حمام

کہ یک روزت افتند ہمائے بدام

مصیبت یہ تھی کہ ماسٹر فاخر حسین نے دانہ ڈالنا تو سکھایا، پکڑنا نہ سکھایا۔ ماسٹر فاخر حسین خود بھی ساری عمر دانہ ہی ڈالتے بلکہ اپنا سارا کھیت چڑیوں کا چگاتے رہے۔ ہما کے چکر میں کسی چڑیا کی دُم تک نہ پکڑ پائے۔

پروف کی ردّی اور کوڑا کرکٹ پڑا تھا، اسے اپنے معتقدین خاص سے دو بوریوں میں بھروا کر خوردبینی معائنے کے لیے گھر لے آئے۔ انہیں کسی نے انتہائی رازداری سے ہنٹ دیا تھا کہ ایک پرچہ اسی پریس میں چھپا ہے۔ ان کے جاسوس شہر کے مختلف حصوں میں کام کر رہے تھے۔ ان کے بقول آگرے، میرٹھ، بریلی اور راجپوتانہ اور سنٹرل انڈیا کے شہروں میں جن کا آگرہ یونیورسٹی سے الحاق تھا، ان کے خفیہ ایجنٹوں نے جاسوسی کا جال بچھا رکھا تھا جس سے کسی بھی ممتحن کا باعزت طریقے سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ یہ سب وہ تھے جو کئی سال سے مختلف مضامین میں فیل ہو رہے تھے۔ ہر جاسوس اسی مضمون کے پرچے کی مخبری میں اسپیشلائز کیئے ہوئے تھا، جس میں وہ گزشتہ سال لڑھکا تھا۔ leakage اور خفیہ اطلاعات کے سوتے خشک ہونے لگے تو انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنے ذاتی کشف و الہام سے اس کمی کو پورا کیا۔ پہلا پرچہ سیٹ کرنے والے ممتحن کے گھر کے باہر تھڑے پر گردن اور پیر لٹکائے دو گھنٹے تک پرچے کی بُو لیتے رہے۔ تین سوال اسی عالم میں القا ہوئے۔ گھر آکر ان میں مزید تین کا اضافہ اس طرح کیا کہ دس سوالوں کی کاغذ کی گولیاں بنائیں اور اسی دوشیزہ کے، جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، پانچ سالہ بھائی سے کہا کہ کوئی سی تین اُٹھالو۔ پیر کی صبح پہلا پرچہ تھا۔ اتوار کی رات کو صبح چار بجے تک دس سوالوں پر مشتمل اپنا

آؤٹ کیا ہوا پرچہ ہر اس طالب علم کے گھر پہنچایا جو گزشتہ برسوں میں متواتر فیل ہوتا رہا تھا، یا جس میں انہیں آئندہ فیل ہونے کی ذرا بھی صلاحیت نظر آئی۔ اس کارِ خیر سے صبح ساڑھے تین بجے فارغ ہوئے۔ گھر آکر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ باہر نکل کے صبح کے تارے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیر تلک دیکھا کیے۔ ایک ہندو پڑوسی سے جو کنویں کی منڈیر پر لٹیا سے اشنان کر رہا تھا اور ہر لٹیا کے بعد جتنی زیادہ سردی لگتی اتنے ہی زور سے "ہری اوم، ہری اوم" پکار رہا تھا، باہر سے تالا لگانے کو کہا، پھر اندر آکے سو گئے۔ کس واسطے کہ دماغ کا تالا نہیں کھلا تھا۔

مُلّا عاصی کے کشف و کرامات

جتنی محنت اور ریاضت انہوں نے رفاہِ عام کی خاطر پرچے آؤٹ کرنے میں کی، اس کی ایک فیصد بھی اپنی پڑھائی میں کر لیتے تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاتے۔ بہر حال افسوس اس کا نہیں کہ انہوں نے ایسے لغو کام وقت کیوں ضائع کیا۔ رونا اس بات کا ہے کہ امتحان کے پہلے پرچے میں آٹھ میں سے پانچ سوال ایسے تھے جو ان کے آؤٹ کیئے ہوئے الہامی پرچے میں موجود تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ممتحن نے ان کا پرچہ سامنے رکھ کر پرچہ سیٹ کیا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا

کہ ممتحن کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ مُلّا عاصی نے تو یہاں تک کہا کہ اس پروفیسر کے وہ تھڑا ہی تڑوا دیا جس پر بیٹھے بیٹھے انہیں کشف ہوا تھا۔ ایک عرصے تک وہ جگہ مرجعِ گمرہانِ خاص رہی۔ واللہ اعلم۔

اب کیا تھا، سارے شہر میں ان کی دھوم مچ گئی۔ دوسرے دن ان کے گھر کے سامنے امتحان میں بیٹھنے والے طلبہ کے ٹھٹ لگ گئے۔ اس کے بعد امتحان میں چار دن کا ناغہ تھا۔ ان ایام میں نزدیک و دور کے کالجوں کے طلبہ نے۔ کوئی لاری میں، کوئی ٹرین سے، کائی پاپیادہ۔ جوق درجوق آکر ان کے گھر کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ میلا سا لگ گیا۔ یو پی کے نالائق لڑکوں کا ایسا عظیم الشان اجتماع چشمِ فلک نے نہ کبھی اس سے پہلے، نہ اس کے بعد دیکھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ پولیس نے کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ مجمعے میں سی آئی ڈی کے آدمی والدوں کا بھیس بنائے پھر رہے ہیں۔ مُلّا عاصی کا بیان تھا کہ دو برقع پوش لڑکیاں بھی آئی تھیں۔ ان میں سے لمبی والی لڑکی کے بارے میں شکیل احمد نے جو کلاس میں سب سے چھوٹا اور خوبرو لڑکا تھا یہ شہادت دی کہ اس نے میرے کولہے میں چٹکی لی اور اس کی نقاب کے پیچھے مجھے تاؤ دی ہوئی مونچھ نظر آئی۔ واللہ اعلم۔ حالانکہ مُلّا عاصی اب خود امتحان میں نہیں بیٹھ رہے تھے، لیکن اوروں کی خاطر دن رات ایک کر دیے۔ کہتے تھے اگر خود امتحان میں بیٹھ جاؤں تو سارا کشف

باطل ہو جائے گا۔ طالب علموں میں یہ افواہ آگ کی طرح پھیل گئی کہ جب سے حجابات اٹھے ہیں، مُلّا عاصی دنیا سے کنارہ کش ہو کر صوفی ہو گئے ہیں اور پے در پے کرامات ظہور میں آ رہی ہیں۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس افواہ کی تردید نہیں کر سکتا۔ وہ کمرے میں تالا ڈلوا کر دن بھر چھٹی حِس کی مدد سے پرچہ بناتے۔ رات کو ٹھیک بارہ بجے اور پھر ڈھائی بجے اپنے ماموں سجاد احمد مرحوم، وکیل، کا بوسیدہ سیاہ گاؤن پہنے حجرہ عالیہ سے برآمد ہوتے اور پرچہ آؤٹ کرتے۔ تین دن تک یہی نقشہ رہا۔ تصوّف و صوف کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو ان کے چہرے پر تپسیا کرنے والے سادھوؤں کی سی گمبھیر شانتی نظر آئی۔ آنکھیں ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں کھولتے تھے۔ گوشت، لہسن اور جھوٹ چھوڑ دیا۔ صبح تڑکے ایسے ٹھنڈے یخ پانی سے اشنان کرتے کہ بے اختیار چیخ کو روکنے کے لیے پورا زور لگانا پڑتا۔ عفتِ نگاہ کا یہ عالم کہ عورت تو کُجا، مرغی یا بکری بھی سامنے آ جائے تو برہمچاریوں کی طرح شرما کر نظریں نیچی کر لیتے۔ مخالف جنس سے اس قدر احتیاط اور پرہیز کہ اُردُو کے بعض ایسے الفاظ کو بھی مذکّر بولنے لگے جو اندھے کو بھی نظر آتے ہیں کہ مؤنث ہیں۔ غرض کہ پرچے آؤٹ کرنے کے لیے اپنی تمام روحانی طاقتیں اور تصرفات داؤ پر لگا دیئے۔

پہلے پرچے کو چھوڑ کر، باقی ماندہ پرچوں میں ان کا بتایا ہوا ایک بھی سوال نہیں آیا۔ وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ان کے حق میں بس یہی کہا جا سکتا تھا کہ انھوں نے بڑے خلوصِ نیت سے خلقِ خدا کو خوار کیا تھا۔ اس سال کانپور اور اس کے ارد گرد پچاس ساٹھ میل کے حلقے میں جتنے بھی لڑکے فیل ہوئے، ان سب کا یہی موقف تھا کہ مُلّا عاصی کے آؤٹ کیے ہوئے پرچوں کی وجہ سے لڑھکے ہیں۔ حد یہ کہ عادی فیل ہونے والے لڑکے جو ہر سال قسمت اور ممتحن کو گالیاں دیا کرتے تھے، وہ بھی مُلّا عاصی کا جان کے لاگو ہو گئے۔ نوبت گالی گلوچ پر آنے لگی تو وہ چپکے سے اپنی ننہال امروہہ سٹک گئے۔ ایک لڑکے کے ماموں نے تو مُلّا عاصی کے ماموں کو سرِ بازار زدوکوب بھی کیا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ تک ان کے خاندان کا کوئی بزرگ گھر سے باہر نہیں نکل سکا۔

تو جناب یہ تھے ہمارے مُلّا عاصی عبد المنان۔ چند مخصوص eccentricities (سنک۔ مضحک عادات و اطوار) سے قطع نظر، جوانی ان کی بھی ویسی ہی گزری جیسی اس زمانے میں عام طالبعلموں کی گزرتی تھی۔ آپ نے اس دن مرزا عبد الودود بیگ کا ایک چرانداسا مقولہ سنایا تھا۔ کس کس بلا سے عبارت تھی جوانی اس زمانے میں؟

"سال بھر عیش، امتحان سے پہلے چلہ، مہاسے، مشاعروں میں ہوٹنگ، آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے، رینالڈ اور مولوی عبدالحلیم شرر کے اسلامی ناول، سونے سے پہلے آدھ سیر اونٹتا دودھ، بلا ناغہ ڈنڑ بیٹھک اور استمنا بالید، جمعے کے جمعے غسل، شب گپ، ریلوے اسٹیشن پر لیڈیز کمپارٹمنٹ کے سامنے solo goose-step، انگریز کے خلاف نعرے اور اسی کی نوکری کی تمنا"۔

مُلّا عاصی نے ساری زندگی تجرّد میں گزار دی۔ سہرا بندھا نہ شہنائی بجی۔ نہ چھوہارے بٹے۔ خود ہی چھوہارا ہو گئے۔ میں نے بہت کریدا۔ پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے۔ گھڑے گھڑائے بقراطی جملے لڑھکانے لگے جو ان اپنے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ "بس تمام عمر ایسی افراتفری رہی کہ تزویج اور متاہلانہ آسودگی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ (جی ہاں، شادی کے لیے مُلّا عاصی اب یہی لذیذ اصتلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ آدھی لذت تو فقط ان کے تلفظ میں ہی مل جاتی ہے)۔ مجھے تو عورتوں کے بغیر زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ ان کی حق تلفی ہوئی ہو تو مجھے علم نہیں۔ اللہ معاف کرے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب بھی اسی کمرے میں رہتے ہیں جس میں انکی ولادت ہوئی تھی۔ میرا تو سوچ سوچ کے ہی دَم گھٹنے لگا کہ کوئی شخص اپنی ساری زندگی ستر پچھتر برس ایک ہی محلے، ایک ہی مکان اور ایک ہی کمرے میں کیسے گزار سکتا

ہے۔ کراچی میں تو اتنے سال آدمی قبر میں بھی نہیں رہ سکتا۔ جہاں گورکنوں نے دیکھا کہ اب کے شبِ برات اور عید بقر عید پر بھی کوئی فاتحہ پڑھنے نہیں آیا، وہیں ہڈیاں اور پنجر نکال کے پھینک دیئے اور تازہ مردے کے لیے جگہ نکال لی۔ جب صور پھونکا جائے گا تو ایک ایک قبر سے ایک سو ایک مردے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ایک سو ایکواں مردہ متعلقہ گورکن ہو گا۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مردِ کہن کا چارہ

صاحب، ویسے تو دنیا میں ایک سے ایک crackpot (سنکی) پڑا ہے، لیکن مُلّا عاصی کا "تُو چیزے دیگری" والا معاملہ ہے۔ ان کے ایک واقف کار کا بیان ہے آخری واٹرلو کے بعد کھسک گئے ہیں۔ فرقہ ملامتیہ سے تعلق ہے۔ نماز اس طرح پڑھتے ہیں جیسے بعض مسلمان شراب پیتے ہیں۔ یعنی چوری چھپے۔ یہ وہی فرقہ ہے جس سے حضرت مادھولال حسین کا تعلق بتایا جاتا ہے۔ ایک صاحب بولے کہ "مرتد ہوئے مدت ہوئی" اس پر دوسرے صاحب بولے کہ "مسلمان تھے کب جو مرتد ہوتے؟" حیدر مہدی نے بتایا کہ ایک دن میں نے پوچھا "مُلّا یہ کیا سچ ہے کہ تم بدھسٹ ہو گئے ہو؟" کہنے لگے "جب میں نے پچاسویں سال میں قدم رکھا تو خیال آیا زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کیوں نہ اپنے عقائد کی اصلاح کر

لوں۔ سانگ باقی بہت ہیں، شب کم ہے"۔ ایک دن بہت اچھے موڈ میں تھے۔ میں نے گھیرا۔ پوچھا کہ "مولانا بدھ ازم میں تمہیں اس کے علاوہ اور کون سے خوبی نظر آئی کہ مہاتما بدھ اپنی بیوی یشودھرا کو سوتا چھوڑ کر راتوں رات سٹک گئے؟" مسکرائے۔ کہنے لگے "میری یشودھرا تو میں خود ہوں۔ وہ بھاگ بھری تو اب اگلے جنم میں جاگے گی"۔

ایک محرم راز نے تو یہاں تک کہا کہ مُلّا عاصی نے وصیت کر رکھی ہے کہ میری لاش تبت لے جائی جائے۔ حالانکہ بچارے تبت والوں نے ان کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پروفیسر بلگرامی جو ایک مقامی کالج میں انگریزی ادب پڑھاتے ہیں اس اتّہام کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مُلّا عاصی نے وصیت لکھی ہے کہ ان کی غیر مغسول لاش کو سپردِ آتش کر دیا جائے۔ اور وہ بھی "لیڈی چیڑ لیز لوور" کے مصنف ڈی ایچ لارنس کی طرح۔ اس کی بیوہ کو ڈر تھا کہ لارنس کی خاک کے چھوٹے سے "ارن" (صراحی نما ظرف) کو اس کے عقیدت مند اور فین چرا کر لے جائیں گے۔ لہذا اس نے شوہر کی راکھ کو سیمنٹ میں ملوا کر بہت بھاری سِل بنوالی تھی جسے لوگ چوم کر چھوڑ دیتے تھے۔ غرض کہ جتنے منہ اتنے بہتان۔ لیکن اتنا تو میں نے بھی دیکھا کہ کونے میں انکی والدہ کی نماز کی چوکی پر جانماز الٹی بچھی تھی۔ یعنی محراب کیا رخ قبلے کی بجائے پورب کی طرف تھا۔

سنا ہے اس پر آسن مار کے دھیان اور تپسیا کرتے ہیں۔ ایک تُونبی بھی پڑی دیکھی جس کے بارے میں ایک دوست نے کہا کہ انھوں نے کبھی سنجیدگی سے کوئی ہول ٹائم (کل وقتی) پیشہ اختیار کیا تو اسی تُونبی میں گھر گھر بھیک مانگیں گے۔ میز پر زین بدھ ازم پر پانچ چھ کتابیں پڑی تھیں۔ میں نے یوں ہی ورق گردانی کی۔ اللہ جانے انہیں کس سے انڈرلائن کرایا ہے۔ کمرے میں صرف ایک ڈیکوریشن پیس ہے۔ یہ ایک انسانی کھوپڑی ہے، جس کے بارے میں لطیفہ مشہور ہے کہ گوتم بدھ کی ہے۔ نروان سے پیشتر کی۔

سلیقے سے طے کی ہوئی ایک گیرواچادر پر گز بھر لمبا چمٹار کھا تھا۔ مجھے تو بجانے والا اپنے عالم لوہار وال چمٹا لگا۔ اس پر کسی دل جلے نے پھبتی کسی کہ مُلا عاصی جب کوہ طور پر اپنی سٹک[1] کی چلم کے لیے آگ لینے جائیں گے تو اسی چمٹے سے ٹین کمانڈ مینٹس (احکامِ عشر) پکڑے پکڑے پیر پٹختے لوٹیں گے۔ پاس ہی لکڑی کی

---

[1] سٹک: لغت میں سٹک کے معانی چھوٹا پیچوان یا چھریرے بدن کی عورت کے ہیں، اور پیچوان کا معنیٰ: ایک قسم کا حقہ جس کی نے لچک دار اور بہت لمبی ہوتی ہے۔ دونوں معنوں کو ملا کر پڑھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اگلے وقتوں کے بزرگ، عورت میں بھی حقے کے اوصاف کے متلاشی رہتے تھے۔ اور بعد تقابل و تلاشِ بسیار حقے اور تصوف ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ کہ یہی ہے اُمتوں کے مردِ کہن کا چارہ۔

سادھوؤں والی کھڑاویں پڑی تھیں۔ وہی جن کے پنجے پر شطرنج کا اونٹ بنا ہوتا ہے۔ نماز کی چوکی پر ایک مٹی کا پیالہ، اِکتارہ، باسی تُلسی اور بدھ کی مورتی رکھی تھی۔ مختصر یہ کہ کمرے میں بدھ ازم کے (Do it yourself) آلات گرد میں اٹے جابجا پڑے تھے۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے ان کا مقصد محض نمائش ہے۔ گویا دوسروں کا منہ چڑانے کے لیے اپنی ناک کاٹ لی۔

آگ تکفیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ انہوں نے یہ سارا آدمبر اور ڈھونگ صرف مسلمانوں کو چڑانے کے لیے رچا رکھا ہے۔ لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ، اپ جانتے ہیں، مسلمانوں نے کسی کے ہندو، عیسائی یا بدھ مت کا پیرو ہونے پر کبھی تعرض نہیں کیا۔ البتہ اپنی فقہ اور فرقے سے باہر ہر دوسرے مسلم فرقے کا سر پھاڑنے اور کفر کا فتویٰ لگانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

کُھل جا سم سم

آپ ذرا گیس کیجیے وہ کیا کرتے ہیں۔ میں آپ کو دو منٹ دیتا ہوں۔ (آدھے منٹ بعد ہی) جناب وہ ٹیوشن کرتے ہیں۔ غریب لڑکوں کو میٹرک کی تیاری

کرواتے ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے لوٹتے ہیں۔ پانچ چھ میل پیدل چل کر جانا تو کوئی بات ہی نہیں۔ کہتے ہیں "سواری سے نفس موٹا ہوتا ہے، سوائے گدھے کی سواری کے۔ اسی لیے بنی اسرائیل کے پیغمبروں نے گدھے کی سواری کی ہے"۔ مگر سنا ہے پڑھانے کا پیسا ایک نہیں لیتے۔ کہتے ہیں "مشرق کی ہزاروں سال پرانی ریت ہے کہ پانی، نصیحت اور تعلیم کا پیسا نہیں لیا جاتا۔ پیسہ لے لو تو یہ انگ نہیں لگتے[1]۔ اور انجام کار پیسہ بھی نہیں پچتا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ معاوضہ دے کر حاصل کئے ہوئے علم سے کوئی روحانی تبدیلی آئی ہو۔ سچی تبدیلی صرف کسی کی نظر سے آتی ہے۔ اور نظر کا کوئی مول نہیں"۔ اللہ جانے گزر بسر کیسے ہوتی ہے۔ دستِ غیب تو ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ بدھسٹ خدا اور اس کی رزاقی کے قائل نہیں۔ بھیک کو ترجیح دیتے ہیں۔ فلسفے کا ایک پورا قلعہ کھڑا کر لیا ہے مُلّا عاصی نے۔ ہم جیسوں کے پلے تو خاک نہیں پڑتا۔ اب اسے جنوں کہیے، جھک کہیے، بس ہے تو ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ پڑھائی کے نام سے بھاگنے والا لڑکا، پڑھانے میں اپنا نروان تلاش کرے گا۔ یاد نہیں، آپ کا قول ہے یا میرا، کہ اپنے ہاں جو لڑکے پڑھائی میں پھسڈی ہوتے ہیں وہ فوج میں چلے جاتے ہیں۔ اور جو فوج کے لیے medically unfit ہوتے ہیں وہ کالجوں میں

---

[1] انگ لگنا: غذا کا جزوِ بدن ہونا

پروفیسر بن جاتے ہیں۔ صاحب، قدرت جس سے جو چاہے کام لے۔ آپ بھی تو ایک زمانے میں لیکچرر بننے کی تمنّا رکھتے تھے۔ خدا نے آپ پر بڑا کرم کیا کہ دلی مراد پوری نہ ہونے دی۔ ویسے آپ کو معلوم ہی ہے، میں نے بھی کئی برس ٹیچری کی ہے، دل کی بات پوچھیئے تو حاصلِ زندگی بس وہی زمانہ تھا۔ یاد آتا ہے:

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب

آسودگی کی جان تیری انجمن میں تھی

لیکن ایک بات ہے، سبھی کہتے ہیں کہ پڑھاتے بہت اچھا ہیں۔ اچھا معلّم ہونے کے لیے عالم ہونے کی شرط نہیں۔ کچھ عرصے گورنمنٹ سکول میں بھی پڑھایا۔ لیکن جب محکمہ تعلیمات نے یہ تیخ نکالی کہ تین سال کے اندر بی ٹی پاس کرو، ورنہ تنزلی کر دی جائے گی، تو یہ کہہ کہ استعفٰی دے دیا کہ "میں بے صبر آدمی ہوں۔ تین سال اس واقعے کے انتظار میں نہیں گزار سکتا۔ میں نے ہمیشہ بی ٹی پاس ٹیچروں سے پڑھا اور ہمیشہ فیل ہوا"۔ اس کے بعد کہیں نوکری نہیں کی۔ البتہ نابیناؤں کے سکول میں مفت پڑھانے جاتے ہیں۔ لہجے میں مٹھاس، ملائمت اور دھیرج بلا کا ہے۔ ہمیشہ سے تھا۔ الفاظ سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ لہجے سے دل میں اتر جاتی ہے۔ جادو الفاظ میں نہیں، لہجے میں ہوتا ہے۔ الف لیلٰوی خزانوں کا

دروازہ ہر ایرے غیرے کے "کھل جا سم سم" کہنے سے نہیں کھلتا۔ وہ اللہ دین کا لہجہ مانگتا ہے۔ دلوں کے قفل کی کلید بھی لفظ نہیں، لہجے میں ہوتی ہے۔ اپنی بات دہرانی پڑے یا دوسرا الجھنے لگے تو ان کا لہجہ اور بھی ریشم ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے فالودہ گلے سے اتر رہا ہے۔ ہر اچھے استاد کے اندر ایک بچہ بیٹھا ہوتا ہے جو ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور سر ہلا ہلا کر بتاتا جاتا ہے کہ بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔ اچھے استاد کا پڑھانا بس اس بچّے سے ایک مکالمہ ہے جو عمر بھر چلتا رہتا ہے۔ انہوں نے اس بچّے کو بچہ ہی رہنے دیا۔

۵

وہ کمرہ بات کرتا تھا

حجرہ جہاں نما

مُلّا عاصی سے اسی کمرے میں گھمسان ملاقاتیں رہیں جہاں پینتیس برس پہلے انہیں خدا حافظ کہہ کر پاکستان آیا تھا۔ اس زمانے میں سبھی پاکستان کھنچے چلے آ رہے تھے۔ زمین جائداد، پھرے بتولے گھر، لگے لگائے روزگار اور اپنے یاروں

پیاروں کو چھوڑ کر۔ اسی کمرے میں مجھے گلے لگا کے رخصت کرتے ہوئے کہنے لگے ”جاؤ، سدھارو، میری جان، تمھیں کو ہِ ندا کے سپرد کیا“۔ آج بھی انہیں اتنا ہی تعجب ہوتا ہے کہ بھلا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس کانپور کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ کمرے میں وہی پنکھا، اسی ڈگمگ ڈگمگ کڑے میں لٹکا، اسی طرح چرغ چوں کرتا رہتا ہے۔ مجھے تو جب بات کرنی ہوتی تو پنکھا آف کر دیتا تھا۔ پنکھا چلتے ہی آندھی آ جاتی ہے اور کتابوں، دیواروں اور دری پر جمی ہوئی گرد کمرے میں اُڑنے لگتی ہے۔ جس سے مچھروں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ پنکھا گرمی سے نہیں مچھروں سے بچنے کے لیے چلاتے ہیں۔ مگر کم، بہت ہی کم، اس لیے نہیں کہ بجلی کی بچت ہوتی ہے، بلکہ چلانے سے پنکھا گِھستا ہے۔ اس کی لائف کم ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ چالیس پینتالیس برس کو تو ہو گا۔ ان حسابوں سو تک گھسیٹ لے جائیں گے۔ بعض سادھوؤں اور جوگیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے مقدر میں بھگوان نے گنتی کے سانس لکھے ہیں۔ چنانچہ بیشتر وقت سانس روکے بیٹھے رہتے ہیں تاکہ زندگی، بقدرِ حبسِ دم، لمبی ہو جائے۔ طوعاً و کرعاً گنڈے دار سانس فقط اس لیے لے لیتے ہیں کہ اسے روک سکیں۔ بس پنکھے کی عمر بھی اسی طرح دراز کی جا رہی ہے۔

ان کے کمرے میں گویا ایک عالم کی سیر ہو گئی۔ حجرۂ جہاں نما کہئے۔ ہر چیز ویسی ہی ہے۔ بلکہ وہیں کی وہیں دھری ہے۔ بخدا مجھے تو ایسا لگا کہ مکڑی کے جالے بھی وہیں ہیں جو چھوڑ کے آیا تھا۔ صرف ایک تبدیلی دیکھی۔ داڑھی پھر منڈوا دی ہے۔ پوچھا تو گول کر گئے۔ کہنے لگے "داڑھی اس وقت تک قابلِ برداشت ہے جب تک کالی ہو"۔ اس پر انعام صاحب آنکھ مارتے ہوئے بولے "مہاتما بدھ بھی تو منڈواتے تھے"۔ کمرے کا نقشہ وہی ہے جو سن ۴۷ء میں تھا۔ البتہ دیواروں پر چیکٹ چڑھ گیا ہے۔ صرف وہ حصّے صاف نظر آئے جس کا پلاسٹر حال میں جھڑا ہے۔ بائیں دیوار پر پلنگ سے دو فٹ اوپر، جہاں پینتالیس سال پہلے میں نے پنسل سے پکنک کا حساب لکھا تھا، اس کی اوپر کی چار لائنیں ابھی تک جوں کی توں ہیں۔ صاحب، روپے میں ۱۹۲ پائی ہوتی تھیں اور ایک پائی آج کل کے روپے کے برابر تھی۔ حیرت اس پر ہوئی کہ دیوار پر بھی حساب کرنے سے پہلے میں نے ۷۸۶ لکھا تھا۔ بقول آپ کے مرزا عبدالودود بیگ کے، اس زمانے میں مسلمان لڑکے حساب میں فیل ہونے کو اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتے تھے۔ حساب کتاب، بنج بیوپار اور ہر وہ کام جس میں منافے کا ذرا بھی امکان ہو، بنیوں، بقالوں اور یہودیوں کا کسب تصور کیا جاتا تھا۔ مگر مجھے چکرورتی ارتھمیٹک ازبر تھی۔ پونا، سوایا اور ڈھائی کا پہاڑا مجھے اب تک یاد ہے۔ ان کا

فائدہ وائدہ تو سمجھ خاک نہیں آیا۔ دراصل یہ لڑکوں کا پتّا مارنے بلکہ خود انہیں پتّے سمیت مارنے کا ایک بہانہ تھا۔ مسلمان پر یاد آیا کہ یہ جو پنج وقتہ ٹکریں مارنے کا گٹّا آپ دیکھ رہے ہیں، یہ الحمدللہ پچیس چھبیس برس کی عمر میں ہی پڑ چکا تھا۔ میاں تجمل کی صحبت اور نیاز فتح پوری کی تحریریں بھی نماز نہ چھڑوا سکیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا، دو تہائی بال اسی عمر میں سفید ہو گئے تھے۔ خیر تو یہ کہہ رہا تھا کہ شیشم کی میز کے اوپر والی دیوار پر میٹرک کی فیئر ویل (الوداعی) پارٹیوں کے گروپ فوٹو لگے ہیں۔ متواتر پانچ سالوں کے۔ خدا خدا کر کے پانچویں سال ان کا بیڑا اس وقت پار لگا۔ جب ان کا ایک کلاس فیلو بی اے کر کے انہیں انگریزی پڑھانے لگا۔ پانچوں میں وہ ہیڈ ماسٹر کے پیچھے کرسی کی پشت مضبوطی سے پکڑے کھڑے ہیں۔ مشہور تھا کہ وہ اس وجہ سے پاس نہیں ہونا چاہتے کہ پاس ہو گئے تو مانیٹری ختم ہو جائے گی۔ کالج میں مانیٹر کا کیا کام۔ ایک فوٹو سیپیا رنگ کا ہے۔ میں تو اس میں اپنا حلیہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یا اللہ۔ ایسے ہوتے تھے ہم نوجوانی میں، کیسے اداس ہوتے تھے لڑکے اس دن۔ تادمِ مرگ دوستی نبھانے، دُکھی انسانیت کی خدمت کرنے اور ایک دوسرے کو تمام عمر ہر تیسرے دن خط لکھنے کے کیسے کیسے عہد و پیمان ہوتے تھے۔ میز پر ابھی تک وہی سبز بانات منڈھی ہوئی ہے۔ روشنائی کے دھبوں سے ۹/۱۰ نیلی ہو گئی ہے۔ بے

اختیار جی چاہا کہ بقیہ ۱۰/ اپر بھی دوات انڈیل دوں تا کہ یہ برص کسی طرح ختم تو ہو۔ چپراسیوں کی وردیاں بھی اسی بانات سے بنتی تھیں۔ سردی کڑاکے کی پڑنے لگتی تو کبھی کبھی سکول کا چپڑاسی بشیر ڈانٹ کے ہمیں گھر واپس بھیج دیتا کہ میاں، کوٹ لنگوٹ سے کام نہیں چلے گا۔ کمری، مرزئی (روئی کی واسکٹ) ڈاٹ کے آؤ۔ مگر خود گھر سے ایک پتلی سی مرزئی پہن کر آتا جو اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ لوزاتی "پیٹرن" کے ڈوروں کے ہر خانے میں روئی کا علیحدہ گومڑہ بن گیا تھا۔ لیکن یونی فارم کی اچکن گھر پہن کر نہیں جاتا تھا۔ میں نے اس پر کبھی کوئی سلوٹ یا داغ نہیں دیکھا۔ چھٹی کا گھنٹہ اس طرح بجاتا کہ گھڑیال کھکھلا اٹھتا۔

بڑے کاز، چھوٹے آدمی

مچھلی بازار کی مسجد شہید ہونے پر مولانا شبلی کی "ہم کشتگانِ معرکہ کانپور ہیں" معرکتہ آلارا نظم ابھی تک اسی کیل پر معلق ہے جو ٹھونکنے میں دہری ہو گئی تھی۔ صاحب، جس شخص نے کیل ٹھونکتے وقت ہتھوڑا کیل کی بجائے اپنے انگوٹھے پر کبھی بھی نہیں مارا، مجھے تو اس کی ولدیت میں شبہ ہے۔ ایسے چوکس چالاک آدمی سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ اس مسجد کے بارے میں خواجہ حسن نظامی

نے لکھا تھا کہ ”یہ وہ مسجد ہے جس کے سامنے ہمارے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں اور ان کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہو گئیں“۔

نظم کے فریم کا شیشہ بیچ میں سے ایسا تڑخا ہے کہ مکڑی کا جالا سا بن گیا ہے۔ میں نے کوئی پچاس برس بعد یہ پوری نظم اور ”بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو“ والی نظم پڑھی۔ کیا عرض کروں۔ دل پہ وہ اثر نہ ہوا۔ اس زمانے اور دورِ ما قبل کے بعض کاز مثلاً ریشمی رومال والی تحریک، خلافت، جنگِ بلقان (لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل، بلقان چل)، تعلیمِ نسواں اور سائنسی تعلیم کی شدید مخالفت جس میں اکبر الہ آبادی پیش پیش تھے، شاردا ایکٹ (صغر سنی کی شادی پر پابندی کا قانون) کے خلاف مسلمانوں کا، بشمول مولانا محمد علی جوہر ایجی ٹیشن۔ یہ اور بہت سے ایسے کاز جن کی خاطر کبھی جان کی بازی لگا دینے کو جی چاہتا تھا، اب کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ خلافت موومنٹ ہی کو لیجیے۔ اس کی حمایت تو گاندھی جی نے بھی کی۔ اس سے زیادہ جوشیلی، ملک گیر، منظم، الٹی اور لاحاصل تحریک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر وہ لوگ بڑے تھے۔ آج کل کاز تو بہت معقول اور بڑے ہیں، پر آدمی بہت چھوٹے ہو گئے۔ نشور ہی نے سودا کا شعر سنایا جو دو سو سال گزرنے کے بعد بھی بالکل آج کا شعر معلوم ہوتا ہے:

اثر سے ہیں تہی نالے، تصرف سے ہیں دم خالی

نیستاں ہو گئے شیروں سے یارب یک قلم خالی

وہ بھی عجیب جذباتی دور تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بدری نرائن نے ایک دفعہ محمود غزنوی کو لٹیرا ملڑ (مُلّا) کہہ دیا تو جواب میں عبدالمقیت خاں نے شیوا جی کو Mountain Rat کہا۔ اس پر بات بڑھی اور بدری نرائن نے نام لے لے کے مغل بادشاہوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اورنگ زیب کی بیٹی شہزادی زیب النسا مخفی پر تو بہت ہی گندہ بہتان لگایا۔ جواباً عبدالمقیت خاں نے پرتھوی راج چوہان، مہارانا پرتاب اور مرزا راجا سوائی مان سنگھ کو تُوم کے رکھ دیا۔ لیکن جب مہاراجا رنجیت سنگھ پر ہاتھ ڈالا تو بدری نرائن تلملا اٹھا حالانکہ وہ سکھ نہیں تھا۔ گوڑ برہمن تھا۔ دونوں وہیں گتھم گتھا ہو گئے۔ مقیت خاں کا انگوٹھا اور بدری نرائن کی ناک کا بانسا ٹوٹ گیا۔ دونوں ایک ہی لونڈے پر عاشق تھے۔

چڑیا کی دسراہٹ

دیواروں پر وہی طغرے، وہی سبق آموز وصلیاں اور چارپائی بھی وہی جس کے سرہانے والے پائے پر عبدالمقیت خاں نے چاقو سے اس لونڈے کا نام کھودا تھا۔

اور اسی سے انگلی میں شگاف لگا کر خون حروف میں بھرا تھا۔ آپ بھی دل میں کہتے ہوں گے کہ عجیب آدمی ہے۔ اس کی کہانی سے خدا خدا کر کے طوائف رخصت ہوئی تو لونڈا ادرّانا چلا آتا ہے۔ صاحب کیا کروں۔ ان گنہ گار آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہی تو بیان کروں گا۔ آپ میر کی کلیات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری پڑھیے، مصحفی کے دیوان دیکھیے۔ آپ کو جابجا اس کر طرف علانیہ اشارے ملیں گے۔ صاحب، عورت کے بارے میں بات کرنے کا ہیاؤ تو کوئی بی اے میں آ کے پڑتا تھا۔ اب اس لونڈے کا نام کیا بتاؤں۔ کانگرس کے ٹکٹ پر منسٹر ہو گیا تھا۔ کرپشن میں نکالا گیا۔ ایک ڈپٹی سیکریٹری کی بیوی سے شادی کر لی تھی۔ ڈسمس ہونے کے تین مہینے بعد ایک سکھ بزنس مین کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس زمانے کی جنسی محرومی اور گھور گھٹن کا آپ بالکل اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس لیے کہ آپ اس وقت تک بالغ نہیں ہوئے تھے۔ مجاز نے جھوٹ نہیں کہا تھا:

موت بھی اس لیے گوارا ہے

موت آتا نہیں ہے، آتی ہے

صاحب، یقین جانیئے، عالم یہ تھا اس زمانے میں کہ عورت کا ایکس رے بھی دکھا دیا جاتا تو لڑکے اسی پر دل و جان سے عاشق ہو جاتے۔

روشندان میں اب شیشے کی جگہ گتا لگا ہوا ہے۔ اس کے سوراخ میں ایک چڑیا بڑے مزے سے آ جا رہی تھی۔ نیچے جھری میں گھونسلا بنا رکھا ہے۔ اس کے بچّے چوں چوں کرتے رہتے ہیں۔ ایک دن مُلّا عاصی کہنے لگے کہ بچّے جب بڑے ہو کر گھونسلا چھوڑ دیں گے تو ہمارا گھر سنسان ہو جائے گا۔ دھول سے دری کی لائنیں مٹ گئی ہیں۔ میاں تجمل حسین کے سگریٹ سے چالیس پینتالیس برس پہلے سوراخ ہو گیا تھا۔ وہ اب بڑھ کے اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اس میں سے تربوز نکل جائے۔ سوراخ کے حاشیے پر دری کے پھونسڑوں کی جھالر سی بن گئی ہے۔ اس کے وسط میں وہی ریلوے ویٹنگ روم اور ڈاک بنگلوں والا کتھئی رنگ کا سیمنٹ کا فرش کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ میاں تجمل حسین کی عمر اس وقت کچھ نہیں تو تیس برس تو ہو گی۔ تین بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ مگر بڑے حاجی صاحب (ان کے والد) کا ایسا رعب تھا کہ سگرٹ کی طلب ہوتی تو کسی دوست کے ہاں جا کر پی آتے تھے۔ حاجی صاحب سگرٹ پینے کا شمار آوارگی میں کرتے تھے۔ خود حقّہ پیتے تھے۔ بائیسکوپ کا شمار بدمعاشی میں کرتے۔ چنانچہ میاں تجمل کو تنہا سینما دیکھنے نہیں جانے دیتے تھے۔ خود ساتھ جاتے تھے۔

دیکھیے، میرے ”چنانچہ “ پر آپ پھر مسکرا رہے ہیں۔ صاحب لکھنؤ اور کانپور والے اگرچہ اور چنانچہ کثرت سے بولتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں لہٰذا بہت گاڑھا لگتا ہے۔ ارے صاحب، میں نے تو اس زمانے میں عام آدمیوں کو لہٰذا، ہر چند، ازبسکہ اور درآنحالیکہ تک کثرت سے بولتے سنا ہے۔

چھپکلی کی کٹی ہوئی دُم

چھت نہایت بوسیدہ، شہتیر دیمک زدہ، پنکھے کا کڑہ گھستے گھستے چوڑی برابر رہ گیا ہے۔ میں نجومی تو ہوں نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان تینوں میں سے پہلے کون گرے گا۔ ملاقاتی کو عین پنکھے کے نیچے بٹھاتے ہیں۔ اس غریب کی نگاہ سارے وقت پنکھے پر ہی جمی رہتی ہے۔ ایئر گن سے میں نے چھت پر جہاں چھپکلی ماری تھی، وہاں چھرے کا نشان جوں کا توں موجود ہے۔ اور ہاں، چھپکلی پر یاد آیا، آپ کے اس دوست کو جس کا خط ہاسٹل کے لڑکوں نے چُرا کر پڑھ لیا تھا۔ اس کی بیوی نے کیا لکھا تھا؟ ہندی میں تھا شاید ۔

”جگت نرائن سری واستو نام تھا، نئی نئی شادی ہوئی تھی، لکھا تھا رام کسم، تمھارے بنا راتوں کو ایسے تڑپتی ہوں جیسے چھپکلی کی کٹی ہوئی دُم“۔

واہ، اس تشبیہ کے آگے تو "ماہی بے آب" پانی بھرتی ہے۔ مگر آپ اسے ناسٹل جیازدہ لوگوں کے لیے سمبل کے طور پر استعمال کرتے ہیں، یہ زیادتی ہے۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مُلّا عاصی کا ذریعہ معاش کچھ نہیں ہے۔ نہ کبھی تھا۔ مگر کبھی خالی بھی نہیں رہے۔ بے روزگار ہمیشہ رہے۔ لیکن بیکار کبھی نہیں۔ غالباً سن ۵۱۔۵۰ء کی بات ہے۔ ان کی والدہ حصولِ ملازمت اور بدھ ازم سے چھٹکارے کی منّت دوسری دفعہ مانگنے اجمیر شریف گئیں۔ وہاں کسی نے کہا کہ اماں تم حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دو۔ وہاں خود خواجہ اجمیری نے چِلّہ کھینچا تھا۔ سو وہ چھ مہینے بعد منت مانگنے لاہور چلی گئیں۔ مزار پر چڑھانے کے لیے جو کامدار ریشمی چادر وہ ساتھ لے گئی تھیں۔ اس میں نہ جانے کیسے سرِ شام آگ لگ گئی۔ لوگوں نے کہا جلالی وظیفہ الٹا پڑ گیا ہے۔ درِ اجابت وا نہ ہو تو نذر قبول نہیں ہوتی۔ وہ رات انہوں نے روتے گزاری۔ صبح فجر ادا کرتے ہوئے سجدے کی حالت میں وہ مجیب الدعوات سے جا ملیں۔ دمے اور قلب کا مزمن عارضہ تھا۔ لاہور ہی میں میانی صاحب قبرستان میں مدفون ہوئیں۔

والدہ کے انتقال کے بعد ان کے گھر میں چولہا نہیں جلا۔ انہوں نے مکان کا بقیہ حصّہ کرائے پر اُٹھا دیا۔ کرایہ دار نے پندرہ سال سے وہ بھی دینا بند کر دیا۔ سنا ہے اب اُلٹا انکو کمرے سے بے دخل کرنے کے لیے قانونی چارہ جوئی کرنے والا ہے۔

عمر کبھی بہتّر، کبھی پچھتر سال بتاتے ہیں۔ اور سال کے بعد وضاحتاً ''شمسی'' کا اضافہ کرتے ہیں تا کہ تسامح نہ ہو۔ شمسی پر یاد آیا کہ چھٹی جماعت میں میں نے بھر کلاس میں قمری سال کو قُمری سال اور لٹریچر کو لڑی چر، پڑھا تو ماسٹر فاخر حسین نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور اس دن کے بعد سے مجھے بشارت لڑی چر کہنے لگے۔

۸

چپراسی کا سنہری دورِ ماتحتی

بشیر چپراسی سے بھی ملنے گیا۔ بالکل بوڑھا پھونس ہو گیا ہے۔ مگر کمر بندوق کی نال کی طرح سیدھی۔ ذرا جوش میں آ جائے تو آواز وہی کڑکا۔ کہنے لگا میاں بے غیرت ہوں۔ اب تو اس لیے زندہ ہوں کہ اپنے چھوٹوں کو، اپنی گود کے کھلائے ہوؤں کو کندھا دوں۔ ہمارا بھی ایک زمانہ تھا۔ اب تو پسینہ اور خواب آنے بھی بند ہو گئے۔ چھٹے چھماہے کبھی خواب میں خود کو گھنٹا بجاتے دیکھ لیتا ہوں تو طبیعت دن بھر چونچال رہتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے ابھی ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ ماسٹر سمیع الحق مجھ سے عمر میں پورے بارہ برس چھوٹے ہیں۔ تس پر یہ حال کہ حافظہ بالکل

خراب۔ ہاضمہ اس سے زیادہ خراب۔ لوٹا ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں اور یہ یاد نہیں کہ بیت الخلا جا رہے ہیں یا ہو کر آ رہے ہیں۔ اگر آ رہے ہیں تو پیٹ میں گڑگڑاہٹ کیوں ہو رہی ہے؟ اور جا رہے ہیں تو لوٹا خالی کیوں ہے؟ مجھے ہر لڑکے کا حلیہ اور حرکتیں یاد ہیں۔ میاں، آپ کا شمار صورت داروں میں ہوتا تھا۔ حالانکہ سر منڈواتے تھے۔ مُلّا عاصی عورتوں کی طرح بیچ کی مانگ نکالتا تھا۔ آپ کا دوست عاصم گلے میں چاندی کا تعویذ پہنتا تھا۔ جس دن اسکا میٹرک کا پہلا پرچہ تھا۔ اسی دن اس کے والد کا انتقال ہوا۔ جب تک وہ پرچہ کرتا رہا، میں کونے میں کھڑا الحمد اور آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ دو دفعہ آدھا آدھا گلاس دودھ پلایا اور جس سال کوئٹہ میں بھونچال آیا اسی سال آپ کے دوست غضنفر نے انجن کے سامنے آ کر خودکشی کی تھی۔ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پر میرے تو سینکڑوں بیٹے ہیں۔ کون بھڑوا کہتا ہے کہ بشیر لاولد ہے۔

شرافت سے گالی دینے والے

پھر کہنے لگا، یہ بھی مولا کا کرم ہے کہ صحیح وقت پر ریٹائر ہو گیا، نہیں تو کیسی خواری ہوتی۔ اللہ کا شکر ہے چاق و چوبند ہوں۔ بڑھاپے میں بیماری عذاب ہے۔ پر ضرورت سے زیادہ تندرستی اس سے بھی بڑا عذاب ہے۔ فالتو تندرستی کو

آدمی کاۓ پہ خرچ کرے؟ میاں، ہٹّا کٹّا بُڈھا گھر کا نہ کھاٹ کا، اسے تو گھاٹ کی ہیرا پھیری میں ہی مزہ آوے ہے۔ چنانچہ پچھلے سال ٹلکتا ہوا اسکول جا نکلا۔ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ چپراسی صاحبان بغیر چپراس، بغیر اچکن، بغیر ٹوپی پگڑی کے کدکڑے مارتے پھر رہے تھے۔ میاں، میں تو آج تک بیت الخلا بھی بغیر ٹوپی کے نہیں گیا۔ اور نہ کبھی بغیر لنگوٹ کے نہایا۔ ایک دن حمید الدین چپراسی نے اپنی اچکن رفوگر کو رفو کرنے کے لیے دی اور فقط کرتا پہنے ڈیوٹی سرانجام دینے لگا تو ہیڈ ماسٹر صاحب بولے کہ آج تم بچوں کے سامنے کاۓ کو شمشیر برہنہ پھر رۓ ہو؟ ہمارے وختوں میں چپراسی کا بڑا رعب ہوا کرتا تھا۔ ہیڈ ماس صاب سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ میاں، آپ تو شاہد ہیں، مجھے آج تک کسی ٹیچر نے بشیریا تم کہہ کر نہیں پکارا۔ اور میں نے کسی برخوردار کو تم نہیں کہا۔ ایک بدزبان ہیڈ کانس ٹیبل نے مجھے ایک دفعہ بھرے بازار میں ”ابے پرے ہٹ“ کہہ دیا۔ میں اس ٹیم اپنی سرکاری یونی فارم میں ملبوس تھا۔ میں نے اسے دونوں کان پکڑ کے ہوا میں ادھر اٹھالیا۔ ڈھائی من کی راس تھی۔ میں نے زندگی میں بڑے سے بڑے تیس مار خان کا گھڑیال بجا دیا۔ آج کل کے چپراسی تو شکل صورت سے چڑی مار لگیں ہیں۔ ہمارے زمانے کا رکھ رکھاؤ، ادب آداب کچھ اور تھے۔ شرفاؤں کی زبان پر تُو اور تیری نہیں آتا تھا۔ گالی بھی دیتے تھے تو آپ اور آپ

کی کہتے تھے۔ میاں، آپ کے دادا بڑے جلالی آدمی تھے۔ پر بڑی شرافت سے گالی دیتے تھے۔ حسبِ مراتب۔ بھوندو، بھٹیارا، بھڑبھونجا، بھانڈ۔ کوئی بہت ہی بے غیرت ہوا تو بھاڑو بھڑوا کہہ دیا۔ ایک دن اُردُو ٹیچر کہنے لگا کہ وہ بڑے بھاری عالم ہیں۔ گالی نہیں بکتے۔ بھ کی گردان کرتے ہیں۔ میاں، میں جاہل آدمی ٹھہرا۔ گردان کا مطلب اس دن سمجھ میں آیا۔ کمال استاد تھے۔ ان کی بات دل میں ایسے اترتی تھی جیسے باؤلی میں سیڑھیاں۔ کس واسطے کہ وہ مجھ جیسے جاہلوں کی عزت کرنا جانتے تھے۔ میاں آج کل کے بد دماغ عالم اپنے تئیں عقلِ کُل سمجھنے لگے ہیں۔ نیا نیا علم انہیں اس طریوں چھبے ہے جیسے نیا جوتا۔ پر سارا سمندر ڈکوس کے اور ساری سپیاں نگل کے ایک بھی موتی نہیں اُگل سکتے۔

آخری گھنٹا

یہ کہہ کر بشیر چاچا دیر تک پوپلے منھ سے ہنستا رہا۔ اب تو مسوڑھے بھی گھس چلے مگر آنکھ میں بھی تک وہی twinkle ۔ پھر ٹوٹے مونڈھے پر اکڑ کے بیٹھ گیا۔ شیخی نے، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، گردن، ہاتھ اور آواز کا رعشہ دور کر دیا۔ کہنے لگا، میاں یقین جانو، گھنٹا سن کے مجھے تو ہول آنے لگا۔ اب ہر گھسیارا، ڈوم دھاڑی گھنٹا بجانے لگا ہے۔ اب تو ستیاناسی ایسے گھنٹا بجاویں ہیں جیسے دارو پی کے

ہولی کا ڈھول پیٹ رہے ہوں۔ ایسے میں بچّے کیا خاک پڑھیں گے۔ پانچواں گھنٹا تو جیسے تیسے میں نے سُنا۔ پھر فوراً سے پیشتر بھاگ لیا۔ کس واسطے کہ چھٹا گھنٹہ سننا میری برداشت سے باہر تھا۔ بوڑھا خون ایک دفعہ کھول جائے تو پھر بڑی مشکل سے جا کے ٹھنڈا ہووے ہے۔ مجھے پندرہ سال کی ملازمت اور جوتیاں سیدھی کرنے کے بعد گھنٹا بجانے کے اختیارات ملے تھے۔ اس زمانے میں گھنٹا بجانے والا چپراسی عزت دار اور صاحبِ اختیار ہوتا تھا۔ ایک دن ہیڈ ماس صاب کے گھر سے خبر آئی کہ گھر والی کے ہاں بال بچہ تقریباً ہوا چاہتا ہے۔ بدحواسی میں وہ سالانہ امتحان کے پرچے میز پر کھلے چھوڑ گئے۔ اس رات میں گھر نہیں گیا۔ رات بھر پرچوں پہ سرکاری یونی فارم پہنے سانپ بنا بیٹھا رہا۔ اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جغرافیہ کے ماسٹر کو مجھ سے اور مجھ کو اس سے بلاوجہ کد ہو گئی۔ میاں، تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ بے سبب دشمنی اور بدصورت عورت سے عشق حقیقت میں دشمنی اور عشق کی سب سے نخالص اور سب سے زیادہ خطرناک قسم ہے۔ کس واسطے کہ یہ شروع ہی وہاں سے ہوویں ہیں جہاں عقل ختم ہو جاوے ہے۔ مطلب یہ کہ میری مَت تو بغضِ للّٰہی میں ماری گئی۔ پر اس کی عقل کا چراغ ایک بدصورت عورت نے گل کیا جو میری ہم محلہ تھی۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عورت کے لیے خوبصورت ہونا ضروری نہیں۔ بس مرد کا نابینا

ہونا کافی ہووے ہے۔ یہ کہہ کے بشیر چاچا پیٹ پکڑ کے پوپلے منھ سے ہنسا۔ آنکھوں سے بھی ہنسا۔ پھر کہنے لگا کہ میاں، ہماری جوانی میں کالی کلوٹی عورت کو کالی نہیں کہتے تھے۔ سانولی کہتے تھے۔ کالی سے تو افیم اور شکتی کی دیوی مراد ہوتی تھی۔ تو میں کہنے یہ چلا تھا کہ جب جغرافیہ ٹیچر نویں دسویں کا کلاس لیتا تو میں گھنٹا دس منٹ دیر سے بجانے لگا۔ وہ تیسرے ہی دن چیں بول گیا۔ دوسرے ٹیچر بھی تراہ تراہ کرنے لگے۔ مجھے اسٹاف روم میں کرسی پہ بٹھال کے بولے کہ ”بشیر میاں، اب غصہ تھوک بھی دو۔ گھُن کے ساتھ ہمیں کائے کو پیستے ہو؟“

میں نے ہمیشہ اپنی مرضی اور اٹکل سے گھنٹہ بجایا۔ بندہ کبھی گھڑی کا غلام نہیں رہا۔ میرے اندر کی ٹک ٹک نے مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔ اپنی مرضی کا مختار تھا۔ مجال ہے کوئی میرے کام میں ٹانگ اڑائے۔ اپنے کانپور کے مولانا حسرت موہانی کی سناؤنی آئی تو، قسم خدا کی، کسی سے پوچھے پاچھے بغیر میں نے چھٹی کا گھنٹا بجا کے سارا اسکول بند کروا دیا۔ غلام رسول دفتری ایک بزدل تھا۔ بولا کہ بشیرا، تیری خیر نہیں۔ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن تجھ سے جواب طلب کرے گا۔ میں بولا فدوی کا جواب یہ ہو گا کہ حضور پرنور دام اقبالہ، خاطر جمع رکھیں۔ جب آپ فوت ہوں گے تب بھی بلا اجازت چھٹی کا گھنٹا بجا کے اسکول بند کر دوں گا۔ پر جب ولبھ بھائی پٹیل کے مرنے کی خبر آئی تو ہیڈ ماس صاب نے کہا بشیر، چھٹی کا

گھنٹہ بجادو۔ میں نے دو دفعہ سنی ان سنی کر دی۔ تیسری دفعہ انہوں نے تاکید کی تو ادھر کو منھ پھیر کے لنجے لنجے ہاتھ سے بجادیا۔ کسی نے سنا کسی نے نہیں سنا۔ سن سینتالیس، گویا آزادی کے بعد تو فقط احاطے کی دیوار کا سایہ دیکھ کے گھنٹا بجانے لگا تھا۔ پاس پڑوس والے گھنٹے سے اپنی گھڑیاں ملاتے تھے۔ ریٹائر ہوئے اب تو پندرہ برس ہونے کو آئے پر اب بھی پہلے اور آخری گھنٹے کے وقت سیدھے ہاتھ میں چُل سی اٹھتی ہے۔ بے طرح پھڑکنے لگتا ہے۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ملازمت کا آخری دن انسان پہ کتنا بھاری ہوئے ہے۔ میرا آخری دن تھا۔ اور میں آخری گھنٹہ بجانے جا رہا تھا کہ راستے میں ایکا ایکی جی بھر آیا۔ وہیں بیٹھ گیا۔ مجید چپراسی کو موگری تھماتے ہوئے بولا "بیٹا، مجھ میں اس کی تاب نہیں۔ اپنا چارج یہیں سنبھال لے۔ کوچ نکارا توہی بجا"۔ پھر ہیڈ ماس صاحب سے ملنے گیا تو وہ بولے کہ بشیر میاں، ٹیچر حضرات تمہیں تحفے میں ایک اچھی سی گھڑی دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، جناب عالی، میں گھڑی لے کے کیا کروں گا؟ مجھے کون سے ٹائم کیپری کرنی ہے۔ جب گھنٹا ہی گھڑی دیکھے بغیر بجاتا رہا تو اب آخری وخت میں کون سا کام ہے جو گھڑی دیکھ کے کروں گا۔ البتہ کچھ دینا ہی ہے تو یہ چپراس دے دیجیئے۔ چالیس سال پہنی ہے۔ کہنا پڑے گا کہ ہیڈ ماس صاب کا دل بڑا تھا۔ تیوری پہ بل ڈالے بغیر بولے "لے جاؤ" وہ سامنے کھونٹی پر ٹنگی ہے۔

تین چار مہینے میں ایک دفعہ اس کے پیتل کو نیبو سے جھما جھم چمکا لیتا ہوں۔ اب ہاتھوں میں پہلی سی طاقت نہیں رہی۔ چپر اس کے بغیر کندھا بالکل خالی خالی الار سا لگے ہے۔ کبھی کبھی پالش کے بعد گلے میں ڈال لیتا ہوں تو آپی آپ میر کُب (پیٹھ کی کجی) نکل جاتا ہے۔ گھڑی بھر کے لیے پہلے کی طریوں چلت پھرت آ جاتی ہے۔ میاں ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے۔ زبردستی سکول بند کروانے کی غرض سے سینکڑوں ہڑتالی غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ ہاتھا پائی، مارا ماری پہ اُتارو تھے۔ معصوم بچّے ہراساں، ٹیچر حریان۔ ہیڈ ماس صاب پریشاں۔ مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں نے للکارا کہ کسی مائی کے لال کی طاقت نہیں کہ میرے گھنٹا بجائے بغیر سکول بند کرا دے۔ منحوسو، میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، نہیں تو ابھی تم سب کا گھڑیال بجا دوں گا۔ ہیڈ ماس صاب نے پولیس کو فون کیا۔ تھانے دار نے کہا آپ کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی۔ میں نے غصے میں آ کر ریسیور ایک گز ڈوری سمیت جڑ سے آکھاڑ لیا۔ پھر میں ایک ہاتھ میں کاغذ کاٹنے کا شمشیر برہنہ چاقو اور دوسرے میں ریسیور لٹھ کی طریوں ہوا میں دائیں بائیں، شائیں شائیں گھماتا، فل سرکاری یونی فارم ڈالے، ہنکارتا ڈکارتا آگے بڑھا تو جنابِ والا، کائی سی چھٹ گئی۔ سروں پر قضا کھیل رئی تھی۔ کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا، جو نہیں گرا اس کو میں نے جا لیا۔

اس وقت بشیر چاچا کی آنکھ میں وہی twinkle تھی جو ساری عمر شریر بچوں کی سنگت میں رہنے سے پیدا ہو گئی ہے۔ بچوں ہی کی طرح جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

پائینتی بیٹھنے والا آدمی

اس نے گھنٹا بجانے کے فن کی بعض ایسی نزاکتوں پر توجہ دلائی جن کی طرف کبھی ذہن نہیں گیا تھا۔ مثلاً یہی کہ پہلے گھنٹے میں وہ موگری کو کھینچ کر گھڑیال کے عین قلب میں مارتا تھا۔ ایک قطعیت اور تحکمانہ اختصار کے ساتھ۔ کھیل کے گھنٹے کا اعلان تیز سرگم میں کنارے کی چھن چھن چھن سے کرتا۔ پیر کے گھنٹوں کا گمبھیر ٹھنا کا سنیچر کی ٹھٹھے مارتی ٹھن ٹھن سے بالکل مختلف ہوتا تھا۔ کہنے لگا "میاں، نئی پیڑی (نسل) کے پی انوں (Peons) کو صبح اور سہ پہر کے مزاج کا فرق معلوم نہیں"۔ اس نے کھل کر دعوی تو نہیں کیا مگر اس کی باتیں سن کر مجھے سچ مچ محسوس ہونے لگا کہ وہ صبح دعا کا گھنٹا اپنے حسابوں بھیرویں میں ہی بجاتا ہوگا۔

جتنی دیر میں وہاں بیٹھا رہا وہ ہر پھر کے اپنے فرائض کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا۔ وہ چپراسی نہ ہوتا، کچھ اور ہوتا تب بھی اپنا کام صرف جاں فشانی ہی سے

نہیں، اتنے ہی خشوع و خضوع سے کرتا۔ جب آدمی اپنے کام پر فخر کرنا چھوڑ دے تو وہ بہت جلد بے حس اور نکمّا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے کام کو بھی سچ مچ ذلیل اور گھٹیا بنا دیتا ہے۔ بشیر چاچا کہنے لگا کہ میری فارغ خطی (وہ ریٹائرمنٹ کو اسی خانہ خراب نام سے یاد کرتا ہے) سے ایک ماہ پیشتر ہیڈ ماس صاب نے سفارش کی کہ نمک خوار قدیم ہے۔ اس کی تنخواہ بطورِ خاص بڑھا دی جائے۔ اس پر محکمے سے اُلٹا حکم آیا کہ اس کی پنشن کر دی جائے۔ یہ تو وہی کہاوت ہوئی کہ میاں ناک کاٹنے کو پھریں، بیوی کہے نتھ گھڑا دو۔ فارغ خطی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ایک چپڑ قنات انسپکٹر نے میرے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا کہ یہ چپراسی بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ کمر جھک گئی ہے۔ اور لنگڑانے بھی لگا ہے۔ میاں، خدا کی شان دیکھو کہ چھ مہینے بعد اسی کبڑے اور لولے لنگڑے نے اسے کندھا دے کر آخری منزل تک پہنچایا۔ رہے نام اللہ کا۔

پھر کہنے لگا "ہمارے زمانے میں پلنگ چرپائی پہ ہی چوپال جمتی تھی۔ بزرگوں کی نصیحت تھی کہ چرپائی پہ کبھی سرہانے کی طرف مت بیٹھو۔ ہمیشہ پائینتی بیٹھا کرو تاکہ کوئی تم سے بڑا آ جائے تو جگہ نہ چھوڑنی پڑے۔ سو ساری زندگی پائینتی بیٹھے گزار دی۔ میاں، اب تو نیّا کنارے آن لگی۔ غریب پیدا ہوا، غریب ہی مروں گا۔ پر مولا کا کرم ہے۔ کسی کا دبیل نہیں۔ میں نے اپنی چپراس کو ہمیشہ زیور سمجھا

اور یونی فارم کو خلعت جان کے پہنا"۔اس نے یہ بھی کہا کہ ہر سال لڑکوں کی ایک نئی کھیپ آئی۔ پر ایک لڑکا ایسا نہیں جسے اس نے تنبیہ و نصیحت نہ کی ہو۔ نیز اس نے اپنے سنہری دورِ ماتحتی میں نو ہیڈ ماسٹروں اور تیرہ انسپکٹروں کو بھگتا دیا۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑن چھو ہو گئے۔ فقیر نے بڑے بڑوں کا گھڑیال بجا دیا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی ہلتی ہوئی گردن اکڑ گئی اور اس نے سینہ تان لیا۔ اپنی کھانسی روکتے ہوئے بولا "ہیڈ ماس صاب نے کئی دفعہ کہا کہ میں تم کو پروموٹ کر کے سب چپراسیوں، بہشتی، مہتروں اور اسکول کے خوانچے والوں۔ سب کے اوپر افسر بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض داشت کی کہ اکبری سروری اسی کی ذات کو زیبا ہے۔ میں نے زندگی میں بڑے بڑے افسر ٹانگ کے نیچے سے نکال دیے۔ افسری تکبّر کا تاج ہے۔ آپ کا غلام اسے جوتی کی نوک پر رکھتا ہے"۔ کہانیاں گھڑتے گھڑتے اب بشیر چاچا انہیں سچ بھی سمجھنے لگا ہے۔ بڑھاپے میں مشیخت پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اب بھی ہمارے آگے، یارو، جوان کیا ہے

میں نے اس کا دل خوش کرنے کے لیے کہا "چاچا تم تو بالکل ویسے ہی ٹانٹھے رکھے ہو۔ کیا کھاتے ہو؟" یہ سنتے ہی لاٹھی پھینک، سچ مچ سینہ تان کے، بلکہ پسلیاں تان کے کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا:

"صبح نہار منھ چار گلاس پانی پیتا ہوں۔ ایک فقیر کا ٹوٹکا ہے۔ کچھ دن ہوئے محلے والے میرے کنے (پاس) وفد بنا کے آئے۔ آپس میں کُھسر پُھسر کرنے لگے۔ میرے سامنے بات کرنے کا ہیاؤ نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے کہا برخوردار، کچھ منھ سے پھوٹو۔ عرض اور غرض میں کاہے کی شرم۔ کہنے لگے، چاچا تم لاولد ہو۔ دوسری شادی کر لو۔ ابھی تمہارا تو کچھ بھی نہیں بگڑا۔ جس دوشیجا کر طرف بھی چشمِ آبرو سے اشارہ کر دو گے، کچے دھاگے میں بندھی چلی آوے گی۔ ہم بقلم خود پیام لے کے جائیں گے۔ میں بولا، پنچایت کا فیصلہ سر آنکھوں پہ، پر یہ جوان جوکھوں کا کام ہے۔ سوچ کے جواب دوں گا۔ کس واسطے کہ میری ایک مستوارت مر چکی ہے۔ یہ بھی مر گئی تو تاب نہیں لا سکوں گا۔ ذرا دل لگی دیکھو۔ ان میں کا ایک چرب زبان لونڈا بولا کہ چاچا، ایسا ہی ہے تو کسی پکی عمر کی سخت جان

لگائی (عورت) کے ساتھ دو بول پڑھوا لو۔ بلقیس دو دفعہ رانڈ ہو چکی ہے۔ میں نے کہا ہشت!

"کیا خوب گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدہ"

صاحب، ملیدے کے استعارے کو اب کون سمجھے گا۔ یوں کہیے کہ شکار مردہ سزاوارِ شہباز نہیں۔ میں نے چھیڑا "چاچا اب بڑھاپے میں نئی روشنی کے بے کہی بیوی سے نباہ کرنا، اسے قابو میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے"۔

بولا "میاں، آپ نے وہ پرانی مثل نہیں سنی کہ ہزار لاٹھی ٹوٹی ہو، پھر بھی گھر بھر کے برتن باسن توڑنے کو بہت ہے"۔

یہ کہہ کر لاٹھی پہ سر ٹیک کے اتنے زور سے ہنسا کہ دمے کا دورہ پڑ گیا۔ دس منٹ تک کھو کھو گھس گھس کرتا رہا۔ مجھے تو ہول آنے لگا کہ سانس آئے گا بھی کہ نہیں۔

۹

گوتم بدھ بطور پیپر ویٹ

ایک دن مُلّا عاصی سے طے پایا کہ اتوار کو لکھنؤ چلیں گے۔ اور وہ شہر نگاراں دیکھیں گے جس پر شامِ اودھ ختم ہوئی۔ لکھنؤ کے شیدائی اور ترجمانِ شیوا بیان مولانا عبد الحلیم شرر نے اودھ کے تمدّن کا یہ باب ایک ڈوبتے سورج کی سرخی شفق سے رقم کیا ہے۔ میرا اصرار تھا کہ تم ساتھ چلو۔ چالیس برس بعد تنہا دیکھنے کا کس میں حوصلہ تھا۔ لوگوں نے ڈرا دیا تھا کہ زندگی اور زندہ دلی کا وہ مرقع جس پر ساری رونقیں، رعنائیاں اور رنگینیاں ختم تھیں۔ حضرت گنج۔ اب حسرت گنج دکھلائی دیتا ہے۔ صاحب لکھنؤ haunted (آسیب زدہ) شہر ہو یا نہ ہو، اپنا تو ہائنٹڈ ذہن ہی ہے۔ مجھے تو ایک صاحب نے یہ کہہ کر بھی دہلا دیا کہ تمھیں چار باغ ریلوے اسٹیشن کا نام اب صرف ہندی میں لکھا نظر آئے گا۔ سارا لکھنؤ چھان مارو، کہیں اُردُو میں سائن بورڈ نظر نہیں آئے گا۔ البتہ قبروں کے کتبے اب بھی نہایت خوشخط اُردُو میں لکھے جاتے ہیں۔ ایسا پاکیزہ خط اور ایسے موتی پرونے والے خطّاط تمھیں ڈھونڈے سے پاکستان میں نہیں ملیں گے۔ میں مہمان تھا۔ چپکا ہو رہا۔ دو دن قبل ایک دِلّی والے سے سیدھے سبھاؤ کہیں یہ کہہ

دیا کہ دِلّی کی نہاری اور گولے کے کباب دِلّی کی بہ نسبت کراچی میں بہتر ہوتے ہیں۔ ارے صاحب وہ تو سر ہو گئے۔ میں نے کان پکڑے۔

عاصی وقتِ مقررہ پر نہیں آئے۔ پہلے تو غصہ آیا۔ پھر تشویش ہونے لگی۔ رکشا پکڑی اور ان کے حجرہ دلکشا گیا۔ دری پر بوسیدہ کاغذات، فائلیں اور تیس برس کے سیکڑوں بل اور رسیدیں پھیلائے، ان کے بیچوں بیچ اکڑوں بیٹھے تھے۔ مینڈک کی طرح پھُدک پھُدک کر مطلوبہ کاغذ تک پہنچے تھے۔ جس کاغذ کا بعد میں بغور معائنہ کرنا ہو اس پر بدھ کی مورتی رکھ دیتے۔ تین بدھ تھے ان کے پاس، آنکھیں موندے ہولے ہولے مسکراتا ہوا بدھ، بیوی کو سوتا چھوڑ کر گھر سے جاتا ہوا جوان بدھ، مہینوں کے مسلسل فاقے ہڈیوں کا پنجر بدھ۔ ان تینوں بدھوں کو وہ اس وقت پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ میں تیز تیز چل کے آیا تھا۔ پسینے میں شرابور، ململ کا کُرتا پیاز کی جھلی کی طرح چپک گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے پنکھا "آن" کیا تو سوئچ کے شاک سے پچھاڑ کھا کے فرش پر گرا۔ خیر، صاحب، اسے آن کرنا تھا کہ کمرے میں آندھی آگئی اور سیکڑوں پتنگیں اُڑنے لگیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے کو نظر آنے بند ہو گئے۔ ان کا تیس سالہ فائلنگ سسٹم محوِ پرواز تھا۔ انہوں نے لپک کر لکڑی کی کھڑاویں پہنیں اور پنکھا بند کیا۔ چالیس پچاس سال پرانا پیتل کا سوئچ شاک مارتا

ہے۔ آن اور آف کرنے سے پہلے کھڑاؤں نہ پہنو تو موت واقع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ پھر انہوں نے دوڑ دوڑ کر اپنا دفترِ لخت لخت اس طرح جمع کیا جس طرح لونڈے پتنگ لوٹتے ہیں۔ کہنے لگے، بھائی معاف کرنا۔ آج لکھنؤ ساتھ نہ جا سکوں گا۔ ایک ناگہانی الجھیڑے میں پھنس گیا ہوں۔

مُرغا بننے کی فضیلت

صاحب، وہ اُلجھیڑا یہ تھا کہ نگر پالیکا (بلدیہ) نے پانی کا جو بِل انہیں کل بھیجا تھا، اس میں ان کے والد کا نام اعجاز حسین کے بجائے اعجاز علی لکھا تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے یہ "سہوِ کتابت" نوٹس نہیں کیا تھا۔ اب وہ گزشتہ تیس سال کے تمام بِل چیک کر رہے تھے کہ اس غلطی کی شروعات کب ہوئی۔ کسی اور محکمے کے بل یا سرکاری مراسلے میں یہ سہوِ ولدیت ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کیوں ہے؟ اور نہیں ہے تو کیوں نہیں؟ ایک تحقیق طلب مسئلہ یہ بھی کھڑا ہوا کہ پانی کے محکمے کو ولدیت سے کیا سروکار۔ اسی کی ایک شق یہ نکلی کہ آیا اوروں کے بِلوں میں بھی متعلقہ والد کی نشان دہی کی جاتی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا، مولانا، بِل "پے" کیجیے اور خاک ڈالیے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بولے فرق کی بھی ایک ہی کہی۔ اگر باپ کے نام سے بھی فرق نہیں پڑتا تو پھر دنیا کی کسی بھی چیز سے نہیں پڑے

گا۔ پانچویں کلاس میں، میں نے ایک دفعہ شاہجہاں کے باپ کا نام ہمایوں بتا دیا تو ماسٹر فاخر حسین نے مُرغا بنا دیا تھا۔ وہ سمجھے میں مذاق کر رہا ہوں۔ یہ غلطی نہ بھی کرتا تو کسی اور بات پر مُرغا بنا دیتے۔ اپنا تو طالبِ علمی کا سارا زمانہ اسی پوز میں گزرا۔ بنچ پر آنا تو اس وقت نصیب ہوتا تھا جب ماسٹر کہتا کہ اب بنچ پر کھڑے ہو جاؤ۔ اب بھی کبھی طالبِ علمی کے زمانے کے خواب آتے ہیں تو یا تو خود کو مُرغا بنا دیکھتا ہوں یا وہ اخبار پڑھتا ہوا دیکھتا ہوں جس میں میرا رول نمبر نہیں ہوتا تھا۔ مسٹر دوارکا داس چترویدی، ڈائرکٹر آف ایجوکیشن حال میں یورپ اور امریکا کا دورہ کر کے آئے ہیں۔ سنا ہے انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ دنیا کے کسی اور ملک نے مُرغا بنانے کا پوز "ڈسکور" ہی نہیں کیا۔ میں نے تو عاجز آ کر ترکی ٹوپی اوڑھنی چھوڑ دی تھی۔ مُرغا بنتا تو اس کا پھندنا آنکھوں سے ایک انچ کے فاصلے پر تمام وقت پنڈولم کی طرح جھولتا رہتا تھا۔ دائیں بائیں۔ پیریڈ کے آخر میں ٹانگیں بری طرح کانپنے لگتیں تو پھندنا آگے پیچھے جھولنے لگتا۔ اس میں تُرکوں کی توہین کا پہلو بھی نکلتا تھا جسے میری غیرت قومی نے گوارا نہ کیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے کسی بھی قسم کی ٹوپی نہیں اوڑھی۔

میں نے فقرہ کسا، مہاتما بدھ تبھی تو ننگے سر رہتے تھے۔ انہوں نے فقرہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے کبھی غور کیا، جب سے لڑکوں کو مُرغا بنانا بند

ہوا ہے، تعلیمی اور اخلاقی معیار گر گیا ہے۔ ویسے تو میں اپنے شاگردوں کی ہر نالائقی برداشت کر لیتا ہوں، لیکن غلط تلفّظ پر آج بھی کھٹ سے مُرغا بنا دیتا ہوں۔ جسم سے چپکی ہوئی جینز پہننے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے کہ اس سے فارسی الفاظ کے تلفظ، آبدست اور مُرغا بننے میں دِقّت ہوتی ہے۔ مگر آج کل کے لونڈوں کی ٹانگیں پانچ منٹ میں ہی ناطاقتی سے لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ میں اپنے زمانے کے ایسے لڑکوں کو جانتا ہوں جو بیس بیس بید کھانے پر ''سی'' تک نہیں کہتے تھے۔ ایک تو ایس پی ہو کے ریٹائر ہوا۔ دوسرا دیہات سُدھار کے محکمے میں ڈائریکٹر ہو گیا تھا۔ اب ویسے شرارتی اور جی دار لڑکے کہاں، دراصل اس زمانے میں کیریکٹر بہت مضبوط ہوا کرتا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ جیسے کیمیا بنانے میں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی، اسی طرح آج کل کی تعلیم میں ایک بید کی کسر رہ جاتی ہے۔

ایک کٹورہ چاندی کا

اس دن سخت گرمی تھی۔ کوئی نصف صدی بعد ناریل کے ڈونگے سے پانی نکال کر اسی نقشین کٹورے سے پیا۔ اندر سورۃ یاسین کندہ ہے۔ خالص چاندی کا ہے۔ آپ نے کٹورا سے آنکھ کا محاورہ سنا ہے؟ حضور میں نے دیکھی ہے۔ تو شام کو جب

ہم فٹ بال کھیل کر لوٹتے تو اس پتلے کنارے کو ہونٹوں کے بیچ میں لیتے ہی لگتا تھا کہ ٹھنڈک رَگ رَگ میں اُتر رہی ہے۔ اسی کٹورے میں شہد گھول کے مُلّا عاصی کو پیدا ہوتے ہیں ماں کے دودھ سے پہلے چٹایا گیا۔ اسی کٹورے سے نزع کے وقت ان کے دادا اور والد کے منھ میں آبِ زم زم چوایا گیا تھا۔ اب بھی آئے دن لوگ مانگ کے لے جاتے ہیں اور بیمار کو آبِ شفا پلاتے ہیں۔ میں نے پینے کو تو کٹورے سے پانی پی لیا۔ مگر عجیب لگا۔ کھدے ہوئے حروف میں کالا سیاہ میل جما ہوا تھا۔

صاحب، سچی بات یہ کہ پانی تو آج بھی اتنا ہی ٹھنڈا ہے۔ کٹورا بھی وہی ہے۔ پینے والا بھی وہی۔ پر وہ پہلی سی پیاس کہاں سے لائیں۔

یوں تو گھر میں ایک مراد آبادی گلاس بھی ہے۔ انہی کا ہم عمر ہو گا۔ پہلی مرتبہ ان سے ملنے گیا تو ایک شاگرد کو دوڑایا۔ وہ کہیں سے ایک پڑیا میں شکر مانگ کر لایا۔ انہوں نے اسی گلاس میں الٹی پنسل سے گھول کر شربت پلایا۔ میں تو شکر کے شربت کا مزہ بھی بھول چکا تھا۔ ہمارے بچپن میں اکثر اسی سے مہمان کی تواضع ہوتی تھی۔ سوڈے اور جنجر کی بوتل تو صرف بد ہضمی اور ہندو مسلم فساد میں استعمال کی جاتی تھی۔

شیر (شاہ) لوہے کے جال میں ہے

دیکھیے، میں کہاں آ نکلا۔ بات بِلّوں سے شروع ہوئی تھی۔ جب انہوں نے اپنا دفتر پریشاں سمیٹ لیا تو میں نے پھر پنکھا آن کرنا چاہا، مگر انہوں نے روک دیا۔ کہنے لگے معاف کرنا۔ شیر شاہ علیل ہے۔ پنکھے سے بخار اور تیز ہو جائے گا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اس نام کا، بلکہ کسی بھی نام کا، کوئی بیمار نظر نہ آیا۔ اور نظر آتا بھی کیسے۔ شیر شاہ دراصل اس بیمار کبوتر کا نام تھا جو کونے میں ایک جالی دار نعمت خانے میں بند تھا۔ ایسے نعمت خانے، جنہیں لوگ گنجینے بھی کہتے تھے، اس زمانے میں ریفریجریٹر کی جگہ استعمال کیے جاتے تھے۔ حدودِ اربع بھی کم و بیش وہی۔ لکڑی کے دو تین منزلہ فریم پر چاروں طرف لوہے کی مہین جالی منڈھی رہتی تھی۔ جس کا ضمنی مصرف ہوا پہنچانا، لیکن اصل مقصد مکھیوں، بلیوں، چوہوں اور بچوں کو کھانے سے محروم رکھنا تھا۔ اس کے پایوں تلے بالعموم پانی سے لبریز چار پیالیاں رکھی ہوتی تھیں۔ جن میں ان چٹوری چیونٹیوں کی لاشیں تیرتی رہتی تھیں جو جان پر کھیل کے، یہ خندق پار کر کے ممنوعہ لذائذ تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ یہ نعمت خانے ڈیپ فریزر اور ریفریجریٹر سے اس لحاظ سے بہتر تھے کہ ان میں رکھا ہوا بدمزہ کھانا نو دس گھنٹے بعد ہی سڑ جاتا تھا۔ اسے

روز نکال نکال کے ہفتوں نہیں کھلایا جاتا تھا۔ ایسے نعمت خانے اس زمانے میں ہر متمول گھرانے میں ہوتے تھے۔ نچلے متوسط طبقے میں چھینکا استعمال ہوتا تھا۔ جب کہ غریب غربا کے ہاں روٹی کی اسٹوریج کے لیے آج بھی محفوظ ترین جگہ پیٹ ہی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا نعمت خانہ ۱۹۵۳ء سے مُلّا عاصی کے بیمار کبوتروں کا Intensive Care Unit ہے۔ اس دن لکھنؤ نہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بیمار کبوتر کو اکیلا چھوڑ کر سیر سپاٹے کے لیے جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایک کبوتری نور جہاں اچانک مر گئی تو دس بارہ دن گھر سے نہیں نکلے۔ کیوں کہ اس کے بچّے بہت چھوٹے اور بالکل گاؤدی تھے۔ انہیں سیتے رہے۔ دروپدی نام کی ایک انارا (سرخ آنکھوں والی) کبوتری کی چونچ ٹوٹ گئی۔ اسے مہینوں اپنے ہاتھ سے چوگا کھلایا۔ انہوں نے ہر کبوتر کا ایک نام رکھ چھوڑا ہے۔ اس وقت ایک لقہ کبوتر رنجیت سنگھ نامی دروازے کے سامنے سینہ اور دُم پھیلائے دوسرے فرقے کی کبوتریوں کے گرد اس طرح چکر لگا رہا تھا کہ اگر وہ انسان ہوتا تو فرقہ وارانہ فساد میں کبھی کا مارا جا چکا ہوتا۔ نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں "شمار" ہوتا۔

کبوتروں کی چھتری

کبوتر بازی ان کا بہت پرانا شوق ہے۔ ان کے والد کو بھی تھا۔ میرے والد بھی پالتے تھے۔ کبوتر کی فضیلت کے تو آپ کے مرزا عبدالودود بیگ بھی قائل ہیں۔ سچے شوق اور ہابی کی پہچان یہ ہے کہ بالکل فضول اور بے مصرف ہو۔ جانور کو انسان کسی نہ کسی فائدے اور خود غرضی کے تحت پالتا ہے۔ مثلاً کتّا وہ دکھیارے پالتے ہیں جو مصاحب اور درباری افورڈ نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ کتّا اس مغالطے میں پال لیتے ہیں کہ اس اس میں برادرِ خورد کی خوبیاں ہوں گی۔ بکری اس غرض سے پالتے ہیں کہ اس کی مینگنی میں دودھ ملا کر جو اباً اُردُو نقادوں کو پلائیں گے۔ ہاتھی زیادہ تر معتوب اُمرا پالتے تھے جنہیں بادشاہ سزا کے طور پر ہاتھ مع ہودہ نقرئی بخش دیتا تھا کہ جاؤ اب تمام عمر اسے کھلاتے ٹھساتے رہو۔ طوطے کو بڑے ارمانوں سے پالتے ہیں کہ بڑا ہر کے اپنی بولی بھول جائے گا اور ساری عمر ہمارا سکھایا ہوا بول دہراتا رہے گا۔ مولوی صاحبان مُرغے کی اذان فقط مُرغی کے لالچ میں برداشت کر لیتے ہیں۔ اور ۱۹۶۳ء میں آپ نے بندر محض اس لیے پالا تھا کہ اس کا نام ''ڈارون'' رکھ سکیں۔ لیکن صاحب کبوتر کو صرف اس لیے پالا جاتا ہے کہ کہ کبوتر ہے اور بس۔ لیکن مُلّا عاصی کے ایک پڑوسی سعد اللہ خان

آشفتہ نے قسم کھا کر کہا کہ ایک دن کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں صبح چھ بجے گرم کشمیری چائے کی ایک چینک لے کر ان کے ہاں گیا۔ دیکھا کہ کمرہ یخ ہو رہا ہے اور وہ گرمائی کے لیے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک کبوتر دبائے بودھی ستو کی مورتی کے سامنے دھیان میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ غلو و غیبت بر گردنِ راوی۔

ایک صحبت میں کبوتروں کا ذکر چھڑ گیا تو کہنے لگے، میں نے سنا ہے، گو کہ یقین نہیں آتا، کہ کراچی میں کبوتروں کی ایک بھی چھتری نہیں۔ یارو، تم نے کیسا شہر بنایا ہے؟ جس آسمان پر کبوتر، شفق، پتنگ اور ستارے نہ ہوں ایسے آسمان کی طرف نظر اُٹھا کے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بھائی ابرار حسین دسمبر ۱۹۷۳ء میں کراچی میں تھے۔ دو مہینے رہے ہوں گے۔ مطلع مستقل ابر آلود رہا۔ صرف ایک دن دوربین کی مدد سے ایک ستارہ نظر آیا۔ وہ دمدار ستارہ تھا۔ کہہ رہے تھے کراچی میں لوگ ہم لکھنؤ والوں کی طرح پتنگ، تیتر، مرغ اند مینڈھے نہیں لڑاتے۔ خود لڑ لیتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس محلے میں بھی اب نہ کوئی پتنگ اُڑاتا ہے، نہ کبوتر۔ لے دے کے یہی ایک چھتری رہ گئی ہے۔ لکھنؤ کا حال اس سے بھی ابتر ہے۔ اور ایک وہ زمانہ تھا کہ تمہارے جانے کے بعد دسمبر میں علیم الدین نے۔ بھئی وہی اپنا شیخ چلی لڈن۔ پاکستان جانے کے لیے بوریا بستر باندھ لیا تھا، مگر عین وقت پر ارادہ فسخ کر دیا۔ کس واسطے کہ ماسٹر عبدالشکور بی اے، بی ٹی

نے اسے ڈرا دیا کہ تم ٹرین میں کبوتروں کی چھتری ہمراہ نہیں لے جاسکتے۔ اور چوری چھپے لے بھی گئے تو واہگہ سرحد پر پاکستان کسٹم والے نہ جانے کیا سمجھیں کے تمھیں دھر لیں۔ بھائی بشارت، تم تو ہجرت کر کے مہاجر بنے۔ ہم اپنے شہر میں بیٹھے بیٹھے ہی غریب الوطن ہو گئے۔ یہ وہ شہر تھوڑا ہی ہے۔ وہ شہر تو قصّہ کہانی ہو گیا۔ آکار بدل چکا ہے۔ اب اس محلے میں ۹۵ فیصد گھروں میں ویجی ٹیرین (سبزی خور) رہتے ہیں۔ ان کی بِلّیاں گوشت کو ترس گئی ہیں۔ چنانچہ سارے دن میری چھتری کے چوگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ بھئی تمھیں تو یاد ہو گا، کوپر ایلن اینڈ کمپنی کا بڑا صاحب۔ کیا نام تھا اس کا؟ سر آرتھر انس کپ؟ اس کی میم جب ولایت سے سیامی بلی لائی تو سر آرتھر نے کانپور شہر کے سارے بِلّوں کو neuter (آختہ) کروا دیا تھا تا کہ بلّی پاکدامن رہے۔ دو بنگلے چھوڑ کر اجمل بیرسٹر رہتے تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ ایک رات ان کے کتّے کو بھی پکڑ کر احتیاطاً آختہ کروا دیا۔ سن اکتالیس کا قصّہ ہے۔ Quit India تحریک سے ذرا پہلے۔

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ وہ اب بھی ہنستے ہیں تو بچوں کی طرح ہنستے چلے جاتے ہیں۔ پھر آنکھیں پونچھ کر یکلخت سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے کہ اب مجھ میں اتنا دم نہیں رہا کہ چھت پر آواز لگا کے سب کو کابکوں میں بند کروں۔ سُدھے

سُدھائے کبوتر تو چراغ جلے خود آ آ کے کابک میں دبک جاتے ہیں۔ بقیہ کو شاگرد گھیر گھار کے بند کر دیتے ہیں۔ وہی دانہ چوگا ڈالتے ہیں۔ اشرافوں کے جتنے شوق تھے سب پہ زوال آ گیا۔ شہر میں جوار تک نہیں ملتی۔ پچاس میل دور ایک گاؤں سے منگواتا ہوں۔ پٹواری میرا شاگرد رہ چکا ہے۔ آج کل کسی گریجویٹ کو پکڑ کے پوچھ دیکھو۔ جوار، باجرے اور کنگنی کا فرق بتا دے تو اسی کے پیشاب سے اپنی بھویں منڈوا دوں۔ ننانوے فیصد نے زندگی میں جَو بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ اماں، کیا کراچی کا بھی یہی حال ہے؟ مگر تیورس کے سال ایک کرم فرما اس شغل میں میرے توغل کے پیشِ نظر (دیکھیے یہاں بھی مُلّا کے منھ سے ماسٹر فاخر حسین بول رہے ہیں) کراچی سے سوغات میں ایک ناول لائے، ''دِلّی کی شام''۔ کوئی جید عالم ہیں پروفیسر احمد علی۔ بھئی خوب لکھتے ہیں۔ دِلّی کے روڑے لگتے ہیں۔ ان کے انگریزی ناول کا بامحاورہ ترجمہ ہے۔ واللہ جی خوش ہو گیا۔ ہر صفحے پر دِلّی کے تمام بیگماتی محاورے اور کبوتر ایک ساتھ چھوڑ دیے ہیں۔ ان کی کوئی اور کتاب کبوتروں کے متعلق ہو تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ بھجنا۔

کالا کبوتر اور دوشیزہ کی بِلّی

ان کے سڑی پن کا ایک واقعہ ہو تو بیان کروں۔ ایک سالانہ روٹین کا حال سناتا ہوں۔ میٹرک کے زمانے سے ہی (جب وہ اپنی بائیسویں سالگرہ منا چکے تھے) انہوں نے یہ وتیرہ اختیار کر لیا تھا کہ امتحان کا نتیجہ اخبار میں نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ اخبار لینا اور پڑھنا اور اخبار بینوں سے ملنا ترک کر دیتے تھے۔ ممکن ہے اس کا سبب بے نیازی ہو۔ خوف بھی ہو سکتا ہے۔ مرزا کا خیال ہے کہ اپنی سالانہ نالائقی کو کولڈ پرنٹ میں face نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال، نتیجے سے تقریباً ایک ہفتے قبل، اپنے ایک جگری دوست امداد حسین زیدی کو اپنا ایک کالا گرہ باز اور ایک سفید لوٹن کبوتر دے آتے۔ اور کمرہ مقفّل کر کے خود مراقبے میں چلے جاتے۔ امداد حسین کو یہ ہدایت تھی کہ جیسے ہی اخبار میں میرے پاس ہونے کی خبر پڑھو، فوراً سفید کبوتر چھوڑ دینا۔ اور فیل ہو جاؤں تو کالا۔ پھر دن بھر کھڑکی سے آدھا دھڑ نکال نکال کر کبھی سوئے آسماں اور کبھی چھتری کو دیکھتے کہ کبوتر خبر لایا کہ نہیں۔ ہر سال منحوس کالے کبوتر کو ذبح کر کے مرجینا (دوشیزہ کی بلی کا نام) کو کھلا دیتے۔ یہ شاہانہ وضع داری انہوں نے بی۔ اے تک قائم رکھی کہ قدیم زمانے میں بادشاہ بھی بری خبر لانے والے قاصد کا سر قلم کروا دیتے تھے۔

رزلٹ والے ہفتے میں گھر میں روز کئی دفعہ رونا پیٹنا مچتا تھا۔ اس لیے کہ ان کی والدہ اور ہمشیر گان جیسے ہی کوئی کالا کبوتر دیکھتیں رونا پیٹنا شروع کر دیتیں۔ یوں تو چھتری پر دن میں کئی سفید کبوتر بھی آتے تھے مگر وہ ان کا کوئی نوٹس نہیں لیتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ غلطی سے آن بیٹھے ہیں۔ بالآخر تین چار سال بعد رُلا رُلا کر، وہ دن آتا جب:

تڑپتا، لوٹتا، اٹھتا جو بے تابانہ آتا ہے

یعنی سفید لوٹن کبوتر آتا تو اسی خوشی میں اپنے تمام کبوتروں کو جن کی تعداد ستر اسی کے لگ بھگ ہو گی، جوار کی بجائے گیہوں کھلاتے اور سب کو ایک ساتھ اُڑاتے۔ دوسرے دن اس کبوتر کے پاؤں میں چاندی کی مُنی سی پُنیچبنی[1] ڈال دیتے، اور اس کے کابک کے پاس کبوتر خانے میں دس تافتہ[2] کبوتریوں کا اضافہ کر دیتے۔ کبوتر خانہ تو ہم روانی میں لکھ گئے۔ ورنہ نقشہ یہ تھا کہ جب انہوں نے بی اے پاس کیا تو میٹرک، انٹر میڈیٹ اور بی اے تینوں ملا کر تیس عدد خولہ کبوتریوں کے اضافے کے بعد ان کا سارا گھر اس طائرِ خوش خبر یعنی لوٹن کبوتر

---

[1] کبوتر کی جھانجھن

[2] سفید چمکیلے رنگ کا کبوتر یا کبوتری

کے حرمِ خاص میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گھر والوں کی حیثیت ان کبوتریوں کے خدمت گاروں اور بیٹ اٹھانے والوں سے زیادہ نہیں رہی تھی۔

وہ اک سپہ جو بظاہر سپاہ سے کم ہے

جس دن وہ شیر شاہ نامی کبوتر کی علالت کے سبب میرے ساتھ لکھنؤ نہ جا سکے، میں نے کسی قدر جھنجلاتے ہوئے ان سے کہا ”بندہ خدا دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اب تو اس کبوتر بازی پہ خاک ڈالو“۔

فرمایا ”تمہارے والد بھی تو بڑے پائے کے کبوتر باز تھے۔ میں تو ان کے سامنے بالکل اناڑی ہوں۔ اب لوگ اسے گھٹیا شوق سمجھنے لگے ہیں، ورنہ یہ صرف شرفا کا شوق ہوا کرتا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بہادر شاہ کی سواری نکلتی تو دو سو کبوتروں کی ٹکری اوپر ہوا میں سواری کے ساتھ اُڑتی ہوئی جاتی۔ اور جہاں پناہ پر سایہ کئے رہتی۔ جب واجد علی شاہ مٹیا برج میں محبوس ہوئے تو اس گئی گزری حالت میں بھی اس کے پاس چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے، جن کی دیکھ ریکھ پر سیکڑوں کبوتر باز مامور تھے“۔

عرض کیا، ”اس کے باوجود لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سلطنت پر زوال کیوں آیا۔ تیغوں کے سائے میں پلنے والوں کے سروں پر جب کبوتر منڈلانے لگیں تو پھر سواری بادِ بہاری مٹیا برج اور رنگون جا کر ہی دم لیتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے کبوتر خانے اور واجد علی شاہ نے پری خانے اور کبوتر خانے پر جتنی رقم اور توجہ صرف کی، اس کا دسواں حصہ بھی اپنے توپ خانے پر صرف کرتے تو فوجِ ظفر موج بلکہ کبوتر موج کی یہ دُرگت نہ بنتی کہ ڈٹ کر لڑنا تو درکنار اس کے پاس تو ہتھیار ڈالنے کے لیے بھی ہتھیار نہ نکلے۔ ہائے! “

وہ اک سپہ جو بظاہر سپاہ سے کم ہے

بگڑ گئے ”تو گویا سلطنتِ مغلیہ کا زوال کبوتروں کے سبب ہوا۔ یہ بات تو جادو ناتھ سرکار تک نے نہیں کہی۔ مسٹر چتر ویدی کہہ رہے تھے کہ انگلستان میں پچھتر لاکھ پالتو کُتے ہیں، فرانس میں سوا تین کروڑ Pets (پالتو جانور) ہیں، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، انگلستان میں ہر تیسرا بچہ ولد الزّنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں گزشتہ دس سال میں پچیس لاکھ اسقاط کرائے گئے۔ جیسے اپنے ہاں آدمی کثیر الاولاد ہوتا ہے، ویسے ہی ان کے ہاں بچہ کثیر الولدیت ہوتا ہے۔ آخر ان پر زوال کیوں نہیں آتا؟“

۱۰

چڑیا

مُلّا عاصی کے کھٹ مٹھے مزاج کا اندازہ ایک واقعے سے لگایئے جو ایک صاحب نے مجھے سنایا۔ ان کے پڑوسی نے کئی مرتبہ شکایت کی "آپ کے کرایہ دار نے ایک نئی کھڑکی نکال لی ہے جو میرے دالان میں کھلتی ہے۔ مستورات کی بے پردگی ہوتی ہے"۔ انہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا تو ایک دن دھمکی دی "آپ نے کھڑکی نہ چنوائی تو ٹھیک نہ ہو گا، نالش کر دوں گا۔ اگر گھر کے سامنے قرقی کا ڈھول نہ بجوا دوں تو میرا نام نہیں۔ سارا بدھ ازم دھرا کا دھرا رہ جائے گا"۔ یہ بچارے خود کرائے دار کے ستائے ہوئے تھے۔ کیا کر سکتے تھے۔ البتہ پردے کے نقصانات ضرور بیان کر دیئے۔ جس سے وہ اور مشتعل ہو گیا۔ دو تین دن بعد اس نے یکم نومبر کو ان کو قانونی نوٹس دے دیا کہ اگر ایک مہینے کے اندر اندر آپ نے کھڑکی بند نہ کروائی تو آپ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جائے گا۔ انہوں نے نوٹس پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کی میعاد تیس نومبر کو ختم ہوتی تھی۔ یکم دسمبر کو صبح پانچ بجے انہوں نے پڑوسی کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتا ہوا ننگے پیر باہر آیا تو کہنے لگے "حضور، گستاخی معاف۔ میں نے کچی

نیند سے اُٹھا دیا۔ میں صرف یہ یاد دہانی کرانے آیا ہوں کہ آج آپ کو میرے خلاف مقدمہ دائر کرنا ہے۔ آداب"۔

ہم کراچی والوں کی اصطلاح میں "چریا" تو وہ سدا کے تھے، مگر اب اصلاح اور برداشت کی حد سے گزر گئے ہیں۔ آٹھویں جماعت سے لے کر بی اے تک کورس کی تمام کتابیں جو انہوں نے پڑھی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نہیں پڑھی تھیں۔ ایک الماری میں سجا رکھی ہیں۔ امتحان کے پرچوں کی ایک علیحدہ فائل ہے۔ ان کی رسمِ بسم اللہ پر جس چاندی کی پیالی میں زعفران گھولا گیا اور مسلمانیوں کی تقریب میں زردوزی کے کام کی جو ٹوپی انہیں پہنائی گئی، اور اسی قسم کے اور بہت سے تبرکات دوسری الماری میں محفوظ ہیں۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ پیدائش کے وقت اپنا کام آپ کرنے سے بوجوہ معذور تھے۔ ورنہ اپنا نال بھی منجملہ دیگر یادگار اشیا کے منگوا کر رکھ لیتے۔ ان کی تفصیل کے یہ صفحات متحمل نہیں ہو سکتے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ عام طور پر مورخ یا ریسرچ کرنے والے کو بڑے آدمیوں کی زندگی کے بارے میں باریک تفصیلات کھود کھود کر نکالنے میں جو مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ انہوں نے اپنا تمام خام مواد اس کی ہتھیلی پر رکھ کے آسان کر دی ہے۔ واللہ، میں نے ایسا آدمی نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی کوئی چیز ڈسکارڈ (ترک) نہیں کر سکتے۔ بجز اپنے عقائد کے۔ اپنے کوڑے کو بھی

"این ٹیک" بنا دیتے ہیں۔ کمرہ کا ہے کو ہے یادوں کا ملبہ ہے جسے بیلچوں سے کھودیں تو آخری تہ کے نیچے سے خود موصوف بر آمد ہوں گے۔

زوجہ کو چک کے نام

اسی طرح گزشتہ تیس چالیس برسوں میں انہیں جتنے خطوط احباب و اعزہ نے لکھے، وہ سب کے سب کھڑے سوؤں میں تاریخ وار پروئے ہوئے محفوظ ہیں۔ بیشتر پوسٹ کارڈ ہیں۔ اس زمانے میں پچانوے فیصد خطوط پوسٹ کارڈ پر ہی لکھے جاتے تھے۔ اس کا ایک کونہ ذرا سا کاٹ دیا جاتا تو یہ الارم ہوتا تھا کہ کسی کے مرنے کی خبر آئی ہے۔ صرف کٹا ہوا کونا دیکھ کر ہی آن پڑھ گھرانوں کی عورتیں نامعلوم مردے کے فرضی اوصاف بیان کر کر کے رونا پیٹنا شروع کر دیتی تھیں۔ اس اثنا میں کوئی پڑوسی خط پڑھ دیتا تو بین میں مرحوم کے نام کا اضافہ اور اوصاف میں کمی کر دی جاتی۔ پوسٹ کارڈ پر ایک طرف تیس تیس سطریں تو میں نے لکھی دیکھی ہیں جنہیں غالباً گھڑی سازوں والی یک چشمی خوردبین لگا کر ہی لکھا اور اسی طرح پڑھا جا سکتا تھا۔ میں ایک چمڑے کے بیوپاری شیخ عطا محمد کو جانتا تھا جو مال بُک کرانے کلکتے جاتا تو اپنی نوخیز و خوبرو زوجہ کو چک کو (جسے محلے والے پیار میں صرف کو چک کہتے تھے) بہ نظرِ کفایت پوسٹ کارڈ پر خط لکھتا،

لیکن نجی جذبات کے اظہار میں کفایت شعاری سے بالکل کام نہیں لیتا تھا۔ دوسروں کے خط پڑھنے کا لپکا اس زمانے میں بہت عام تھا۔ پوسٹ مین ہمیں یعنی مجھے، میاں تجمل حسین اور مُلّا عاصی کو وہ پوسٹ کارڈ پڑھوا دیتا تھا۔ ہم اسے ہرن کے کوفتے کھلاتے تھے۔ صاحب، زبان کا چٹخارا بری بلا ہے۔ میں جب اٹاوہ کے اسکول میں تعینات ہو کر گیا تو اس نے میرا خط جو میں نے شادی کے کچھ دن بعد آپ کی بھابھی کو لکھا تھا، مُلّا عاصی اور میاں تجمل کو پڑھوا دیا۔ خط کا مضمون سارے شہر میں ہیضے کی طرح پھیل گیا۔ میں نے کئی بیقرار فقرے اور جملے کے جملے چمڑے کے بیوپاری کے پوسٹ کارڈوں سے اڑائے تھے۔ ہر چند کہ وہ چمڑا بیچتا تھا اور انشا پردازی اس کے پیشہ ورانہ فرائض اور شوہرانہ وظائف میں داخل نہ تھی، لیکن چودھری محمد علی ردولوی نے بیوی کے نام مثالی خط کی جو تعریف کی ہے اس پر شیخ عطا محمد کے خطوط پورے اُترتے تھے۔ یعنی ایسا ہو کہ مکتوب الیہ کسی کو دکھا نہ سکے۔ کسی متنفّس نے شیخ عطا محمد کو میرے خط کا مضمون سنا دیا۔ کہنے لگا کہ اگر کوئی میرے انتہائی نجی جذبات اپنی ذاتی زوجہ تک پہنچانا چاہتا ہے تو میری عین خوش نصیبی ہے۔ شدہ شدہ آپ کی بھابھی تک جب اس سرقے کی خبر پہنچی تو انہیں مدتوں میرے انتہائی اوریجنل مکاتیب سے بھی چمڑے کی بُو آتی رہی۔ عجیب گھپلا تھا۔ وہ اور کوچک ایک دوسرے کو اپنی سوکن سمجھنے لگیں جو ہم

دونوں مردوں کے لیے باعثِ شرم تھا۔ دسمبر کی تعطیلات میں جب میں کانپور گیا تو اس حرمزدگی پر پوسٹ مین کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور دھمکی دی کہ ابھی پوسٹ ماسٹر کو رپورٹ کر کے تجھے ڈسمس کرادوں گا۔ غصے سے میں پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا "بے ایمان، اب تجھے وہ دونوں ہرن کے کوفتے کھلا رہے ہیں"۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا "قسم قرآن کی، جب سے آپ گئے ہیں، ہرن کے کوفتے کھائے ہوں تو سؤر کھایا ہو"۔ میں جوتا لے کے پیچھے دوڑا تو بدمعاش قبولا کہ نیل گائے کے کھائے تھے۔

بلیک باکس[1]

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ سوؤں میں پروئے ہوئے خطوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہر سُوئے پر پانچ پانچ سال کی مراسلت کو سُولی دی ہے۔ لکڑی کے گول پینڈے میں ٹھکے ہوئے یہ سُوئے اس زمانے میں فائلوں اور فائلنگ کیبنٹ کی جگہ استعمال ہوتے تھے۔ سیاہ پینڈے کا ایک سُوا مرحومین کے لیے وقف ہے۔ کہنے

---

[1] (Black Box) وہ مضبوط فائر، واٹر اور شاک پروف باکس جس کے اندر بند آلات سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ہوائی جہاز کے گر کر تباہ ہونے اور مسافروں کے ہلاک ہونے کی وجہ کیا تھی۔ یعنی بقول مخدومی ماجد علی صاحب کے مسافر گر کر مرے یا مر کر گرے تھے۔

لگے کہ جب کسی کے انتقال کی خبر آتی ہے تو اس کے تمام خطوط مختلف سُوؤں سے نکال کر اس میں لگا دیتا ہوں۔ اور یہ بلیک بکس بہت ہی اہم اور نجی کاغذات کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ میں نے وصیت کر دی ہے کہ مرنے کے فوراً بعد نذرِ آتش کر دیا جائے۔ میرا مطلب ہے کاغذات کو۔

پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے جس سیاہ صندوق کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا، وہ دراصل ایک کیش بکس تھا۔ اس کے والد کے دوالے اور اس کے نتیجے میں انتقال کے بعد بس یہی اثاثہ ان کو ترکے میں ملا۔ اب بھی اکثر فرماتے ہیں کہ اس میں ایک لاکھ نقدی کی گنجائش ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس بکس میں اس کی وصیت رکھی ہے جس میں واضح ہدایات ہیں کہ ان کی میت کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے یا پارسیوں کی طرح لاش چیل کوؤں کو کھلا دی جائے۔ یا بدھ رسوم کے مطابق ٹھکانے لگائی جائے۔ جہاں عقائد میں اتنا گھپلا ہو وہاں یہ وضاحت از بس ضروری ہے۔ غالب کو اس کی "گلیوں میں میری لاش کو کھینچے پھرو کہ میں۔۔۔" والی خواہش کے برعکس اس کے سُنی عقیدت مند سُنی طریقے سے گاڑ آئے۔ جب کہ اس غریب کا مسلک امامیہ تھا۔ صاحب، اس پر یاد آیا۔ غالب نے کیسی ظالم بات کہی ہے۔ حیف کافر مُردن و آدخ مسلما زیستن۔ یعنی پروردگار مجھے کافروں کی طرح مرنے اور

مسلمانوں کی طرح جینے سے بچا۔ سب کچھ سات لفظوں کے ایک مصرعے میں سمو دیا۔

حرفِ حق کہ بعد از مرگ یاد آید۔۔۔

ان کے ایک قریبی دوست سید حمید الدین کا بیان ہے کہ وصیت میں یہ رقم فرمایا ہے کہ میں مسلمان تھا، مسلمان ہی مرا۔ باقی سب ڈھونگ تھا جو مسلمانوں کو چڑانے کے لیے رچانا پڑا۔ گویا ان کا کفر درحقیقت مکاری تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ انہوں نے ہدایت کی ہے کہ میری وصیت ٹھیک اسی دن کھولی جائے جس دن مولانا ابو الکلام آزاد کی کتاب کے غیر مطبوعہ حصّے بینک کے سیف ڈپازٹ لاکر سے نکالے جائیں۔ اس پر ایک دل جلے نے یہ نیم چڑھایا کہ وصیت میں مُلّا عاصی نے مولانا آزاد کے بارے میں اپنی بے نقط رائے لکھ دی ہے جس کا اظہار وہ اپنی زندگی میں خوفِ فسادِ خلق سے نہیں کر سکتے تھے۔ مگر سوچیے تو سہی۔ مُلّا عاصی نے آخر کون سے توپ چلائی ہو گی۔ بدترین سے بدترین گمان یہی ہو سکتا ہے کہ سچ بولا ہو گا۔ لیکن صاحب، وہ کلمۂ حق کس کام کا جس کے اُعلا کی جیتے جی جُرات نہ ہوئی۔ ہر لمحے کی اپنی سچائی اور اپنی صلیب اور اپنا تاج ہوتا ہے۔ اس سچائی کا اعلان و ابلاغ بھی صرف اسی لمحے واجب ہوتا ہے۔ سو جو چپ رہا اس نے

اس لمحے سے اور اپنے آپ سے کیسی دغا کی۔ بقول آپ کے مرزا عبدالودود بیگ کے، تمام عمر دروغ مصلحت آمیز کے ساتھ ہنسی خوشی گزارا کرنے کے بعد قبر میں پہنچ کر اور کفن پھاڑ کر سچ بولنے اور منھ چڑانے کی کوشش کرنا مردوں ہی کو نہیں، مُردوں کو بھی زیب نہیں دیتا۔

پریم پتر اور گوتم بدھ کے دانت

شہر میں یہ بھی مشہور ہے کہ بکس میں اس پنجابی شرنارتھی لڑکی کے خطوط اور فوٹو ہیں جسے وہ ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ واللہ اعلم۔ یہ قبل از بدھ ازم کی بات ہے۔ میں تو اس زمانے میں کراچی آ چکا تھا۔ سب اس کی ٹوہ میں ہیں۔ مگر بکس میں پیتل کا سیر بھر کا تالا پڑا ہے جس کی چابی وہ اپنے کمر بند میں باندھے پھرتے ہیں۔ خلقِ خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ کسی نے کہا، لڑکی نے بلیڈ سے کلائی کی رگ کاٹ کے آتم ہتیا (خودکشی) کی۔ کسی نے اس کی ایک ناگفتہ بہ وجہ بتائی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ لڑکی کو ایک دوسرا ٹیوٹر بھی پڑھاتا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شمشان تک ارتھی سے جیتا جیتا خون ٹپکتا گیا۔ اسی رات اس کا باپ نیند کی تیس چالیس گولیاں کھا کر ایسا سویا کہ پھر صبح ارتھی ہی اٹھی۔ لیکن دیکھا جائے تو نہ لڑکی مری، نہ اس کا باپ۔ موت تو اس بیوہ اور چھ بچوں کی واقع ہوئی جو اس نے

چھوڑے۔ تین چار دن بعد گلی کے موڑ پر کسی نے مُلّا عاصی کے پیٹ میں چُھرا گھونپ دیا۔ آنتیں کٹ کر باہر نکل پڑیں۔ چار مہینے گمنامی کی موت اور بدنامی کی زندگی کی کشمکش میں اسپتال میں پڑے رہے۔ سنا ہے جس دن ڈسچارج ہوئے، اسی دن سے جوگ لے لیا مگر صاحب، جوگی تو وہ جنم جنم کے تھے۔ ایک مثل ہے کہ جوگی کا لڑکا کھیلے گا تو سانپ سے۔ سو یہ ناگن نہ بھی ہوتی تو کسی اور گزندے سے خود کو ڈسوا لیتے۔ ارے صاحب، جب کشتی غرقابی ٹھہری تو، اور تو اور، خود خواجہ خضر پیندے میں سوراخ کر دیتے ہیں۔

اللہ جانے مذاق میں کہا یا سچ ہی ہو، انعام اللہ برملائی کہنے لگے کہ بلیک بکس میں مُلّا عاصی کے چار ٹوٹے دانت محفوظ ہیں جو وہ اپنے عقیدت مندوں اور آئندہ نسلوں کے لیے بطور relic چھوڑ کر مرنا چاہتے ہیں۔ آخر مہاتما بدھ کے بھی تو کم از کم سو دانت مختلف مقدس مقامات پر زیارت کے لیے بھاری حفاظتی پہرے میں رکھے ہیں۔

کمرے میں صرف ایک چیز واقعی نئی دیکھی۔ رسالہ ''عرفان'' کا تازہ شمارہ۔ اللہ جانے کسی نے ڈاک سے بھیجا یا کوئی شرارتاً چھوڑ گیا۔ جہاں تہاں سے پڑھا۔ صاحب! وضع داری اس رسالے پر ختم ہے۔ نصف صدی پہلے اور آج کے

”عرفان“ میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ وہی ترتیب، وہی چھپائی اور گیٹ اپ جو پچاس برس پہلے تھا، الحمدللہ آج بھی ہے۔ مجھے تو چھاپا خانہ اور کاتب بھی وہی معلوم ہوتا ہے۔ موضوعات اور مسائل بھی بعینہ وہی ہیں جو سرسید اور شبلی کے زمانے میں تھے۔ کاش یہ شمارہ ستر اسی سال قبل چھپا ہوتا تو بالکل ”اپ ٹو ڈیٹ“ معلوم ہوتا۔ مولانا شبلی نعمانی اور شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد ایل ایل ڈی اسے دیکھ کر کیسے خوش ہوتے!

۱۱

سانبھر کا سینگ

کمرے میں سانبھر کا سر ابھی تک وہیں ٹنگا ہوا ہے۔ اس بیت الحزن میں صرف یہی Life ـ Like دکھلائی دیتا ہے۔ لگتا ہے ابھی دیوار سے چھلانگ لگا کر جنگل کی راہ لے گا۔ اس کے نیچے ان کے دادا کی سیپیا رنگ کی بیضوی تصویر ہے۔ صاحب، اس زمانے میں سبھی کے داداؤں کا حلیہ ایک جیسا ہوتا تھا۔ بھرواں داڑھی، پگڑ باندھے، پھولدار اچکن پہنے، ایک ہاتھ میں پھول، دوسرے میں تلوار پکڑے کھڑے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد، بلکہ اس سے بہت پہلے، شرفا تلوار

کو واکنگ اسٹک کے طور پر اور شعر ابطور استعارہ یعنی ناکردہ وصل کی حسرت کے الزام میں خود کو معشوق کے ہاتھوں قتل کروانے کے لیے استعمال کرنے لگے تھے۔ برصغیر میں یہ انحطاط و طوائف الملوکی کو وہ دور تھا جب رجز خوانوں کے دف ڈفلی بن چکے تھے اور طبلِ جنگ کی جگہ طبلے نے لے لی تھی۔ قومی عظمت کے ثبوت میں لوگ صرف عالیشان کھنڈر پیش کرتے تھے۔

سانبھر ستر اسی سال کا تو ہو گا۔ دادا نے نیپال کی ترائی میں گرایا تھا۔ رفاہ عام بلکہ شفائے عام کے لیے ایک سینگ آدھا کاٹ کر رکھ لیا ہے۔ گھِس کر لگانے سے دردِ گُردہ میں آرام آجاتا ہے۔ دور دور سے لوگ مانگ کر لے جاتے ہیں۔ ایک بے ایمان مریض نے ایک انچ کاٹ کر لوٹایا۔ اسکے دونوں گُردوں میں درد رہتا تھا۔ مُلّا عاصی اب سینگ کو اپنی ذاتی نگرانی میں کرنڈ کی سِلی پر گِھسواتے ہیں۔ ہندوستان میں ابھی تک یہ جاہلوں کے ٹوٹکے خوب چلتے ہیں۔ وہ اس کے لیپ کی تعریفیں کرنے لگے تو میں چٹکی لی "مگر مُلّا گردہ تو بہت اندر ہوتا ہے" بولے ہاں تمھارے والد نے بھی پاکستان جانے سے پہلے تین چار دفعہ لیپ لگایا تھا۔ ایک سینگ کاٹ کر ہمراہ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے منع کر دیا۔ میں نے کہا، قبلہ، بارہ سنگھوں کے رمنے میں اس گھسے گھسائے سینگ سے کام نہیں چلنے کا"۔

نٹ راج اور مردار تیتر

مُلّا عاصی نے ایک اور یادگار فوٹو دکھایا جس میں میاں تجمل حسین نٹ راج کا سا فاتحانہ پوز بنائے، یعنی نیل گائے کے سر پر اپنا پیر اور ۱۲ بور کا کندہ رکھے، کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اور میں گلے میں جست کی نمدہ چڑھی چھاگل اور دونوں ہاتھوں میں ایک ایک میلرڈ (نیل سر) مرغابی اور اپنا منھ لٹکائے کھڑا ہوں۔ میاں تجمل کا دعویٰ تھا کہ تھوتھنی سے دُم کی نوک تک نیل گائے کی لمبائی وہی ہے جو بڑے سے بڑے آدم خور بنگال ٹائیگر کی ہوتی ہے۔ نیل گائے کا شکار ایک مدت تک انڈیا میں ممنوع رہا۔ اب کُھل گیا ہے۔ جب سے وہ فصلیں کی فصلیں صاف کرنے لگیں، نیل گایوں کو گھوڑا کہہ کر مارنے کی اجازت مل گئی ہے۔ جیسے انگلینڈ میں اب کالوں اور سانولوں کو بلیک نہیں کہتے ethnic کہہ کر ٹھکانے لگاتے ہیں۔

یہ فوٹو چوہدری گلزار محمد فوٹو گرافر نے منٹ کیمرے سے میاں تجمل حسین کے گھر کے احاطے میں کھینچا تھا۔ فوٹو کھنچوانے کے لیے اتنی دیر سانس روکنا پڑتا تھا کہ صورت کچھ سے کچھ ہو جاتی تھی۔ چنانچہ صرف مُردہ گائے کا فوٹو اصل کے مطابق تھا۔ گلزار محمد اکثر شکار میں ساتھ لگ لیتا تھا۔ شکار سے مجھے کوئی دلچسپی

نہیں رہی۔ میرا مطلب شکار کرنے سے ہے، کھانے سے نہیں۔ بس میاں تجمل حسین ہمہ وقت اپنی اردلی میں رکھتے تھے۔ خدانخواستہ وہ دوزخ میں بھیجے گئے تو مجھے یقین ہے تنہا ہرگز نہیں جائیں گے۔ پیشوائی PR کے لیے پہلے مجھے روانہ کر دیں گے۔ شہر سے سات آٹھ میل پر شکار ہی شکار تھا۔ عموماً تانگے میں جاتے تھے۔ گھوڑا اپنی ہی ہم وزن، ہم شکل اور ہم رنگ نیل گائے ڈھو کر لاتا تھا۔ شکار کے تمام فرائض و انتظامات اس ناچیز کے ذمے تھے۔ سوائے بندوق چلانے کے۔ مِثلانہ صرف ٹھسا ٹھس بھرا ہوا ٹِفن کیریئر اٹھائے اٹھائے پھرنا، بلکہ اپنے گھر سے صبح چار بجے تازہ تر تراتے پراٹھے اور کباب بنوا کر اس میں ٹھسا ٹھس بھر کر لانا اور سب کو ٹھسانا۔ دسمبر کر کڑ کڑاتے جاڑے میں تالاب میں اتر کر چھرّا کھائی ہوئی مرغابی کا تعاقب کرنا، ہرن پر نشانہ خطا ہو جائے، جو کہ اکثر و بیشتر ہوتا رہتا تھا، تو میاں تجمل حسین کو قسمیں کھا کھا کے یقین دلانا کہ گولی برابر لگی ہے۔ ہرن بری طرح لنگڑاتا ہوا گیا ہے۔ زخم ذرا ٹھنڈا ہو گا تو بے حیا وہیں پچھاڑ کھا کے ڈھیر ہو جائے گا۔ تیتر ذبح ہونے سے پہلے دم توڑ دے تو اس کے گلے پر کسی حلال شدہ تیتر کا خون لگانا بھی میرے گناہ منصبی میں داخل تھا۔ اس لیے کہ شکار اگر چھری پھیرنے سے پہلے مردار ہو جائے تو وہ مجھے ہفتوں برا بھلا کہتے تھے۔ لہٰذا چھرا یا گولی لگنے کے بعد میں زخمی جانور کی درازی عمر کی دعا مانگتا تھا تاکہ اسے

زندہ حالت میں حلال کر سکوں۔ مردار تیتر اور مرغابیاں وہ سر آر تھر انس کپ کے بنگلے پر بھجوا دیتے تھے۔ بھجوا کیا دیتے تھے، یوں کہیے مجھی کو سائیکل پر لاد کے لے جانا پڑتا تھا۔ پیچھے کیریئر پر وہ خود شکار کو اپنی گود میں لے کر بیٹھتے تاکہ سائیکل پر بوجھ نہ پڑے۔ ان کا اپنا وزن (نہار منھ) ۲۳۰ پونڈ تھا۔ اس کے باوجود میں بہت تیز سائیکل چلاتا تھا۔ ورنہ شکار کی بُو پر لپکتے کتّے فوراً آ لیتے۔ میاں تجمل کہتے تھے کہ بندوق میری، کارتوس میرے، نشانہ میرا، شکار میرا، چھری میری، سائیکل میری، حد یہ کہ سائیکل میں ہوا بھی میں نے ہی بھری۔ اب اگر اسے چلاؤں بھی میں ہی تو آپ کیا کریں گے؟

وفا بھی حُسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے؟

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ بس کیا عرض کروں، اس یاری میں کیسی کیسی خواری ہوئی ہے۔ یہ تو کیسے کہوں کہ میاں تجمل حسین نے ساری عمر میرے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی ہے۔ ارے صاحب، کندھا خالی ہی کہاں تھا کہ بندوق رکھتے۔ کندھے پر تو وہ خود مع بندوق کے سوار رہتے تھے۔ بخدا ساری عمر ان کے غمزے ہیں نہیں literally (لفظاً) خود انہیں بھی اُٹھایا ہے۔

اونٹ کی مستی کی سزا بھی مجھی کو ملی

یہ تو غالباً پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ بڑے حاجی صاحب یعنی تجمل کے والد، تانگا اور موٹر کار رکھنے کو تکبر اور کاہلی کی علامت سمجھتے تھے۔ سائیکل اور اونٹ کی سواری پر البتہ تعرض نہ کرتے۔ اس لیے کہ ان کا شمار وہ آلات نفس کشی میں کرتے تھے۔ اکثر فرماتے کہ ”میں پچیس سال کا ہو گیا، اس وقت تک میں نے ہیجڑوں کے ناچ کے سوا کوئی ناچ نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی تجمل (یعنی اپنے بیٹے) کی پیدائش پر۔ چھبیسویں سال میں لائل پور میں چوری چھپے ایک شادی میں مجرا دیکھ لیا تو والد صاحب نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ عاق کرنے کی دھمکی دی۔ حالانکہ ورثے میں مجھے سوائے ان کے قرضوں کے اور کچھ ملنے والا نہیں تھا۔ کہنے لگے کہ لونڈا بد چلن ہو گیا۔ چنیوٹ برادری میں، میں پہلا باپ ہوں جس کی ناک فرزند کے ہاتھوں کٹی۔ چنانچہ بطور سزا اور سرزنش مجھے ادھار کپاس خریدنے چنیوٹ سے جھنگ ایک مستی پر آئے ہوئے اونٹ پر بھیجا، جس کے ماتھے سے بودار مدرِس رہا تھا۔ چلتا کم، بلبلاتا زیادہ تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں جھنگ کے درختوں کے جُھنڈ اور جوہ[1] نظر آنے لگی تو وہ یکایک بدک گیا۔ اسے ایک

---

[1] پنجابی۔ گاؤں کی سرحد

اونٹنی نظر آ گئی۔ اس کے تعاقب میں جھنگ پار کر کے مجھے اپنے کوہان پر ہاتھ ہاتھ بھر اُچھالتا پانچ میل آگے نکل گیا۔ مجھے تو ایک میل بعد ہی اونٹنی نظر آنی بند ہو گئی۔ اس لیے کہ میں اونٹ نہیں تھا۔ لیکن وہ مادہ کی بُو پہ لپکا جا رہا تھا۔ میں ایک مست بھونچال پہ سوار تھا۔ بالآخر اونٹ انتہائی جوش کے علام میں ایک دلدل میں مجھ سمیت گھس گیا۔ اور تیزی سے دھنسنے لگا۔ میں نہ اوپر بیٹھا رہ سکتا تھا، نہ نیچے کود سکتا تھا۔ گاؤں والے رسے، نسینی (سیڑھی) اور قبر کھودنے والے کو ساتھ لے کر آئے تو جان بچی۔ کجاوہ گز بھر چوڑا تھا۔ ایک ہفتے تک میری ٹانگیں ایک دُکھتی غلیل کیطرح چری کی چری رہ گئیں۔ اس طرح چلنے لگا جیسے خطرناک قیدی ڈنڈا بیڑی پہن کر چلتے ہیں۔ یا لڑکے ختنوں کے بعد۔ مہتر سے کہہ کر قدمچے ایک ایک گز کے فاصلے پر رکھوائے۔ اونٹ کی مستی کی سزا تھی مجھی کو ملی"۔

قبلہ کا ہی خیال تھا کہ بیٹے کی چال دیکھ کر اونٹ نے بھی عبرت پکڑی ہو گی۔

علی گڑھ کٹ پاجامہ اور ارہر کی دال

حاجی صاحب قبلہ نے کانپور میں ایک ہندو سیٹھ کے ہاں ۱۹۰۷ء میں چار روپے ماہوار کی نوکری سے ابتدا کی۔ انتہائی دیانت دار، دبنگ، قد آور اور ڈیل ڈول کے مضبوط تھے۔ سیٹھ نے سوچا ہوگا اُگاہی میں آسانی رہے گی۔ دوسری جنگ کے بعد حاجی صاحب کروڑ پتی ہو گئے۔ مگر وضع داری میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ مطلب یہ کہ ان کی خود آزاری تک پہنچی ہوئی جُزرسی، وضع قطع، انکسار اور اندازِ گفتگو سے یہی لگتا تھا کہ اب بھی چار روپے ہی ملتے ہیں۔ گاڑھی ململ کا کُرتہ اور ٹُخنے سے اونچی چوخانے کی لنگی باندھتے۔ شلوار صرف کسی فوجداری مقدمے کی پیروی کے لیے عدالت میں جانے اور جنازے میں شرکت کے موقعے پر پہنتے تھے۔ گاگلز لگانے اور پتلون اور چوڑی دار پاجامہ پہننے والے کو کبھی اُدھار مال نہیں دیتے تھے۔ کچھ نہیں تو چالیس پینتالیس برس تو یوپی میں ضرور رہے ہوں گے، مگر لگی ہوئی فیرنی، نہاری اور ارہر کی دال دوبارہ نہیں کھائی۔ نہ کبھی دوپلّی ٹوپی اور پاجامہ پہنا۔ البتہ ۱۹۳۸ء میں آپریشن ہوا تو نرسوں نے حالتِ بے ہوشی میں پاجامہ پہنا دیا تھا جو انہوں نے ہوش میں آتے ہی اتار پھینکا۔ بقول شاعر

بے ہوش ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا

اکثر فرماتے کہ اگر چمٹے کو کسی شرعی تقاضے کے تحت یا پھکنی کے پھُسلاوے سے کچھ پہننا پڑے تو اس کے لیے علی گڑھ کٹ پاجامے سے زیادہ موزوں کوئی پہناوا نہیں۔ پنجابی میں یہ فقرہ بڑا مزہ دیتا تھا۔ ہم سب فرمائش کر کے سنتے۔

نیل گائے اور پری چہرہ نسیم

میں نے مُلّا عاصی کو چھیڑا "اب بھی شکار پر جاتے ہو؟" کہنے لگے "اب نہ فرصت، نہ شوق، نہ گوارا۔ ہرن اب صرف چڑیا گھر میں نظر آتے ہیں۔ میں تو اب مرغابی کے پروں کا تکیہ تک استعمال نہیں کرتا"۔ پھر انہوں نے الگنی پر سے ایک لیر لیر بنیان اتارا۔ اسے سونگھا اور اس سے لکڑی کے ایک فریم کو کچھ دیر رگڑا تو ثانی الذکر کے نیچے سے ایک شیشہ اور شیشے کے نیچے سے فوٹو برآمد ہوا۔ یہ فوٹو چودھری گلزار محمد نے جنگل میں شکار کے دوران کھینچا تھا۔ اس میں یہ عاجز اور ایک چمار کالے ہرن کو ڈنڈا ڈولی کر کے تانگے تک لے جا رہے ہیں۔ غنیمت ہے اس میں وہ چیل کوّے نظر نہیں آ رہے ہیں جو ہم تینوں کے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ کیا بتاؤں صاحب، ہمارے یار نے ہم سے کیا کیا بیگار لی ہے۔ مگر سب گوارا تھا۔ فرشتوں کو کنویں جھنکوا دیے اس عشق ظالم نے۔ بڑا خوبصورت اور کڑیل ہرن تھا وہ۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بہت اداس تھیں۔ مجھے یاد ہے۔

اسے ذبح کرتے وقت میں نے منھ پھیر لیا تھا۔ اچھے شکاری عام طور پر کالا نہیں مارتے۔ ساری ڈار بے آسرا، بے سری ہو جاتی ہے۔ آپ نے وہ کہاوت سُنی ہو گی۔ کالا ہرن مت ماریو ستر ہو جائیں گی رانڈ۔ چودھری گلزار محمد پنڈی بھٹیاں کا رہنے والا، پندرہ بیس سال سے کانپور میں آباد و ناشاد تھا۔ اپنے اسٹوڈیو میں تاج محل اور قطب مینار کے فوٹو بھی (جو اس نے خود کھینچے تھے) بیچتا تھا۔ اپنے مکان کی دیواروں کو پنڈی بھٹیاں کے مناظر سے سجا رکھا تھا۔ اس میں اس کا پھوس کے چھپر والا گھر بھی شامل تھا جس پر ترئی کی بیل چڑھی تھی۔ دروازے کے سامنے ایک جھلنگے پر نورانی صورت ایک بزرگ حقّہ پی رہے تھے۔ قریب ہی ایک کھونٹے سے غبارہ تھنوں والی بکری بندھی تھی۔ ہر منظر مثلِ لیلیٰ کے تھا۔ جسے صرف مجنوں کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ وہ دیگچی کو دیگچی اور تمغہ کو تغمہ[1] کہتا تو ہم سب اس پر ہنستے تھے۔ لحیم شحیم آدمی تھا۔ بڑی سے بڑی ہڈی توڑنے کے لیے بغدا صرف ایک دفعہ مارتا تھا۔ چار من وزنی نیل گائے کی کھال آدھ گھنٹے میں اتار، تکا بوٹی کر کے رکھ دیتا۔ کباب لاجواب بناتا تھا۔ ہر وقت بمبئی کے خواب دیکھتا رہتا۔ کھال اتارتے وقت اکثر کہتا کہ کانپور میں نیل گائے کے سوا

---

[1] صوبہ سرحد اور پنجاب میں جب لوگ تمغہ کو تغمہ کہتے ہیں تو عام طور پر اسے تلفّظ کی غلطی پر محمول کیا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ کہ صحیح لفظ تغمہ ہی ہے جو ترکی الاصل ہے۔ اور صحیح املا تغما ہے۔

اور کیا دھرا ہے؟ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن منروا موویٹون میں کیمرا مین بنوں گا۔ اور مادھوری اور مہتاب کے کلوز اپ لے کے تمھیں بھیجوں گا۔ پھر خود ہی نرت کر کے سیکسی پوز بناتا اور خود ہی کالے کپڑے کی بجائے اپنے سر پر خون آلود جھاڑن ڈال کر فرضی کیمرے سے خود کو کلوز اپ لیتا ہوا imagine کرتا۔ ایک دفعہ اسی طرح پری چہرہ نسیم کا کلوز اپ لیتے لیتے اس کی چھری بہک کر نیل گائے کی کھال میں گھس گئی۔ میاں تجمل چیخے کہ "پری چہرہ گئی بھاڑ میں۔ یہ تیسرا چرکہ ہے۔ تیرا دھیان کدھر ہے؟ کھال داغدار ہوئی جارہی ہے"۔ کانپور میں ایک لاجواب taxidermist تھا۔ شیر کا سر البتہ بنگلور بھیجنا پڑتا تھا۔ رئیسوں کر فرش پر شیر کی اور مڈل کلاس گھرانوں میں ہرن کی کھال بچھی ہوتی تھی۔ غریبوں کے گھروں میں عورتیں گوبر کی لپائی کے کچے فرش پر پکے رنگوں سے قالین کے سے ڈیزائن بنا لیتی تھیں۔

قصّہ ایک مِرگ چھالے کا

مُلّا عاصی کے کمرے میں دری پر ابھی تک نثار احمد خان کی ماری ہوئی ہرنی کی کھال بچھی ہے۔ خاں صاحب کے چہرے، مزاج اور لہجے میں خشونت تھی۔ وہابی مشہور تھے۔ واللہ اعلم۔ شکار کے دھنی، مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میاں تجمل کہتے

تھے کہ وجہ پسندیدگی تمہارا مُنڈا ہوا سر اور ٹخنے سے اونچا پاجامہ ہے۔ گرّاب جہاں لگا تھا، اس کا سوراخ کھال پر جوں کا توں موجود ہے۔ اس کے پیٹ سے پورے دنوں کا بچہ نکلا۔ کسی نے گوشت نہیں کھایا۔ خود نثار احمد دو راتیں نہیں سوئے۔ اتنا اثر تو ان کے قلب پر اس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب تیتر کے شکار میں ان کے فیر کے چھروں سے جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک کسان کی دونوں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ دو سو روپے میں معاملہ رفع دفع ہوا۔ ہرنی والے واقعے کے تین مہینے کے اندر اندر ان کا اکلوتا جوان بیٹا جو بی اے میں پڑھ رہا تھا، زخمی مرغابی کو پکڑنے کی کوشش میں تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ کہنے والوں نے کہا، گیا بھن، گربھ وتی کا سراب لگ گیا۔ جنازہ دالان میں لا کے رکھا تو زنانے میں کہرام مچ گیا۔ پھر ایک بھنچی بھنچی سے چیخ کہ سننے والوں کی چھاتی پھٹ جائے۔ نثار احمد خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "بیوی، صبر، صبر، صبر۔ اونچی آواز سے رونے سے اللہ کے رسول نے منع کیا ہے"۔ وہ بی بی خاموش ہو گئی۔ پھر کھڑکی کے جنگلے سے سر ٹکرا ٹکرا کے لہولہان کر لیا۔ مانگ خون سے بھر گئی۔ میت لحد میں اتارنے کے بعد جب لوگ قبر پر مٹی ڈال رہے تھے تو باپ دونوں سے اپنے سفید سر پر مٹھی بھر بھر کے خاک ڈالنے لگا۔ لوگوں نے بڑھ کر ہاتھ پکڑے۔ مشکل سے چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ بیوی کو صبر کی تلقین کرنے

والا تھی کفن اوڑھ کے خاک میں جا سویا۔ وصیت کے مطابق قبر بیٹے کے پہلو میں بنائی گئی۔ ان کی پائینتی بیوی کی قبر ہے۔ فاتحہ پڑھنے قبرستان گیا۔ بڑی مشکل سے قبر ملی۔ شہر تو پھر بھی پہچانا جاتا ہے۔ قبرستان تو بالکل ہی بدل گیا ہے۔ پہلے ہر قبر کو سارا شہر پہچانتا تھا کہ ہر ایک کا مرنے والے سے جنم جنم کا ناتا تھا۔ صاحب، قبرستان بھی جائے عبرت ہے۔ کبھی جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جس اس میں میت اُتری ہو گی، کیسا کہرام مچا ہو گا۔ رونے والے کیسے بلک بلک کے تڑپ کے روئے ہوں گے۔ پھر خود یہی رونے والے دوسروں کو رُلا کے یہیں باری باری پیوندِ خاک ہوتے چلے گئے۔ صاحب، جب یہی کچھ ہونا ہے تو پھر کیسا سوگ، کس کا ماتم، کاہے کا رونا۔

ماسٹر فاخر حسین کی قبر پر بھی فاتحہ پڑھی۔ کچھ نہ پوچھئے، دل کو کیسی کیسی باتیں یاد آ کے رہ گئیں۔ لوحِ مزار ِگر گئی ہے۔ اس پر وہی شعر کندہ ہے جو وہ اکثر پڑھا کرتے تھے۔ حروف کی سیاہی کو تیس پینتیس برس کی بارشیں بہا کے لے گئیں۔

بعد از وفات تُربتِ ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست [1]

---

[1] میرے مرنے کے بعد میری قبر رُوئے زمین پر تلاش نہ کرو۔ میرا مزار تو عارفوں کے سینے میں ہے۔

تحت اللّفظ، شرمائے شرمائے ترنم اور کھرج کی آمیزش بلکہ آویزش سے شعر پڑھنے کی ایک مخصوس طرزِ فاخری ایجاد کی تھی جو انہیں پر ختم ہو گئی۔ پڑھنے سے پہلے شیر وانی کا تیسرا بٹن کھول دیتے۔ پڑھ چکتے تو بغیر پھُندنے والی تُرکی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دیتے۔ ہر شعر ایک ہی لے اور ایک ہی بحر میں پڑھنے کے سبب درمیان میں جو جھٹکے اور سکتے پڑتے۔ انہیں واہ، ارے ہاں، حضور، یا فقط باوزن کھانسی سے دور کر دیتے۔ مندرجہ بالا شعر میں سینہ ہائے عارف ادا کرتے تو انگشتِ شہادت سے تین چار دفعہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے۔ البتہ مزار ماست پڑھتے وقت ہم نالائق شاگردوں کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنی قبر کی نشان دہی کرتے۔

دیکھیے، یادوں کی بھول بھلیّوں میں کہاں آنکلا۔ جبھی تو بچارے ساحر نے کہا تھا، یا ممکن ہے کسی اور نے کہا ہو:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

بات دراصل مِرگ چھالے سے نکلی۔ ایک دفعہ میں نے لاپروائی سے ہولڈر جھٹک دیا تھا۔ روشنائی کے چھینٹے ابھی تک کھال پر موجود ہیں۔ میں نے دیکھا کہ

عاصی کھال پر پاؤں نہیں رکھتے۔ سارے کمرے میں یہی سب سے قیمتی چیز ہے۔
قیاس کن زگلستانِ من۔ دیکھیے زبان پر پھر وہی کم بخت "الخ" آتے آتے رہ گیا۔
آپ نے بھی تو کسی بزنس ایگزیکٹیو کا ذکر کیا تھا جن کے اٹالین ماربل فلور پر ہر
سائز کے نایاب ایرانی قالین بچھے ہیں۔ کمرے میں ایک سرے سے دوسرے
سرے تک جانا ہو تو وہ ان پر قدم نہیں رکھتے۔ ان سے بچ بچ کے ننگی راہداریوں
پر اس طرح قدم رکھتے زگ زیگ جاتے ہیں جیسے وہ خود اسنیکس اینڈ لیڈرس کی
گوٹ ہوں۔ ارے صاحب، میں بھی ایک بزنس مین کو جانتا ہوں۔ ان کے گھر
میں قالینوں کے لیے فرش پر جگہ نہ رہی تو دیواروں پر لٹکا دیے۔ قالین ہٹا ہٹا کر
مجھے دکھاتے رہے کہ ان کے نیچے قیمتی رنگین ماربل ہے۔

شہر دو قصّہ

وہ منحوس بندوق نثار احمد خان نے مُلّا عاصی کو بخش دی کہ وہ ان کے بیٹے کے
جگری دوست تھے۔ ہنگاموں میں پولیس نے سارے محلے کے ہتھیار تھانے میں
جمع کروائے تو یہ بندوق بھی مال خانے پہنچ گئی۔ پھر اس کی شکل دیکھنا نصیب نہ
ہوئی۔ فقط مہر شدہ رسید ہاتھ میں رہ گئی۔ پیروی تو بہت کی۔ ایک وکیل بھی کیا۔
مگر تھانے دار نے کہلا بھیجا کہ "ڈی آئی جی کو پسند آگئی ہے"۔ زیادہ غوغا کروگے

تو بندوق تو مل جائے گی مگر پولیس تمہارے گھر سے شراب کشید کرنے کی بھٹی برآمد کروائے گی۔ تمہارے ساتھ رہنے والے سارے رشتے دار پاکستان جا چکے ہیں۔ تمہارا مکان بھی Evacuaee Property (متروکہ املاک) قرار دیا جا سکتا ہے۔ سوچ لو"۔ چنانچہ انہوں نے سوچا اور چپ ہو رہے۔ اللہ، اللہ، ایک زمانہ تھا کہ شہر کوتوال ان کے باوا سے ملنے تیسرے چوتھے آتا تھا۔ پرڈی کی بڑی نایاب بندوق تھی۔ آج کل چھ لاکھ قیمت بتائی جاتی ہے۔ مگر صاحب، مجھ سے پوچھیے تو چھ لاکھ کی بندوق سے آدم خور شیر یا مردم آزار بادشاہ۔ یا خود۔ سے کچھ کم مارنا اتنی قیمتی بندوق کی توہین ہے۔ مُلّا عاصی ابھی تک ہر ایک کو ضبط شدہ بندوق کی مہر شدہ رسید اور لائسنس دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدھ میل دور سے اس کا گرّاب اچٹتا ہوا بھی لگ جائے تو کالا (ہرن) پانی نہ مانگے۔

۱۲

خلاف وضع فطری موت

پرانے دوست جب مدتوں بعد ملتے ہیں تو کبھی کبھی باتوں میں اچانک ایک تکلیف دہ وقفۂ سکوت آ جاتا ہے۔ کہنے کو اتنا کچھ ہوتا ہے کہ کچھ بھی تو نہیں کہا

جاتا۔ ہزار باتیں ہجوم کر آتی ہیں۔ اور کہنی مار مار کے کندھے پکڑ پکڑ کے، ایک دوسرے کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ پہلے میں، پہلے میں، تو صاحب، میں ایک ایسے ہی وقفے میں ان کی مفلوک الحالی اور عُسرت پر دل ہی دل میں ترس کھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہمارے ساتھ پاکستان آ گئے ہوتے تو سارے دلدر دور ہو جاتے۔ انہوں نے یکبارگی سکوت توڑا۔ کہنے لگے، تم واپس کیوں نہیں آ جاتے؟ تمھارے ہارٹ اٹیک کی جس دن خبر آئی تو یہاں صفِ ماتم بچھ گئی۔ تمہیں یہ راج روگ، یہ رئیسوں کی بیماری کیسے لگی۔ سنا ہے میڈیکل سائنس کو ابھی تک اس کی اصل وجہ معلوم نہیں ہوئی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسی خوردبین ضرور ایجاد ہو گی جو اس مرض کے جراثیم کرنسی نوٹوں میں ٹریس کر لے گی۔ بندہ خدا، تم پاکستان کاہے کو چلے گئے؟ یہاں کس چیز کی کمی ہےِ دیکھو، وہاں تمہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ میاں تجمل حسین کو ہوا۔ منیر احمد کا "بائی پاس" ہوا۔ ظہیر صدیقی کے "پیس میکر" لگا۔ منظور عالم کے دل میں سوراخ نکلا۔ مگر مجھے یقین ہے یہ پاکستان میں ہی ہوا ہو گا۔ یہاں سے تو صحیح سالم گئے تھے۔ خالد علی لندن میں انجیو گرافی کے دوران میز پر ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میت کی ممی ساگوان کے شاندار بکس میں کراچی فلائی کی گئی۔ اور تو اور دبلے سوکھے چھوہارا، بھیا احتشام بھی لاہور میں ہارٹ اٹیک میں گئے۔ سبطین اور انسپکٹر

ملک غلام رسول لنگڑیال کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ مولانا ماہر القادری کو ہوا۔ یوں کہو، کس کو نہیں ہوا۔ بھائی میرے، یہاں ذہنی سکون ہے۔ قناعت ہے۔ توکّل ہے۔ یہاں کسی کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا۔ اہلِ ہنود میں البتہ cases ہوتے رہتے ہیں۔

گویا سارا زور کس پر ہوا؟ اس پر کہ کانپور میں ہر شخص اپنی طبعی موت مرتا ہے۔ ہارٹ اٹیک سے بے موت نہیں مرتا۔ ارے صاحب، میرے ہارٹ اٹیک کو تو انہوں نے گویا کھونٹی بنالیا جس پر جان پہچان کے گڑے مُردے اُکھاڑ اُکھاڑ کر ٹانگتے چلے گئے۔ مجھے تو سب نام یاد بھی نہیں رہے۔ دوسرے ہارٹ اٹیک کے بعد میں نے دوسروں کی رائے سے اختلاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب اپنی رائے کو ہمیشہ غلط سمجھتا ہوں۔ سب خوش رہتے ہیں۔ لہذٰا چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ اور وہ ان خوش نصیب مرحومین کے نام گنواتے رہے جو ہارٹ اٹیک میں نہیں مرے، کسی اور مرض میں مرے۔ "اپنے مولوی محتشم ٹی بی میں مرے، حمید اللہ سینئر کلرک نبیرۂ خان بہادر عظمت اللہ خان کا گلے کے کینسر میں انتقال ہوا۔ شہناز کے میاں عابد حسین وکیل ہندو مسلم فساد میں شہید ہوئے۔ قائم گنج والے عبد الوہاب خاں پورے پچیس دن ٹائیفائڈ میں مبتلا رہے۔ حکیم کی کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ بقائمی ہوش و حواس و حافظہ جاں بحق تسلیم ہوئے۔ مرنے سے دو منٹ

پہلے حکیم کا پورا نام لے کر گالی دی۔ منشی فیض محمد ہیضے میں ایک دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ حافظ فخر الدین فالج میں گئے۔ مگر الحمدللہ، ہارٹ اٹیک کسی کو نہیں ہوا۔ کوئی بھی خلافِ وضع فطری موت نہیں مرا۔ پاکستان میں میری جان پہچان کا کوئی متمول شخص ایسا نہیں جس کے دل کا بائی پاس نہ ہوا ہو۔ چندے یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب خوش حال گھرانوں میں ختنے اور بائی پاس ایک ساتھ ہوا کریں گے۔

پھر وہ آواگون اور نروان کے فلسفے پر لیکچر دینے لگے۔ بیچ لیکچر کے انہیں اچانک ایک اور مثال یاد آ گئی۔ اپنا ہی قطع کلام کرتے ہوئے اور بھگوان بدھ کو بودھی پیڑ کے نیچے اکیلا اونگھتا چھوڑ کر کہنے لگے "حد یہ کہ خواجہ فہیم الدین کا ہارٹ فیل نہیں ہوا۔ بیوی کے مرنے کے بعد دونوں بیٹیاں ہی سب کچھ تھیں۔ انہی میں مگن تھے۔ ایک دن اچانک پیشاب بند ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا پروسٹیٹ بڑھ گیا ہے۔ فوراً ایمرجنسی میں آپریشن کروانا پڑا جو بگڑ گیا۔ مگر تین چار مہینے میں لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو گئے۔ لیکن بڑی بیٹی نے ناگہاں ایک ہندو وکیل اور چھوٹی نے سکھ ٹھیکے دار سے شادی کر لی تو جانو کمر ٹوٹ گئی۔ پرانی چال، پرانے خیال کے آدمی ہیں۔ اٹواٹی کھٹواٹی لے کے پڑ گئے۔ اور اس وقت تک پڑے رہے جب تک اس کرسچین نرس سے شادی نہ کر لی جس نے پروسٹیٹ کے آپریشن کے

دوران ان کا گو مُوت کیا تھا۔ وہ حرّافہ تو گویا اشارے کی منتظر بیٹھی تھی۔ بس انہیں کی طرف سے ہچر مچر تھی:

اے مردِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟

باپ کے سہرے کے پھول کھلنے کی خبر سنی تو دونوں عاق شدہ بیٹیوں نے کہلا بھیجا کہ ہم ایسے باپ کا منھ دیکھیں تو بد جانور کا منھ دیکھیں۔ وہ چیختے ہی رہ گئے کہ بد بختو میں نے کم از کم یہ کام تو شرع شریف کے عین مطابق کیا ہے۔ میاں یہ سب کچھ ہوا۔ مگر ہارٹ اٹیک خواجہ فہیم الدین کو بھی نہیں ہوا۔ تمھارے ہارٹ اٹیک کی خبر سنی تو دیر تک افسوس کرتے رہے۔ کہنے لگے، یہاں کیوں نہیں آجاتے؟

صاحب، مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا پروسٹیٹ بڑھ گیا تو میں بھی آجاؤں گا۔

پنڈولے کا پیالہ

طالبِ علمی کے زمانے میں کھانے کے معاملے میں بڑے نفاست پسند تھے۔ دو پیازہ گوشت، لہسن کی چٹنی، سری پائے، کلیجی، گُردے، کھیری اور مغز سے انہیں بڑی کراہت آتی تھی۔ دستر خوان پر ایسی کوئی ڈش ہو تو بھوکے اٹھ جاتے۔ اس "وزٹ" میں ایک جگہ میرے اعزاز میں دعوت ہوئی تو بھنا ہوا مغز

بھی تھا۔ صاحب لہسن کا چھینٹا دے دے کے بھونا جائے اور پھٹکیوں کو گھوٹ دیا جائے تو ساری بساند نکل جاتی ہے۔ بشرطیکہ گرم مصالحہ ذرا بولتا ہوا اور مرچیں بھی چہکا مارتی ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے بھی کھایا اور منغض نہ ہوئے۔ میں نے پوچھا، حضرت، یہ کیسی بدپرہیزی؟ بولے جو سامنے آ گیا، جو کچھ ہم پر اترا، کھالیا۔ ہم انکار کرنے، منھ بنانے والے کون۔

پھر کہنے لگے "بھائی تم نے وہ بھکشو والا قصّہ نہیں سنا؟ بھکشو سے سات برس بھیک منگوائی جاتی تھی تاکہ انا کا پھن ایڑیوں تلے بالکل کچل جائے۔ اس کے بغیر آدمی کچھ پا نہیں سکتا۔ کاسہ گدائی کو مہاتما بدھ نے تاجِ سلطانی کہا ہے۔ بھکشو کو اگر کوئی ایک وقت سے زیادہ کھانا دینا بھی چاہے تب بھی وہ قبول نہیں کر سکتا۔ اور جو کچھ اس کے پیالے میں ڈال دیا جائے، اسی کو بے چون و چرا کھانا اس پر فرض ہے۔ پالی کی قدیم روایات میں آیا ہے کہ پنڈولے نامی ایک بھکشو کے پیالے میں ایک کوڑھی نے روٹی کا ٹکڑا ڈالا۔ ڈالتے وقت اس کا کوڑھ سے گلا ہوا انگوٹھا بھی جھڑ کر پیالے میں گر پڑا۔ پنڈولے کو دونوں کا سواد ایک سا لگا۔ یعنی کچھ نہیں"۔ صاحب وہ تو قصّہ سنا کر سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ مگر میرا یہ حال کہ مغز تو ایک طرف رہا، میز پر رکھا ہوا سارا کھانا زہر ہو گیا۔ صاحب، اب ان کا ذہن پنڈولے کا پیالہ ہو گیا ہے۔

مُلّا بھکشو

لڑکی کی خودکشی والا واقعہ ۱۹۵۳ء کا بتایا جاتا ہے۔ سنا ہے اس دن کے بعد سے وہ مستغنی الاحوال ہو گئے اور پڑھانے کا معاوضہ لینا ترک کر دیا۔ تیس سال ہو گئے۔ کسی نے کچھ کھلا دیا تو کھا لیا، ورنہ تکیہ پیٹ پر رکھا اور گھٹنے سکیڑ، دونوں ہاتھ جوڑ کے انہیں دائیں گال کے نیچے رکھ کے سو جاتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں اس کو؟ جی، foetal posture اُردُو میں اسے جنم آسن، کوکھ آسن کہہ لیجیے۔ مگر مجھے آپ کی اس فرائیڈ والی تاویل سے قطعی اتفاق نہیں۔ آپ خود بھی تو اسی طرح کنڈلی مار کے سوتے ہیں۔ مگر سبب اس کا تپسیا نہیں، السر ہے۔ مُلّا عاصی بھکشو کہتے ہیں کہ بھگوان بدھ بھی داہنے پاؤں پر بایاں پاؤں اور سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر داہنی کروٹ سوتے تھے۔ اسے سِنگھ شیّا کہتے ہیں۔ بھوگ بلاسی یعنی اہلِ ہوس اور عیاش بائیں کروٹ سوتے ہیں۔ اسے کام بھوگی شیّا کہتے ہیں۔ یہ مجھے انہیں سے معلوم ہوا کہ بدچلن آدمی فقط سونے کے آسن سے بھی پکڑا جا سکتا ہے۔ بہر کیف، اب عالم یہ ہے کہ جو کسی نے پہنا دیا پہن لیا۔ جو مل گیا، کھا لیا، جس سے ملا، جیسا ملا۔ جب ملا۔ جہاں تھک گئے وہیں رات ہو گئی۔ جہاں پڑ رہے، وہیں رین بسیرا۔ تن تکیہ من بسرام۔ چار چار دن گھر نہیں آتے۔ مگر کیا فرق پڑتا

ہے۔ جیسے کنتھا گھر رہے ویسے رہے بدیس [1]۔ خدا بھلا کرئے ان کے چیلوں کا۔ وہی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ ایسے محبتی، خدمتی شاگرد نہیں دیکھے۔ مُلّا ایک دن ہاتھ کا پیالہ سا بنا کر کہنے لگے، بس مٹھی بھر دانوں کے لیے بنجارا کیسا گھبرایا، کیسا بولایا پھرتا ہے۔ ہر کس و ناکس پہ اگر یہ بات کھل جائے کہ زندگی کرنا کتنا سہل ہے تو یہ سارا کارخانہ ٹھپ ہو جائے۔ یہ سارا پاکھنڈ [2]، یہ سارا آڈمبر [3] پل بھر میں کھنڈت ہو جائے۔ ہر آدمی کا شیطان اس کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ اور خواہش اس شیطان کا دوسرا نام ہے۔ انسان اپنی خواہشوں کو جتنی بڑھاتا اور ہشکارتا جائے گا۔ اس کا من اتنا ہی کٹھور اور اس کی زندگی اتنی ہی کٹھن ہوتی چلی جائے گی۔ ڈائنا سور (Dinosaur) کا ڈیل جب اتنا بڑا ہو گیا اور کھانے کی خواہش اتنی شدید ہو گئی کہ زندہ رہنے کے لیے اسے چوبیس گھنٹے مسلسل چرنا پڑتا تھا تو اس کی نسل ہی extinct (معدوم) ہو گئی۔ کھانا صرف اتنی مقدار میں جائز ہے کہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رہے۔ جسم فربہ ہو گا تو نفس کا موٹا ہونا لازمی ہے۔

[1] نکما خاوند گھر رہے یا پردیس برابر ہے

[2] بکھیڑا، دکھاوے کی عبادت

[3] نمائش، تصنع، دکھاوے کے تکلفات

میں نے آج تک کوئی لاغر مولوی نہیں دیکھا۔ بھرے پیٹ عبادت اور شب زندہ داری اور خالی پیٹ عیاشی نہیں ہو سکتی۔

یہ کہتے ہوئے وہ میز پر سے اپنے تالیف کردہ بودھ منتروں کا قلمی نسخہ اُٹھا لائے اور اس کے دیباچے سے اشلوک پڑھنے والے لہجے میں لہک لہک کر اقتباس سنانے لگے:

"بودھی ستوا نے بھگوان سچک سے کہا کہ اے اگی ویسن! جب میں دانتوں پر دانت جما کر اور اور تالو کو زبان لگا کر دل و دماغ کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتا تھا تو میری بغلوں سے پسینا چھوٹنے لگتا تھا۔ جس طرح کوئی بلوان کسی کمزور آدمی کا سر یا کندھا پکڑ کر دباتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح میں اپنے دل و دماغ کو دباتا تھا۔ اے اگی ویسن، اس کے بعد میں نے سانس روک کر تپسیا کرنا شروع کی۔ اس سمے میرے کانوں سے سانس نکلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوہار کی دھونکنی جیسی۔ یہ آوازیں بہت تیز تھیں۔ پھر اے اگی ویسن، میں سانس روک کر اور کانوں کو ہاتھوں سے دبا کر تپسیا کرنے لگا۔ ایسا کرنے سے مجھے یوں لگا جیسے کوئی تلوار کی تیز نوک سے میرے ماتھے کو چھلنی کر رہا ہے۔ پھر بھی اے اگی ویسن، میں نے اپنی تپسیا جاری رکھی"۔

”اے اگی ویسن، تپسیا اور فاقے سے میرا شریر (جسم) بدن بدن کمزور پڑتا گیا۔ آستک ولی کی گانٹھوں کی طرح میرے شریر کا جوڑ جوڑ صاف دکھائی دیتا تھا۔ میرا کولھا سوکھ کر اونٹ کے پاؤں کی مانند ہو گیا۔ میری ریڑھ کی ہڈّی سُوت کی تکلیوں کی مال کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ جس طرح گرے ہوئے مکان کی بلیلاں اوپر نیچے ہو جاتی ہیں، میری پسلیوں کی بھی وہی دِشا (کیفیت) ہو گئی ہے۔ میری آنکھیں کسی گہرے کنویں میں ستاروں کے عکس کی طرح اندر کو دھنس گئیں، جیسے کچا کڑوا کدّو کاٹ کر دھوپ میں ڈال دیتے سے سوکھ جاتا ہے، ویسے ہی میرے سر کی چمڑی سوکھ گئی ہے۔ جب پیٹ پر ہاتھ پھیرتا تھا تو میرے ہاتھ میں ریڑھ کی ہڈی آ جاتی تھی۔ اور جب پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا تو ہاتھ پیٹ کی چمڑی تک پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح میری پیٹھ اور پیٹ برابر ہو گئے تھے۔ شریر پر ہاتھ پھیرتا تو بال جھڑنے لگتے تھے“۔

فلیس مِنی! فلیس مِنی[1]!

یہ پڑھنے کے بعد قدرے توقف کیا۔ آنکھیں موندلیں۔ میں سمجھا دھیان گیان کے غوطہ میں چلے گئے۔ ذرا دیر بعد آنکھیں بس اتنی کھولیں کہ پلک سے پلک جدا ہو جائے۔ اب وہ دھیان کی ساتویں سیڑھی پہ جھوم رہے تھے۔ ہاتھ کا چُلّو بنا کر کہنے لگے "ایک پیاس تو وہ ہوتی ہے جو گھونٹ دو گھونٹ پانی پینے سے بجھ جاتی ہے۔ اور ایک تونس ہوتی ہے کہ جتنا پانی پیو پیاس اتنی ہی بھڑکتی جاتی ہے۔ ہر گھونٹ کے بعد زبان پر کانٹے پڑتے چلے جاتے ہیں۔ آدمی آدمی پر منحصر ہے۔ کسی کو کایاموہ، کسی کو زر، زمین کی پیاس لگتی ہے۔ کسی کو علم اور شہرت کی۔ کسی کو خدا کے بندوں پر خدائی کی۔ اور کسی کو عورت کی پیاس ہے کہ بے تحاشا لگے چلی جاتی ہے۔ یہ پیاس دریاؤں، بادلوں اور گلیشروں کو نگل جاتی ہے اور سیر اب نہیں ہوتی۔ انسان کو دریا دریا، سراب سراب لیے پھرتی ہے۔ بجھائے نہیں بجھتی۔ العطش، العطش، پھر ہوتے ہوتے یہ ان بجھ پیاس خود انسان ہی کو پگھلا کے پی جاتی ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ "جب طالوت لشکر لے کر چلا، تو اس نے کہا، ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی

---

[1] وہ میرا ساتھی نہیں، وہ میرا ساتھی نہیں

پیے گا۔ وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے۔ ہاں ایک آدھا چلو کوئی پی لے تو پی لے۔ مگر ایک گروہ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیر اب ہوئے۔ پھر جب طالوت اور اس کے اہل ایمان ساتھ دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے"[1]۔ سو اس دریا کنارے ہر ایک کی آزمائش ہوتی ہے۔ جس نے اس کا پانی پی لیا اس میں بدی کے مقابلے کی طاقت نہ رہی۔ فلیس مِنی، فلیس منیِ، پس جیت اس کی اور نجات اس کی جو بیچ دریا سے پیاسا لوٹ آئے۔

ملاحظہ فرمایا اپ نے، بس اسی کارن مُلّا بھکشو کہلاتے ہیں۔ زبان و بیان بالوں سے بھی زیادہ کھچڑی اور عقائد ان سے زیادہ رنگ برنگے۔ صوفیوں کی سی باتیں کرتے کرتے یکایک سادھو کا برن لے لیتے ہیں۔ الفاظ کے سر سے دفعتاً عمامہ اُتر جاتا ہے اور ہر شبد، ہر انچھر کے جٹائیں نکل آتی ہیں۔ آبِ زم زم سے وضو کر کے بھبھوت رما لیتے ہیں۔ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ۔ کبھی آپ کو ایسا محسوس ہو گا کہ بھٹک کے کہاں سے کہاں جا نکلے:

---

[1] البقرۃ ۲۴۳

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترکِ اسلام کیا

اور کبھی ایسا محسوس کراویں گے گویا گوتم بدھ نے برکش تلے اپنی سمادھی چھوڑ کر احرام باندھ لیا ہے۔ مگر کبھی ایک نقطے اور نکتے پر جمتے نہیں۔ ٹڈے کی طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر بُھدکتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک دن چھیڑا کہ مولانا، بعض فقیہوں کے نزدیک مرتد کی سزا قتل ہے۔ اشارہ سمجھ گئے۔ مسکرا دیئے۔ کہنے لگے، سوچنے کی بات ہے۔ جس نے پہلے ہی خودکشی کرلی ہو اسے سُولی پہ لٹکانے سے فائدہ؟

تمام چہرے ہیں میرے چہرے، تمام آنکھیں ہیں میری آنکھیں

اپنے تمام خلوص اور تپاک کے باوصف وہ مجھے خاصے بے تعلق نظر آئے۔ ایک طرح کو درویشانہ استغناء آگیا ہے۔ رشتوں میں بھی۔ ایک دن کہنے لگے کہ کوئی شے ہو یا شخص، اس سے ناتا جوڑنا ہی دکھ کا اصل سبب ہے۔ پھر انسان کی سانس چھوٹی اور اُڑان اوچھی ہو جاتی ہے۔ انسان جی کڑا کر کے ہر چیز سے ناتا توڑ لے تو پھر دُکھ سُکھ کے بے انت چکر سے باہر نکل جاتا ہے۔ پھر وہ شاد رہتا ہے، نہ ناشاد۔ مسرور نہ مغموم:

عیش و غم در دل نمی استد، خوشا آزادگی

بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما[1]

مگر یہ بے نیازی "بیدلی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق" والی منزل سے ماورا نظر آتی ہے۔ میری واپسی میں دو دن رہ گئے تو میں نے چھیڑا۔ "مولانا، یہاں بہت رہ لیے۔ جُورو نہ جاتا، کانپور سے ناتا۔ اب میرے ساتھ پاکستان چلو۔ سب یار دوست، سارے سنگی ساتھی وہیں ہیں"۔

"پُرکھوں کے ہاڑ ہڑواڑ[2] تو یہاں ہیں"۔

"تم کون سے ان پر فاتحہ پڑھتے ہو یا جمعرات کی جمعرات پھولوں کی چادر چڑھاتے ہو جو چھوٹنے کا ملال ہو"۔

اتنے میں ایک چتکبری بِلّی اپنا بچہ منھ میں دبائے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نعمت خانے میں بند کبوتر سہم کر کونے میں دبک گیا۔ بلی کے پیچھے ایک پڑوسی کی بچی مینا کا پنجرہ ہاتھ میں لٹکائے اور اپنی گُڑیا دوسری بغل میں دبائے آئی اور کہنے لگی کہ صبح سے ان دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔ بولتے بھی نہیں۔ دوا دے دیجیے۔

---

[1] غالب کہتا ہے، عیش اور غم دونوں ہمارے دل میں نہیں ٹھہر پاتے۔ ہماری آزاد منشی کے کیا کہنے، ہماری چھلنی کے لیے شراب اور خون دونوں برابر ہیں۔ یعنی دونوں چھن کے نکل جاتے ہیں۔

[2] ہڈیاں اور خاندانی قبرستان

انہوں نے بیمار گڑیا کی نبض دیکھی۔ اور مینا سے اسی کے لہجے میں بولنے لگے تو ذرا دیر بعد مینا ان کے لہجے میں بولنے لگی۔ انہوں نے ایک ڈبے میں سے لیمن ڈراپ نکال کر بچی کو دی۔ اس نے اسے چوسا تو گڑیا کو آرام آ گیا۔ وہ مسکرا دیے۔ پھر بحث کا سرا وہیں سے اٹھایا جہاں سے بلی، بچی اور مینا کی اچانک آمد سے ٹوٹ گیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے "یہاں میں سب کے دکھ درد میں ساجھی ہوں۔ وہاں میری ضرورت کس کو ہو گی؟" وہاں مجھ سا غریب اور کون ہو گا۔ یہاں مجھ سے بھی غریب ہیں:

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ

داورا، نمی زیبد بال و پر بمن تنہا[1]

"بندہ خدا، ایک دفعہ چل کے تو دیکھو۔ پاکستان کا تمہارے ذہن میں کچھ عجیب سا نقشہ ہے۔ وہاں بھی دُکھی بستے ہیں۔ ہماری خاطر ہی چلو۔ ایک ہفتے کے لیے ہی سہی"۔

"کون پوچھے گا مجھ کو میلے میں؟"

---

[1] یعنی میرے سب رفیق اور سب ہمدم پُر شکستہ اور دل تنگ ہیں۔ اے خدائے عادل، مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ تنہا میرے ہی بال و پر ہوں

”تو پھر یوں سمجھو کہ جہاں سبھی تاج پہنے بیٹھے ہوں، وہاں ننگے سر، خاک بسر آدمی سب سے نمایاں ہوتا ہے“۔

خدا جانے سچ مچ قائل ہوئے یا محض زچ ہو گئے۔ کہنے لگے ”برادر میں تو تمہیں دانہ ڈال رہا تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ ہماری چھتری پہ آن بیٹھو۔ خیر چلا تو چلوں۔ مگر خدا جانے ان کبوتروں کا کیا ہو گا“۔

”اس کا انحصار خدا پر نہیں بلی کی نیّت پر ہے مگر سنو، تم خدا کے کب سے قائل ہو گئے؟“

”میں نے تو محاورۃً کہا تھا۔ سامنے جو جامن کا پیڑ دیکھ رہے ہو، یہ میرے دادا نے لگایا تھا۔ جس سمے پو پھٹتی ہے اور اس کھڑکی سے صبح کا ستارہ نظر آنا بند ہو جاتا ہے یا جب دونوں وقت ملتے ہیں اور شام کا جُھٹ پٹا سا ہونے لگتا ہے تو اس پر بے شمار چڑیاں جی جان سے ایسے چہچہاتی ہیں کہ دل کو کچھ ہونے سا لگتا ہے۔ اس جامن کی دیکھ بھال کون کرئے گا؟“

”اوّل تو اس بوڑھے جامن کو تمہاری اور بدھ ازم کی ضرورت نہیں، گوبر کے کھاد کی ضرورت ہے۔ دوم، تمہیں اِلتباس ہوا ہے۔ مہاتما بدھ کو نروان جامن کے نیچے نہیں، پیپل تلے حاصل ہوا تھا۔ بفرضِ محال تم پشُو پکھشی اور پیڑ کی سیوا

کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو کراچی کے لاغر گدھوں اور لاہور کی اپر مال کے جامنوں کی رکھوالی کر کے شوق پورا کر لینا۔ جامنوں کے پکنے سے پہلے ہی نسینیاں (سیڑھیاں) لگ جاتی ہیں۔ زندہ دالانِ لاہور پرائے درختوں کے پھل کانپور والوں کی طرح دور سے پتھر مار مار کے نہیں توڑتے۔ رسان سے درخت پر چڑھ کے یا سیڑھی لگا کے توڑ توڑ کے خود کھاتے ہیں اور رکھوالوں کو کھلاتے ہیں۔

"میں آؤں گا۔ لاہور ایک دن ضرور آؤں گا۔ مگر کبھی اور"۔

"ابھی میرے ساتھ چلنے میں کیا قباحت ہے؟"

"ان بچوں کا کیا ہو گا؟"

ہونا کیا ہے۔ بڑے ہو جائیں گے۔ تمھیں کوئی miss نہیں کرئے گا۔ آخر کو تم مر گئے، تب کیا ہو گا؟"

"تو کیا ہوا۔ یہ بچّے۔ اور بچوں کے بچّے تو زندہ رہیں گے۔ سینوں میں اُجالا بھر رہا ہوں۔ مر گیا تو ان کے منھ سے بولوں گا۔ ان کی اوتار آنکھوں سے دیکھوں گا"۔

(بشارت کی زبانی یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے)

پسِ نوشت

لو وہ بھی ہارٹ اٹیک میں گئے!

۳ دسمبر ۱۹۸۵ء کو طلوع آفتاب سے ذرا پہلے جب ان ہی کے الفاظ میں، جامن پر چڑیاں اس طرح چہچہار ہی تھیں، جانو جی جان سے گزر جائیں گی، مُلّا عبد المنان عاصی کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ محلے کی مسجد کے پیشِ امام نے کہلا بھیجا کہ ملحد کی صلوٰۃ الجنازہ جائز نہیں۔ جس کے وجود ہی کے آنجہانی قائل نہ تھے۔ اس سے رحمت و بخشائش کی دعا کیا معنی؟ بڑی دیر تک جنازہ جامن کے نیچے پڑا رہا۔ بالآخر ان کے ایک عزیز شاگرد نے امامت کے فرائض انجام دیے۔ سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ تجہیز و تکفین سے پہلے ان کے بلیک بکس کا تالا معززینِ محلہ کی موجودگی میں کھولا گیا۔ اس میں اسکول کی کاپی کے ایک صفحے پر پنسل سے لکھی ہوئی تحریر ملی جس پر نہ تاریخ تھی نہ دستخط۔ لکھا تھا کہ پسِ مردن میری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ (جس کی مکمل فہرست اور احوال ہم پچھلے صفحات میں دے چکے ہیں) نیلام کر کے کبوتروں کے لیے ٹرسٹ بنا دیا جائے۔ یہ احتیاط رکھا جائے کہ کوئی گوشت خور ٹرسٹی (متولی) مقرر نہ ہو۔ یہ

بھی لکھا تھا کہ مجھے کانپور میں دفن نہ کیا جائے۔لاہور میں ماں کے قدموں میں لٹا دیا جائے۔

دھیرج گنج کا پہلا یادگار مُشاعرہ

ا

فیل ہونے کے فوائد

بشارت کہتے ہیں کہ بی اے کا امتحان دینے کے بعد یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر فیل ہو گئے تو کیا ہو گا۔ وظیفہ پڑھا تو بحمد اللہ یہ فکر تو بالکل رفع ہو گئی، لیکن اس سے بھی بڑی ایک اور تشویش لاحق ہو گئی۔ یعنی اگر خدا نخواستہ پاس ہو گئے تو؟ نوکری ملنی محال۔ یار دوست سب تتر بتر ہو جائیں گے۔ والد ہاتھ کھینچ لیں گے۔ بے کاری، بے روزگاری، بے زری، بے شغلی۔۔۔ زندگی عذاب جائے گی۔ انگریزی اخبار فقط wanted کے اشتہارات کی خاطر خریدنا پڑے گا۔ پھر ہر کڈھب آسامی کے سانچے میں اپنی کوالیفیکیشنز کو اس طرح ڈھال کر درخواست دینی ہو گی گویا ہم اس عالمِ رنگ و بُو میں صرف اس ملازمت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنا ہو گا۔ روزانہ دفتر بہ دفتر ذلت اٹھانا

پڑ یگی۔ تاوقتے کہ ایک ہی دفتر میں اس کا مستقل بندوبست نہ ہو جائے۔ ہر چند کہ فیل ہونے کا قوئی امکان تھا، لیکن پاس ہونے کا خدشہ بھی لگا ہوا تھا۔

دیکھیں کیا گزرے ہے خدشے پر خطر ہونے تک

بعض لڑکے اس ذلّت کو مزید دو سال کے لیے ملتوی کرنے کی غرض سے ایم اے اور ایل ایل بی میں داخلہ لے لیتے تھے۔ بشارت کی جان پہچان کے جن مسلمان لڑکوں نے تین سال پہلے یعنی ۱۹۳۳ء میں بی اے کیا تھا، وہ سب جوتیاں چٹخاتے بیکار پھر رہے تھے۔ سوائے ایک خوش نصیب کے، جو مسلمانوں میں اوّل آیا تھا اور اب مسلم مڈل اسکول میں ڈرل ماسٹر لگ گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی بھیانک عالم گیر کساد بازاری اور بے روزگاری کی تباہ کاریاں ابھی ختم نہیں ہوئیں تھیں۔ مانا کہ ایک روپے کے گیہوں پندرہ سیر اور اصلی گھی ایک سیر ملتا تھا، لیکن ایک روپیہ تھا کس کے پاس؟

کبھی کبھی وہ ڈرڈر کے مگر سچ مچ تمنّا کرتے کہ فیل ہی ہو جائیں تو بہتر ہے۔ کم از کم ایک سال اور بے فکری سے کٹ جائے گا۔ فیل ہونے پر تو، بقول مرزا، صرف ایک دن آدمی کی بے عزتی خراب ہوتی ہے۔ اس کے بعد چین ہی چین۔ بس یہی ہوگا نا کہ جیسے عید پر لوگ ملنے آتے ہیں، اسی طرح اس دن خاندان کا ہر بزرگ

باری باری برسوں کا جمع شدہ غبار نکالنے آئے گا اور فیل ہونے اور خاندان کی ناک کٹوانے کی ایک مختلف وجہ بتائے گا۔ اس زمانے میں نوجوانوں کا کوئی کام، کوئی فعل ایسا نہیں ہوتا تھا جس کی جھپیٹ میں آکر خاندان کی ناک نہ کٹ جائے۔ آج کل والی صورت نہیں تھی کہ اوّل تو خاندانوں کے منھ پر ناک نظر نہیں آتی اور ہوتی بھی ہے تو tube ۔ less tyre کی مانند جس میں آئے دن ہر سائز کے پنکچر ہوتے رہتے ہیں اور اندر ہی اندر آپی آپ جڑتے رہتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات خاندان کے دور ونزدیک کے بزرگ چھٹی ساتویں جماعت تک فیل ہونے والے برخورداروں کی، حسبِ قرابت و طاقت، دستِ خاص سے پٹائی بھی کرتے تھے۔ لیکن لڑکا جب ہاتھ پیر نکالنے لگے اور اتنا سیانا ہو جائے کہ وہ آوازوں سے رونے لگے، یعنی تیرہ چودہ سال کا ہو جائے تو پھر اسے تھپڑ نہیں مارتے تھے، اس لیے کہ اپنے ہی ہاتھ میں چوٹ لگنے اور پہنچا اترنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ فقط لعن طعن اور ڈانٹ پھٹکار سے کام نکالتے تھے۔ ہر بزرگ اس کی certified (مستند، مصدقہ) نالائقی کا اپنے فرضی تعلیمی ریکارڈ سے موازنہ کرتا اور نئی پود میں تاحدِ (موٹی) نظر، انحطاط، اور گراوٹ کے آثار دیکھ کر اس خوشگوار نتیجے پر پہنچتا کہ ابھی دنیا کو اس جیسے بزرگ کی ضرورت ہے۔ بھلا وہ ایسی نالائق نسل کو دنیا کا چارج دے کر اتنی جلدی کیسے رحلت کر سکتا

ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہر بزرگ بڑے پیغمبرانہ انداز میں بشارت دیتا تھا کہ تم بڑے ہو کر بڑے آدمی نہیں بنوگے! صاحب یہ تو اندھے کو بھی۔۔۔۔۔۔۔۔ حد تو یہ کہ خود ہمیں بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نظر آرہا تھا۔ یہ پیشین گوئی کرنے کے لیے سفید داڑھی یا ستارہ شناس ہونے کی شرط نہیں تھی۔ بہر طور، یہ ساری farce ایک ہی دن ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن پاس ہونے کے بعد تو ایک عمر کا رونا تھا۔ خواری ہی خواری۔ ذلّت ہی ذلّت۔

بشارت اور شاہ جہاں کی تمنّا

بالآخر دوسرا خدشہ پورا ہوا۔ وہ پاس ہو گئے، جس پر انہیں مسرت، پروفیسروں کو حیرت اور بزرگوں کو شاک ہوا۔ اس دن کئی مرتبہ اپنا نام اور اس کے آگے بی اے لکھ لکھ کر دیر تک مختلف زاویوں سے دیکھا کیے۔ جیسے آرٹسٹ اپنی پینٹنگ کو ہٹ ہٹ کر دیکھتا ہے۔ ایک مرتبہ تو B. A کے بعد بریکٹ میں (First Attempt) بھی لکھا۔ مگر اس میں شیخی اور تکبر کا پہلو نظر آیا۔ تھوڑی دیر بعد گتّے پر انگریزی میں نیلی روشنائی سے نام اور سُرخ سے B.A لکھ کر دروازے پر لگا آئے۔ پندرہ بیس دن بعد اُردُو کے ایک مقامی اخبا میں اشتہار دیکھا کہ دھیرج گنج کے مسلم اسکول میں جہاں اسی سال نویں کلاس شروع ہونے والی تھی، اُردُو

ٹیچر کی اسامی خالی ہے۔ اشتہار میں یہ لالچ بھی تھا کہ ملازمت مستقل، ماحول پاکیزہ و پر سکون اور مشاہرہ معقول ہے۔ مشاہرے کی معقولیت کی وضاحت بریکٹ میں کر دی تھی کہ الاونس سمیت پچیس روپے ماہوار ہو گا۔ سوا روپیہ سالانہ ترقی اس پر مستزاد۔۔۔۔ ملک الشعرا خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کو بہادر شاہ ظفر نے اپنا استاد بنایا تو بہ نظرِ پرورش چار روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ "تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا۔۔۔۔ لیکن قسمت نے آواز دی کہ للعہ (چار روپے) نہ سمجھنا۔ یہ ایوانِ ملک الشعرائی کی چار ستون قائم ہوتے ہیں۔ موقعے کو ہاتھ سے جانے نہ دینا"۔ اور ان کا قصرِ آرزو تو پورے پچّیس ستونوں پر کھڑا ہونے والا تھا!

لیکن وہ "پر سکون ماحول" پر مر مٹے۔ دھیرج گنج کانپور اور لکھنؤ کے درمیان ایک بستی تھی جو گاؤں سے بڑی اور قصبے سے چھوٹی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ ہر شخص ایک دوسرے کے آباواجداد کے کرتوتوں تک سے واقف تھا۔ اور نہ صرف یہ جانتا تھا کہ ہر گھر میں جو ہانڈی چولھے پر چڑھی ہے اس میں کیا پک رہا ہے، بلکہ کس کس کے ہاں تیل میں پک رہا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے زندگی میں اس بُری طرح دَخیل تھے کہ آپ کوئی کام چھپ کر نہیں کر سکتے تھے۔ عیب کرنے

کے لیے بھی ساری بستی کا ہنر اور تعاون درکار تھا۔ عرصے سے ان کی تمنّا تھی کہ قسمت نے ساتھ دیا تو ٹیچر بنیں گے۔ لوگوں کی نظر میں استاد کی بڑی عزت تھی۔ کانپور میں ان کے والد کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ مگر آبائی کاروبار کے مقابلے میں انھیں دنیا کا ہر پیشہ دلچسپ اور کم ذلیل لگتا تھا۔ بی اے کا نتیجہ نکلتے ہی والد نے ان کی تالیفِ قلب کے لیے اپنی دکان کا نام بدل کر ''ایجوکیشنل ٹمبر ڈپو'' رکھ دیا۔ پر طبیعت ادھر نہیں آئی۔ مارے باندھے کچھ دن دکان پر بیٹھے، مگر بڑی بے دلی کے ساتھ۔ کہتے تھے بھاؤ تاؤ کرنے میں صبح سے شام تک جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ جس دن سچ بولتا ہوں اس دن کوئی بوہنی بکری نہیں ہوتی۔ دکان میں گردا بہت اڑتا ہے اور گاہک چیخ چیخ کر گفتگو کرتے ہیں''۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ انجن ڈرائیور اور ہوش سنبھالنے کے بعد اسکول ٹیچر بننا چاہتے تھے۔ کلاس روم بھی کسی سلطنت سے کم نہیں۔ استاد ہونا بھی ایک طرح کی فرماں روائی ہے۔ جبھی تو اورنگ زیب نے شاہ جہان کو ایّامِ اسیری میں بچّوں کو پڑھانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بشارت خود کو شاہ جہاں سے زیادہ خوش نصیب سمجھتے تھے۔ خصوصاً اس لیے کہ انہیں تو معاوضے میں پورے پچیس روپے بھی ملنے والے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں معلّمی کا پیشہ بہت باوقار اور باعزّت سمجھا جاتا تھا۔ زندگی اور کیریئر میں دو چیزوں کی بڑی اہمیت تھی۔ اوّل عزّت۔ دوم ذہنی سکون اور بے فکری۔ دنیا کے کسی اور ملک میں "عزّت" پر کبھی اتنا زور نہیں رہا جتنا کہ برِّصغیر میں۔ انگریزی میں تو اس مفہوم کا حامل کوئی ڈھنگ کا مترادف بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انگریزی کے بعض صحافیوں اور نامور کہانی لکھنے والوں نے اس لفظ کو انگریزی میں جوں کا توں استعمال کیا ہے۔ آج بھی جہاں دیدہ بزرگ جب کسی کو دعا دیتے ہیں تو خواہ صحت، عافیت، کثرتِ اولاد، آسودہ حالی اور فزونیِ ایمان کا ذکر کریں یا نہ کریں، یہ دعا ضرور کرتے ہیں کہ اللہ تمھیں اور ہمیں عزّت وآبرو کے ساتھ (بالترتیب) رکھے۔ اٹھائے۔ ملازمت کے ضمن میں بھی ہم حسنِ کارکردگی، ترقیِ درجات اور بلندی مناصب کی دعا نہیں مانگتے۔ اپنے لیے ہماری واحد دعا یہ ہوتی ہے کہ عزّت کے ساتھ سبکدوش ہوں! یہ دعا آپ کو دنیا کے کسی اور زبان یا ملک میں نہیں ملے گی۔ سبب یہ کہ ملازمت پیشہ آدمی بے توقیری کو Professisional hazard سمجھ کر قبول اور انگیز کرتا ہے۔ فیوڈل عہد کی روایت، خو بو اور خواری جاتے جاتے جائے گی۔ ان دنوں ملازم خود کو نمک خوار کہتے اور سمجھتے تھے۔ (روم میں تو عہدِ قدیم میں سپاہیوں کو

تنخواہ کے بجائے نمک دیا جاتا تھا اور غلاموں کی قیمت نمک کی شکل میں ادا کی جاتی تھی۔) تنخواہ تقسیم کرنے والے محکمے کو بخشی خانہ کہتے تھے۔

نیک چلنی کا سائن بورڈ

اشتہار میں مولوی سیّد محمد مظفّر نے، کہ یہی اسکول کے بانی، منتظم، مہتمم، سرپرست اور خازن و خائن کا نام تھا، مطّلع کیا تھا کہ امیدواروں کو تحریری درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ اپنی ڈگری اور نیک چلنی کے دستاویزی ثبوت کے ساتھ صبح آٹھ بجے اصالتاً پیش ہوں۔ بشارت کی سمجھ میں نہ آیا کہ نیک چلنی کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ بد چلنی کا البتہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً چالان، مچلکہ، وارنٹِ گرفتاری، مصدّقہ نقل حکم سزایابی یا "بستہ الف" جس میں نامی بدمعاشوں کا اندراج ہوتا ہے۔ پانچ منٹ میں آدمی بد چلنی تو کر سکتا ہے، نیک چلنی کا ثبوت فراہم نہیں کر سکتا۔ مگر ان کا تردّد بے جا تھا۔ اس لیے کہ جو حلیہ انھوں نے بنا رکھا تھا، یعنی منڈا ہوا سر، آنکھوں میں سرمے کی تحریر، اٹنگا پاجامہ، سر پر مخمل کی سیاہ رام پوری ٹوپی، گھر، مسجد اور محلّے میں پیر پر کھڑاؤں۔۔۔۔۔ اس حلیے کے ساتھ وہ چاہتے بھی تو نیک چلنی کے سوا اور کچھ ممکن نہ تھا۔ نیک چلنی انکی

مجبوری تھی، اختیاری وصف نہیں۔ اور ان کا حلیہ اس کا ثبوت نہیں، سائن بورڈ تھا۔

یہ وہی حلیہ تھا جو اس علاقے میں مڈل کلاس خاندانی شریف گھرانوں کے نوجوانون کا ہوا کرتا تھا۔ خاندانی شریف سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں شریف بننے، رہنے اور کہلانے کے لیے ذاتی کوشش قطعی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ مہرِ شرافت، جائداد اور مذکورہ بالا حلیہ نسلاً بعد نسل اس طرح ورثے میں ملتے تھے جس طرح ہماشما کو Genes اور موروثی امراض ملتے ہیں۔ عقیدے، مبلغِ علم اور حلیے کے لحاظ سے پڑپوتا اگر ہو بہو اپنا پڑدادا معلوم ہو تو یہ خاندانی نجابت، شرافت اور اصالت کی دلیل تصور کی جاتی تھی۔ انٹرویو کے لیے بشارت نے اسی حلیے پر صیقل کر کے نوک پلک سنواری۔ اچکن دھلوائی۔ بدرنگ ہو گئی تھی لہٰذا دھوبی سے کہا ذرا کلف زیادہ لگانا۔ سر پر ابھی جمعے کو "زیرو نمبر" کی مہین مشین پھروائی تھی۔ اب استرا اور اس کے بعد آم کی گٹھلی پھروا کر آملہ کے تیل سے مالش کروائی۔ دیر تک مرچیں لگتی رہیں۔ ٹوپی پہن کر آئینہ دیکھ رہے تھے کہ اندر منڈے ہوئے سر سے پسینہ اس طرح رسنے لگا جیسے پیشانی پر "وکس" یا "بام" لگانے کے بعد جھرتا ہے۔ ٹوپی اتارنے کے بعد پنکھا جھلا تو ایسا لگا جیسے کسی نے ہوا میں پیپرمنٹ ملا دیا ہو۔ یہاں یہ اعتراف غالباً بے محل نہ ہو گا کہ ہم

نے اپنا ایشیائی خول اتار کے یورپ کے رنگ ڈھنگ پہلے پہل "ننگی آنکھ" سے دیکھے تو ہمارے سارے وجود کو بالکل ایسا ہی محسوس ہوا۔ پھر بشارت نے جوتوں پر تھوک سے پالش کر کے اپنی پرسنلٹی کو فنشنگ ٹچ دیا۔ سلیکشن کمیٹی کا چیرمین تحصیل دار تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ تقرریوں کے معاملے میں اسی کی چلتی ہے۔ پھکڑ، فقرے باز، ادب دوست، ادیب نواز، ملنسار، نڈر اور رشوت خور ہے۔ گھوڑے پر کچہری آتا ہے۔ نادم تخلص کرتا ہے۔ آدمی بلا کا ذہین اور طبیعت دار ہے۔ اسے اپنا طرف دار بنانے کے لیے بادامی کاغذ کا ایک دستہ اور چھ سات نیزے (نرسل) کے قلم خریدے اور راتوں رات اپنے کلام کا انتخاب یعنی ستائیس غزلوں کا گلدستہ مرتب کیا۔ مخمور تخلص کرتے تھے جو ان کے استاد جوہر الہ آبادی کا عطا کردہ تھا۔ اسی کی رعایت سے کلیاتِ ناتمام و بادہ خام کا نام "خمخانہ مخمور کانپوری ثم لکھنوی" رکھا۔ (لکھنو کو ان سے صرف اتنی نسبت تھی کہ پانچ سال قبل اپنا پِتّا نکلانے کے سلسلے میں دو ہفتے وہاں کے اسپتال میں تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں قیام فرمایا تھا) پھر اس میں ایک ضخیم ضمیمہ بھی شامل کر دیا۔

اس ضمیمے کا قصّہ یہ ہے کہ اپنی غزلوں اور اشعار کا انتخاب انھوں نے دل پر پتھر بلکہ پہاڑ رکھ کر کیا تھا۔ شعر کتنا ہی لَغو اور کمزور کیوں نہ ہو اسے بقلم خود کاٹنا اور

حذف کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنی اولاد کو بد صورت کہنا یا زنبور سے اپنا ہلتا ہوا دانت خود اکھاڑنا۔ غالب تک سے یہ مجاہدہ نہ ہو سکا۔ کاٹ چھانٹ مولانا فضل حق خیر آبادی کے سپرد کر کے خود ایسے بن کے بیٹھ گئے جیسے بعض لوگ انجکشن لگواتے وقت دوسری طرف منھ پھیر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ بشارت نے اشعار قلم زد کرنے کو تو کر دیے، مگر دل نہیں مانا۔ چنانچہ آخر میں ایک ضمیمہ اپنے تمام منسوخ کلام کا شامل کر دیا۔ یہ کلام تمام تر اس دور سے تعلق رکھتا تھا جب وہ بے استادے تھے اور فریفتہ تخلص کرتے تھے۔ اس تخلص کی صفت یہ تھی کہ جس مصرعے میں بھی ڈالتے، وہ بحر سے خارج ہو جاتا۔ چنانچہ بیشتر غزلیں بغیر مقطعے کے تھیں۔ چند مقطعوں میں ضرورتِ شعری کے تحت فریفتہ کا مترادف شیدا اور دلدادہ استعمال کیا اور صراحتاً اوپر ڈوئی بھی بنا دی، مگر اس سے شعر میں کوئی اور سقم پیدا ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ غیب سے جو مضامین خیال میں آتے تھے ان کے الہامی وفور اور طوفانی خروش کو وزن و عروض کے کوزے میں بند کرنا انسان کے بس کا کام نہ تھا۔

خدا بنے تھے یگانہ، خدا بنا نہ گیا

کلیات کے سرورق کی محراب پر ”اِنَ من الشّعر لِحکمتہ وَ اِنَ مِنَ البیَان لسّحراً“ لکھا۔ اور اس کے نیچے ”خمخانہ مخمور کانپوری ثم لکھنوی۔ ترتیبِ جدید“۔ نیچے کی دو سطروں میں ”باہتمام کیسری داس سپرنٹنڈنٹ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا“ لکھا۔ پھر ”ہوا“ کا الف مٹا کر اس کی جگہ بہت باریک خط میں ”گا“ اس طرح لکھا کہ پہلی نظر میں ”ا“ ہی دکھائی دیتا تھا۔ آخری سطر میں ”پہلا ایڈیشن۔ دسمبر ۱۹۳۷ء قیمت للعہ“۔ کتاب کے نام کے نیچے اس سے دگنے جلی حروف میں اپنا نام لکھا:

”بشارت علی فاروقی کانپوری ثم لکھنوی۔ بی اے (آگرہ یونی ورسٹی)“

جانشین افسر الشعرا، افصح الفصحا حضرت جوہر چغتائی الہ آبادی اعلیٰ اللہ مقامہ۔

”ہمارے جن پڑھنے والوں کو اس میں غلو یا زیبِ داستان کا شائبہ نظر آئے ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ۱۹۴۷ء تک کرشن چندر بھی اپنے نام کے ساتھ ایم اے کا دُم چھلہ لگاتے تھے۔ اور اس کے بغیر ان کا نام بالکل ننگ دھڑنگ بلکہ

کسی اور کا معلوم ہوتا تھا۔ اور ایک انھیں پر موقوف نہیں، ان سے بہت پہلے اکبر الہ آبادی کا نام ان کے مجموعوں اور رسالوں میں اس طرح چھپتا تھا:

"از لسان العصر خان بہادر اکبر حسین صاحب۔ پینشنر ششن جج، الہ آباد"

اور بشارت کے پسندیدہ شاعر یگانہ چنگیزی نے جو خود کو "امام الغزل، ابو المعانی، یگانہ علیہ السلام" کہتے اور لکھتے تھے، اپنے دوسرے مجموعہ کلام کو اپنے ہیرو اور مرشدِ روحانی، چنگیز خاں کے نام انتہائی عقیدت سے ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا:

"تحفہ ادب بجناب ہیبت مآب، پیغمبرِ قہر و عذاب، شہنشاہ بنی آدم سر تاج سکندر و جم، حضرت چنگیز خانِ اعظم، قہر اللہ، منجانب میر زا یگانہ چنگیزی، لکھنوی"۔

ایک سنگین غلطی البتہ نادانستہ در آئی۔ بشارت نے ساری عبارت اور القاب مع قیمت للعہ، نول کشور پریس کی ایک ٹائٹل سے من و عن نقل کیے تھے۔ رواروی میں اپنے استاد جوہر چغتائی الہ آبادی کے نام کے آگے "اعلیٰ اللہ مقامہ"، نقل کرتے وقت یہ خیال نہ رہا کہ ابھی تو وہ حیات ہی نہیں، جو اں بھی ہیں اور آخرت میں ان کے مقامات بلند ہونے میں ابھی خاصی دیر ہے۔

یگانہ نے اپنے مطبوعہ دیوان میں اپنی پسندیدگی کی مناسبت سے اشعار پر ص کے نشان بالالتزام چھپوائے تھے۔ جو اشعار زیادہ پسند آئے ان پر دو ص ص اور جن پر خود لوٹ ہو ہو جاتے تھے ان پر تین ص ص ص لگوائے، تاکہ کل کلاں کو لاپرواہ پڑھنے والا یہ نہ کہے کہ مجھے خوب، خوب تر اور خوب ترین کے فرق سے کب کسی نے آگاہی بخشی؟ بشارت نے استاد کا تتبع تو کیا، مگر اتنی سی ترمیم کے ساتھ کہ صاد کے دقیانوسی نشان کے بجائے سرخ ٹک مارک دائیں اور بائیں دونوں حاشیوں میں لگا دیے۔

دھیرج گنج کی ملازمت پر انھیں صرف ایک اعتراض تھا۔ مخمور کے آگے دھیج گنجوی لکھنا تخلص اور تغزّل کا دھرا خون کرنے سے کم نہ تھا۔ لیکن جب ان مظلوم شاعروں پر نظر کی جو اس سے بھی زیادہ گنوارو اور کڈھب نام کے قصبوں، مثلاً پھپھوند، بہرائچ، گونڈہ، بارہ بنکی، چڑیا کوٹ، جالندھر، لوہارو، لدھیانہ، مچھلی شہری کے ساتھ نباہ کیے جارہے تھے تو بقول انکے "صبر تو نہیں آیا، سمجھ آگئی" پھر ایک دن لیٹے لیٹے دفعتاً خیال آیا کہ عظیم شاعر نظامی بھی تو اپنے تخلص کے بعد گنجوی لکھتا تھا۔ چلیے "گنج" کی خلش دور ہوئی۔ اللہ نے چاہا تو اسی طرح دھیرج کا کانٹا بھی دفعتاً نکل جائے گا۔

مولوی مجن سے تاناشاہ تک

حفظِ ماتقرر کے طور پر تحصیل دار تک سفارش پہنچانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ البتہ مولوی مظفر (جو حقارت، اختصار اور پیار میں مولی مجّن کہلاتے تھے) کے بارے میں جس سے پوچھا اس نے ایک نیا عیب نکالا۔ ایک صاحب نے کہا: قوم کا درد رکھتا ہے، حکام رس ہے، پر کم ظرف۔ بچ کے رہنا۔ دوسرے صاحب بولے، مولی مجّن ایک یتیم خانہ، شمع الاسلام بھی چلاتا ہے۔ یتیموں سے اپنے پیر دبواتا اور اسکول کی جھاڑو دلواتا ہے۔ اور ماسٹروں کو یتیموں کی ٹولی کے ساتھ چندہ اکھٹا کرنے کانپور اور لکھنؤ بھیجتا ہے۔ وہ بھی بِلا ٹکٹ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دھن کا پکّا ہے۔ مسلمانانِ دھیرج گنج کی بڑی خدمت کی ہے۔ دھیرج گنج کے جتنے بھی مسلمان آج پڑھے لکھے اور بر سرِ روزگار نظر آتے ہیں وہ سب اسی اسکول کے زینے سے اوپر چڑھے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا کہ لوگوں کو مولوی مظفر سے بغضِ للّہی ہو گیا ہے۔ بشارت کو ان سے ایک طرح کی ہمدردی ہو گئی۔ یوں بھی ماسٹر فاخر حسین نے ایک مرتبہ بڑے کام کی نصیحت کی تھی کہ کبھی اپنے کسی بزرگ یا باس یا اپنے سے کم بدمعاش کی اصلاح کرنے کی کوشش نہ

کرنا۔ انہیں غلط راہ پر دیکھو تو تین دانا بندروں کی طرح اندھے، بہرے اور گونگے بن جاؤ۔ ٹھاٹ کرو گے۔

ایک جلے تن بزرگ جو رسالہ "زمانہ" میں کاتب تھے، فرمانے لگے "وہ چھا کٹا یہ نہیں چر کٹا بھی ہے۔ پچیس روپے کی رسید لکھوا کر پندرہ رُپلّی ہاتھ میں ٹکا دے گا۔ پہلے تمہیں جانچے گا۔ پھر آنکے گا۔ اس کے بعد تمام عمر ہانکے گا۔ اس نے دستخط کرنے اس وقت سیکھے جب چندے کی جعلی رسیدیں کاٹنے کی ضرورت پڑی۔ ارے صاحب! سر سیّد تو اب جا کے بنا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے اپنے نکاح نامے پر انگوٹھا لگاتے دیکھا ہے۔ ٹھوٹھ جاہل ہے۔ مگر بلا کا کڑھا ہوا ہے۔ گِھسا ہوا بھی ہے اور گھٹا ہوا بھی۔ ایسا ویسا چپڑ قنات نہیں ہے۔ لُقّہ بھی ہے۔ لُچہ بھی اور ٹُچّہ بھی" بزرگوار موصوف نے ایک ہی سانس میں پاجی پن کے ایسے باریک شیڈز گنوا دیے کہ جب تک آدمی ہر گالی کے بعد لغت نہ دیکھے، یا ہماری طرح عرصہ دراز تک زبان دانوں کی صحبت کے صدمے نہ اٹھائے ہوئے ہو، وہ زبان اور نالائقی کی ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔

سید اعجاز حسین وفا کہنے لگے "مولی مجّن پانچوں وقت ٹکریں مارتا ہے۔ گھٹنوں، ماتھے اور ضمیر پر یہ بڑے بڑے گٹے پڑ گئے ہیں۔ تھانے دار اور تحصیل دار کو اپنے حسنِ

اخلاق، اسلامی جزبہ اخوت و مدارات اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔رشوت سے قابو میں کر رکھا ہے۔ دمے کا مریض ہے۔ پانچ منٹ میں دس دفعہ آستین سے ناک پونچھتا ہے"۔ دراصل انہیں آستین سے ناک پونچھنے پر اتنا اعتراض نہ تھا جتنا اس پر کہ آستین کو اَستین کہتا ہے۔ یخنی کو اَخنی اور حوصلہ کو حونصلہ۔ انھوں نے اپنے کانوں سے اسے مجاز شریف اور شبرات کہتے سنا تھا۔ جہلا، دہقانیوں اور بکریوں کی طرح ہر وقت ، میں، میں !، کرتا رہتا ہے۔ لکھنؤ کے شرفا انانیت سے بچنے کی غرض سے خود کو ہمیشہ "ہم" کہتے ہیں۔ اس پر ایک نحیف و لاغر بزرگ نے اضافہ فرمایا کہ ذات کا قصائی کنجڑا یا دِلّی والا معلوم ہوتا ہے۔ کس واسطے کہ تین دفعہ گلے ملتا ہے۔ اودھ میں اشراف صرف ایک مرتبہ گلے ملتے ہیں۔

یہ اودھ کے ساتھ سراسر زیادتی تھی۔ اس لیے کہ صرف ایک دفعہ گلے ملنے میں شرافت و نجابت کا غالبًا اتنا دخل نہ تھا جتنا نازک مزاجی کا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ اس زمانے کے چونچلے ہیں جب نازک مزاج بیگمات خشکے اور شبنم کو آلہ خودکشی کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ اور یہ دھمکی دیتی تھیں کہ خشکہ کھا کر اوس میں سو جاؤں گی۔ وہ تو خیر بیگمات تھیں، تاناشاہ ان سے بھی بازی لے گیا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ گرفتار ہو کر دربار میں پابجولاں پیش کیا گیا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اسے کسطرح مروایا جائے۔ درباریوں نے ایک

سے ایک تجویز پیش کی ہو گی۔ مثلاً ایک درباری نے کہا کہ ایسے عیّاش کو مست ہاتھی کے پیر سے باندھ کر شہر کا گشت لگوانا چاہیے۔ دوسرا کورنش بجا کے بولا: بجا، مگر مست ہاتھی کو شہر کا گشت کون مائی کا لال لگوائے گا۔ ہاتھی گشت لگانے کے لیے تھوڑا ہی مست ہوتا ہے۔ البتہ آپ تاناشاہ کی عیاشی کی سزا ہاتھی کو دینا چاہتے ہیں تو اور بات ہے۔ اس پر تیسرا درباری بولا کہ تاناشاہ جیسے عیاش کی اس سے زیادہ اذیت ناک سزا نہیں ہو سکتی کہ اسے مخنّث کر کے اسی کے حرم میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ایک اور درباری نے تجویز پیش کی کہ آنکھوں میں نیل کی سلائی پھروا کر اندھا کر دو۔ پھر قلعہ گوالیار میں دو سال تک روزانہ نہار منہ پوست کا پیالہ پلاؤ تاآنکہ اپنے کو دھیرے دھیرے مرتے ہوئے خود بھی دیکھے۔ اس پر کسی تاریخ داں نے اعتراض کیا کہ سلطان ذی شان کا تاناشاہ سے کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے۔ یہ سلوک تو صرف سگے بھائیوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ ایک شقی القلب نے کہا کہ قلعے کی فصیل سے نیچے پھینک دو۔ مگر یہ طریقہ اس بنا پر رد کر دیا گیا کہ اس کا دَم تو مارے ڈر کے رستے میں ہی نکل جائے گا۔ اگر مقصد اذیت دینا ہے تو وہ پورا نہیں ہو گا۔ بالآخر وزیر نے، جس کا باتدبیر ہونا ثابت ہو گیا، یہ مشکل حل کر دی۔ اس نے کہا کہ اگر ذہنی اذیت دے کر اور تڑپا کر مارنا ہی مقصود ہے تو اس کے پاس سے ایک گوالن گزار دو۔ جن پڑھنے والوں

نے بگڑے ہوئے رئیس اور گوالن نہیں دیکھی ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مکھّن اور کچے دودھ کی بُو، ریوڑ باس میں بسے ہوئے لہنگے اور پسینے کی کھار سے سفید پڑے ہوئے سیاہ شلوکے کے ایک ہی بھبکے سے امرا اور رؤسا کا دماغ پھٹ جاتا تھا۔ پھر انھیں ہرن کے نافے سے نکلے ہوئے مادّے کے لخلخے سنگھا کر ہوش میں لایا جاتا تھا۔

حلوائی کی دکان اور کتے کا ناشتہ

انٹرویو کی غرض سے دھیرج گنج جانے کے لیے بشارت صبح تین بجے ہی نکل کھڑے ہوئے۔ سات بجے مولوی مظفر کے گھر پہنچے تو وہ تخت پر بیٹھے جلیبیوں کا ناشتہ کر رہے تھے۔ بشارت نے اپنا نام پتہ بتایا تو کہنے لگے "آیئے آیئے! آپ تو کان ہی پور کے (کانپور ہی کے) رہنے والے ہیں۔ کانپور کو گویا لکھنؤ کا آنگن کہیے۔ لکھنؤ کے لوگ تو بڑے مدمّغ اور ناک والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ناشتے کے لیے جھوٹوں بھی نہیں ٹوکوں گا۔ اے ذوق تکلّف میں ہے تکلیف برابر (جی ہاں۔ انھون نے سراسر، کو، برابر، کر دیا تھا) ظاہر ہے ناشتہ تو آپ کر کے آئے ہوں گے۔ سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ انجمن کے دفتر میں ایک گھنٹہ بعد ہو گی۔ وہیں

ملاقات ہو گی۔ اور ہاں جس ناہنجار سے آپ نے سفارش کروائی وہ نہایت بخیل اور نامعقول آدمی ہے"۔

اس تمام گفتگو میں زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگے ہوں گے۔ مولوی مظفر نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ کھڑے کھڑے ہی بھگتا دیا۔ گھر سے منھ اندھیرے چلے تھے، مولوی مظفر کو گرم جلیبی کھاتے دیکھ کر ان کی بھوک بھڑک اٹھی۔ محمد حسین آزاد کے الفاظ میں بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کر دیا۔ گھوم پھر کر حلوائی کی دکان دریافت کی اور ڈیڑھ پاؤ جلیبیاں گھان سے اترتی ہوئی تلوائیں۔ دونے سے پہلی جلیبی اٹھائی ہی تھی کہ حلوائی کا کتّا ان کے پورے عرض کے غرارے نما لکھنؤی پاجامے کے پائنچے میں منھ ڈال کر بڑی تندہی سے لپڑ لپڑ ان کی پنڈلی چاٹنے لگا۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ، بے حس و حرکت چٹواتے رہے۔ اس لیے کہ انھوں نے کسی سے سن رکھا تھا کہ کتّا اگر پیچھا کرے یا آپ کے ہاتھ پیر چاٹنے لگے تو بھاگنا یا شور نہیں مچانا چاہیے، ورنہ وہ مشتعل ہو کر سچ مچ کاٹ کھائے گا۔ جیسے ہی انھوں نے اسے ایک جلیبی ڈالی، اس نے پنڈلی چھوڑ دی۔ اس اثنا میں انھوں نے خود بھی ایک جلیبی کھائی۔ کتّا اپنی جلیبی ختم کرتے ہی پھر شروع ہو گیا۔ زبان بھی ٹھیک سے صاف نہیں کی۔ اب ناشتے کا یہ "پیٹرن" بنا کہ پہلے ایک جلیبی کتّے کو ڈالتے تب خود بھی ایک کھا پاتے۔ جلیبی دینے میں ذرا دیر ہو جاتی تو وہ

لپک کر دوبارہ بڑی رغبت وانہماک سے پنڈلی چچوڑنے لگتا۔ شاید اس لیے کہ اس کے اندر ایک ہڈی تھی۔ لیکن اب دل سے کُتّے کا خوف اس حد تک نکل چکا تھا کہ اس کی ٹھنڈی ناک سے گدگدی ہو رہی تھی۔ انہوں نے کھڑے کھڑے دو نہایت اہم فیصلے کیے۔ اول یہ کہ آئندہ کبھی جہلائے کانپور کی طرح سڑک پر کھڑے ہو کر جلیبی نہیں کھائیں گے۔ دوم، شرفائے لکھنؤ کی دیکھا دیکھی اتنے چوڑے پائینچے کا پاجامہ ہرگز نہیں پہنیں گے۔۔ کم از کم زندہ حالت میں۔ کتّے کو ناشتہ کروا چکے تو خالی دونا اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ شیرہ چاٹنے میں منہمک ہو گیا تو حلوائی کے پاس دوبارہ گئے۔ ایک پاؤ دودھ کلھڑ میں اپنے لیے اور ڈیڑھ پاؤ کتے کے لیے خریدا، تاکہ اسے پیتا چھوڑ کر سٹک جائیں۔ اپنے حصّے کا دودھ غٹاغٹ پی کر قصبے کی سیر کو روانہ ہونے لگے تو کتّا اپنا دودھ چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ انھیں جاتا دیکھ کر پہلے کتّے کے کان کھڑے ہوئے تھے، اب ان کے کھڑے ہوئے کہ بدذات اب کیا چاہتا ہے۔ تین چار جگہ جہاں انھوں نے ذرا دم لینے کے لیے رفتار کم کرنے کی کوشش کی، یا اپنی مرضی سے مڑنا یا لوٹنا چاہا تو کتّا کسی طرح راضی نہ ہوا۔ ہر موڑ پر گلی کے کتّے چاروں طرف سے انہیں اور اسے گھیر لیتے اور کھدیڑتے ہوئے دوسری گلی تک لیجاتے جس کی بین الکلبی سرحد میں دوسرے تازہ دَم کتّے چارج لے لیتے۔ کتّا بڑی بے جگری سے تنہا لڑ رہا تھا۔

جب تک جنگ فیصلہ کن طریقے سے ختم نہ ہو جاتی یا کم از کم عارضی سگ بندی نہ ہو جاتی یا بصورت دیگر، دوسری گلی کے شیروں سے از سرِ نو مقابلہ شروع نہ ہوتا، وہ UNO کی طرح بیچ میں خاموش کھڑے دیکھتے رہتے۔ وہ لونڈوں کو کتوں کو پتھر مارنے سے بڑی سختی سے منع کر رہے تھے۔ اس لیے کہ سارے پتھر انھی کو لگ رہے تھے۔ وہ کتّا دوسرے کتّوں کو ان کی طرف بڑھنے نہیں دیتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی اخلاقی ہمدردیاں بھی اب اپنے ہی کتّے کے ساتھ ہو گئیں تھیں۔ دو فرلانگ پہلے جب وہ چلے تھے تو وہ محض ایک کتّا تھا۔ مگر اب رشتہ بدل چکا تھا۔ وہ اس کے لیے کوئی اچھا سا نام سوچنے لگے۔

انھیں آج پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ گاؤں میں اجنبی کی آمد کا اعلان کتّے، مور اور بچّے کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سارے گاؤں اور ہر گھر کا مہمان بن جاتا ہے۔

ٹیپو نام کے کتّے

انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ حلوائی اور بچّے اس کتّے کو ٹیپو! ٹیپو! کہہ کر بلا اور دھتکار رہے تھے۔ سرنگاپٹم کی خون آشام جنگ میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے کثرت سے کتّوں کا نام ٹیپو رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور ایک

زمانے میں یہ نام شمالی ہندوستان میں اتنا عام ہوا کہ خود ہندوستانی بھی آوارہ اور بے نام کتّوں کو ٹیپو کہہ کر بلاتے اور ہشکارتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ جانے بغیر کہ کتّوں کا یہ نام کیسے پڑا۔ باستثنائے نپولین اور ٹیپو سلطان، انگریزوں نے ایسا سلوک اپنے کسی اور دشمن کے ساتھ روا نہیں رکھا۔ اس لیے کہ کسی اور دشمن کی ان کے دل میں ایسی ہیبت اور دہشت کبھی نہیں بیٹھی تھی۔ برِصغیر کے کتّے سو سال تک سلطان شہید کے نام سے پکارے جاتے رہے۔ کچھ برگزیدہ شہید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آزمائش، عقوبتِ مطہرہ اور شہادتِ عظمیٰ ان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ ربِ جلیل انہیں شہادتِ جاریہ کی سعادت سے سرفراز فرماتا ہے۔

تلوا دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والا

حالانکہ انکا اپنا گھر پختہ اور اسکول نیم پختہ تھا، لیکن مولوی مظفر نے اپنی دیانت اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی سادگی کا نمونہ پیش کرنے کے غرض سے اپنا دفتر ایک کچے ٹن پوش مکان میں بنا رکھا تھا۔ سلیکشن کمیٹی کا اجلاس اسی جگہ ہونے والا تھا۔ بشارت سمیت کل تین امیدوار تھے۔ باہر دروازے کے بائیں طرف ایک بلیک بورڈ پر چاک سے یہ ہدایات مرقوم تھیں (ا) امیدوار اپنی باری کا

انتظار صبر و تحمل سے کریں (۲) امیدواروں کو سفر خرچ اور بھتّہ ہرگز نہیں دیا جائے گا۔ ظہر کی نماز کے بعد ان کے طعام کا انتظام یتیم خانہ شمع الاسلام میں کیا گیا ہے (۳) انٹرویو کے وقت امیدوار کو مبلغ ایک روپے چندے کی یتیم خانے کی رسید پیش کرنا ہو گی (۴) امیدوار حضرات براہِ کرم اپنی بیڑی بجھا کر اندر داخل ہوں"۔

بشارت جب انتظار گاہ یعنی نیم کی چھاؤں تلے پہنچے تو کتّا ان کی جلو میں تھا۔ انھوں نے اشاروں کنایوں سے کئی بار اس سے رخصت چاہی مگر وہ کسی طور ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔ نیم کے نیچے وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئے تو وہ بھی ان کے قدموں میں آن بیٹھا۔ نہایت مناسب وقفوں سے دُم ہلا ہلا کر انہیں ممنون نگاہوں سے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ انداز انھیں بہت اچھا لگا اور اس کی موجودگی سے انھیں کچھ تقویت سی محسوس ہونے لگی۔ نیم کے سائے میں ایک امیدوار جو خود کو الہ آباد کا L.T بتاتا تھا، اُکڑوں بیٹھا تنکے سے ریت پر ایک تکسیر یعنی ۲۰ کا مبارک نقش بنا رہا تھا، جس کے خانوں کے عدد کسی طرف سے بھی گنے جائیں، حاصل جمع ۲۰ بنتا تھا۔ تسخیرِ زن اور افسر کو رام کرنے کے لیے یہ نقش تیر بہدف سمجھا جاتا تھا۔ کان کے پیچ و خم میں جو سوالیہ نشان کے اندر ایک اور سوالیہ نشان بنا ہوتا ہے، ان دونوں کی درمیانی گھائی میں اس نے عطر خس کا

پھویا اُڑس رکھا تھا۔ ”زلفِ بنگال ہیئر آئل“ سے کی ہوئی سینچائی کے ریلے جو سر کی فوری ضروریات سے زائد تھے، پیشانی پر بہ رہے تھے۔ دوسرا امیدوار جو کالپی سے آیا تھا، خود کو علی گڑھ کا بی اے، بی ٹی بتلاتا تھا۔ دھوپ کی عینک تو سمجھ میں آتی تھی، لیکن اس نے گلے میں سلک کا سرخ اسکارف بھی باندھ رکھا تھا، جس کا اس چلچلاتی دھوپ میں بظاہر یہی مصرف نظر آتا تھا کہ چہرے سے ٹپکا ہوا پسینا محفوظ کرلے۔ اگر اس کا وزن سو پونڈ کم ہوتا تو وہ سوٹ جو وہ پہن کر آیا تھا، بالکل فِٹ آتا۔ قمیض کے دو نیچے کے بٹن اور پتلون کے دو اوپر والے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ صرف سولر ہیٹ صحیح سائز کا تھا۔ فیروزے کی انگوٹھی بھی غالبًا تنگ ہوگئی تھی، اس لیے کہ انٹرویو کے لیے آواز پڑی تو اس نے جیب سے نکال کر چھنگلیا میں پہن لی۔ جوتے کے تسمے جنہیں وہ کھڑے ہونے کے بعد دیکھ نہیں سکتا تھا، کھلے ہوئے تھے۔ کہتا تھا گول کیپر رہ چکا ہوں۔ اس تن و توش کے باوجود خود کو نیم کے دوشاخے میں اس طرح فٹ کیا تھا کہ دور سے ایک V نظر آتا تھا جس کی ایک نوک پر جوتے اور دوسری پر ہیٹ رکھا تھا۔ یہ صاحب اوپر ٹنگے ٹنگے ہی گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ اور وہیں سے پیک کی پچکاریاں اور پاسنگ شو سگریٹ کی راکھ چٹکی بجا بجا کر جھاڑ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بشارت کے پاس ایک

جنگم فقیر[1] آن بیٹھا۔ اپنا سونٹا ان کے ماتھے پر رکھ کر کہنے لگا"۔ قسمت کا حال بتاتا ہوں پاؤں کے تلوے دیکھ کر۔ ابے جوتے اتار۔ نہیں تو سالے کو یہیں بھسم کر دوں گا"۔ انھوں نے اسے پاگل سمجھ کر منھ پھیر لیا، لیکن جب اس نے نرم لہجے میں کہا "بچہ! تیرے پیڑو پہ تِل اور سیدھی بغل میں مَسّا ہے"۔ تو انھوں نے خوفزدہ ہو کر جوتے اتار دیے، اس لیے کہ اس نے بالکل صحیح نشاندہی کی تھی۔ ذرا دور پر ایک بَڑ کے درخت کے نیچے تیسری جماعت کے لڑکے ڈرل کر رہے تھے۔ اس وقت ان سے ڈنڑ لگوائے جا رہے تھے۔ پہلے ہی ڈنڑ میں "ہوں!" کہتے ہوئے سر نیچے لے جانے کے بعد صرف دو لڑکے ہتھیلیوں کے بل اٹھ پائے۔ باقی ماندہ وہیں دھول میں چھپکلی کی طرح پٹ پڑے رہ گئے۔ اور گردن موڑ موڑ کر بڑی بے چارگی سے ڈرل ماسٹر کو دیکھ رہے تھے، جو انھیں طعنے دے رہا تھا کہ تمھاری ماؤں نے تمھیں کیسا دودھ پلایا ہے؟

دروازے پر سرکنڈوں کی چق پڑی تھی جس کا نچلا حصہ جھڑ چکا تھا۔ سُتلی کی لڑیاں لٹکی رہ گئی تھیں۔ سب سے پہلے علیگ امیدوار کو اس طرح آواز پڑی جیسے عدالت میں فریقینِ مقدمہ کے نام مع ولدیت پکارے جاتے ہیں۔ پکارنے کے

---

[1] جنگم فقیر: جس کے سر پر جٹائیں، ہاتھ میں سونٹا اور پاؤں میں زنجیر ہوتی تھی۔ ہاتھ میں ایک گھنٹی ہوتی تھی، جسے بجاتا پھرتا تھا۔

انداز سے ظاہر ہوتا تھا گویا سو دو سو امیدوار ہیں جو ڈیڑھ دو میل دور کہیں بیٹھے ہیں۔ امیدوار مذکور نیم کی غلیل سے دھم سے کود کر سولر ہیٹ سمیت دروازے میں داخل ہونے والا تھا کہ چپراسی نے راستہ روک لیا۔ اس نے یتیم خانے کی رسید طلب کی اور پاسنگ شو کی ڈبیا جس میں ابھی دو سگریٹ باقی تھے بصیغہ خراج دَھروالی۔ پھر جوتے اتروا کر بحالتِ رکوع اندر لے گیا۔ پچاس منٹ بعد دونوں باہر نکلے۔ چپراسی نے دروازے کے پاس رکھی ہوئی چوبی گھوڑی میں معلق گھنٹے کو ایک دفعہ بجایا جس کا مقصد اہالیانِ قصبہ اور امیدواروں کو مطلع کرنا تھا کہ پہلا انٹرویو ختم ہوا۔ باہر کھڑے ہوئے لڑکوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد الہ آبادی امیدوار کا نام پکارا گیا اور وہ بیس کا نقش مٹا کر لپک جھپک اندر چلا گیا۔ پچاس منٹ بعد پھر چپراسی نے باہر آکر گھنٹے پر دوبارہ اتنے زور سے ضرب لگائی کہ قصبے کے تمام مور چنگھاڑنے لگے۔ ہر انٹرویو کا دورانیہ وہی تھا جو اسکول کے گھنٹوں کا۔ چپراسی نے آنکھ مار کر بشارت کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

بلیک ہول آف دھیرج گنج

بشارت انٹرویو کے لیے اندر داخل ہوئے تو کچھ دیر تک تو کچھ نظر نہ آیا، اس لیے کہ بجز ایک گول موکھے کے، روشنی آنے کے لیے کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں

تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اسی اندھیرے میں ہر چیز کی آؤٹ لائن اُبھرتی، اُجلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دیواروں پر کہگل یعنی پیلی مٹی اور گوبر کی تازہ لپائی میں مضبوطی اور گرفت کے لیے جو کڑبی کی چھیلن اور توڑی کے تنکے ڈالے گئے تھے ان کا قدرتی سنہری وارنش اندھیرے میں چمکنے لگا۔ دائیں طرف نیم تاریک کونے میں دو بٹن روشن نظر آئے۔ وہ چل کر ان کی طرف آنے لگے تو انہیں خوف محسوس ہوا۔

یہ اس بلّی کی آنکھیں تھیں جو کسی اَن دیکھے چوہے کی تلاش میں تھی۔ بائیں طرف ایک چار فُٹ اونچی مچان نُما کھاٹ پڑی تھی جس کے پائے غالبًا درختوں کے سالم تنے سے بنائے گئے تھے۔ بسولے سے چھال اتارنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی تھی۔ اس پر سلیکشن کمیٹی کے تین ممبر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اس کے پاس ہی ایک اور ممبر بغیر پشت کے مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ دروازے کی طرف پشت کیے مولوی مظفّر ایک ٹیکی دار مونڈھے پر براجمان تھے، جس کے ہتھوں کی پیڈنگ نکلنے کے بعد سر کنڈے ننگے سر کھڑے رہ گئے تھے۔ ایک بغیر بازو والی لوہے کی کرسی پر ایک نہایت خوش مزاج شخص الٹا بیٹھا تھا۔ یعنی اس کی پشت سے اپنا سینہ ملائے اور کنارے پر اپنی ٹھوڑی رکھے ہوئے۔ اس کا رنگ اتنا سانولا تھا کہ اندھیرے میں صرف دانت نظر آرہے تھے۔ یہ

تحصیلدار تھا جو اس کمیٹی کا چیئرمین تھا۔ ایک ممبر نے اپنی تُرکی ٹوپی کھاٹ کے پائے کو پہنا رکھی تھی۔ کچھ دیر بعد جب بلّی اس کے پُھندنے سے طمانچے مار مار کے کھیلنے لگی تو اس نے پائے سے اتار کر اپنے سر پر رکھ لی۔ سب کے ہاتھ میں کھجور کے پنکھے تھے۔ مولی مجّن پنکھے کی ڈنڈی گردن کے راستے شیروانی میں اتار کر بار بار اپنی پیٹھ کھجانے کے بعد ڈنڈی کی نوک کو سُونگھتے تھے۔ تحصیل دار کے ہاتھ میں جو پنکھا تھا اس میں سرخ گوٹ اور درمیان میں چھوٹا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ امیدوار کے بیٹھنے کے لیے ایک اسٹول، جس کے وسط میں گُردے کی شکل کا ایک سوراخ تھا جو اس زمانے میں سب اسٹولوں میں ہوتا تھا۔ اس کا مصرف ایک عرصے تک ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ بعض لوگ گرمیوں میں اس پر صراحی یا ٹھلیا رکھ دیتے تھے تاکہ سوراخ سے پانی رِستا رہے اور پیندے کو ٹھنڈی ہوا لگتی رہے۔ بشارت آخر وقت تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ وہ خود نروس ہیں یا اسٹول لڑکھڑا رہا ہے۔ تحصیل دار پیڑے کی لسّی پی رہا تھا اور بقیہ ممبران حقّہ۔ سب نے جوتے اتار رکھے تھے۔ بشارت کو اگر یہ علم ہوتا تو یقیناً صاف موزے پہن کر آتے۔ مونڈھے پر بیٹھا ہوا ممبر اپنے بائیں پیر کو دائیں گھٹنے پر رکھے، ہاتھ کی انگلیوں سے پاؤں کی انگلیوں کے ساتھ پنجہ لڑا رہا تھا۔ بد قلعی اگالدان گردش میں تھا۔ ہوا میں حقے، پان کے بنارسی تمباکو، کونے میں پڑے ہوئے خربوزے

کے چھلکوں، عطرِ خس اور گوبر کی تازہ لپائی کی بو بسی ہوئی تھی۔۔۔ اور ان سب پر غالب وہ بھبکا جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دیسی جوتوں کی بو ہے جو پیروں سے آ رہی ہے یا پیروں کی سڑاند ہے جو جوتوں سے آ رہی ہے۔

جس موکھے کا ہم ذکر کر چکے ہیں اس کے بارے میں فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ روشنی کے لیے بنایا گیا ہے یا اندر کی تاریکی کو contrast (تضاد، تقابل) سے اور زیادہ تاریک دکھانا مقصود ہے۔ باہر کا منظر دیکھنے کے لیے روزن ہے یا بہر والوں کو اندر تانک جھانک کرنے کے لیے جھانکی مہیا کی گئی ہے۔ روشندان، ہوادان، دُودکش، دریچہ، پورٹ ہول۔۔ بقول بشارت یہ ایشیا کا سب سے کثیر المقاصد سوراخ تھا جو بے حد overworked اور چکرایا ہوا تھا۔ چنانچہ ان میں سے کوئی سا فریضہ بھی ٹھیک سے انجام نہیں دے پا رہا تھا۔ فی الوقت اس میں ہر پانچ منٹ میں ایک نیا چہرہ فٹ ہو جاتا تھا۔ ہو یہ رہا تھا کہ باہر دیوار تلے ایک لڑکا گھوڑا بنتا اور دوسرا اس پر کھڑے ہو کر اس وقت تک تماشہ دیکھتا رہتا جب تک گھوڑے کے پیر نہ لڑکھڑانے لگتے اور وہ کمر کو کمانی کی طرح لچکا لچکا کے یہ مطالبہ نہ کرنے لگتا کہ یار! اُتر مجھے بھی تو دیکھنے دے۔ گاہے گاہے یہ موکھا آکسیجن اور گالیوں کی رہگزر کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولی مجّن

دمے کے مریض تھے۔ جب کھانسی کا دورہ پڑتا اور ایسا لگتا کہ شاید دوسرا سانس نہیں آئے گا وہ دوڑ کر آکسیجن کے لیے موکھے میں اپنا منھ فٹ کر دیتے اور جب سانس کی آمد وشد بحال ہو جاتی تو قرات سے الحمد اللہ کہنے کے بعد لونڈوں کو سڑی سڑی گالیاں دیتے۔ تھوڑی دیر بعد دھوپ کا رُخ بدلا تو سورج کا ایک چکاچوند لپکتا نیزہ اس روزن سے داخل ہو کر کمرے کی تاریکی کو چیرتا چلا گیا۔ اس میں دھویں کے بل کھاتے مرغولوں اور ذروں کا ناچ دیدنی تھا۔ بائیں دیوار کے طاق میں دینیات کے طلبہ کے ہاتھ کے بنائے ہوئے استنجے کے نہایت سڈول ڈھیلے قرینے سے تلے اوپر سجے تھے، جن پر اگر مکھیاں بیٹھی ہوتیں تو بالکل بدایوں کے پیڑے معلوم ہوتے۔

دائیں دیوار پر شہنشاہ جارج پنجم کے فوٹو پر گیندے کا سُوکھا کھڑنک ہار لٹک رہا تھا۔ اس کے نیچے مصطفٰی کمال پاشا کا فوٹو اور مولانا محمد علی کی تصویر جس میں وہ چُغّہ پہنے اور سُموری ٹوپی پر چاند تارا لگائے کھڑے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان مولی مجّن کا بڑا سا فوٹو اور اس کے نیچے فریم کیا ہوا سپاس نامہ جو اساتذہ اور چپراسیوں نے ان کی خدمت میں ہیضے سے جانبر ہونے کی خوشی میں درازی عمر کی دعاؤں کے ساتھ پیش کیا تھا۔ ان کی تنخواہ پانچ مہینے سے رکی ہوئی تھی۔

ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ جب بشارت انٹرویو کے لیے اٹھ کر جانے لگے تو کتّا بھی ساتھ لگ لیا۔ انھوں نے بہتیرا روکا مگر وہ نہ مانا۔ چپراسی نے کہا، آپ اس پلید کو اندر نہیں لے جاسکتے۔ بشارت نے جواب دیا یہ میرا کتّا نہیں ہے۔ چپراسی بولا تو پھر آپ اسے دو گھنٹے سے آغوش میں لیے کیوں بیٹھے تھے؟ اس نے ایک ڈھیلا اٹھا کر رسید کرنا چاہا تو کتّے نے جھٹ پنڈلی پکڑلی۔ اور وہ چیخنے لگا۔ بشارت کے منع کرنے پر اس نے فوراً پنڈلی چھوڑ دی۔ شکریہ ادا کرنے کے بجائے چپراسی کہنے لگا، اس پر آپ کہتے ہیں کہ کتّا میرا نہیں ہے! جب وہ اندر داخل ہوئے تو کتا بھی ان کے ساتھ گھس گیا۔ روکنا تو بڑی بات ہے اب چپراسی میں اتنا حوصلہ نہیں رہا تھا کہ ٹوک بھی سکے۔ اس کے اندر گھُستے ہی ایک بھونچال آگیا۔ ممبرانِ کمیٹی نے چیخ چیخ کر چھپر سر پر اٹھالیا۔ لیکن جب کتّا ان سے بھی زیادہ زور سے بھونکا تو سب سہم کر اپنی اپنی پنڈلی گود میں لے کر بیٹھ گئے۔ بشارت نے کہا کہ اگر آپ لوگ خاموش و ساکت ہو جائیں تو یہ بھی چپکا ہو جائے گا۔ اس پر ایک صاحب بولے کہ آپ انٹرویو میں کتّا ساتھ لے کر کیوں آئے ہیں؟ بشارت نے قسم کھا کر کتّے سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا تو وہی صاحب بولے اگر آپ کا دعوٰی ہے کہ یہ کتّا آپ کا نہیں ہے تو آپ اس کی عادات قبیحہ سے اس درجہ کیوں کر واقف ہیں؟

بشارت انٹرویو کے لیے اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو کتّا ان کے پیروں سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ یونہی بیٹھا رہے۔ اس کی وجہ سے اب وہ نروس محسوس نہیں کر رہے تھے۔ انٹرویو کے دوران دو مرتبہ مولی مجّن نے بشارت کی کسی بات پر بڑی حقارت سے زوردار قہقہہ لگایا تو کتّا ان سے بھی زیادہ زور سے بھونکنے لگا اور وہ سہم کر اپنا قہقہہ بیچ میں ہی سوئچ آف کر کے چپکے بیٹھ گئے۔ بشارت کو کتّے پر بے تحاشہ پیار آیا۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

انٹرویو سے پہلے تحصیل دار نے گلا صاف کر کے سب کو خاموش کیا تو ایسا سناٹا طاری ہوا کہ دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک کی ٹک ٹک اور مولوی مظفّر کے ہانپنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ پھر انٹرویو شروع ہوا اور سوالوں کی بوچھار۔ اتنے میں کلاک نے گیارہ بجائے اور سب دوبارہ بالکل خاموش ہو گئے۔ دَھیرج گنج میں کچھ عرصے رہنے کے بعد بشارت کو معلوم ہوا کہ جب کلاک کچھ بجاتا ہے تو دیہات کے آداب کے مطابق سب خاموش ہو کر سنتے ہیں کہ غلط تو نہیں بجا رہا۔

انٹرویو دوبارہ شروع ہوا تو جس شخص کو وہ چپراسی سمجھتے تھے وہ کھاٹ کی اَدواین پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ دینیات کا ماسٹر نکلا جو ان دنوں اُردُو ٹیچر کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ انٹرویو میں سب سے زیادہ دھر پٹخ اسی نے کی، گو کہ مولوی مظفّر اور ایک ممبر نے بھی جو عدالت منصفی کے ریٹائرڈ سرشتہ دار تھے، اینڈے بینڈے سوال کیے۔ تحصیل دار نے البتہ درپردہ مدد اور طرف داری کی اور سفارش کی لاج رکھ لی۔ چند سوالات ہم نقل کرتے ہیں جن سے سوال کرنے والے اور جواب دینے والے دونوں کی قابلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

مولوی مظفّر: (''کلیاتِ مخمور'' پر چمکارنے کے انداز سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) شعر کہنے کے فوائد بیان کیجیے۔

بشارت: (چہرہ پر ایسا ایکسپریشن گویا آؤٹ آف کورس سوال پوچھ لیا) شاعری... میرا مطلب ہے۔ شعر... یعنی اس کا گویا مقصد... تلامیذ الرحمٰن... بات دراصل یہ کہ شوقیہ ...

مولوی مظفّر: اچھا! ''خالق باری'' کا کوئی شعر سنائیے۔

بشارت :

خالق باری سرجن ہار

سر رشتہ دار: آپ کے والد، دادا اور نانا کس محکمے میں ملازم تھے؟

بشارت: انھوں نے ملازمت نہیں کی۔

سر رشتہ دار: پھر آپ کیسے ملازمت کر سکیں گے؟ چار پشتیں یکے بعد دیگرے اپنا پِتّا ماریں، تب کہیں ملازمت کے لائق جوہرِ قابل پیدا ہوتا ہے۔

بشارت: (سادہ لوحی سے) جناب عالی! میرا پِتّا آپریشن کے ذریعے نکالا جا چکا ہے۔

دینیات ٹیچر: شگاف دکھائیے۔

تحصیل دار: آپ نے کبھی بید استعمال کیا ہے؟

بشارت: جی نہیں۔

تحصیل دار: آپ پر کبھی بید استعمال ہوا ہے؟

بشارت: بارہا۔

تحصیل دار: آپ یقیناً ڈسپلن قائم رکھ سکیں گے۔

سرشتہ دار: اچھا یہ بتایے، دنیا گول کیوں بنائی گئی ہے؟

بشارت: (سرشتہ دار کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے چاروں خانے چت ہونے کے بعد پہلوان اپنے حریف کو دیکھتا ہے)

تحصیل دار: سرشتہ دار صاحب، انھوں نے اُردُو ٹیچری کی درخواست دی ہے۔ جغرافیہ والوں کے انٹرویو جمعرات کو ہیں۔

دینیات ٹیچر: بلیک بورڈ پر اپنی خوشخطی کا نمونہ لکھ کر دکھایئے۔

سرشتہ دار: داڑھی پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟

بشارت: کچھ نہیں۔

سرشتہ دار: پھر رکھتے کیوں نہیں؟

دینیات ٹیچر: آپ کو چچا سے زیادہ محبت ہے یا ماموں سے؟

بشارت: کبھی غور نہیں کیا۔

دینیات ٹیچر: اب کر لیجیے۔

بشارت: میرے کوئی چچا نہیں ہیں۔

دینیات ٹیچر: آپ کو نماز آتی ہے؟ اپنے والد کی نمازِ جنازہ پڑھ کر دکھایئے۔

بشارت: وہ حیات ہیں!

دینیات ٹیچر: لاحول ولا قوۃ میں نے تو بُشرے پر قیاس کیا تھا۔ تو پھر اپنے دادا کی پڑھ کر دکھایئے۔ یا آپ ابھی ان کے سائے سے بھی محروم نہیں ہوئے؟

بشارت: (مری آواز میں) جی، ہو گیا۔

مولوی مظفّر: مسّدس حالی کا کوئی بند سنایئے۔

بشارت: مسّدس کا تو کوئی بند اس وقت یاد نہیں آرہا۔ حالی ہی کی "مناجاتِ بیوہ" کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔[1]

---

[1] یہ جواب سن کر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے ممبران معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں۔ تحصیل دار بشارت کو آنکھ مارتا ہے۔ مولوی محبن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ سبب؟ کچھ عرصے پہلے مولوی محبن نے حساب کے ٹیچر کی بیوہ بہن سے دوسری شادی رچائی تھی اور سالے کی تنخواہ میں چار روپے کا اضافہ کیا تھا، جس سے ان سینئر ٹیچروں کی بڑی حق تلفی ہوئی تھی جن کی کوئی بیوہ بہن نہیں تھی۔ قصبے میں ان

تحصیل دار: اچھا، اب کوئی اپنا پسندیدہ شعر سنائیے، جس کا موضوع بیوہ نہ ہو۔

بشارت:

توڑ ڈالے جوڑ سارے باندھ کر بندِ کفن

گور کی بغلی سے چت ہیں پہلواں، کچھ بھی نہیں

تحصیل دار: کس کا شعر ہے؟

بشارت: زبان کا شعر ہے۔

تحصیل دار: اے سبحان اللہ! قربان جایئے۔ کیسی کیسی لفظی رعایتیں اور قیامت کے تلازمے باندھے ہیں! توڑ کی ٹکر پہ جوڑ۔ ایک طرف باندھا ہے تو دوسری طرف بند۔ واہ وا! اس کے بعد بغلی قبر اور بغلی داؤ کی طرف لطیف اشارہ۔ پھر بغلی داؤ سے پہلوان

کے نکاحِ صغیرہ وکبیرہ اور سالے کی ترقی کے بڑے چرچے تھے۔ لیکن سالا چار روپے سے مطمئن نہیں تھا۔ ہر وقت شاکی ہی رہتا اور بار بار طعنے دیتا تھا:

ہم سے کب پیار ہے، ہمشیر تمہیں پیاری ہے

کا چت ہونا۔ اخیر میں چت پہلوان اور چت مردہ اور کچھ بھی نہیں، کہہ کر دنیا کی بے ثباتی کو تین لفظوں میں بُھگتا دیا۔ ڈھیر سارے صنائع بدائع کو ایک شعر کے کوزے میں بند کر دینا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسا ٹُھکا ہوا، اتنا پختہ اور اتنا خراب شعر کوئی استاد ہی کہہ سکتا ہے۔

مولوی مظفر: آپ سادگی پسند کرتے ہیں یا عیش و عشرت؟

بشارت: سادگی۔

مولوی مظفّر: شادی شدہ ہیں یا چھڑے دم؟

بشارت: جی۔ غیر شادی شدہ ہوں۔

مولوی مظفّر: پھر آپ اتنی ساری تنخواہ کا کیا کریں گے؟ یتیم خانے کو ماہوار کتنا چندہ دیں گے؟

تحصیل دار: آپ نے شاعری کب شروع کی؟ اپنا پہلا شعر سنایئے؟

بشارت:

ہے انتظارِ دید میں لاشہ اچھل رہا

حالانکہ کوئے یار ابھی اتنی دور ہے

تحصیل دار: واہ وا! ”حالانکہ“ کا جواب نہیں۔ واللہ! اَو سر اُفتادہ زمین میں ”لاشہ“ نے جان ڈال دی۔ اور ”اتنی دور“ میں کچھ نہ کہہ کر کتنا کچھ کہہ دیا۔

بشارت: آداب بجالاتا ہوں!

تحصیل دار: چھوٹی بحر میں کیا قیامت شعر نکالا ہے۔ شعر میں کفایتِ الفاظ کے علاوہ خستت خیال بھی پائی جاتی ہے۔

بشارت: آداب!

تحصیل دار: (کتّا بھونکنے لگتا ہے) معاف کیجیے، میں آپ کے کتّے کے بھونکنے میں مخل ہو رہا ہوں۔ یہ بتایئے کہ زندگی میں آپ کی کیا ambition ہے؟

بشارت: یہ ملازمت مل جائے۔

تحصیل دار: تو سمجھیے مل گئی۔ کل صبح اپنا اسباب، برتن بھانڈے لے آیئے گا۔ ساڑھے گیارہ بجے مجھے آپ کی Joining Report مل جانی چاہیے۔ تنخواہ آپ کی چالیس روپے ماہوار ہو گی۔

مولوی مظفّر چیختے اور پیر پٹختے ہی رہ گئے کہ سنیے تو! گریڈ پچیس روپے کا ہے۔ تحصیل دار نے انہیں جھڑک کر خاموش کر دیا۔ اور فائل پر انگریزی میں یہ نوٹ لکھا کہ اس امیدوار میں وہ تمام اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں جو کسی بھی لائق اور abitious نوجوان کو ایک کامیاب پٹواری یا کلاس ٹیچر بنا سکتے ہیں، بشرطیکہ مناسب نگرانی اور رہنمائی میسر آ جائے۔ عدیم الفرصتی کے باوجود میں اسے اپنا کچھ وقت اور توجہ دینے کو تیار ہوں۔ ابتدا میں، میں نے اسے ۱۰۰ میں سے ۸۰ نمبر دیے تھے، مگر بعد میں پانچ نمبر خوش خطی کے بڑھائے۔ لیکن پانچ نمبر شاعری کے کاٹنے پڑے۔

خواصِ مُولی اور اچھا سا نام

بشارت نے دوپہر کا کھانا یتیم خانے کے بجائے مولوی بادل (عباد اللہ) کے ہاں کھایا جو اسی اسکول میں فارسی پڑھاتے تھے۔ مکھن سے چپڑی ہوئی گرم روٹی اور

آلو کا بھُرتا اور لہسن کی چٹنی مزہ دے گئی۔ مولوی بادل نے اپنی شفقت اور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ برخوردار! میں تمھیں کھُونتے کو رفو کرنا، آٹا گوندھنا اور ہر طرح کا سالن پکانا سکھا دوں گا۔ بخدا! بیوی کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو گی۔ سرِ دست انھوں نے مُولی کی بھجیا بنانے کی جو ترکیب بتائی وہ خاصی پیچیدہ اور پُر خطر تھی۔ اس لیے کہ اس کی ابتدا مولی کے کھیت میں پو پھٹنے سے پہلے جانے سے ہوتی تھی۔ انھوں نے ہدایت کی کہ دیہات کے آداب کے خلاف، لہلہاتے کھیت میں علی الصبح منھ اٹھائے نہ گھس جاؤ، بلکہ مینڈھ پر پہلے اس طرح کھانسو کھنکھارو جیسے بے کواڑ یا ٹاٹ کے پردے والے بیت الخلا میں داخل ہونے سے پہلے کھنکھارتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہدایت کہ ٹخنے سے ایک بالشت اونچا لہنگا اور ہنسلی سے دو بالشت نیچی چولی پہننے والی کھیت کی مالکن دھاپاں سے تازہ گدرائی ہوئی مولی کا محلِ وقوع اور اسے توڑنے کی اجازت کس طرح لی جائے کہ نظر دیدنی پر نہ پڑے۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ چمگادڑ سبزیاں مقوی اور کاسِر ریاح ہوتی ہیں۔ اس سے ان کی مراد وہ پودے تھے جو اپنے پیر آسمان کی طرف کیے رہتے ہیں۔ مثلاً گاجر، گوبھی، شلغم۔ پھر انھوں نے پتّے دیکھ کر یہ پہنچاننا بتایا کہ کون سی مُولی کھاری، پھُسپھُس نکلے گی اور کون سی جڑیلی اور مچھیل۔ ایسی تیز ابی کہ کھانے والا کھاتے وقت منہ پیٹ لے اور کھانے کے بعد پیٹ پیٹتا پھرے۔

اور کوئی ایسی سڈول، چکنی اور میٹھی کہ بے تحاشا جی چاہے کہ گز بھر کی ہوتی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کبھی غلطی سے تیزابی مولی اکھاڑ لو تو پھینکو مت۔ اس کا عرق نکال کے اونٹ کی کھال کی کُپّی میں محفوظ کر لو۔ چالیس دن بعد جہاں داد یا اگیزیما ہو وہاں پھریری سے لگاؤ۔ اللہ نے چاہا تو جلد ایسی نکل آئے گی جیسے نوزائیدہ بچّے کی! کچھ عرصے بعد جیسے ہی بشارت نے اپنے ماموں کے اگیزیما کی پھنسیوں پر اس عرق کی پھریری پھیری تو بزرگوار بالکل نوزائدہ بچّے کی طرح چیخیں مارنے لگے۔

بشارت انٹرویو سے فارغ ہو کر بامراد شام کو نکلے تو کتّا ان کے ساتھ نتھی تھا۔ انھوں نے حلوائی سے تین پوریاں اور ربڑی خرید کر اسے کھلائی۔ وہ ان کے ساتھ لگا لگا مولوی بادل کے ہاں بھی گیا۔ انٹرویو میں آج جو معجزہ ان کے ساتھ ہوا، اسے انھوں نے اسی کے دَم قدم کا ظہورا سمجھا۔ کانپور واپس جانے کے لیے وہ لاری میں سوار ہونے آئے تو وہ ان سے پہلے چھلانگ لگا کر اس میں گھس گیا جس سے مسافروں میں کھلبلی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ کلینر اسے انجن اسٹارٹ کرنے والے ہینڈل سے مارنے کو دوڑا تو انھوں نے لپک کر اس کی کلائی مروڑ دی۔ کتّا لاری کے چھت پر کھڑا ان کے ہمراہ کانپور آیا۔ ایسے باوفا کتّے کو کتّا کہتے ہوئے اب انھیں حجاب محسوس ہونے لگا۔ انھوں نے اسی وقت اس کا نام بدل کر

لارڈ ولزلی رکھا جو اس جنرل کا نام تھا جس سے مقابلہ کرتے ہوئے ٹیپو نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔

کانپور پہنچ کر انھوں نے پہلی مرتبہ اس پر ہاتھ پھیرا۔ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ کتّے کا جسم اتنا گرم ہوتا ہے۔ اس پر جا بجا لڑکوں کے پتھروں سے پڑے ہوئے زخموں کے نشان تھے۔ انھوں نے اس کے لیے ایک خوبصورت کالر اور زنجیر خریدی۔

بحضور فیض گنجور تحصیل دار صاحب بہادر

دوسرے دن بشارت اپنی ساری کائنات ٹین کے ٹرنک میں سمیٹ کر دھیرج گنج آ گئے۔ ٹرنک پر انھوں نے ایک پینٹر کو چار آنے دے کر اپنا نام، ڈگری اور تخلص سفیدے سے پینٹ کروا لیے تھے جو بمشکل دو سطروں میں سما پائے۔ یہ ٹرنک ان کی پیدائش سے پہلے کا تھا، مگر اس میں چار لیور والا پیتلی تالا ڈال کر لائے تھے۔ اس میں کپڑے اتنے کم تھے کہ راستے بھر اندر رکھا ہوا مراد آبادی لوٹا ڈھولک بجاتا آیا۔ اتنا شور مچانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے اثاث البیت میں یہ تازہ قلعی شدہ لوٹا ہی سب سے قیمتی شے تھی۔ ابھی انھوں

نے منھ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا کہ تحصیل دار کا چپراسی ایک لٹھ اور یہ پیغام لے کر وارد ہوا کہ تحصیل دار صاحب بہادر نے یاد فرمایا ہے۔ انھوں نے پوچھا ابھی؟ بولا، اور کیا؟ فوراً سے بیشتر! بالمواجہ، اصالتاً۔ چپراسی کے منھ سے یہ منشیانہ زبان سن کر انھیں حیرت ہوئی اور خوشی بھی، جو اس وقت ختم ہوئی جب اس نے یہ پیغام لانے کا انعام، دوپہر کا ماحضر اور زادِ راہ اسی زبان میں طلب کیا۔ کہنے لگا، تحصیلِ ہٰذا میں یہی دستور ہے۔ بندہ تو اجورہ دار[1] ہے۔ جتنی دیر وہ ان مطالبات پر غور کریں، وہ اپنے لٹھ کی چاندی کی شام کو منھ کی بھاپ اور انگوچھے سے رگڑ رگڑ کر چمکاتا رہا۔

جھلستی جھلساتی دوپہر میں بشارت ڈیڑھ دو میل پیدل چل کر ہانپتے کانپتے تحصیل دار کے ہاں پہنچے تو وہ قیلولہ کر رہا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے انتظار کے بعد اندر بلائے گئے تو خس کی ٹٹی کی مہکیلی ٹھنڈک جسم میں اُترتی چلی گئی۔ لُو سے جھلسی ہوئی آنکھوں میں ایک دَم ٹھنڈی ٹھنڈی سی روشنی سی آ گئی۔ اوپر چھت میں لٹکا ہوا

---

[1] اجورہ دار: وہ ہرکارہ جس کی اُجرت، آمد و رفت اور قیام و طعام کا خرچ اس ماتحت کو برداشت کرنا پڑتا تھا جس کے نام وہ سرکاری احکام لے کر آتا تھا۔ یہ ایک نوع کی سزا ہوتی تھی۔ کچھ علاقوں میں یاددہانیوں (reminders) کی ترسیل اجورہ دار ہی کے ذریعے ہوتی تھی تاکہ آئندہ کو سبق ہو۔

جھالر دار پنکھا ہاتھی کے کان کی طرح ہل رہا تھا۔ فرش پر بچھی چاندنی کی اُجلی ٹھنڈک ان کی جلتی ہوئی ہتھیلی کو بہت اچھی لگی۔ اور جب اس کی حدّت سے چاندنی گرم ہو ہو جاتی تو وہ ہتھیلی کھسکا کر دوسری جگہ رکھ دیتے۔ تحصیل دار بڑے تپاک اور شفقت سے پیش آیا۔ برف میں لگے ہوئے تربوز کی ایک قاش اور چھلے ہوئے سنگھاڑے پیش کرتے ہوئے بولا، تو اب اپنے کچھ ایسے اشعار بھی سنایئے جو مہمل نہ ہوں، چھوٹی بحر میں نہ ہوں۔ وزن اور تہذیب سے گرے ہوئے نہ ہوں۔ بشارت اشعار سنا کر داد پا چکے تو اس نے اپنی تازہ نظم ''ماہ و پروین ہیں یہ ذراتِ زمیں آج کی رات'' سنائی جو ڈپٹی کلکٹر کے حالیہ دورہ دھیرج گنج کے موقع پر لکھی تھی۔ نظم بشارت کو پکڑاتے ہوئے کہنے لگا کہ ۲۷ تاریخ کو ڈپٹی کلکٹر کے سالے کی شادی ہے۔ اسی نمونے کے مطابق ایک پھڑکتا ہوا سہرا لکھ کر مجھے دکھایے۔ (آنکھ مارتے ہوئے) بحر وہی اپنی ''مناجاتِ بیوہ'' والی ٹھیک رہے گی۔

حق بحقِ تحصیل دار رسید

وہ اپنی ران کھجائے چلا جارہا تھا۔ ٹانگوں پر منڈھے چوڑی دار پاجامے میں نہ جانے کیسے ایک بھُنگا گھس گیا تھا۔ اور وہ اسے اوپر ہی اوپر چٹکی سے مسلنے کی بار بار

کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک خوش شکل نوعمر خادمہ نازو، تازہ توڑے ہوئے فالسوں کا شربت لائی۔ تحصیل دار کنکھیوں سے برابر بشارت کو دیکھتا رہا کہ وہ نازو کو دیکھ رہے ہیں یا نہیں۔ موٹی ململ کے سفید کرتے میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ وہ گلاس دینے کے لیے جھکی تو اس کے بدن سے جوان پسینے کی مہکار آئی۔ اور ان کا ہاتھ اس کے چاندی کے بٹنوں کے گھنگھروؤں کو چھو گیا۔ اس کا آڑا پاجامہ رانوں پر سے کسا ہوا تھا اور پیوند کے ٹانکے دو ایک جگہ اتنے بکسے ہوئے تھے کہ نیچے چنبیلی بدن کھکھلا رہا تھا۔ شربت پی چکے تو تحصیل دار کہنے لگا کہ آج تو خیر آپ تھکے ہوئے ہوں گے، کل سے میرے بچوں کو اُردُو پڑھانے آیئے۔ ذرا کھلنڈرے ہیں۔ تیسرے نے تو ابھی قاعدہ شروع ہی کیا ہے۔ بشارت نے کچھ پس و پیش کیا تو یکلخت اس کے تیور بدل گئے۔ لہجہ کڑا اور کڑوا ہوتا چلا گیا۔ کہنے لگا۔ جیسا کہ آپ کو بخوبی معلوم تھا، ہے اور ہو جائیگا، آپ کی اصل تنخواہ پچیس روپے ہی ہے۔ میں نے جو پندرہ روپے ازخود بڑھا کر چالیس کر دیے تو وہ درحقیقت پانچ روپے فی بچہ ٹیوشن تھی۔ ورنہ میرا دماغ تھوڑا ہی خراب ہوا تھا کہ کالج سے نکلے الل بچھیرے کو مسلمانوں کی گاڑھی کمائی کے چندے سے پندرہ روپے کی نذر گزارتا۔ آخر کو ٹرسٹی کی کچھ ذمّے داری ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ چالیس روپے ہے اور وہ تو بی اے،

بی ٹی (علیگ) سیکنڈ ڈویژن ہے۔ امروہے کا ہے۔ مگر نہایت شریف۔ سیّد ہے۔ علاوہ ازیں، سر منڈوا کے عشقیہ شعر نہیں کہتا۔

آخری سات لفظوں میں اس نے ان کی شخصیت کا خلاصہ نکال کے رکھ دیا۔ اور وہ ڈھے گئے۔ انھوں نے بڑی لجاجت سے پوچھا، کیا کوئی alternative بندوبست نہیں ہو سکتا؟

تحصیل دار چڑاونی ہنسی ہنسا۔ کہنے لگا، ضرور ہو سکتا ہے۔ وہ آلٹرنیٹو بندوبست یہ ہے کہ آپ کی تنخواہ وہی پچیس روپے رہے، اور اسی میں آپ میرے بچوں کو بھی پڑھائیں گے۔ آیا خیال شریف میں؟ برخوردار! ابھی آپ نے دنیا نہیں دیکھی۔ میں آپ کے ہاتھ میں دو کبوتر دیتا ہوں۔ آپ یہ تک تو بتا نہیں سکتے کہ مادہ کون سی ہے!

ان کے جی میں تو بہت آئی کہ پلٹ کر جواب دیں کہ کولمبس صاحب! اگر اسی ڈسکوری کا نام دنیا دیکھنا ہے تو یہ کام تو کبوتر کہیں بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے! اتنے میں تحصیل دار دو تین دفعہ زور زور سے کھانسا اور ہال میں دور ایک کونے میں دبکا گرداوَر قانون گو لپک کر بشارت کے پاس آیا اور ان کی ٹھڈی میں ہاتھ دیتے ہوئے کہنے لگا، آپ سرکار کے سامنے کیسی بچکانی باتیں کر رہے ہیں۔

یہ عزت کسے نصیب ہوتی ہے۔ سرکار جھوٹوں بھی اشارہ کر دیں تو لکھنؤ یونیورسٹی کے سارے پروفیسر ہاتھ باندھے سر کے بل چل کے آئیں۔ سرکار کو تین دفعہ ڈپٹی کلکٹری آفر ہو چکی ہے، مگر سرکار نے ہر دفعہ پائے حقارت سے ٹھکرا دی کہ میں خود غرضی پر اتر آؤں اور ڈپٹی کلکٹر بن کر چلا جاؤں تو تحصیل دھیرج گنج کا عملہ اور رعایا کہے گی، سرکار! ہمیں بیچ منجدھار میں کس پہ چھوڑے جاتے ہو؟

بشارت دَم بخود رہ گئے۔ مرد ایسے موقعوں پر خون کر دیتے ہیں اور نامرد خودکشی۔ انھوں نے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ نوکری کی، جو قتل اور خودکشی دونوں سے کہیں مشکل کام ہے۔

یہ رتبہ بلند مِلا جس کو مل گیا

تحصیل دار نے زنانے سے اپنے صاحبزادگان کو بلوایا اور ان سے کہا، چچا جان کو آداب کرو۔ یہ کل سے تمھیں پڑھانے آئیں گے۔ بڑے اور چھوٹے لڑکے نے آداب کیا۔ منجھلے نے دائیں ہاتھ سے اوک بنایا اور جھک جھک کے دو دفعہ آداب کرنے کے بعد جب تیسری دفعہ رکوع میں گیا تو ساتھ ہی منھ بھی چڑایا۔

اب تحصیل دار کا موڈ بدل چکا تھا۔ لڑکے قطار بنا کر واپس چلے گئے تو وہ بشارت سے کہنے لگا "پرسوں جغرافیہ ٹیچر کی اسامی کے لیے انٹرویو ہیں۔ میں آپ کو سلیکشن کمیٹی کا ممبر نامزد کرتا ہوں۔ دینیات کا ٹیچر اس لائق نہیں کہ کمیٹی کا ممبر رہے۔ مولی مجّن کو مطلع کر دیا جائے گا"۔ یہ سنتے ہی بشارت کے گدگدیاں ہونے لگیں۔ اس وقت کوئی انھیں وائسرائے بنا دیتا تب بھی اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اب وہ بھی انٹرویو میں اچھے اچھوں کو خوب رگیدیں گے۔ اور پوچھیں گے میاں، تم ڈگریاں بغل میں دبائے افلاطون بنے پھرتے ہو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ دنیا گول کیوں بنائی گئی ہے؟ بڑا مزہ آئے گا۔ یہ عزت کس کو نصیب ہوتی ہے کہ خود بلاوجہ ذلیل ہونے کے فوراً بعد دوسروں کو بلاوجہ ذلیل کر کے حساب برابر کر دے۔ ان کی گھائل انا کے سارے گھاؤ پل بھر میں بھر گئے۔

مارے خوشی کے وہ یہ وضاحت کرنی بھول گئے کہ بندہ ہر انٹرویو کے بعد نہ آواز لگائے گا، نہ گھنٹا بجائے گا۔ چلنے لگے تو تحصیل دار نے گرداوَر قانون گو کو آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا اور اس نے پندرہ سیر گندم اور ایک ہانڈی پیوسی کی ساتھ کر دی۔ اسے یہ بھی ہدایت کر دی کہ کل اتالیق صاحب کے گھر جَواسے کی ایک گاڑی ڈلوا دینا۔ اور بیگار میں کسی پنی گر کو بھیج دینا کہ ہاتھوں ہاتھ ٹٹی بنا دے۔ اس زمانے میں جو لوگ خس کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، وہ جواسے کے

کانٹوں کی ٹٹی پر اکتفا کرتے تھے۔ اور جو اس قابل بھی نہ ہوتے وہ خس کی پنکھیا پر کوری ٹھلیا کا پانی چھڑک لیتے۔ اسے جُھلتے جُھلتے جب نیند کا جھونکا آتا تو خس خانہ و برفاب کی خوابناک خنکیوں میں اترتے چلے جاتے۔

اُردُو ٹیچر کے فرائضِ غیر منصبی

اگلے دن علی الصبح بشارت اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔ مولوی مظفّر نے ان سے تحریری چارج رپورٹ لی کہ آج صبح فدوی نے باضابطہ چارج سنبھال لیا۔ ''چارج'' بہت جامع اور دھوکے میں ڈالنے والا لفظ ہے، ورنہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ جو چیزیں ان کے چارج میں دی گئیں وہ بغیر چارج کے بھی کچھ ایسی غیر محفوظ نہ تھیں:

کھادی کا ڈسٹر (ڈیڑھ عدد) مروحہ (دستی پنکھا۔ ۱ عدد) رجسٹر حاضری (۱ عدد) سفالی مٹی کی دوات (۲ عدد)

مولوی مظفّر نے بلیک بورڈ کا ڈسٹر ان کی تحویل میں دیتے ہوئے تنبیہ کی تھی کہ دیکھا گیا ہے کہ ماسٹر صاحبان چاک کے معاملے میں بہت فضول خرچی کرتے ہیں۔ لہٰذا مجلسِ منتظمہ نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ماسٹر صاحبان چاک خود خرید کر

لائیں گے۔ کھجور کے پنکھے کے بارے میں بھی انھوں نے مطلع کیا کہ گرمیوں میں ایک مہیّا جائے گا۔ ماسٹر بالکل لاپرواواقع ہوئے ہیں۔ دو ہفتے میں ہی ساری بنائی ادھڑ کے جھونترے نکل آتے ہیں۔ نیز، اکثر ماسٹر صاحبان چھٹی کے دن اسکول کا پنکھا گھر میں استعمال کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ بعضے کاہل الوجود بھی ہیں۔ اسی کی ڈنڈی سے لونڈوں کو مارتے ہیں۔ حالانکہ دو قدم پر نیم کا درخت بیکار کھڑا ہے۔ اور ہاں مولوی مظفّر نے ایک چوبی ہولڈر بھی ان کی تحویل میں دیا جو اُن کے پیشروؤں نے غالباً مسواک کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس کا بالائی حصّہ عالمِ فکر میں مسلسل دانتوں تلے رہنے کے باعث جھڑ گیا تھا۔ بشارت کو اس بے جا استعمال پر بہت غصہ آیا، اس لیے کہ اب وہ اس سے کمر بند نہیں ڈال سکتے تھے۔

چارج مکمل ہونے کے بعد بشارت نے کورس کی کتابیں مانگیں تو مولوی مظفّر نے مطلع کیا کہ مجلسِ منتظمہ کے ریزولیوشن نمبر ۵، مجریہ ۳ فروری ۱۹۳۵ء کی رو سے ماسٹر کو کورس کی کتابیں اپنی جیب سے خرید کر لانی ہوں گی۔ بشارت نے جَل کر پوچھا "سب؟ یعنی کہ پہلی جماعت سے لیکر آٹھویں جماعت تک؟" فرمایا "تو کیا آپ کا خیال ہے کہ پہلی جماعت کے قاعدے سے آپ مڈل کا امتحان دلوادیں گے؟"

مولوی مظفّر نے چلتے چلتے یہ اطلاع بھی دی کہ مجلسِ منتظمہ بے جا اخراجات کم کرنے کی غرض سے ڈرل ماسٹر کی پوسٹ ختم کر رہی ہے"۔ خالی گھنٹوں میں آپ پڑے پڑے کیا کریں گے؟ اسٹاف روم ٹھالی ماسٹروں کے اینڈنے اور لوٹنے لگانے کے لیے نہیں ہے۔ خالی گھنٹوں میں ڈرل کرا دیا کیجیے۔ (پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بادی بھی چھٹ جائے گی۔ جوان آدمی کو چاق و چوبند رہنا چاہیے"۔ بشارت نے کھردرے اختصار سے جواب دیا "مجھے ڈرل نہیں آتی"۔ بہت شفیق اور شیریں لہجے میں جواب دیا "کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی بھی ماں کے پیٹ سے ڈرل کرتا ہوا پیدا نہیں ہوتا۔ کسی بھی طالب علم سے کہیے۔ سکھا دے گا۔ آپ تو ماشاء اللہ سے ذہین آدمی ہیں۔ بہت جلد سیکھ جائیں گے۔ آپ ٹیپو سلطان اور طارق، فاتحِ اندلس کے نام لیوا ہیں"۔

بشارت بڑی محنت اور لگن سے لڑکوں کو اُردُو پڑھا رہے تھے کہ دو ڈھائی ہفتے بعد مولوی مظفّر نے اپنے دفتر میں طلب کیا اور فرمایا کہ آپ الحمد اللہ مسلمان کے فرزند ہیں، جیسا کہ آپ نے درخواست میں لکھا تھا۔ اب جلد از جلد نمازِ جنازہ اور نیاز دینا سیکھ لیجیے۔ کوردِہ ہے۔ وقت بے وقت ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ نمازِ جنازہ تو کورس میں بھی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو مکتب میں غسلِ میت بھی 'کمپل سری' تھا۔ دینیات کے ٹیچر کی بیوی پر بارہ بنکی میں جن دوبارہ سوار ہو گیا

ہے۔ اماوس کی راتوں میں چارپائی اُلٹ دیتا ہے۔ اسے اُتارنے جارہا ہے۔ پچھلے سال ایک پڑوسی کا جبڑا اور دو دانت توڑ کے آیا تھا۔ اس کی جگہ آپ کو کام کرنا ہو گا۔ ظاہر ہے اس حرام خور کی عوضّی کرنے آسمان سے فرشتے تو اترنے سے رہے۔

تین چار دن کا بھُلاوہ دیکر مولوی مظفّر نے پوچھا، برخوردار آپ اتوار کو کیا کرتے رہتے ہیں؟ بشارت نے جواب دیا، کچھ نہیں۔ فرمایا "تو یوں کہیے فقط سانس لیتے رہتے ہیں۔ یہ تو بڑی معیوب بات ہے۔ سر محمد اقبال نے فرمایا ہے، کبھی اے نوجوانِ مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟ جوان آدمی کو اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔ جمعے کو اسکول کی جلدی چھٹی ہو جاتی ہے۔ بعد نمازِ جمعہ یتیم خانے کی خط و کتابت دیکھ لیا کیجیے۔ آپ تو گھر کے آدمی ہیں۔ آپ سے کیا پردہ؟ آپ کی تنخواہیں دراصل یتیم خانے کے چندے ہی سے دی جاتی ہیں۔ تین مہینے سے رکی ہوئی ہیں۔ میرے پاس الہ دین کا چراغ تو ہے نہیں۔ دراصل یتیموں پر اتنا خرچ نہیں آتا جتنا آپ حضرات پر۔ اتوار کو یتیم خانے کے چندے کے لیے اپنی سائیکل لے کر نکل جایا کیجیے۔ کارِ خیر بھی ہے۔ اور آپ کو بیکاری کی لعنت سے نجات مل جائے گی سو الگ۔ آس پاس کے دیہات میں الحمد اللہ

مسلمانوں کے کافی گھر ہیں۔ تلاش کرنے سے خدا مل جاتا ہے، معطی کس کھیت کی گاجر مولی ہیں"۔

بشارت ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ "معطی" کو کیسے تلاش اور شناخت کریں گے کہ اتنے میں سر پر دوسرا بم گرا۔ مولوی مظفّر نے کہا کہ چندے کے علاوہ گردونواح کے دیہات سے موزوں یتیم بھی تلاش کر کے لانے ہوں گے!

آئیڈیل یتیم کا حلیہ

یتیم جمع کرنا بشارت کو چندہ جمع کرنے سے بھی زیادہ دشوار نظر آیا۔ اس لیے کہ مولی مجّن نے یہ پَخ لگادی کہ یتیم تندرست، مسٹنڈے نہ ہوں۔ صورت سے بھی مسکین معلوم ہونا چاہییں۔ خوش خوراک نہ ہوں۔ نہ اتنے چھوٹے ٹوئیاں کہ چونچ میں چوگا دینا پڑے۔ نہ اتنے ڈھسَو کے ڈھسَو اور پیٹو کہ روٹیوں کی تھئی کی تھئی تھور جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ پر ایسے گلبدن بھی نہ ہوں کہ گال پہ ایک مچھر کا سایہ بھی پڑ جائے تو شہزادہ گلفام کو ملیریا ہو جائے۔ پھر بخار میں دودھ پلاؤ تو ایک ہی سانس میں بالٹی کی بالٹی ڈکوس جائیں۔ بعضا بعضا لونڈا ٹخنے تک پولا ہوتا ہے۔ لڑکے باہر سے لاغر مگر اندر سے بالکل تندرست ہونے چاہییں۔ نہ

اتنے نازک کہ پانی بھرنے کنویں پر بھیجو تو ڈول کے ساتھ یوسفِ بے کارواں خود بھی کھچے کھچے کنویں کے اندر چلے جارہے ہیں۔ جب دیکھو حرام کے جَنے ثبوت میں ٹوٹے گھڑے کا منھ لیے چلے آرہے ہیں۔ ابے مجھے کیا دکھا رہا ہے؟ یہ ہنسلی اپنی میّا بہنا کو پہنا۔ میانہ قد اور درمیانہ عمر کے ہوں۔ اتنے بڑے اور ڈھیٹ نہ ہوں کہ تھپڑ مارو تو ہاتھ گھنٹے بھر تک جھنجھناتا رہے اور ان حرامیوں کا گال بھی بیکا نہ ہو۔ جاڑے میں زیادہ جاڑا نہ لگتا ہو۔ یہ نہیں کہ ذرا سی سردی بڑھ جائے تو سارے قصبے میں کانپتے، کپکپاتے، کٹکٹاتے پھر رہے ہیں اور یتیم خانے کو مفت میں بدنام کر رہے ہیں، اور ہاں یہ تصدیق کر لیں کہ رات کو بستر میں پیشاب نہ کرتے ہوں۔ خاندان میں فی اور سر میں لیکھیں نہ ہوں۔ اُٹھان کے بارے میں مولی مجّن نے وضاحت کی کہ اتنی معتدل بلکہ مفقود ہو کہ ہر سال جوتے اور کپڑے تنگ نہ ہوں۔ اندھے، کانے، لولے، لنگڑے، گونگے، بہرے نہ ہوں، مگر لگتے ہوں۔ لونڈے خوش شکل ہرگز نہ ہوں۔ منھ پر مہاسے اور ناک لمبی نہ ہو۔ ایسے لونڈے آگے چل کر لوطی نکلتے ہیں۔ وہ آئیڈیل یتیم کا حلیہ بیان کرنے لگے تو بار بار بشارت کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے آرٹسٹ پورٹریٹ بناتے وقت ماڈل کا چہرہ دیکھ دیکھ کر کینوس پر آؤٹ لائن بناتا ہے۔ وہ بولتے رہے، لیکن بشارت کا دھیان کہیں اور تھا ان کے ذہن میں ایک سے ایک منحوس تصویر ابھر

رہی تھی۔ بلکہ tableau کہنا چاہیے، جس میں وہ خود کو کسی طرح فٹ نہیں کر پا رہے تھے۔

مثنوی مولانا روم اور یتیم خانے کا بینڈ

پہلا منظر: ٹرین کا گارڈ ہری جھنڈی ہاتھ میں لیے سیٹی بجا رہا ہے۔ چھ سات لڑکے لپک کر چلتی ٹرین کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں چڑھتے ہیں، جس سے ابھی ابھی ایک سُرمہ اور سلاجیت بیچنے والا اُترا ہے۔ سب نیکر پہنے ہوئے ہیں۔ صرف ایک لڑکے کی قمیض کے بٹن سلامت ہیں، لیکن آپس کی لڑائی میں حریف اس کی داہنی آستین جڑ سے نوچ کر لے گیا۔ کسی کے پیر میں جوتا نہیں، لیکن ٹوپی سب پہنے ہوئے ہیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں بڑا سا فریم ہے۔ جس میں ضلع کے ایک گمنام لیڈر کا سرٹیفکٹ جڑا ہوا ہے۔ کمپارٹمنٹ میں گھستے ہی لڑکوں نے کہنیوں اور دھکوں سے اپنی جگہ بنالی۔ جیسے ہی ٹرین سگنل سے آگے نکلی، سب سے بڑے لڑکے نے ریزگاری سے بھرا ہوا ٹین کا گولک جھن جھنے کی طرح بجانا شروع کیا۔ ڈبّے میں خاموشی چھا گئی۔ ماؤں کی گود میں روتے بچّے سہم کر دودھ پینے لگے اور دودھ پیتے ہوئے بچّے دودھ چھوڑ کر رونے لگے۔ مردوں نے سامنے بیٹھی عورت کو گھورنا اور اس کے میاں نے اونگھنا چھوڑ دیا۔ جب سب مسافر اپنا

اپنا شغل روک کر لڑکے کی طرف متوجہ ہوگئے تو اس نے اپنا گولک راگ بند کیا۔ اس کے ساتھیوں نے اپنے منھ آسمان کی طرف کر لیے اور آسمانی طاقتوں سے براہِ راست رابطہ قائم کرنے کے ثبوت میں سب نے ایک ساتھ آنکھوں کی پتلیاں اتنی اوپر چڑھالیں کہ صرف سفیدی دکھائی دینے لگی۔ پھر سب ملکر انتہائی منحوس لے میں کورس گانے لگے:

ہماری بھی فریاد سُن لیجیے

ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے

تھرڈ کلاس کے ڈبّے میں یتیم خانے کے جو لڑکے داخل ہوئے ان سب کی آوازیں پھَٹ کر کبھی کی بالغ ہو چکی تھیں۔ صرف ایک کے کنٹھ نہیں پھوٹے تھے یہی لڑکا چیل جیسی آواز میں کورس کو lead کر رہا تھا۔ اس زمانے میں پشاور سے ٹراونکور اور کلکتے سے کراچی تک ریل میں سفر کرنے والا کوئی مسافر ہو گا جو اس نحوستوں سے لبریز گانے اور اس کی خانہ برباد لے سے نا آشنا ہو۔ جب سے برصغیر میں ریل اور یتیم خانے آئے ہیں، یہی ایک دُھن چل رہی ہے۔ اسی طرح برصغیر ہندو پاکستان میں کوئی آدم آزار شخص مثنوی مولانا روم کی ایسی

اسطوخودوس[1] مولویانہ دُھن کمپوز کر گیا ہے کہ پانچ سو سال سے اوپر گزر گئے، اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ شعر کو اس طرح ناک سے گا کر صرف وہی مولوی پڑھ سکتا ہے جو گانے کو واقعی حرام سمجھ کر گاتا ہو۔ کسی شخص کو گانے، تصوف، فارسی اور مولوی، چاروں سے بیک وقت متنفّر کرنا ہو تو مثنوی کے دو شعر اس دُھن میں سنوا دیجیے۔ "سنا دیجیے" ہم نے اس لیے نہیں کہا کہ یہ لے صرف ایسے شخص کے گلے سے نکل سکتی ہے جس نے زندگی میں کسی ایرانی کو فارسی بولتے نہ سنا ہو اور جس کے گلے سے مفت کی مرغی کے علاوہ کوئی چیز نہ اُتری ہو۔

دوسرا منظر: یتیم خانے کا بینڈ بج رہا ہے۔ آگے آگے سر کو دائیں بائیں جھلاتا بینڈ ماسٹر چل رہا ہے۔ جس طرح پہلوان، فوج کے جوان اور بے کہی لڑکیاں سینہ نکال کے چلتی ہیں، اسی طرح یہ پیٹ نکال کر چل رہا ہے۔ کچھ لڑکوں کے ہاتھ میں پیتل کے بھونپو نما باجے ہیں جو جلیبی اور Angry Young Men کی

---

[1] اسطوخودوس: اس کے لغوی معنی تو ظاہر ہے کچھ اور ہیں۔ مرزا یہ لفظ اس کے صوتیاتی کڈھب پن کے سبب اکثر استعمال کیا کرتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہاں ادا کرنا مقصود ہے وہ کسی اور لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ یقین نہ آئے تو آپ اس کی جگہ کوئی اور لفظ جڑ کر دیکھ لیں۔ ویسے لغت میں اس کے معنی ہیں: نزلے اور پاگل پَن کی ایک دوا جسے اطبّا دماغ کی جھاڑو کہتے ہیں!

طرح پیچ و تاب کھا کے بالآخر بڑی آنت کی شکل میں اختتام پزیر ہوتے ہیں۔ یوں تو ان باجوں کی ٹونٹی لڑکوں نے اپنے ہونٹوں سے لگا رکھی ہے، لیکن انھیں پھونکنے، دھونکنے کا غریبوں میں دَم درود کہاں۔ لہٰذا بیشتر وقت ڈھول اور بانسری ہی بجتی رہتی ہے۔ بعض وقت بانسری کی بھی سانس اکھڑ جاتی ہے اور تنہا ڈھول سارے آرکسٹرا کے فرائض انجام دیتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ایسا بینڈ باجا تو خدا دشمن کی شادی میں بھی نہ بجوائے۔ بینڈ کی اجاڑ دھن بھی برصغیر کے طول و عرض میں ایک ہی تھی۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے بینڈ میں چند دلچسپ فرق تھے۔ مثلاً یہی کہ مسلمان بالعموم مجیرے نہیں بجاتے تھے۔ اور ہندوؤں کے اناتھ آشرم کے بینڈ میں ڈھول بجانے والا اتنی مستی سے گھوم گھوم کے ڈھول نہیں پیٹتا تھا کہ ترکی ٹوپی کا پھندنا ہر ضرب پر ۳۶۰ ڈگری کا چکر لگائے۔ ہندو یتیم لڑکے پھندنے کے بجائے اپنی اصلی چوٹیاں استعمال کرتے تھے۔ دوم، ہندوؤں میں یہ بینڈ صرف اناتھ آشرم کے یتیم بجاتے تھے۔ مسلمانوں میں یتیم ہونے کی شرط نہیں تھی۔ چنانچہ کراچی کے بعض اسکولوں میں ہم نے اسکول بینڈ کو اسپورٹس ڈے پر marching songs بھی اسی دھن میں بجاتے ہوئے سنا ہے:

ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے، ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے

کچھ علاج اس کا، "شہنشاہِ غزل!" ہے کہ نہیں؟

اس لائن (ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے) کی خوبی یہ ہے کہ اس کے سات الفاظ، چار اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہیں اور یہ چاروں ہی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے بھی / اک روز / ماں باپ / تھے۔ آپ کسی بھی جزو پر زور دے کر پڑھیں، بے کسی اور نحوست کا ایک نیا پرت ابھرے گا۔ حد یہ کہ تنہا "تھے" بھی پوری لائن کے تاکیدی معنی، رخ اور لہجہ بدل کے رکھ دے گا۔ تھے ے ے ے! ایسے چوکھے مصرعے بڑے بڑے شاعروں کو نصیب نہیں ہوتے۔ البتہ مہدی حسن اپنی گائیکی سے شعر کے جس لفظ کو چاہیں کلیدی بنا دیتے ہیں۔ ان میں جہاں ایک ہزار ایک خوبیاں ہیں وہاں ایک بری عادت یہ پڑ گئی ہے کہ اکثر اپنی سخن فہمی کا ثبوت دینے کے لیے شعر کا کوئی سا لفظ جس پر انہیں کلیدی ہونے کا شبہ ہو جائے، پکڑ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ الاپ روک کے سامعین کو نوٹس دیتے ہیں کہ اب ذرا جگر تھام کے بیٹھو۔ گنجینہ معنی کا طلسم دکھاتا ہوں۔ پھر آدھ گھنٹے تک اس لفظ کو جھنجھوڑتے بھنبھوڑتے ہیں۔ اسے طرح طرح سے پٹخنیاں دے کر ثابت کرتے ہیں کہ سارا مفہوم اس ایک لفظ میں بند ہے۔ باقی تمام الفاظ فقط طبلہ بجانے کے لیے ہیں۔ یعنی صرف شعر کا وزن پورا کرنے اور ٹھیکا لگانے

کے لیے۔ مقصد یہ جتانا ہوتا ہے کہ میں شعر سمجھ کر ہی نہیں، سمجھا سمجھا کر گا رہا ہوں۔ ان کی دیکھا دیکھی اوروں نے خود سمجھے بغیر ہی سمجھا سمجھا کر گانا شروع کر دیا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ مہدی حسن کبھی اس لفظ کو کھدیڑتے ہوئے راگ اور غزل کی No۔ man's ۔ land (نہ تیری نہ میری زمین) میں چھوڑ آتے ہیں۔ اور کبھی "کبڈی! کبڈی!" کہتے ہوئے اسے اپنے پالے میں لے آتے ہیں۔ پھر فری اسٹائل میں اس کے مختلف حصّوں کو کو اپنی طاقت اور سامعین کی برداشت کی حد تک توڑتے، مروڑتے اور کھینچتے ہیں۔ وہ بے دَم ہو کے سَت چھوڑ دے تو اسے پھپھیڑنے لگتے ہیں۔ ابھی، لمبی سی گٹکری کے بعد، عجیب سا منھ بنائے، اسے پپول پپول کے دیکھ رہے تھے اور اپنی ہی لذّت سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ ذرا دیر میں اس کی ہڈی تک چچوڑ کے طبلہ نواز کے سامنے پھینک دی کہ استاد، اب کچھ دیر جُگل بندی ہو جائے۔ کبھی حرفِ سادہ کے راگ انگ جی بھر کے جھنجھوڑنے کے بعد اس کی چھاتی پہ اپنے ریشمی کُرتے، زرین واسکٹ اور ہارمونیم سمیت چڑھ جاتے ہیں۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا ہے تو چوم چاٹ کے واپس لِٹا دیتے ہیں :

چمٹے رہو سینے سے ابھی رات پڑی ہے

پھر وہ ساعتِ نایاب بھی آتی ہے جب یہ راگ بھوگی، اس کے منھ میں اپنی زبان اس طرح رکھ دیتا ہے کہ راگنی چیخ اٹھتی ہے:

تم اپنی زبان مرے منھ میں رکھے، جیسے پاتال سے مری جان کھینچتے ہو

بالآخر گھنٹوں رگیدنے کے بعد اسے تھپڑ مار کے چھوڑ دیتے ہیں کہ "جا! اب کے چھوڑ دیا۔ آئندہ یاروں کے سامنے اس طرح نہ آئیو"۔

جس کو ہو دِین و دل عزیز مرے گلے میں آئے کیوں

اچھا! آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں

بشارت کا تقرر تو بحیثیت اُردُو ٹیچر ہوا تھا، لیکن انہیں ٹیچروں کی کمی کے سبب تقریباً سبھی مضامین پڑھانے پڑتے تھے، سوائے دینیات کے۔ جامع مسجد دھیرج گنج کے پیش امام نے فتوٰی دیا تھا کہ جس شخص کے گھر کتّا ہو، وہ دینیات پڑھائے تو پڑھنے والوں پر غسل واجب ہو جاتا ہے بشارت کی ریاضی، جیومیٹری اور انگریزی بہت کمزور تھی، لیکن وہ اس ہینڈی کیپ سے ذرا جو پریشان ہوتے ہوں۔ پڑھانے کا گُر انھوں نے اپنے استاد ماسٹر فاخر حسین سے سیکھا تھا۔ ماسٹر

فاخر حسین کا اپنا مضمون (بزعمِ خود) تاریخ تھا۔ لیکن انہیں اکثر ماسٹر مینڈی لال، انگلش ٹیچر کی کلاس بھی لینی پڑتی تھی۔ ماسٹر مینڈی لال کا گُردہ اور گریمر دونوں جواب دے چکے تھے۔ اکثر دیکھا کہ جس دن نویں دسویں کلاس کی گریمر کی کلاس ہوتی، وہ گھر بیٹھ جاتا۔ اس کے گردے میں گریمر کا درد اُٹھتا تھا۔ سب ٹیچر اپنے مضمون کے علاوہ کوئی اور مضمون پڑھانے سے کچیاتے تھے۔ ماسٹر فاخر حسین واحد استاد تھے جو ہر مضمون پڑھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، حالانکہ انہوں نے بی اے "وایا بھٹنڈہ" کیا تھا۔ مطلب یہ کہ پہلے منشی فاضِل کیا۔ انگلش گریمر انہیں بالکل نہیں آتی تھی۔ وہ چاہتے تو انگریزی کا سارا گھنٹا ہنس بول کر یا پند و نصائح میں گزار سکتے تھے۔ لیکن ان کا ضمیر ایسی دفعہ الوقتی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے استادوں کی طرح لڑکوں کو مصروف رکھنے کی غرض سے وہ املا بھی لکھوا سکتے تھے۔ مگر اس حیلے کو وہ اپنے تبحرِ علمی اور منصبِ عالمانہ کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ جس بھاری پتھر کو سب چوم کر چھوڑ دیتے، اسے یہ گلے میں ڈال کر بحرِ علوم میں کود پڑتے۔ پہلے گریمر کی اہمیت پر لکچر دیتے ہوئے یہ بنیادی نکتہ بیان کرتے کہ ہماری گائیکی کی بنیاد طبلے پر ہے۔ گفتگو کی بنیاد گالی پر۔۔ اسی طرح انگریزی کی اساس گریمر ہے۔ اگر کمال حاصل کرنا ہے تو پہلے بنیاد مضبوط کرو۔ ماسٹر فاخر حسین کی اپنی انگریزی کی عمارت فنِ تعمیر کے کمال کا

نادر نمونہ اور یکے از ہفت عجائباتِ عالم تھی۔ مطلب یہ کہ بغیر نیو کی تھی۔ بیشتر جگہ تو چھت بھی نہیں تھی۔ اور جہاں تھی، اسے چمگادڑ کی طرح اپنے پیروں کی اَڑواڑا[1] سے تھام رکھا تھا۔ اس زمانے میں انگریزی بھی اُردُو میں پڑھائی جاتی تھی۔ لٰہذا کچھ گرتی ہوئی دیواروں کو اُردُو اشعار کے بر محل پشتے تھامے ہوئے تھے۔ بہت ہی منجھے اور گِھسے ہوئے ماسٹر تھے۔ سخت سے سخت مقام سے آسان گزر جاتے تھے۔ مثلاً parsing کروا رہے ہیں۔ اپنی دانست میں نہایت آسان سوال سے ابتدا کرتے۔ بلیک بورڈ پر To go لکھتے اور لڑکوں سے پوچھتے، اچھا بتاؤ یہ کیا ہے؟ ایک لڑکا ہاتھ اٹھا کر جواب دیتا، simple infinitive!، اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے فرماتے، بالکل ٹھیک۔ لیکن دیکھتے کہ دوسرا اٹھا ہوا ہاتھ ابھی نہیں گرا۔ اس سے پوچھتے، آپ کو کیا تکلیف ہے؟ وہ کہتا، نہیں سر noun infinitive! ہے! فرماتے، اچھا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ کلاس کا سب سے ذہین لڑکا ابھی تک ہاتھ اٹھائے ہوئے ہے۔ اس سے کہتے، آپ کا سگنل ابھی تک ڈاؤن نہیں ہوا۔ کہیے، کہیے! وہ کہتا یہ Gerundial infinitive ہے جو reflexive verb سے مختلف ہوتا

[1] اَڑواڑ: وہ لکڑی جو پرانی چھت کے نیچے گر پڑنے کے خوف سے لگا دیتے ہیں۔

ہے۔ Nesfield گریمر میں لکھا ہے۔ اس مرحلے پر ماسٹر فاخر حسین پر واضح ہو جاتا کہ

گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

لیکن بہت سہج اور نکتہ فہم انداز میں فرماتے، اچھا! تو گویا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں! اتنے میں نظر اس لڑکے کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر پڑی جو ایک کانوینٹ سے آیا تھا اور فر فر انگریزی بولتا تھا۔ اس سے پوچھا !Well! Well! Well، اس نے جواب دیا :

Sir! I am afraid, this is an intransitive verb.

فرمایا، اچھا! تو گویا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں! پھر آئی ایم افریڈ کے محاورے سے ناواقفیت کے سبب بڑے مشفقانہ انداز میں پوچھا، عزیز من! اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟

موصوف اکثر فرماتے کہ انسان کو علمی تحقیق و تفحص کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ خود انھوں نے ساری عمر بارہ دری میں گزاری۔ اب ایسے استاد کہاں سے لائیں جن کی لاعلمی پر بھی پیار آتا تھا۔

ماسٹر فاخر حسین سادہ دلانِ سلف اور اساتذہ پیشین کی حاضر جوابی کا آخری نمونہ تھے۔ ہر چند کہ ان کا علم مستحضر نہیں تھا، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ طبیعت حاضر نہ ہو۔

بشارت اکثر کہتے ہیں "ماسٹر فاخر حسین کا مبلغ علم مجھ جیسے نالائق شاگردوں تک سے پوشیدہ نہ تھا۔ میں زندگی میں بڑے بڑے پروفیسروں اور جید عالموں سے ملا ہوں۔ لیکن مجھے آج بھی چوائس دی جائے تو میں ماسٹر فاخر حسین ہی سے پڑھنا پسند کروں گا۔ صاحب، وہ آدمی تھا۔ کتاب نہیں، زندگی پڑھاتا تھا"۔

سیّد سیّد کہیں ہیں، سیّد کیا تم سا ہو گا؟

اب اس خاکے میں خواری کے مختلف شیڈ اور جزئیات بھرنا ہم آپ کے قیاس و تخیل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان حالات میں جیسا وقت گزر سکتا تھا، ویسا گزر رہا تھا۔ دسمبر میں اسکول کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا، جس کی اتنے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں کہ مولی مجّن کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ استادوں کی چڑھی ہوئی تنخواہوں کی ادائیگی تو درکنار، اس موضوع پر جھوٹ بھی بول سکیں۔ دسمبر کا مہینہ سالانہ قومی جلسوں، مرغابی کے شکار، بڑے دن پر "صاحب لوگوں" کو

ڈالیاں بھیجنے، پتنگ اڑانے اور ماءاللحم سہ آتشہ، معجونیں اور کُشتے کھانے اور ان کے نتائج سے مایوس ہونے کا زمانہ ہوتا تھا۔ ۳۰ نومبر کو مولی مجّن نے بشارت کو بلوایا تو وہ یہ سمجھے کہ شاید دستِ خاص سے تخلیے میں تنخواہ دیں گے تاکہ اور ٹیچروں کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ مگر وہ چھوٹتے ہی بولے کہ برخوردار، آپ اپنے اشعار میں پرائی بہو بیٹیوں کے بارے میں اپنے منصوبوں کا اظہار کرنے کے بجائے قومی جذبہ کیوں نہیں ابھارتے؟ اپنے مولانا حالی پانی پتی[1] نے کیا کہا ہے

---

[1] اپنے مولانا حالی: حالی اور سر سیّد احمد خان کو بوجوہ اپنے مولانا حالی اور اپنے سر سیّد کہتے تھے۔ سر سیّد کا تلفظ اضافت کے ساتھ یعنی "سرے سیّد" فرماتے۔ حالی کو تو وہ ایک لحاظ سے اپنا "گرائیں" سمجھتے، لیکن سر سیّد کو اپنا ہم پیشہ اور ہمسر گردانتے تھے۔ اساتذہ اور اہلِ غرض انھیں دھیرج گنج کا سر سیّد کہتے تو مولی مجّن اسے سر سیّد کے لیے باعثِ افتخار سمجھتے۔ سر سیّد پر انہیں یہ فضیلت بھی حاصل تھی کہ ان کے یعنی سر سیّد کے کالج فنڈ میں تو ان کی لاپروائی کے سبب ایک خزانچی نے غبن کر لیا تھا، جب کہ مولی مجّن کا کنٹرول اتنا سخت تھا کہ خود ان کے سوا کسی اور کو غبن کرنے کا سلیقہ و اختیار نہ تھا۔ ادھر مولانا حالی سے انھوں نے تین رشتے نکالے تھے۔ اوّل، حالی بھی انھی کی طرح گلے میں مفلر ڈالے رہتے تھے۔ دوم، حالی بھی انھی کی طرح اپنے دل میں قوم کا درد رکھتے تھے۔ سوم، حالی سے ان کا ایک ازار بندی رشتہ یہ نکلا کہ ان کی پہلی بیوی پانی پت کی تھیں۔ یہ دعوٰی یوں بھی درست معلوم ہوتا تھا کہ دوسری شادی کے بعد (اہل) خانہ جنگی کے سبب ان کی زندگی پانی پت کا میدان بن کر رہ گئی تھی، جس میں فتح ہمیشہ ہتھنیوں کی ہوتی تھی۔

ایسی شاعری کے بارے میں (چٹکی بجاتے ہوئے) کیا ہے وہ شعر؟ اماں، وہی سنڈاس والی بات؟

بشارت نے مری مری آواز میں شعر پڑھا :

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر

عفونت میں سنڈاس ہے جس سے بہتر

ان کی اہلیہ اور مولانا حالی کی مشترک غلطیاں

شعر سن کر فرمایا "جزاک اللہ! آپ کے ہاتھ میں اللہ نے شعر گھڑنے کا ہنر دیا ہے۔ اسے کام میں لائیے۔ سالانہ جلسے کے لیے یتیموں پر ایک زوردار نظم لکھیے۔ مسلم قوم کی بے حسی، سائنس پر مسلمانوں کے احسانات، سر سید کی قربانیاں، سلطنتِ انگلشیہ میں امن چین کا دور دورہ، چندے کی اہمیت، فتح اندلس اور تحصیل دار صاحب کی کارکردگی کا ذکر ہونا چاہیے۔ پہلے مجھے سنا دیجیے گا۔ وقت کم ہے"۔

بشارت نے کہا "معاف کیجیے۔ میں غزل کا شاعر ہوں۔ غزل میں یہ مضامین نہیں باندھے جاسکتے"۔

غضب ناک ہو کر بولے "معاف کیجیے۔ کیا غزل میں صرف پرائی بہو بیٹیاں باندھی جا سکتی ہیں؟ تو پھر سُنیے۔ پچھلے سال جو اُردُو ٹیچر تھا وہ ڈسمس اسی بات پر ہوا۔ وہ بھی آپ کی طرح شاعری کرتا تھا۔ میں نے کہا تقسیمِ انعامات کے جلسے میں بڑے بڑے لوگ آویں گے۔ ہر معطّی اور بڑے آدمی کی آمد پر پانچ منٹ تک یتیم خانے کا بینڈ بجے گا۔ اب ذرا یتیموں کی حالتِ زار اور یتیم خانے کے فوائد اور خدمات پر ایک پھڑکتی ہوئی چیز ہو جائے۔ تمھاری آواز اچھی ہے۔ گا کے پڑھنا۔ عین جلسے والے دن منمناتا ہوا آیا۔ کہنے لگا، بہت سر مارا پر بات نہیں بنی۔ ان دنوں استحضار نہیں ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا بلا ہوتی ہے؟ بولا طبیعت حاضر نہیں ہے۔ میں نے کہا اماں، حد ہو گئی۔ گویا اب ہر چپڑ قنات ملازم کی طبیعت کے لیے علاحدہ سے رجسٹرِ حاضری رکھنا پڑے گا۔ کہنے لگا، بہت شرمندہ ہوں۔ ایک دوسرے شاعر کی نظم، حسبِ حال، ترنم سے پڑھ دوں گا۔ میں نے کہا چلو، کوئی بات نہیں، وہ بھی چلے گی۔ باپ رے باپ! اس نے تو حد کر دی۔ بھرے جلسے میں اپنے مولانا حالی پانی پتی کی "مناجاتِ بیوہ" کے بند کے بند پڑھ ڈالے۔ ڈائس پر میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے آنکھ سے، کہنی کے ٹھوکے سے، کھنکھار کے، بہتیرے اشارے کیے کہ بندہ خدا! اب تو بس کر۔ حد یہ کہ میں نے دائیں کولھے پر چٹکی لی تو بایاں بھی میری طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ اسکول کی

بڑی بھد ہوئی۔ سب منھ پر رومال رکھے ہنستے رہے، مگر وہ آسمان کی طرف منھ کر کے رانڈ بیواؤں کی جان کو روتا رہا۔ ایک میراثی نے جس کے ذریعے میں نے رقعے تقسیم کروائے تھے، مجھے بتایا کہ ''مناجاتِ بیوہ'' میں اس بے حیا نے دو تین سُر راگ مالکونس کے بھی لگا دیے۔ ان لوگوں نے دل میں کہا ہوگا کہ شاید میں مولانا حالی کی آڑ میں وِدھوا آشرم یا بیوہ خانہ کھولنے کے لیے زمین ہموار کر رہا ہوں۔ بعد کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا تو کہنے لگا، سب دیوان کھنگال ڈالے، یتیموں پر کوئی نظم نہیں ملی۔ ستم یہ کہ میر تقی میر جو خود بچپنے میں یتیم ہو گئے تھے، مثنوی در تعریف مادہ سگ اور موہنی بلّی پر تو نظم لکھ گئے، مگر معصوم یتیموں پر چھوٹے منھ سے ایک مصرع کہہ کے نہ دیا۔ اسی طرح مرزا غالب نے قصیدے لکھے، سہرے لکھے، بیسنی روٹی، ڈومنی اور چھالیا کی مدح میں پے در پے شعر کہے۔ حد یہ کہ دو کوڑی کی سپاری کو ''سرِ پستان پریزاد'' سے بھڑا دیا، مگر یتیمی کے بارے میں کم از کم نسخہ حمیدیہ میں تو مجھے ایک شعر نہیں ملا۔ جب ہر دیوان سے مایوس ہو گیا تو اچانک خیال آیا کہ یتیموں اور بیواؤں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مضمون واحد، مظلومیت مشترک۔ اندریں حالت، فدوی نے ''مناجاتِ بیوہ'' پڑھ دی۔ شاہکار نظم ہے۔ تین سال سے انٹرنس کے امتحان میں اس پر برابر سوال آرہے ہیں''۔ چنانچہ اندریں حالات میں نے بھی فدوی کو اس

کے شاہکار اور چولی دامن سمیت کھڑے کھڑے ڈسمس کر دیا۔ کچھ دن بعد اس حرام خور نے میرے خلاف انسپکٹر آف اسکولز کو عرضداشت جڑ دی کہ میں مولانا حالی کے کلام کو فحش سمجھتا ہوں! نیز، میں نے اس سے اپنے غسل کے لیے پانچ مرتبہ بالٹی میں پانی منگوایا۔ سراسر جھوٹ بولا۔ میں نے پندرہ بیس دفعہ منگوایا تھا۔ یہ بھی جھوٹ کہ بالٹی میں منگوایا تھا۔ گھڑے میں بھر کر چھلکاتا لایا تھا۔ وجہ غسل کے بارے میں بھی رکیک اور حاسدانہ حملے کیے۔ خیر، ایسی سناری چوٹوں سے تو یاروں کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ پر محکمہ تعلیمات نے اب مجھ سے تحریری جواب طلب کیا ہے کہ "آپ کو مولانا حالی کی مسدّس اور مناجاتِ بیوہ پر کیا اعتراض ہے، جب کہ سرکار نے اسے کورس میں بھی داخل کر رکھا ہے۔ ان حصّوں کی نشاندہی کیجیے جن کو آپ قابلِ اعتراض گردانتے ہیں۔ اب آپ میری کمک پر آگئے ہیں تو اس کا جواب بھی لکھ دیجیے۔ مگر اعتراض ایسے ہونے چاہییں کہ منھ پھر جائے۔ اٹھائے نہ اٹھیں۔ دو چار غلطیاں زبان کی بھی نکال دیجیے گا۔ آخر کو پانی پت کے تھے۔ پانی پت پن نہیں جاتا۔ میرے گھر میں سے بھی وہیں کی ہیں۔ ان سے گفتگو کر کے آپ پر مولانا کی زباں دانی کا سارا بھرم کھل جائے گا۔

ٹیڑھی انگلی والے لوگ

مولوی مظفّر کی خامیاں بالکل آشکارا، مگر خوبیاں نگاہوں سے پوشیدہ تھیں۔ وہ بشارت کے اندازے اور اندیشے سے کہیں زیادہ ذہین کائیاں نکلے۔ ایسے ٹھوٹ جاہل بھی نہیں تھے جیسا کہ ان کے دشمنوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ جہاں دیدہ، مزاج شناس، حکّام رس، سخت گیر۔ رہن سہن میں ایک سادگی اور سادگی میں ایک ٹیڑھ۔ عقدِ ثانی کے علاوہ اور کوئی کبیرہ بدپرہیزی ان سے منسوب نہ تھی۔ کانوں اور قول کے کچے، مگر دُھن کے پکے تھے۔ انھی کا حوصلہ تھا کہ دس بارہ سال سے وسائل کے بغیر لشتم پشتم اسکول کو چلا رہے تھے۔ اسے چلانے کے لیے ان کے ضابطہ اخلاق میں ہر قسم کی دھاندلی روا تھی۔ ان کے طریقِ کار میں عیب نکالنے کے لیے زیادہ عالم الغیب بلکہ عالم العیب ہونے کی شرط نہ تھی کہ وہ بالکل عیاں تھے، مگر جو کام وہ کر گئے وہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اکثر فرماتے کہ ”صاحب زادے، سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا“۔ مگر ایسے لوگوں کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ گھی نکال چکنے کے بعد بھی ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہی رہتی ہیں۔ اور انگلیاں ٹیڑھی رکھنے میں جو مزا انہیں آتا ہے وہ سچ پوچھیے تو گھی نکال کر کھانے میں بھی نہیں آتا۔ یہ حضرات التّحیات کے دوران اشہد ان لا الہ الا اللہ

پڑھتے وقت اللہ کے وجود اور وحدانیت کی شہادت بھی ٹیڑھی انگلی ہی سے دیتے ہیں!

رانڈ کڑھی

اسکول کی مالی حالت خراب بتائی جاتی تھی۔ ماسٹروں سے آئے دن دردمندانہ اپیل کی جاتی کہ آپ دل کھول کر چندہ اور عطیات دیں تاکہ آپ کو تنخواہیں دی جاسکیں۔ پانچ چھ مہینے کی ملازمت کے دوران میں انھیں علی الحساب کل ساٹھ روپے ملے تھے جو اسکول کی اکاؤنٹ کی کتابوں میں انکے نام بطور قرضِ حسنہ دکھائے گئے تھے۔ اب انھیں تنخواہ کا تقاضا کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا، اسلیے کہ قرضِ حسنہ بڑھتا چلا جارہا تھا۔ ادھر تنخواہ جتنی چڑھتی جاتی ادھر مولی مجّن کا لہجہ ریشم اور باتیں لچھے دار ہوتی جاتیں۔ ایک دن بشارت نے دبے الفاظ میں تقاضا کیا تو کہنے لگے "برخوردار" میں مِثل تمہارے باپ کے ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، تم اس کوردہ میں اتنے روپے کا کیا کروگے؟ چھڑے چھٹانک آدمی ہو۔ اکیلے گھر میں بے تحاشا نقدی رکھنا جوکھم کا کام ہے۔ رات کو تمہاری طرف سے مجھے ڈر ہی لگا رہتا ہے۔ سلطانہ ڈاکو نے تباہی مچا رکھی ہے"۔

بہر حال، اس تقاضے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ دوسرے دن سے انھوں نے ان کے گھر ایک مٹکی چھاچھ روزانہ بھیجنی شروع کر دی۔

تحصیل دار نے روپے پیسے سے تو کبھی سلوک نہیں کیا، البتہ ایک دو چنگیر پالک یا چنے کا ساگ، کبھی ہرن کی ران کبھی ایک گھڑا رساول یا دو چار بھیلیاں تازہ گُڑ کی ساتھ کر دیتا تھا۔ عید پر ایک ہانڈی سندیلے کے لڈوؤں کی اور بقر عید پر ایک بوک بکرے کی سری بھی دی۔ اُترتی گرمیوں میں چار تربوز پھٹی بوری میں ڈلوا کر ساتھ کر دیے۔ ہر قدم پر نکل نکل پڑتے تھے۔ ایک کو پکڑتے تو دوسرا لڑھک کر کسی اور سمت بدراہ ہو جاتا۔ جب باری باری سب تڑخ گئے تو آدھے رستے میں ہی بوری ایک پیاؤ کے پاس پٹک کے چلے آئے۔ ان کے بہتے شیرے کو ایک پیاسا سانڈ جو پنڈت جگل کشور نے اپنے والد کی یاد میں چھوڑ رکھا تھا اس وقت تک انہماک سے چاٹتا رہا جب تک کہ ایک الھڑ بچھیا نے اس کی توجہ کو خوب سے خوب تر کی طرف منعطف نہ کر دیا۔

جنوری کی مہاوٹ میں ان کے خس پوش مکان کا چھپر ٹپکنے لگا تو تحصیل دار نے دو گاڑی پنی کے پولے اور اَستر کے لیے سِرکیاں مفت ڈلوا دیں۔ اور چار چھپر بند بیگار میں پکڑ کر لگا دیے۔ قصبے کے تمام چھپر بارش، دھوپ اور دھویں سے سیاہ

پڑ گئے تھے۔ اب صرف ان کا چھپر سنہرا تھا۔ بارش کے بعد چمکیلی دھوپ نکلتی تو اس پر کرن کرن اشرفیوں کی بوچھار ہونے لگتی۔ اس کے علاوہ تحصیل دار نے لحاف کے لیے باریک دُھنکی ہوئی روئی کی ایک بوری اور مرغابی کے پروں کا ایک تکیہ بھی بھیجا جس کے غلاف پر نازو نے ایک گلاب کا پھول کاڑھا تھا۔ (بشارت اس تکیے پر الٹے یعنی پیٹ کے بل سوتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھول پر ناک اور ہونٹ رکھ کر) تحصیل کے دواب خانے (کانجی ہاؤس) میں ایک شورہ پشت چودھری کی دودھیل بکری کو آوارہ اور لاوارث قرار دے کر دو ہفتے سے بند کر رکھا تھا۔ جب اس کے دانے اور چارے کا سرکاری خرچ اس کی قیمت سے تجاوز کر گیا تو اس کی زنجیر بشارت کے ہاتھ میں پکڑا دی کہ آج سے تمہاری ہوئی۔ مگر انھوں نے دو وجہوں سے قبول نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے ہی چھاچھ پی پی کے اور رانڈ کڑھی[1] کھا کھا کے میری تو آنکھیں پیلی اور شاعری پتلی پڑ گئی ہے۔ اب مزید کسی رقیق شے کی گنجائش نہیں۔ دوم، میں خود تو روپے اور روٹی کے بغیر بھی شاعری اور ڈیوٹی انجام دے سکتا ہوں، لیکن بکری ان حالات میں دودھ تو درکنار مینگنی بھی نہیں دے سکتی۔

---

[1] رانڈ کڑھی: وہ کڑھی جو اپنے خصم کو کھا جائے یعنی جس میں پھلکیاں نہ ہوں۔

لارڈ بلجی

بشارت نے ایک دفعہ یہ شکایت کی کہ مجھے روزانہ دھوپ میں تین میل پیدل چل کر آنا پڑتا ہے تو تحصیل دار نے اسی وقت ایک خچر ان کی سواری میں لگانے کا حکم صادر کیا۔ یہ اَڑیل خچر اس نے نیلام میں آرمی ٹرانسپورٹ سے خریدا تھا۔ اب بڑھاپے میں صرف اس لائق رہ گیا تھا کہ شورہ پشت جاٹوں، بیگار سے بچنے والے چماروں اور لگان اور مفت دودھ نہ دینے والے کاشتکاروں کا منھ کالا کر کے اس پر قصبے میں گشت لگوائی جاتی تھی۔ پیچھے ڈھول تاشے اور مجیرے بجوائے جاتے تاکہ خچر بدکتا رہے۔ اس پر سے گر کر ایک معتوب گھسیارے کی، جس نے مفت گھاس دینے میں پس و پیش کیا تھا، ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، جس سے وہ بالکل مفلوج ہو گیا۔ سواری کی بہ نسبت بشارت کو پیدل چلنا کہیں زیادہ پروقار و پر عافیت نظر آیا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر لارڈ ولزلی ہمرکاب نہ ہوتا تو تین میل کی مسافت بہت کھلتی۔ وہ راستے بھر اس سے باتیں کرتے جاتے۔ اس کی طرف سے جواب اور ہنکارہ بھی خود ہی بھرتے۔ پھر جیسے ہی نازو کا خیال آتا ان کی ساری تھکن اور کوفت دور ہو جاتی۔ ڈگ کی لمبائی آپ ہی آپ بڑھ جاتی۔ وہ تحصیل دار کے نٹ کھٹ لڑکوں کو اس وقت تک پڑھاتے رہے جب تک کہ وہ

واقعہ پیش نہ آیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ قصبے میں وہ اتالیق صاحب کہلاتے تھے۔ اور اس حیثیت سے ہر جگہ ان کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اہلِ معاملہ کو تحصیل دار سے سفارش کروانی ہوتی تو لارڈ ولزلی تک سے لاڈ کرتے۔ وہ رشوت کی دودھ جلیبی کھا کھا کے اتنا موٹا اور کاہل ہو گیا کہ صرف دُم ہلاتا تھا۔ بھونکنے میں اب اسے آلکس اور خوف آنے لگا تھا۔ اس کا "کوٹ" ایسے چمکنے لگا جیسا ریس کے گھوڑوں کا ہوتا ہے۔ قصبے میں وہ لاٹ لجلجی کہلاتا تھا۔ جلنے والے البتہ بشارت کو تحصیل دار کا ٹیپو کہتے تھے۔ نازو نے جاڑے میں ولزلی کو اپنی پرانی صدری قطع و برید کرکے پہنادی تو لوگ اُترن پر ہاتھ پھیر پھیر کر کتّے سے شفقت فرمانے لگے۔ مولی مجّن کو ایک بری عادت یہ تھی کہ استاد پڑھا رہے ہوتے تو درّانا کلاس روم میں داخل ہو جاتے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ٹھیک پڑھا رہے ہیں یا نہیں لیکن بشارت کی کلاس میں کبھی نہیں آتے تھے اس لیے کہ ان کے دروازے پر ولزلی پہرہ دیتا رہتا تھا۔

واقفیت بڑھی اور بشارت شکار میں تحصیل دار کی اردلی میں رہنے لگا تو ولزلی جھیل میں تیر کر زخمی مرغابی پکڑنا سیکھ گیا۔ تحصیل دار نے کئی مرتبہ فرمائش کی، یہ کتّا مجھے دے دو۔ بشارت ہر دفعہ اپنی طرف اشارہ کرکے ٹال جاتے کہ یہ سگ حضوری، مع اپنے کتّے کے، آپ کا غلام ہے۔ آپ کہاں کی ٹہل سیوا، مگنے

موتنے کی کھکھیڑ میں پڑیں گے۔ جس دن سے تحصیل دار نے ایک قیمتی کالر لکھنؤ سے منگوا کر اسے پہنایا تو اس کا شمار شہ کے مصاحبوں میں ہونے لگا اور بشارت شہر میں اتراتے پھرنے لگے۔ لیکن اس کے شریف النسل ہونے میں کوئی کلام نہ تھا کہ اس کا pointer جَد ٹیپو (کلاں) الٰہ آباد ہائی کورٹ کے انگریز جج کا پروردہ تھا۔ وہ جب انگلستان جانے لگا تو اسے اپنے ریڈر کو بخش دیا۔ ولزلی اسی کی اولاد تھا جو دھیرج گنج آ کر یوں گلی گلی خراب و خوار ہو رہا تھا۔

مولی مجّن کو ولزلی زہر لگتا تھا۔ فرماتے تھے کہ "اوّل تو کتّے کی ذات ہے۔ کتّا اصحابِ کہف کا ہو تب بھی کتّا ہی رہتا ہے۔ پھر اسے تو ایسا ٹرین کیا کہ واللہ صرف اشرافوں کو کاٹتا ہے!" اس میں شک نہیں کہ جب وہ مولی مجّن پر بھونکتا تو بہت ہی پیارا لگتا تھا۔ اب وہ واقعی اتنا ٹرینڈ ہو گیا تھا کہ بشارت حکم دیتے تو اسٹاف روم سے ان کا رولر منھ میں دبا کر لے آتا۔ مولی مجّن کا بیان تھا کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس پلید کو رجسٹر حاضری لے جاتے دیکھا (لیکن تحصیل دار اور rabies کے ڈر سے کچھ نہ بولے۔ ایک چینی دانا کا قول ہے کہ کتّے پر ڈھیلا کھینچ کر مارنے سے پہلے یہ ضرور تحقیق کر لو کہ اس کا مالک کون ہے)۔

اطوار و طریقہ واردات کے لحاظ سے ولزلی دوسرے کتّوں سے بالکل مختلف تھا۔ گھر میں کوئی اجنبی داخل ہو تو کچھ نہیں کہتا تھا۔ لیکن جب وہ واپس جانا چاہتا تو کسی طرح نہیں جانے دیتا تھا۔ اس کی ٹانگ اپنی زنبور میں پھنسا کر کھڑا ہو جاتا۔

ٹیچر حضرات یتیم خانے کو کھا گئے!

رفتہ رفتہ مولی مجّن نے قرضِ حسنہ سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ اور خود بھی کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ ایک دن بشارت چاک میں لت پت، ڈسٹر ہاتھ میں اور رجسٹر بغل میں دبائے کلاس روم سے نکل رہے تھے کہ مولی مجّن انھیں آستین پکڑ کے اپنے دفتر میں لے گئے اور الٹے سر ہو گئے۔ غالباً ''حملہ کرنے میں پہل بہترین دفاع ہے'' والی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ کہنے لگے ''بشارت میاں، ایک مدّت سے آپ کی تنخواہ چڑھی ہوئی ہے۔ اور آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اسکول ان حالوں کو پہنچ گیا۔ کچھ اُپائے کیجیے۔ یتیم خانے کے چندے کی مد سے ٹیچروں کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ ٹیچر حضرات یتیم خانے کو کھا گئے! ڈرتا ہوں آپ صاحبان کو یتیموں کی آہ نہ لگ جائے''۔ بشارت یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ کہنے لگے ''سات آٹھ مہینے ہونے کو آئے۔ کُل ساٹھ ستّر روپے ملے ہیں۔ دو دفعہ گھر سے منی آرڈر منگوا چکا ہوں۔ اگر اس پر بھی یتیموں کی آہ لگنے کا اندیشہ ہے تو اپنی

نوکری تہ کر کے رکھیے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے وہیں چارج دے دیا۔ مطلب یہ کہ ڈسٹر اور رجسٹر حاضری مولی مجّن کو پکڑا دیا۔

مولی مجّن نے یکلخت پینترا بدلا اور ڈسٹر ان کی تحویل میں واپس دے کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولے "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، برخوردار؟ قسم ہے وحدہ لا شریک کی! وہ رقم جسے آپ اپنے حسابوں ساٹھ ستّر بتا رہے ہیں، وہ بھی یتیموں کا پیٹ کاٹ کر، زکات اور صدقات کی مد سے نکال کر آپ کی نذر کی تھی۔ اس کا آپ یہ صلہ دے رہے ہیں! سر سیّد کو بھی آخری عمر ایسے ہی صدمے اٹھانے پڑے تھے جن سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ میں سخت جان ہوں۔ خیر۔ ذرا صبر سے کام لیجیے۔ اللہ نے چاہا تو بقر عید کی کھالوں سے سارا حساب یک مشت بے باق کر دوں گا۔ یتیموں کا حال آپ پر روشن ہے۔ غریب کندھوں پر چڑھ چڑھ کے میونسپلٹی کی لالٹینوں سے پلی دو پلی تیل نکالتے ہیں تب کہیں رات کو پڑھ پاتے ہیں۔ میونسپلٹی والوں نے تاڑ کے برابر اونچی بلیوں پہ لالٹینیں لٹکا دی ہیں تاکہ ان کے نیچے کوئی پڑھ نہ سکے۔ اب کوئی ان اللہ دین چراغ کی اولادوں سے پوچھے کہ تم نے لالٹین لٹکائی ہے یا اپنے بھانویں سوا نیزے پر آفتاب ٹانگا ہے۔ معصوم بچّے اس کی اندھی روشنی میں کیا تمھارے باپ کا کفن سییں گے۔ آپ کے آنے سے تین چار سال پہلے ایک یتیم لونڈا بلّی پر سے ایسا گرا کہ ہاتھ اور ٹانگ کی ہڈی پکی

ککڑی کی طرح ٹوٹ گئی۔ عبدالسلام کمنگر نے جوڑنے کی بہتیری کوشش کی، مگر پیپ پڑ گئی۔ کانپور لے جاکر، دست بخیر، یہاں سے (گھٹنے کے اوپر سے) ٹانگ کٹوانی پڑی۔ سیدھا ہاتھ جُڑنے کو تو جُڑ گیا، مگر اس طرح جیسے قرابت داروں میں ناچاقی کے بعد ٹوٹا ہوا تعلق جوڑا جاتا ہے۔ ہاتھ کی کمان سی بن گئی۔ دونوں سِروں پر تار باندھ دیں تو اس گز سے سارنگی بجا سکتا تھا۔ لولا لنگڑا لونڈا رفتہ رفتہ بری صحبت میں پڑ گیا۔ میں نے لنگڑ دین کو کان پکڑ کے نکال باہر کیا تو کانپور میں فقیروں کی ٹولی میں جا شامل ہوا۔ اور دوسرے لونڈوں کو بھی بہکانے لگا کہ "یار تم بھی بلّی پر سے چھلانگ لگا کے ادھر آجاؤ۔ بڑے مزے ہیں۔ یہاں برتن نہیں مانجھنے پڑتے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کے آموختہ نہیں سنانا پڑتا۔ رات کو کسی کے پیر نہیں دابنے پڑتے۔ روز روز سویم کے چنے پڑھ پڑھ کے خود ہی کھانے نہیں پڑتے۔ صبح کوئلے سے دانت نہیں مانجھنے پڑتے۔ بیڑی پینے کے لیے بار بار لوٹا لے کے پاخانے نہیں جانا پڑتا۔ جَے دفعہ (جتنی دفعہ) چاہو دھڑلے سے پیو اور دھویں کی گاڑی (ریل) کی طرح بھک بھک کرتے پھرو۔ غرض کہ یہاں عیش ہی عیش ہیں۔ کچھ بھی حرمزدگی کرو کوئی کچھ نہیں کہتا"۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ یہ اطوار ولد الزنا کی پہنچان ہیں۔ تو میں کہہ یہ رہا تھا، برخوردار، کہ یہ آپ کا اسکول ہے۔ آپ کا اپنا یتیم خانہ۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ آپ جس لگن اور تندہی سے کام کر

رہے ہیں وہ اندھے کو بھی نظر آتی ہے۔ آپ زندگی میں بہت آگے جائیں گے۔ اگر اسی طرح کام کرتے رہے تو انشاء اللہ العزیز بیس پچیس برس میں اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو جائیں گے۔ میں ٹھہرا جاہل آدمی۔ میں تو ہیڈ ماسٹر بننے سے رہا۔ اسکول کا احوال آپ کے سامنے ہے۔ چندہ دینے والوں کی تعداد گھٹ کر اتنی رہ گئی ہے کہ سر سیّد بھی ہوتے تو نواب محسن الملک کا اور اپنا سر پیٹ لیتے۔ مگر آپ سب مجھی پر غصّہ اتارتے ہیں۔ میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں۔ اکیلا چنا بھاڑ تو کیا خود کو بھی نہیں پھوڑ سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکول اور یتیم خانے کو امرا، رؤسا، تعلقہ داروں اور آس پاس کے شہروں میں روشناس کرایا جائے۔ لوگوں کو کسی بہانے بلایا جائے۔ ایک یتیم کا چہرہ دکھانا ہزار وعظوں اور لاکھ اشتہاروں سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔

یہ تو کارِ خیر ہے۔ کوئی سرکس یا آغا حشر کا کھیل تو ہے نہیں کہ اشتہار دیکھتے ہی آدمی ٹوٹ پڑیں۔ یقین جانیے جب سے ٹیچر صاحبان کی تنخواہیں رکی ہیں، میری نیند اُڑ گئی ہے۔ برابر صلاح مشورے کر رہا ہوں۔ آپ کو بھی کئی بار تاکید کر چکا ہوں کہ للہ اپنی تنخواہوں کی ادائیگی کی کوئی ترکیب جلد از جلد نکالیے۔ بہت غور وخوض کے بعد اب آپ ہی کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسکول کی مشہوری کے لیے ایک شاندار مشاعرہ ہونا از حد ضروری ہے۔ لوگ آج بھی

دھیرج گنج کو گاؤں سمجھتے ہیں۔ ابھی کل ہی ایک پوسٹ کارڈ ملا۔ پتے میں بمقام موضع دھیرج گنج لکھا تھا۔ موضع دھیرج گنج! واللہ خون کھولنے لگا۔ لوگ عرصے تک علی گڑھ کو بھی گاؤں سمجھتے رہے، تاوقتیکہ وہاں بائیسکوپ شروع نہیں ہوا اور موٹر کار کے ایکسی ڈنٹ میں پہلا آدمی نہ مرا۔

تقسیم کار کے باب میں انھوں نے وضاحت فرمادی کہ بشارت کے ذمّے صرف شاعروں کو لانا، لے جانا، قیام وطعام کا بندوبست، مشاعرے کی پبلسٹی اور مشاعرہ گاہ کا انتظام ہوگا۔ بقیہ تمام کام وہ تن تنہا انجام دے لیں گے۔ اس سے ان کی مراد صدارت تھی!

دھیرج گنج کا پہلا اور آخری مشاعرہ

مشاعرے کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ عمائدینِ دھیرج گنج کو مدعو کرنا، مصرع طرح اور شعرا کا انتخاب، شاعروں کو کانپور سے آخری ٹرین سے بصد احترام لانا اور مشاعرے کے بعد پہلی ٹرین سے دفان کرنا، مشاعرے سے پہلے اور مفت غزل پڑھنے تک ان کی خاطر مدارات کسی اور سے کروانا۔۔۔۔۔۔۔ اور اسی قسم کے فرائض جو سزا کا درجہ رکھتے تھے بشارت کے ذمے کیے گئے۔ شاعروں اور ان

کے اپنے آنے جانے کا ریل اور اِکّے کا کرایہ اور دھیرج گنج میں قیام و طعام، پان سگریٹ اور متفرق اخراجات کے لیے مولی مجّن نے بشارت کو دس روپے دیے اور تاکید کی کہ آخر میں خرچ سے جو رقم بچ رہے اس کو مشاعرے کے دوسرے روز مع رسیدات و گوشوارہ اخراجات واپس کر دی جائے۔ انہوں نے سختی سے یہ ہدایت بھی کی کہ شاعروں کو آٹھ آنے کا ٹکٹ خرید کر خود دینا۔ نقد کرایہ ہر گز نہ دینا۔ بشارت یہ پوچھنے ہی والے تھے کہ شاعروں کے ہاتھ خرچ، نذرانے کا کیا ہو گا کہ مولی مجّن نے ازخود یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ فرمایا شعرائے کرام سے یتیم خانے اور اسکول کے چندے کے لیے اپیل ضرور کیجیے گا۔ انہیں شعر سنانے میں ذرا حجاب نہیں آتا تو آپ کو کارِ خیر میں کاہے کی شرم۔ اگر آپ نے پھوہڑ پن سے کام نہ لیا تو ہر شاعر سے کچھ نہ کچھ وصول ہو سکتا ہے۔ مگر جو کچھ بھی وصول کرنا ہے مشاعرے سے پہلے ہی دھر والینا۔ غزل پڑھنے کے بعد ہر گز قابو میں نہیں آئیں گے۔ رات گئی بات گئی والا مضمون ہے۔ اور جو شاعر یہ کہے کہ وہ اٹھنی بھی نہیں دے سکتا تو واللہ اسے تو ہمارے یتیم خانے میں ہونا چاہیے۔ کانپور میں بیکار پڑا کیا کر رہا ہے؟

قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ ان تمام انتظامی امور کے سلسلے میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ سو اس کی ایک نہایت معقول وجہ تھی۔ ہیڈ ماسٹر

کو ملازم رکھتے وقت مولی مجّن نے صرف ایک شرط لگائی تھی۔ وہ یہ کہ ہیڈ ماسٹر اسکول کے معاملات میں قطعی دخل نہیں دے گا۔

اسے خود نمائی کہیے یا ناتجربہ کاری، بشارت نے مشاعرے کے لیے جو مصرع طرح انتخاب کیا وہ اپنی ہی تازہ غزل سے لیا گیا تھا۔ اس میں سب سے بڑا فائدہ تو یہ نظر آیا کہ مفت میں شہرت ہو جائیگی۔ دوسرے، انھیں مشاعرے کے لیے علاحدہ غزل پر مغزماری نہیں کرنی پڑے گی۔ یہ سوچ سوچ کر ان کے دل میں گُدگُدی ہوتی رہی کہ اچھے اچھے شاعر ان کے مصرعے پر گرہ لگائیں گے۔ بہت زور ماریں گے۔ گھنٹوں فکرِ سخن میں کبھی پیر پٹخیں گے۔ کبھی دل کو، کبھی سر کو پکڑیں گے اور شعر ہوتے ہی ایک دوسرے کو پکڑ کے بیٹھ جائیں گے۔ انھوں نے اٹھارہ شاعروں کو شرکت کے لیے آمادہ کرلیا، جن میں جوہر چغتائی الٰہ آبادی، کاشف کانپوری اور نشور واحدی بھی شامل تھے جو ازراہِ شفقت اور خورد نوازی رضامند ہو گئے تھے کہ بشارت کی نوکری کا سوال تھا، نشور واحدی اور جوہر الٰہ آبادی تو ان کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان دونوں کو انھوں نے اپنا مصرع طرح نہیں دیا، بلکہ غیر طرحی غزلیں پڑھنے کی درخواست کی۔ ایسا لگتا تھا کہ باقی ماندہ شعرا کے انتخاب میں انھوں نے صرف یہ التزام رکھا ہے کہ کوئی

شاعر ایسا نہ آنے پائے جس کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی اندیشہ ہو کہ ان سے بہتر شعر کہہ سکتا ہے۔

اِکّا کس نے ایجاد کیا؟

ان سب شاعروں کو دو اِکّوں میں بٹھا کر وہ کانپور کے ریلوے اسٹیشن پر لائے۔ جن قارئین کو دو اِکّوں میں اٹھارہ شاعروں کی "سارڈینز" بنانے میں زیادتی یا مبالغہ نظر آئے، انہوں نے غالباً نہ اِکّے دیکھے ہیں نہ شاعر۔ یہ تو کانپور تھا، ورنہ علیگڑھ ہوتا تو ایک ہی اِکّا کافی تھا۔ قارئین کی آسانی کے لیے ہم اس نادرالوجود اور محیّرالعقول سواری کا سرسری خاکہ کھینچے دیتے ہیں۔ پہلے غسلِ میت کے تختے کو کاٹ کے چوکور اور چورس کر لیں۔ پھر اس میں دو مختلف سائز کے بالکل چوکور پہیے اس یقین کے ساتھ لگا دیں کہ ان کے چلنے کے ساتھ علیگڑھ کی سڑکیں ہموار ہو جائیں گی اور اس عمل سے یہ خود بھی گول ہو جائیں گے۔ تختہ سڑک کے گڑھوں کی بالائی سطح سے چھ ساڑھے چھ فٹ اونچا ہونا چاہیے تاکہ سواریوں کے لٹکے ہوئے پیروں اور پیدل چلنے والوں کے سروں کی سطح ایک ہو جائے۔ چھوٹے پہیے کا قطر کم از کم پانچ فٹ ہو۔ پہیے میں سورج کی شعاعوں کی مانند جو لکڑیاں لگی ہوتی ہیں وہ اتنی مضبوط ہونی چاہییں کہ نئی سواری ان پر پاؤں رکھ کر

تختے تک ہائی جمپ کر سکے۔ پاؤں کے دھکے سے پہیے کو بھی اسٹارٹ ملے گا۔ اس کے بعد تختے میں دو بانسوں کے بم[1] لگا کر اس میں ایک لاغر گھوڑا کو لٹکا دیں، جس کی پسلیاں دور سے گن کر سواریاں یہ اطمینان کر لیں کہ پوری ہیں۔ لیجیے اِکّا تیار ہے۔ اس کے مذکورہ بالا چار اجزائے تخریبی کا ذکر آگے آئے گا۔

نہاری، رساول، جلی اور دھواں لگی فیرنی، محاورے، ساون کے پکوان، امریوں میں جھولے، ارہر کی دال، ریشمی دُلائی، غرارے، دوپلی ٹوپی، آلھا اودل اور زبان کے شعر کی طرح اکّا بھی یوپی کے خاصے کی چیزوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۳۵ء تک اپنے قیامِ علی گڑھ کے دوران ہم بھی اِکّے میں ذلیل و خوار ہو چکے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اِکّا کسی گھوڑے نے ایجاد کیا تھا۔ اسی لیے اس کے ڈیزائن میں یہ حکمت پوشیدہ رکھی کہ گھوڑے سے زیادہ مشقت سواری کو اٹھانی پڑے۔ اِکّے کی خوبی یہ تھی کہ زائد سواریوں کا بوجھ گھوڑے پر نہیں پڑتا تھا، بلکہ ان سواریوں پر پڑتا تھا جن کی گود میں وہ آ آ کر بیٹھتی جاتی تھیں[2]۔

---

[1] بم: اِکّے اور تانگے میں لگانے والی لکڑی جس میں گھوڑا جوتتے ہیں۔

[2] حضرت جوش ملیح آبادی ایسے اکّوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ تمام اس قدر ذلیل ہیں کہ ان پر اگر سکندرِ اعظم تک کو بٹھا دیا جائے تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کا بھڑوا نظر آنے لگے"۔

آپ نے دیکھا ہو گا مغربی "بیلے" میں بعض ایسے نازک مقام آتے ہیں کہ ڈانسر صرف پاؤں کے انگوٹھے کے بل کھڑی ہو کر ناچتی چلی جاتی ہے۔ سارے جسم کا بوجھ انگوٹھے پر ہوتا ہے اور چہرے پر کرب کے آثار کے بجائے مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ ایسی ہی مسرت بھری مہارت اور مہارت بھری مسرت کا مظاہرہ علی گڑھ میں دیکھا جہاں یونیورسٹی کے لڑکے اِکّے کے تختے سے باہر نکلی ہوئی بے پردہ کیل پر صرف ہاتھ کے انگوٹھے کے بل ادھَر بیٹھے گرلز کالج اور نمائش کا طواف کرتے تھے۔ زندگی میں کامیابی کا گُر بھی یہی بتایا جاتا ہے کہ جہاں انگوٹھا دھرنے کو جگہ مل جائے، وہاں خود کو سموچا دھانس دو۔

سڑک کوٹنے کے انجن سے تصادم

سواریاں ایک دوسرے کے جسم کے curves میں کنڈلی مار کے بیٹھ جاتی تھیں۔ اِکّا جب گھوڑے اور سواریوں سمیت کسی کھلے مین ہول کے اندر داخل ہونے میں ناکام رہتا تو، بقول دِلّی والوں کے، جانیں سی گھل جاتیں۔ سواریوں

غیر متوازن طرزِ بیان سے قطع نظر قابلِ غور نکتہ یہ کہ تحقیر کے آخری درجے پر نہ رنڈی فائز ہے نہ بھڑوا، دیہاتی ہے!

کے ہاتھ پاؤں اس طرح گتھے اور ایک دوسرے میں پروئے ہوئے ہوتے تھے جیسے دُھلائی کے بعد واشنگ مشین میں کپڑوں کی آستینیں اور ازار بند۔ اگر کسی ایک کو اترنا ہوتا تھا تو سب سواریوں کو اپنی اپنی گرہ اور قینچی کھولنی پڑتی تھی، جب کہیں جا کے وہ اس استخوانی شکنجے سے آزاد ہو کر چھ فٹ کی بلندی سے اکڑوں حالت میں چھلانگ لگاتا۔ اعضا باہم دگر خلط ملط ہونے کے علاوہ ایسے سُن ہو جاتے تھے کہ اگر کسی کے پنڈلی میں خارش ہو تو کھجا کھجا کے خونم خون کر دیتا مگر خارش مٹنے کا نام نہ لیتی۔ اس لیے کہ کھجائی ہوئی پنڈلی کسی اور کی ہوتی تھی۔ اِکّے کا اگر ایکسی ڈنٹ ہو جاتا تو اسے یا بالا نشین سواریوں کو کبھی گزند نہیں پہنچتا تھا۔ اس لیے کہ اوّل تو اِکّے میں ایسی کوئی چیز یا کل پرزہ نہیں ہوتا کہ اس کے ٹوٹ جانے یا نہ ہونے سے اِکّے کی کارکردگی میں مزید فرق آئے۔ دوم ٹکرانے والی کار یا سائیکل اس کے تختے کے نیچے سے ایسی رسان سے نکل جاتی کہ گھوڑے تک کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ گرہ گیر سواریوں کا گپھے کا گپھا جوں کا توں زمین پر گدسے رگبی کے scrum کی طرح آن پڑتا کہ مجال ہے ایک بھی سواری علیحدہ ہو جائے۔ ایسا ہی ایک منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ میں دیکھا۔ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ ہم ایک عدد بلیڈ خریدنے نکلے تھے جو ان دنوں نایاب تھا۔ ایک ایک دکان پر پوچھتے

پھر رہے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بیچ سڑک پر سات آٹھ سیاہ پیراشوٹ پرا باندھ کر اتر رہے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ ایک اِکّے کا، جس میں گرلز کالج کی لڑکیاں سوار تھیں، سڑک کوٹنے کے انجن سے ہیڈ آن کولیژن ہو گیا ہے اور لڑکیاں ہوا بھرے برقعوں کی مدد سے اِکّے کی بلندیوں سے با جماعت لینڈ کر رہی ہیں۔ اور لڑکے ترکی ٹوپیاں پہنے، سیاہ شیروانیوں کے بٹن نرخرے تک بند کیے، زخمیوں کو اٹھانے اور ابتدائی غیر طبی امداد، انسانی ہمدردی، دکھی انسانیت کی خدمت اور معاشقے کے لیے تیار واُمیدوار کھڑے ہیں۔

سوہارس پاور کی گالی سے اسٹارٹ

اِکّے کے پچھلے حصّے میں اتنی سواریاں لدی، ٹنگی، اٹکی ہوئی ہوتی تھیں کہ اگر گھوڑے کو ٹھوکر لگ جائے یا نقاہت سے بیہوش ہو جائے، تب بھی زمین پر نہیں گر سکتا تھا، اس لیے کہ پچھلی سواریاں اپنی اُلار سے اسے بے ہوش ہونے کے بعد بھی کھڑی حالت میں رکھتی تھیں۔ تختے پر گدی کا دستور نہیں تھا۔ جیسی چمک اس تختے پر نظر آئی ویسی آج تک قیمتی سے قیمتی لکڑی پر بھی نہیں دیکھی۔ وجہ یہ کہ پالش کا طریقہ قدرے مختلف تھا۔ اس پر روزانہ، کم از کم دس گیارہ گھنٹے مسلسل، پوسٹ گریجویٹ کولھوں سے پالش کی جاتی تھی۔ (جونیئر انڈر

گریجویٹ کو تو سینئر پوسٹ گریجویٹ کی گود میں جگہ ملتی تھی) اتنے چکنے اور پھسلنے تختے پر اگر گدی بچھادی جاتی تو پہلے ہی جھٹکے میں سواریاں اڑن گدیلے پر slide کرکے glide کرتی ہوئی راہ گیروں کے سروں پر لینڈ کرتیں۔ سواری کو اِکّے کا ڈنڈا پکڑ کر سڑک پر گھسٹتے ہوئے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس سے اِکّے کی رفتار سست پڑنے کا احتمال تھا۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ اِکّا گھوڑے کی طاقت سے چلتا تھا، کیوں کہ ہوتا یہ تھا کہ اِکّے والا نیچے اتر کر اسے ایک دھکے اور سو ہارس پاور کی گالی سے اسٹارٹ کرتا اور اسی کے زور سے یہ لڑھکتا رہتا تھا۔ گھوڑے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ اِکّے کو آگے لڑھکنے سے روک سکے۔

"خوشامدید!"۔۔۔ صحیح املا

دھیرج گنج کے پلیٹ فارم کو اسکول کے بچّوں نے رنگ برنگی جھنڈیوں سے اسطرح سجایا تھا جیسے پھوہڑ ماں، بچّی کا منھ دُھلائے بغیر بالوں میں شوخ ربن باندھ دیتی ہے۔ ٹرین سے اترتے ہی ہر شاعر کو گیندے کا ہار پہنا کر گلاب کا ایک ایک پھول اور اونٹتے دودھ کا گلاس پیش کیا گیا جسے ہاتھ میں لیتے ہی وہ بِلبلا کر پوچھتا، کہاں رکھوں؟ استقبال کرنے والوں نے پچیس میل اور ایک گھنٹے دور

کانپور سے آنے والوں سے پوچھا، ''سفر کیسا رہا؟ کانپور کا موسم کیسا ہے؟ ہاتھ منھ دھو کے تین چار گھنٹے سو لیں تو سفر کی تکان اتر جائے گی''۔ جواباً مہمانوں نے دریافت کیا'' یہاں مغرب کس وقت ہوتی ہے؟ دھیرج گنج والے تو مہمان نوازی کے لیے مشہور ہیں؟ یہاں کی کونسی سوغات مشہور ہے؟ روپے میں کَے مرغیئیں آتی ہیں؟ کیا یہاں کے مسلمان اتنے ہی پسماندہ ہیں جتنے باقیماندہ ہندوستان کے؟''

اٹھارہ شاعر اور پانچ مصرعہ اٹھانے والے جو ایک شاعر اپنے ہمراہ لایا تھا، دو بجے کی ٹرین سے دھیرج گنج پہنچے۔ ٹرین کی آمد سے تین گھنٹے پہلے ہی پلیٹ فارم پر یتیم خانہ شعاع الاسلام کا بینڈ بجنا شروع ہو گیا۔ لیکن جیسے ہی وہ آن کر رکی تو کبھی ڈھول، کبھی بانسری اور کبھی ہاتھی کی سونڈ جیسا باجا (ٹرمپٹ) بند ہو ہو جاتا۔ اور کبھی تینوں ہی خاموش ہو جاتے۔ صرف بینڈ ماسٹر چھڑی ہلاتا رہ جاتا۔ وجہ یہ کہ ان سازوں کو بجانے والے لڑکوں نے اس سے پہلے انجن کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھنے میں بار بار اتنے محو ہو جاتے کہ بجانے کی سُدھ نہ رہتی۔ انجن ان کے اتنے قریب آ کر رکا تھا کہ ایک ایک پُراسرار پُرزہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سیٹی بجانے والا آلہ، کوئلے جھونکنے کا بیلچہ، بوائلر کے دہکتے چٹختے کوئلوں کا تیز اور انگریزی دواؤں کی بو جیسا بھبھکتا جھونکا۔ شعلوں کی آنچ

سے اینگلو انڈین ڈرائیور کا تمتماتا لال چقندر چہرہ اور کلائی پر گُدی ہوئی نیلی میم۔ مسلمان خلاصی کے سر پر بندھا ہوا سیاہ رومال اور چہرے پر کوئلے کی زیبرا دھاریاں۔ پہیے سے جڑی ہوئی لمبی سلاخ جو بالکل ان کے ہاتھ کی طرح چلتی جسے وہ آگے پیچھے ہلاتے ہوئے چھک چھک کرتے ریل چلاتے تھے۔ انجن کی ٹونٹی سے اُبلتی، شور مچاتی اسٹیم کا چہرے پر اسپرے۔ ان بچّوں نے دھویں کے مرغولوں کو مٹیالے سے ہلکا سُرمئی اور سُرمئی سے گاڑھا گاڑھا سیاہ ہوتے دیکھا۔ گلے میں اس کی کڑواہٹ انہیں اچھی لگ رہی تھی۔ گھنگھرالے دھویں کا سیاہ اژدھا پھنکاریں مارتا آخری ڈبّے سے بھی آگے نکل کر اب پیچ و تاب کھاتا آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ بینڈ بجانے والے بچّے خاموش، بالکل خاموش ہو کر، قریب، بالکل قریب سے انجن کی سیٹی کو بجتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو جاتے وقت اپنی آنکھیں وہیں چھوڑ جاتے، اگر ان بچوں سے بینڈ ہی بجوانا تھا تو بغیر انجن کی ٹرین لانی چاہیے تھی۔

شعرائے کرام اسٹیشن سے بیل تانگوں اور بہلیوں میں قصبے لائے گئے۔ وہ ہر دس منٹ بعد گاڑی بان سے پوچھتے کہ قصبہ اتنی دور کیوں بنایا گیا ہے؟ بیلوں کے سینگوں پر نئی سنگوٹیاں اور گلے میں گھنگھرو پڑے تھے۔ ایک بیل کے پٹھے پر مہندی سے ”خوشامدید“ لکھا تھا۔ غلط املا کی سزا بیل کو مل رہی تھی۔ مطلب یہ

کہ گاڑی بان بار بار، خ، کے نقطے میں آرا[1] چبھو رہا تھا۔ ویسے ہمارے خیال میں وزیروں اور بڑے آدمیوں کے استقبال کے لیے جو بینر، خیر مقدمی دروازے اور محرابیں بنائی جاتی ہیں، ان پر خوش آمدید کا یہی املا (خوشامدید) ہونا چاہیے کہ سارے کھٹ راگ کا اصل مقصد و مدعا یہی تو ہے۔ بیل تانگوں کے پیچھے ڈرل ماسٹر کی قیادت میں اسکول کے تمام اساتذہ اور انکے پیچھے قدم ملائے لڑکوں کے والد صاحبان۔ آگے آگے بینڈ بجتا جا رہا تھا۔ بینڈ کے آگے ایک لڑکا چل رہا تھا جس کے ہاتھ میں یتیم خانہ شمع الاسلام کا سیاہ پرچم تھا، جس پر آسمان کو دھمکی آمیز لہجے میں مخاطب کر کے باطل سے نہ دبنے کے الٹی میٹم کے بعد اہلِ زمین کو اپنے انجام سے ڈرنے اور یتیم خانے کو دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل کی گئی تھی۔ پرچموں کی تاریخ میں یہ پہلا پرچم تھا جس پر لعن طعن اور کچھ کرنے کی بھی تلقین کی گئی تھی۔ ورنہ نادان چند رنگ برنگی پٹیوں اور دھاریوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ جلوس کے پیچھے پیچھے لارڈ ولزلی کی سربراہی میں سارے قصبے کی ننگ دھڑنگ بچّے اور کتّے دوڑ رہے تھے۔ کچھ ثقہ شاعروں نے بینڈ پر اعتراض

---

[1] آر: وہ نوکیلی کیل جو بیلوں کو ہانکنے کی لکڑی کے آگے لگی ہوتی ہے۔

کیا تو ڈرل ماسٹر نے انہیں یہ کہہ کر چپ کا کر دیا کہ اگر اب بینڈ بجنا بند ہوا تو کتّے آ لیں گے۔

سمدھن تیری گھوڑی چنے کے کھیت میں

بینڈ ماسٹر کو بشارت نے ایک ہفتے پہلے ہدایت کر دی تھی کہ ”خدا کے واسطے! تم اپنی اسطوخودوس منحوس ماتمی دھن نہ بجانا۔ خوشی کا موقع ہے۔ کسی ’چیئرفل ٹیون‘ کا ریہرسل کو لو۔ ابھی تو دن پڑے ہیں“۔ چنانچہ پہلے تو بینڈ نے ۱۹۲۵ کے گراموفون ریکارڈ کا مشہور گانا بجایا:

بیٹا جُمّا جُمّا! تھوڑی آگ لا دے

آگ لا دے، تمبا کو لا دے

لا دے تھوڑا پانی

بیٹا جُمّا جُمّا! تھوڑی آگ لا دے

اور اب ہز ماسٹرز وائس کے ایک مقبولِ عام ریکارڈ کی اس سے بھی زیادہ ''چیئر فل'' دُھن بجا رہا تھا۔ یہ ہٹ گانا ۱۹۳۰ میں بچّے بچّے کی زبان پر تھا۔ ان بچوں میں ہم بھی شامل تھے۔

سمدھن! تیری گھوڑی چنے کے کھیت میں!

یہ معلومات فراہم کرنے کے بعد، دوسرے مصرع میں موصوف کو مذکورہ بالا مقام یعنی چنے کے کھیت میں آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ گانا ہم نے لگ بھگ پچاس برس پہلے سنا تھا۔ جب ہم نے سمدھن تو درکنار، چنے کا کھیت بھی نہیں دیکھا تھا۔ سمدھن کی بے لگام گھوڑی تو ظاہر ہے کھیت میں ہرے بھرے چنوں کے لالچ میں گئی ہوگی۔ مگر یہ عقدہ آج تک نہ کھلا کہ سمدھی صاحب خود پرائے کھیت میں کیا کر رہے تھے۔ آج بھی ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ گیت میں مرکزی کردار گھوڑی کا ہے یہ سمدھن کا۔ ہُڑدنگے پن اور چال چلن سے متعلق گیت کے چند بول اتنے سچے،، تُند اور تنومند تھے کہ گمان ہوتا تھا کسی گھوڑے نے بقلم خود لکھے ہیں۔ یاد رہے کہ سمدھن کو صبح کی بھُولی ہوئی گھوڑی کو پکڑنے کا لالچ دے کر شام کو کھیت میں بُلایا جا رہا ہے۔ مگر یہ نہیں کھُلتا کہ سمدھی

صاحب سمدھن کو آیا اس لئے بُلا رہے ہیں کہ دونوں مل کر گھوڑی پر بیٹھیں گے یا ی تینوں مل کر بونٹ کھائیں گے۔

انہی پتھروں پہ چل کر۔۔۔۔

اٹھارہ شاعروں کا جلوس اسکول کے سامنے سے گزرا تو ایک رہکلے سے ۱۸ توپوں کی سلامی اُتاری گئی۔ یہ ایک چھوٹی سی پنچایتی توپ تھی جو نارمل حالات میں پیدائش اور ختنوں کے موقعے پر چلائی جاتی تھی۔ اس کے چلتے ہی سارے قصبے کے کتے، بچّے کوے، مرغیاں اور مور کورس میں چنگھاڑنے لگے۔ بڑی بوڑھیوں نے گھبراکر "دین جاگے، کفر بھاگے" کہا۔ خود وہ منی توپ بھی اپنے چلنے پر اتنی متعجب اور وحشت زدہ تھی کہ دیر تک ناچی ناچی پھری۔ شاعروں کو حیثیت دار کاشتکاروں کے ہاں ٹھہرایا گیا، جو اپنے اپنے مہمان اسکول سے گھر لے گئے۔ ایک کاشتکار تو اپنے حصّے کے مہمان کی سواری کے لیے ٹٹو اور راستے کے شغل کے لیے ناریل کی گڑگڑی بھی لایا تھا۔ قصبے میں جو گنے چُنے آسودہ حال مسلمان گھرانے تھے ان سے مولی مجّن کی نہیں بنتی تھی۔ لہٰذا شاعروں کے قیام و طعام کا بندوبست کاشتکاروں اور چودھریوں کے ہاں کیا گیا، جس کا تصّور ہی شاعروں کی نیند اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ شعر و شاعری اور ناولوں میں دیہاتی زندگی کو

romanticise کر کے اس کے خلوص، سادگی، قناعت اور مناظرِ قدرت پر سر دُھننا اور دُھننوانا اور بات ہے، لیکن سچ مچ کسی کسان کے نیم پختہ یا مٹی گارے کے گھر میں ٹھہرنا کسی شہری انٹلکچوئل کے بس کا روگ نہیں۔ کسان سے بغل گیر ہونے سے پہلے اس کے ڈھور ڈنگر، گھی کے فنگر پرنٹ والے دھات کے گلاس، جن ہاتھوں نے اُپلے تھاپے انھی ہاتھوں سے پکائی ہوئی روٹی، ہل، درانتی اور مٹی سے کھُردرائے ہوئے ہاتھ، باتوں میں پیار اور پیاز کی مہک، اور مکھن پلائی ہوئی مونچھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان سب سے بیک وقت گلے ملنا پڑتا ہے۔ انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ۔

۹

رسالہ در مدح و مذمّتِ طوائف

یعنی

در دِفاعِ خود

کلام اور اولاد کی شانِ نزول

اس قصباتی مشاعرے میں جو دھیرج گنج کا آخری یادگار مشاعرہ ثابت ہوا، ۱۸ بیرونی شاعروں کے علاوہ ۳۳ مقامی اور مضافاتی شعرا شرکت کے لیے بلائے گئے یا بن بلائے آئے۔ باہر سے آنے والوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اس لالچ میں آئے تھے کہ نقد معاوضہ نہ سہی، گاؤں ہے، کچھ نہیں تو سبزیاں، فصل کے میوے، پھل پھلاری کے ٹوکرے، پانچ چھ مرغیوں کا جھابہ تو منتظمینِ مشاعرہ ضرور ساتھ کر دیں گے۔ دھیرج گنج میں کچھ منتفنی نوجوان ایسے بھی تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ گردونواح میں تین چار مشاعرے درہم برہم کر چکے ہیں۔ ان کی مشکیں بشارت نے عجیب انداز سے کسیں۔ ان کے ایک پرانے

لنگوٹیے تھے، جنہوں نے میٹرک میں چار پانچ دفعہ فیل ہونے کے بعد ممتحنوں کی ہٹ دھرمی اور جوہر ناشناسی سے عاجز آکر محکمہ چُنگی میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ موصوف کو اس سے اپنے تزکیہ نفس کے علاوہ اس بدنام محکمے کو بھی سزا دینی مقصود تھی۔ چُنگی کی فضا کو انہوں نے شاعری کے لیے نہایت موزوں و سازگار پایا۔ موجودہ صورتحال سے اس درجہ مطمئن و مسرور تھے کہ اسی پوسٹ سے ریٹائر ہونے کے آرزومند تھے۔ کثیر العیال تھے۔ نہایت بسیار و بدیہہ گو۔ جو اشعار کی شانِ نزول تھی وہی اولاد کی۔ مطلب یہ کہ دونوں کے ورود و بہتات کا بہتان مبدہ فیاض پر لگاتے تھے۔ عام سا جملہ بھی ان پر ردیف قافیے کے ساتھ اترتا تھا۔ نثر بولنے اور لکھنے میں ان کو اتنی ہی تکلیف ہوتی تھی جتنی ہما شما کو شعر کہنے میں۔

وہ شاعری کرتے تھے مگر شاعروں سے بیزار و متنفر۔ فرماتے تھے ”آج کل جسطرح شعر کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح داد دی جاتی ہے۔ یعنی مطلب سمجھے بغیر۔ صحیح داد دینا تو درکنار، اب تو لوگوں کو ڈھنگ سے ہوٹ کرنا بھی نہیں آتا۔ شعر مشاعرے میں سننے سنانے کی چیز نہیں۔ تنہائی میں پڑھنے، سمجھنے، سننے اور سہنے کی چیز ہے۔ کلام کتابی شکل میں ہو تو لوگ شاعر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں میر کے کلیات میں سے ایک دو نہیں، سو دو سو اشعار ایسے نکال کر دکھا سکتا ہوں

جو وہ کسی مشاعرے میں پڑھ دیتے تو عزّتِ سادات اور دستار ہی نہیں، سر بھی سلامت لے کے نہ لوٹتے"۔ انہیں میر کے صرف یہی اشعار یاد تھے۔ دیگر اساتذہ کے بھی صرف وہ اشعار یاد کر رکھے تھے جن میں ان کے نزدیک کوئی سقم تھا۔ ان صاحب سے بشارت پانچ چھ غیر طرحی غزلیں کہلوا کے لے آئے اور ان مشاعرہ بگاڑ نوجوانوں میں تقسیم کر دیں کہ تم بھی پڑھنا۔ اور یہ ترکیب کارگر رہی۔ دیکھا گیا ہے کہ جس شاعر کو دوسرے نالائق شاعروں سے داد لینے کی توقع ہو وہ انہیں ہوٹ نہیں کیا کرتا۔ چوریاں بند کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ چور کو تھانیدار مقرر کر دو۔ ہمیں اس میں اس فائدے کے علاوہ کہ وہ دوسروں کو چوری نہیں کرنے دیگا، ایک اور فرق نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ پہلے جو مال وہ اندھیری راتوں میں نقب لگا کے بڑی مصیبتوں سے حاصل کرتا تھا وہ اب مالکان خود تھانے میں رشوت کی شکل میں لا کر برضا و رغبت پیش کر دیں گے۔

بین السّطور سے بین الستّور تک

اسی پروگرام کے تحت پانچ تازہ غیر طرحی غزلیں حکیم احسان اللہ تسلیم سے اس وعدے پر لکھوا لائے کہ جاڑے میں ان کے (حکیم صاحب کے) ماء اللحم کے

لیے پچاس تلیر، بیس تیتر، پانچ ہریل اور دو قازیں نذر کریں گے۔ اور بقر عید پر پانچ خصّی بکرے آدھے داموں دھیرج گنج سے خرید کر حلوہ کنجشک کے لیے ایک سو ایک نہایت بد چلن چڑوں کے مغز اور ایک درجن سیاہ ریگستانی بچھو (زندہ) خود پکڑ کر رؤسا و والیانِ ریاست کی مبہی ادویات کے لیے بھجوائیں گے[1]۔ حکیم احسان اللہ تسلیم مول گنج کی طوائفوں کے طبیب خاص تو تھے ہی، گانے کے لیے انہیں فرمائشی غزلیں بھی لکھ کر دیتے تھے۔ کسی طوائف کے پیر بھاری ہوتے تو اس کے لیے بطور خاص بہت چھوٹی بحر میں رَواں غزل کہتے، تاکہ ٹھیکا اور ٹھُمکا نہ لگانا پڑے۔ ویسے اس زمانے میں طوائفیں عموماً داغ اور فقیر، بہادر شاہ ظفر کا کلام گاتے تھے۔ حکیم صاحب کسی طوائف پر مائل بہ کرم ہوتے تو مقطے میں اس کا نام ڈال کر غزل اسی کو بخش دیتے۔ بعض طائفیں مثلاً مشتری، دُلاری، زہرہ معتبر شاعروں سے غزلیں کہلواتیں اور نہ صرف گانے کی بلکہ غزل کہنے کی بھی داد پاتیں۔ حکیم تسلیم طوائفوں کے تلفّظ کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ بقیہ چیزیں ماورائے اصلاح تھیں۔ مطلب یہ کہ گو اصلاح طلب تھیں، لیکن

---

[1] ہم نے بشارت سے پوچھا، بھائی، تم نے اتنے سارے چرندے پرندے اور گزندے زندہ پکڑ کر مہیا کرنے کی حامی کیسے بھر لی؟ بولے، جب مجھے سرے سے کچھ سپلائی نہیں کرنا تھا تو پھر the more the merrier! پھر انھوں نے ہمیں تسلی دی کہ یہ جھوٹ انہوں نے غلطی سے نہیں بولا، عادتاً بولا تھا!

ناقابلِ اصلاح۔ تاہم اس زمانے میں طوائفوں اور ان کے پرستاروں کی اصلاح کرنا ادبی فیشن میں داخل تھا۔ حقیقت میں یہ سماجی سے زیادہ خود مصنف کا نفسیاتی مسئلہ ہوتا تھا، جس کا catharsis (تطہیر) ممکن ہو یا نہ ہو، اس کا بیان خالی از علّت و لذت نہ تھا۔ ذکرِ گناہ، عملِ گناہ سے کہیں زیادہ لذیذ ہو سکتا ہے، بشرطیکہ طویل ہو اور راوی جسمانی اور معنوی دونوں لحاظ سے ضعیف ہو۔ ایمی زولا کی Nana، رسوا کی امراؤ جان ادا، ٹولوز لا ٹریک (Toulouse Lautrec) اور دیگا (Degas) کی کسبیوں اور قحبہ خانوں کی تصویریں جنسی حقیقت نگاری کے سلسلے کی پہلی کڑی ہیں، جب کہ قاری سرفراز حسین کی "شاہدِ رعنا" سے ناصحانہ رنگینی کے ایک دوسرے مرصع و ملذّذ سلسلے کا آغاز ہوتا ہے، جس کی کڑیاں قاضی عبد الغفار کے لیلیٰ کے خطوط کی خطیبانہ رومانیت اور زیرِ بحث زندگی سے عالمانہ لاعلمی، غلام عباس کی "آنندی" کی پُرکار سادگی اور منٹو[1] کی بظاہر کھردری حقیقت نگاری لیکن اصلاً inverted romanticism (معکوس رومانیت) سے جا ملتی ہیں۔ ہمارے یہاں

---

[1] منٹو تو خیر "الکحلک" بھی تھا۔ کوئے ملامت کے طواف کی اس غریب کو نہ فرصت اور طاقت تھی، نہ استطاعت اور ہوش۔ اسے اس کوچے کا اتنا ہی ذاتی تجربہ تھا جتنا ریاض خیر آبادی کو شراب خانے کا۔ ہمارے یہاں شاید یہ اتنا ضروری بھی نہیں۔

طوائف سے متعلق رومانی کہانیوں کی نوعیت بالعموم تحفتہ الطّوائف کی سی ہوتی ہے۔ اس میں طوائف سے متعلق تمام طِفلانہ حیرتوں، خوش گمانیوں، سنی سنائی باتوں اور رومانی تصورات ــــــــــ جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے ــــــــــــــ سب کا انبارِ گراں اس طور لگایا جاتا ہے کہ ہر طرف الفاظ کے طوطا مینا بُھدکتے چہکتے دکھائی دیتے ہیں۔ زندہ طوائف کہیں نظر نہیں آتی۔ رومانی ملبے تلے اس کے گھنگھرو کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ اس طوائف کا خمیر عنفوانِ شباب کی مہاسوں بھری ادھ کچری جزباتیت سے اٹھا ہے، جس کی مہک ریسرچ اسکالروں کی رگوں میں دوڑتی پھرتی روشنائی کو مدتوں گرماتی رہے گی۔ اس شہرِ آرزو نژاد طوائف نے اپنی chastity belt کی چابی دریا میں پھینک دی ہے اور اب اسے کسی سے ــــــــــ حد یہ کہ خود مصنف اور اپنے آپ سے بھی کوئی خطرہ نہیں۔

وہ سر سے ہے تا ناخنِ پا، نامِ خدا، برف

بات ساٹھ ستّر سال پرانی لگتی ہے، مگر آج بھی اتنی ہی سچ ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ طوائف کو ذلیل اور قابلِ نفرین گردانتے تھے، مگر ساتھ ہی ساتھ اس کے ذکر و تصّور میں ایک نیابتّی لذّت (vacarius pleasure) بھی

محسوس کیے بغیر نہ رہتے۔ معاشرے اور طوائف کی اصلاح کے بہانے اس کی زندگی کی تصویر کشی میں ان دونوں متناقض بورژوا جذبوں کی تسکین ہو جاتی تھی۔ اس صدی کے پہلے نصف حصے کا شعر و ادب، بالخصوص فکشن، طوائف کے ساتھ اسی love ۔ hate دُلار دُھتکار کے ادلتے بدلتے تعلق کا عکس ہے۔ اس نے ایک ذو بیانی کو جنم دیا جس میں مذمّت بھی مزے لینے کا حیلہ بن جاتی ہے۔ حقیقت نگاری کے پردے میں جتنی داد طوائف کو اُردُو فکشن لکھنے والوں سے ملی اتنی اپنے شبینہ گاہکوں سے بھی نہ ملی ہو گی۔ البتہ انگریزی فکشن پچھلے تیس برسوں میں بین السّطور کا گھونگٹ اٹھا کر کھلم کھلا بین السّتور پر اتر آئی۔

قبلہ چوں پیر شود۔۔۔۔

مُول گنج میں وحیدن بائی کے کوٹھے پر ایک بزرگ جو ہل ہل کر سِل پر مسالا پیستے ہوئے دیکھے گئے، ان کے بارے میں یار لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ تیس برس پہلے جمعے کی نماز کے بعد وحیدن بائی کے چال چلن کی اصلاح کی نیت سے کوٹھے کے زینے پر چڑھے تھے۔ مگر اس وقت اس قتالہ عالم کی بھری جوانی تھی۔ لہٰذا ان کا مشن بہت طول کھینچ گیا :

وحیدن بائی جب فرسٹ کلاس کرکٹ سے رٹائر ہوئی اور اس مُزمّن گناہ سے توبہ کرنے کا تکلف کیا جس کے لائق اب وہ ویسے بھی نہیں رہی تھی تو قبلہ عالم کی ڈاڑھی سفید ہو کر ناف تک آگئی تھی۔ اب وہ اس کی بیٹیوں کے باورچی خانے کے انتظام اور غزلوں اور گاہکوں کے انتخاب میں مدد دیتے تھے۔ قبلہ چوں پیر شود۔۔۔ الخ۔ ۱۹۳۱ء میں وہ حجِ بیت اللہ کو گئی تو یہ نو سو چوہوں کے واحد نمائندے کے حیثیت سے اس کے ہم رکاب تھے۔

جو پیدا کسی گھر میں ہوتی تھی دختر

حکیم احسان اللہ تسلیم کا دعویٰ تھا کہ امارت، طبابت اور شاعری انہیں ورثے میں ملی ہے۔ البتہ اوّل الذّکر میں نمایاں کمی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے۔ ان کے دادا حکیم احتشام حسین رعنا کی قنوج میں اتنی بڑی زمینداری تھی کہ ایک نقشے میں نہیں آتی تھی! اس کا ذکر بڑے فخر و غلو سے کرتے تھے۔ اب نقشے ان کے، اور متعلقہ زمینیں مہاجن کے قبضے میں تھیں۔ حکیم احسان اللہ تسلیم رنگین مزاج رؤسا کا بھی علاج کرتے تھے۔ فقط قارورہ دیکھ کر رئیس کا نام بتا دیتے۔ اور

رئیس کی نبض پہ انگلی رکھتے ہی یہ نشان دہی کر دیتے کہ مرض کے جراثیم کس کوٹھے کے آوردہ و پروردہ ہیں۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ کسی طوائف کے ہاں لڑکا پیدا ہو جائے تو رونا پیٹنا مچ جاتا ہے۔ حکیم تسلیم کے پاس خاندانی بیاض کا ایک ایسا مجرّب نسخہ تھا کہ شرطیہ لڑکی پیدا ہوتی تھی۔ یہ سفوف اس رات کے راجہ یا تماش بینِ خصوصی کو چُپکے سے پان میں ڈال کر کھلا دیا جاتا تھا۔ نسخے کے تیر بہدف ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کانپور میں کسی کی ذاتی بیوی کے ہاں بھی لڑکی پیدا ہوتی تو وہ میاں کے سر ہو جاتی کہ ہو نہ ہو، تم وہیں سے پان کھا کر آئے تھے!

طوائف کتنی بھی حسین و جمیل اور دشمنِ ایمان و ہوش ہو، حکیم صاحب کی نیت صرف اس کے پیسے پر بگڑتی تھی۔ طوائفیں ان سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ اور کہنے والے یہاں تک کہتے تھے کہ ان کے مرنے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں تاکہ سنگِ مرمر کا مزار بنوائیں اور برس کے برس دھوم دھام سے عرس منائیں۔

بھکشوؤں کی فینٹسی

مول گنج کا ذکر اوپر کی سطور اور کانپور سے متعلق خاکوں میں جابجا، بلکہ جا و بے جا آیا ہے۔ اس محلے میں طوائفیں رہتی تھیں۔ لہٰذا تھوڑی سی معذرتی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ بشارت کا دلپسند موضوع ہے، جس سے ہمارے قارئین واقف و منغص ہو چکے ہوں گے۔ وہ ہِر پھر کے اس کے ذکر اذکار سے اپنی سنجیدہ گفتگو میں کھنڈت ڈالتے رہتے ہیں، حالاں کہ بے شک و شبہ وہ دوسرے زمرے کے آدمی ہیں:

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

جیسے بعض الرجک لوگوں کو پِتّی اچھل آتی ہے، اسی طرح ان کی گفتگو میں طوائف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ موقع دیکھے نہ محل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چھم سے آن کھڑی ہوتی ہے۔ تہجد گزار ہیں۔ کبھی کے نانا دادا بن گئے، مگر طوائف ہے کہ کسی طور ان کے سسٹم سے نکلنے کے لیے راضی نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ ہم نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ہم نے کہا، حضرت، پرانی داستانوں میں ہیرو اور دیو کی جان کسی طوطے میں ہوتی ہے۔ مگر آپ کی ہر طوطا کہانی میں طوطے کی جان طوائف

میں اٹکی ہوتی ہے! کہنے لگے، ارے صاحب! میری داستان پر خاک ڈالیے۔ یہ دیکھیے کہ آج کل کی فکشن اور فلموں میں ہیرو اور ہیروئن سے کون سے نفل پڑھائے جارہے ہیں۔ جس نسخے کے مطابق پہلے طوائف کہانی میں ڈالی جاتی تھی، اب اس ضمن میں شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو زحمت دی جاتی ہے۔ پڑھنے والے اور فلم دیکھنے والے آج بھی طوائف کو اسطرح اچک لیتے ہیں جیسے مریض حکیموں کے نسخے میں سے منقّیٰ!

عرض کیا یہ طبّی تشریح تو طوائف سے بھی زیادہ ancient (پراچین / قدیم) ہے۔ کون سمجھے گا؟ فرمایا، طوائف کو سمجھنے کے لیے طبِ یونانی سے واقفیت ضروری ہے۔ اور اس کی الٹ بھی درست ہے۔ طب اور طوائف ہمارے ہاں بد قسمتی سے لازم و۔۔۔ملزمہ ہیں۔

اور بشارت کچھ غلط نہیں کہتے۔ شاید آج اس کیفیت کا اندازہ کرنا مشکل ہو۔ طوائف اس ڈگمگاتے ہوئے معاشرے کے آسودہ حال طبقے کے اعصاب پر ممنوعہ لذّت کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ اور یہ کچھ اس دور ہی سے مختص نہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے دنیا کے سب سے قدیم پیشے کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ ایک مقررہ تاریخ

تک تمام طوائفیں نکاح کر لیں، ورنہ ان سب کو کشتی میں بھر کر جمنا میں ڈبو دیا جائے گا۔ بیشتر طوائفیں غرقابی کو ہانڈی چولھے پر اور مگرمچھ کے جبڑے کو ایسے شوہر پر ترجیح دیتی تھیں جو پیار بھی کرتے ہیں تو فرض عبادت کی طرح۔ یعنی بڑی پابندی کے ساتھ اور بڑی بے دلی اور بے رغبتی کے ساتھ! معدودے چند طوائفوں نے اس دھندے کو خیرباد کہہ کر بہ کراہت نکاح کر لیے:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک عقدِ ناگہانی اور ہے

اب ذرا اس کے دوسو برس بعد کی ایک جھلک "تذکرہ غوثیہ" میں ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے مؤلف مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اپنے لائقِ صد احترام پیرو مرشد کے بارے میں ایک معتبر روایت نقل کرتے ہیں: "ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دہلی کی زینت مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے، ہمارے دوست کمبل پوش (یوسف خاں کمبل پوش، مصنّف تاریخِ یوسفی / عجائباتِ فرنگ جو اُردُو کا اولین سفر نامہ انگلستان ہے) نے ہماری دعوت کی۔ مغرب کے بعد ہم کو لے کر چلے۔ چاندنی چوک میں پہنچ کر ایک طوائف کے کوٹھے پر ہم کو بٹھا دیا اور آپ چنپت ہو گئے۔ پہلے تو ہم نے خیال کیا کہ شاید کھانا اسی جگہ پکوایا ہو گا۔ مگر پھر

معلوم ہوا کہ یوں ہی بٹھا کر چل دیا ہے۔ ہم بہت گبھرائے کہ بھلا ایسی جگہ کمبخت کیوں لایا۔ دو گھڑی بعد ہنستا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میاں صاحب! کہ میں آپ کی بھڑک مٹھانے یہاں بٹھا گیا تھا۔ بعدہٗ اپنی قیام گاہ پر لے گیا اور کھانا کھلایا"۔

یاد رہے کہ کمبل پوش ایک آزاد منش، من موجی آدمی تھا۔ یہ قصّہ اس وقت کا ہے جب پیرومرشد کی صحبت میں اسکی قلبِ ماہیت ہوچکی تھی۔ قیاس کیجیے، جس کی خزاں کا یہ رنگ ہو اس کی بہار کیسی رہی ہو گی !

اخیر میں، اس لطیفے کے تخمیناً ڈیڑھ سو سال بعد کے ایک ناخنی نقش[1] پر بھی اچٹتی سی نگاہ ڈالتے چلیں۔ جوش جیسا قادرالکلام، عالی نسب، خوش ذوق اور نفاست پسند شاعر جب نشاطِ ہستی اور مسرتِ بے نہایت کی تصویر کھینچتا ہے تو دیکھیے اس کا قلم غمزہ رقم کیا گل کھلاتا ہے:

کوٹھے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات

---

[1] ناخنی نقش Thumb :۔nailsketch

کوٹھے پر ہاتھ رکھ کر تھرکنے میں چنداں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ کوٹھا اپنا ہی ہو۔ دوم، تھرکنا پیشہ ورانہ فرائض میں داخل ہو۔ شوقیہ یا اضطراری نہ ہو۔ مطلب یہ کہ کوئی کوٹھے پر ہاتھ رکھ کر تھرکنے لگے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے ذات پہچانی جاتی ہے۔

تو خدا آپ کا بھلا کرے۔۔۔۔ اور مجھے معاف کرے۔۔۔۔۔ مول گنج بیسواؤں کا چکلہ تھا۔ اس زمانے میں بھی لوگوں کا چال چلن اتنا ہی خراب تھا جتنا اب ہے، مگر بینائی ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ کسبیوں کی بستی کو آج کل کی طرح ''بازارِ حسن'' کہنے لگیں۔ چکلے کو چکلہ ہی کہتے تھے۔ دنیا میں کہیں اور بد صورت رنڈیوں کے کوٹھوں اور بے ڈول بے ہنگم جسم کے ساتھ جنسی امراض بیچنے والیوں کی چکٹ کوٹھریوں کو اس طرح گلیمرائز نہیں کیا گیا۔ ''بازارِ حسن'' کی رومانی اصطلاح آگے چل کر ان ادیبوں نے عام کی جو کبھی زنانِ زود یاب کی بکر منڈی کے پاس سے بھی نہیں گزرے تھے۔ لیکن ذاتی تجربہ غالباً اتنا ضروری بھی نہیں۔ ریاض خیر آبادی ساری عمر شراب کی تعریف میں شعر کہتے رہے، جب کہ ان کی مشروباتی بد پرہیزی بھی شربت اور سکنج بین سے آگے نہیں بڑھی۔ دور کیوں جائیں خود ہمارے ہم عصر شعراء مقتل، پھانسی گھاٹ، جلّاد اور رسّی کے بارے میں للچانے والی باتیں کرتے رہے ہیں۔ اس کے لیے پھانسی یافتہ

ہوناضروری نہیں۔ دادِ عیش دینے اور کوچہ شب فروشاں کے طواف کی ہمت یا استطاعت نہ ہوتو "ہوس سینوں میں چھُپ چھُپ کر بنالیتی ہے تصویریں"۔

اور سچ یہ ہے کہ ایسی ہی تصویرون کے رنگ زیادہ چوکھے اور خطوط کہیں زیادہ دلکش ہوتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ خیالی ہوتے ہیں اجنتا اور ایلورا کے frescoes (دیواری تصویریں) اور مجسّمے اس کی کلاسیکی مثال ہیں۔ کیسے بھرے پُرے بدن بنائے ہیں بنانے والوں نے۔ اور بنانے پر آئے تو بناتے ہی چلے گئے۔ گداز پیکر تراشنے چلے تو ہر sensous لکیر بل کھاتی، گدراتی چلی گئی۔ سیدھی سُبک لکیریں آپ کو مشکل ہی سے نظر آئیں گی۔ حد یہ کہ ناک تک سیدھی نہیں۔ بھاری بدن کی ان عورتوں اور اپسراؤں کے نقوش اپنے نقاش کے آشوبِ تخیل کی چغلی کھاتے ہیں: نارنگی کی قاش ایسے ہونٹ۔ سہار سے زیادہ بھری بھری چھاتیاں جو خود سنگتراش سے بھی سنبھالے نہیں سنبھلتیں۔ باہر کو نکلے ہوئے بھاری کولھے جن پر گاگر رکھ دیں تو ہر قدم پر پانی، دیکھنے والوں کے دل کی طرح بانسوں اچھلتا جائے۔ ان گولائیوں کے خم وپیچ کے بیچ بل کھاتی کمر۔ اور پیٹ جیسے جوار بھاٹے میں پیچھے ہٹتی لہر۔ پھر وہ ٹانگیں جن کی تشبیہ کے لیے سنسکرت شاعر کو کیلے کے تنے کا سہارالینا پڑا۔۔۔۔ اس وصل آشنا اور نا مجوب بدن کو اس کے حدِ آرزو تک exaggerated خطوط اور کھُل کھیلتے

اُبھاروں کو ان ترسے ہوئے برہمچاریوں اور بھکشوؤں نے بنایا اور بنوایا ہے جن پر بھوگ بلاس حرام تھا اور جنھوں نے عورت کو صرف فینٹسی اور سپنے میں دیکھا تھا۔ اور جب کبھی وہ سپنے میں اتنے قریب آجاتی کہ اس کے بدن کی آنچ سے اپنے لہو میں الاؤ بھڑک اٹھتا تو فوراً آنکھ کھل جاتی اور وہ ہتھیلی سے آنکھیں ملتے ہوئے سنگلاخ چٹانوں پر اپنے اپنے خواب لکھنے شروع کر دیتے۔

وہ صورت گر کچھ خوابوں کے

مغرب کا سارا porn اور Erotic Art بھکشو اور راہب کی فینٹسی کے آگے بالکل بچکانہ اور پتلی چھاچھ لگتا ہے۔ ایسے چھتنار بدن اور شاخِ نہالِ آرزو کے یہ دھیان دھوپ میں پکے نار پھل[1] صرف اور صرف وہ تیاگی اور بھکشو بنا سکتے تھے جو اپنی اپنی یشودھرا کو سوتا چھوڑ کر حقیقت اور نروان کی تلاش میں نکلے تھے، پر ساری زندگی بھیگی سیلی تاریک گپھاؤں میں جہاں خواب کے سوا کچھ

[1] نار پھل: گات، چھب تختی اور چھاتیوں کے لیے قدیم اُردو میں یہ لفظ بہت عام تھا۔ افسوس کہ بہت سے اور خوب صورت لفظوں کی طرح یہ بھی لسانی وہابیت (puritanism) اور نک چڑھی ناسخیت کی نذر ہو گیا۔

دکھائی نہیں دیتا، پہاڑ کا سینہ کاٹ کاٹ کے اپنا خواب یعنی عورت برآمد کرتے رہے! برس دو برس، جُگ دو جُگ کی بات نہیں، ان گیانیوں نے پورے ایک ہزار برس اسی مِتھُن کلا[1] میں بِتا دیے۔ پھر جب ساری چٹانیں ختم ہو گئیں اور ایک ایک پتھر نے ان کے جیون سوپن کا روپ دھار لیا اور وہ نشچنت ہو کے اندھیری گپھاؤں سے باہر نکلے تو دیکھا کہ دھرم اور ستیہ کا سورج تو کب کا ڈوب چکا اور باہر اب ان کے لیے جنم جنم کا اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ سو وہ باہر کے اندھیرے اور ہاہاکار سے دہشت کھا کے آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھے پھر سے بھیتر کے جانے پہچانے اندھیرے میں چلے گئے۔

صدیوں رُوپ سُروپ اور شرنگار رَس کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے والے تپسّوی تو مٹّی تھے، سو مٹّی میں جا ملے۔ ان کے خواب باقی رہ گئے۔ ایسے خواب دیکھنے والے، ایسے بھٹکنے اور بھٹکانے والے اب کہاں آئیں گے:

---

[1] مِتھُن کلا: قارئین مِتھُن کے معنی لغت میں تلاش کرنے کی بجائے راجندر سنگھ بیدی کی، اسی عنوان کی شاہکار کہانی ''مِتھُن'' ملاحظہ فرمائیں۔ بیدی نے سنگِ خارا کا پورا پہاڑ کاٹ کر ایک بت تراشا ہے۔ اور اس قوت اور ضربت کاری سے تراشا ہے کہ مجال ہے تیشہ ایک ہی جگہ دوبارہ لگ تو جائے۔

Erotic Art کا اُردُو مترادف مجھے معلوم نہیں۔ اس لیے سرِ دست یہ اصطلاح وضع کرنی پڑی۔

کوئی نہیں ہے اب ایسا جہان میں غالب

جو جاگنے کو مِلا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

دیکھیے بات میں بات بلکہ خرافات نکل آئی۔ مطلب یہ کہ بات حکیم احسان اللہ تسلیم سے شروع ہوئی اور کوٹھے کوٹھے چڑھتی اُترتی، اجنتا اور ایلورا تک پہنچ گئی۔ کیا کیجیے، ہمارے یارِ طرح دار کا یہی اندازِ گفتگو ہے۔ چاند اور سورج کی کرنوں سے چادر بن کر رکھ دیتے ہیں۔

ہم نے اس بات میں ان کے خیالات کو حتیٰ الوسع انھی کے الفاظ اور توجہ بھٹکانے والے انداز میں یکجا کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے کوئی حک و اضافہ نہیں کیا۔ وہ اکثر کہتے ہیں "آپ میرے زمانے کے گھٹے گھٹے ماحول، پاکیزہ محرومیوں اور آرزو مند پاکیزگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے"۔

"آپ کی اور میری عمر میں ایک نسل کا ۔۔۔۔ بیس سال کا ۔۔۔ تفاوت ہے"۔

بجا کہتے ہیں ان کی اور ہماری نسل کے درمیان طوائف حائل ہے۔

مشاعرہ کس نے لُوٹا؟

جوہر الہ آبادی، کاشف کانپوری اور نشور واحدی کو چھوڑ کر، باقی ماندہ مقامی اور مہمان شاعروں کو تقدیم و تاخیر سے پڑھوانے کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا نکلا، کیوں کہ سبھی ایک دوسرے کے ہم پلّہ تھے اور ایسی برابر کی ٹکر تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں کم لغو شعر کون کہتا ہے، تاکہ اس کو بعد میں پڑھوایا جائے۔ بہر حال اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا گیا کہ شعرا کو حروفِ تہجی کی الٹی ترتیب سے پڑھوایا گیا، یعنی پہلے یاور نگینوی کو اپنی ہوٹنگ کروانے کی دعوت دی گئی۔ سیدھی ترتیب میں یہ قباحت تھی کہ ان کے استاد محترم جوہر الہ آبادی کو اِن سے بھی پہلے پڑھنا پڑتا۔

مشاعرہ گاہ میں ایک ہڑبونگ مچی تھی۔ خلافِ توقع و تخمینہ گردونواح کے دیہات سے لوگ جوق در جوق آئے۔ دریاں اور پانی کم پڑ گیا۔ سننے میں آیا کہ مولی مجّن کے مخالفوں نے یہ اشغلا چھوڑا ہے کہ محفل کے اختتام پر لڈوؤں اور کھجوروں کا تبرک اور ملیریا اور رانی کھیت (مرغیوں کی مہلک بیماری) کی دوا کی پڑیاں تقسیم ہوں گی۔ ایک دیہاتی اپنی دس بارہ بیمار مرغیاں جھابے میں ڈال کے لے آیا تھا کہ صبح تک بچنے کی آس نہیں تھی۔ اسی طرح ایک کاشتکار اپنی

جوان بھینس کو نہلا دُھلا کر بڑی امیدوں سے ہمراہ لایا تھا۔ اس کے کٹّے ہی کٹّے ہوتے تھے۔ مادہ بچہ نہیں ہوتا تھا۔ اسے کسی نے اطلاع دی تھی کہ شاعروں کے میلے میں طوائفوں والے حکیم احسان اللہ تسلیم آنے والے ہیں۔ سامعین کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل تھی جنھوں نے اس سے قبل مشاعرہ اور شاعر نہیں دیکھے تھے۔ مشاعرہ خاصی دیر سے یعنی دس بجے شروع ہوا جو دیہات کے دو بجے کے عمل کے برابر تھا۔ جو نوجوان والنٹئیر (جنھیں دھیرج گنج والے بالم بٹیر کہتے تھے) روشنی کے انتظام کے انچارج تھے، انھوں نے مارے جوش کے چھ بجے ہی ہنڈے روشن کر دیے، جو نو بجے تک اپنی بہارِ جان افزا دکھا کے گُل ہو گئے۔ ان میں دوبارہ تیل اور ہوا بھرنے اور اس عمل کے دوران آوارہ لونڈوں کو حسبِ مراتب و شرارت گاؤدُم گالیاں دے دے کر پرے ہٹانے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ ایسا شور و غُل تھا کہ کان پڑی گالی سنائی نہیں دیتی تھی۔ تحصیل دار کو اسی دن کلکٹر نے طلب کر لیا۔ اس کی غیر موجودگی سے لونڈوں لہاڑیوں کو اور شہ ملی۔ رات کے بارہ بجے تک صرف ستائیس شاعروں کا بھگتان ہوا۔ صدرِ مشاعرہ مولی مجّن کو کسی ظالم نے داد دینے کا انوکھا طریقہ سکھایا تھا۔ وہ ''سبحان اللہ! واہ! وا!'' کہنے کے بجائے ہر شعر پر ''مکرر ارشاد'' کہتے۔ نتیجہ یہ کہ ۲۷ شاعر ۵۴ کے برابر ہو گئے! ہوٹنگ بھی دو سے ضرب ہو گئی۔ قادر بارہ بنکوی کے تو

مطلع پر ہی سامعین نے تمبو سر پر اٹھالیا۔ وہ عاجز آ کر کہنے لگا ”حضرات! سنیے تو! شعر پڑھا ہے۔ گالی تو نہیں دی!“ اس پر حاضرین اور بے قابو ہو گئے۔ قادر بارہ بنکوی نے ہمت نہیں ہاری بلکہ ایک شخص سے بیڑی مانگ کر بڑے اطمینان سے سلگائی اور باآوازِ بلند کہا ”آپ حضرات کو ذری قرار آئے تو دوسرا شعر عرض کروں“۔ بقول مرزا اُردُو شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا مشاعرہ تھا جو سامعین نے لُوٹ لیا۔

ساغر جالونوی

رات کے بارہ کا عمل ہو گا۔ چار سو سامعین کا طوطی بول رہا تھا۔ مشاعرے کے شور و شغب سے سہم کر گاؤں کی سرحد پر گیڈروں تک نے بولنا بند کر دیا۔ ایک مقامی شاعر خود کو ہر شعر پر ہوٹ کروا کے گردن ڈالے جا رہا تھا کہ ایک صاحب چاندنی پر گھٹنوں کے بل چلتے صدرِ مشاعرہ تک پہنچے۔ دائیں ہاتھ سے آداب کیا اور بائیں سے اپنی مٹن چاپ مونچھ کو، جو کھچڑی ہو چلی تھی، تاؤ دیتے رہے۔

انہوں نے درخواست کی کہ میں ایک غریب، غریب الدیار آدمی ہوں[1] مجھے بھی کلامِ ناقص سنانے کی اجازت دی جائے۔ (ایک آواز آئی، ناقص صاحب کا کلام سنوایئے) موصوف نے خبردار کیا کہ اگر پڑھوانے میں دیر کی گئی تو ان کے مدارج خودبخود بلند ہوتے چلے جائیں گے اور وہ استادوں سے پہلو مارنے لگیں گے۔ انہیں اجازت مل گئی، جس پر انہوں نے کھڑے ہو کر حاضرین کو، دائیں بائیں اور سامنے گھوم کر تین دفعہ آداب کیا۔ ان کی کریم رنگ کی ٹسر کی اچکن اتنی لمبی تھی کہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے پاجامہ پہن رکھا ہے یا نہیں۔ سیاہ مخمل کی ٹیڑھی ٹوپی بھیڑ بھڑکے میں سیدھی ہو گئی تو انہوں نے اسے اتار کر اس میں پھونک ماری اور تھتکار کر اور بھی ٹیڑھے زاویے سے سر پر جمالی۔

مشاعرے کے دوران یہ صاحب چھٹی صف میں بیٹھے عجیب انداز سے "اے سبحان اللہ! اے سبحان اللہ!" کہہ کر داد دے رہے تھے۔ جب سب تالی بجانی بند کر دیتے تو یہ شروع ہو جاتے۔ اور اس انداز سے بجاتے گویا روٹی پکا رہے ہیں۔

---

[1] ہرچند کہ ان کا وطن جالون (خورد) وہاں سے کل اٹھارہ میل دور تھا مگر اگلے وقتوں میں آدمی اپنی میونسپلٹی کی حدود سے باہر قدم رکھتے ہی خود کو غریب الوطن کہنے لگتا تھا۔ اور وطن سے مراد صرف شہر یا قصبہ ہوتی تھی۔ صوبے یا ضلعے کو کوئی بھی اپنا وطن نہیں کہتا تھا۔

فرشی آداب و تسلیمات کے بعد وہ اپنی بیاض لانے کے لیے اچکن اس طرح اٹھائے اپنی نشست تک واپس گئے جیسے خود بین و خود آرا خواتین بھری برسات اور چبھتی نظروں کی سہتی سہتی بوچھار میں صرف اتنے گہرے پانی سے بچنے کے لیے جس میں چیونٹی بھی نہ ڈوب سکے، اپنے پائنچے دو دو بالشت اوپر اٹھائے ایک گوارا ناگواری کے ساتھ چلتی ہیں اور دیکھنے والے قدم قدم پہ دعائیں کرتے ہیں کہ

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

اپنی نشست سے انھوں نے بیاض اٹھائی جو دراصل اسکول کا ایک پرانا رجسٹر حاضری تھا جس میں امتحان کی پرانی کاپیوں کے خالی اوراق پر لکھی ہوئی غزلیات رکھ لی تھیں۔ اسے سینے سے لگائے وہ صاحب واپس صدرِ مشاعرہ کے پہلو میں اپنا کلام سنانے پہنچے۔ ہوٹنگ تھی کہ کسی طرح بند ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ ایسی ہوٹنگ نہیں دیکھی کہ شاعر کے آنے سے پہلے اور جانے کے بعد زوروں سے جاری رہے۔ انھوں نے اپنی از کارِ رفتہ جیبی گھڑی ایک دفعہ بیٹھنے سے پہلے اور ایک دفعہ بیٹھنے کے بعد بغور دیکھی۔ پھر اسے ڈگڈگی کی طرح ہلایا اور کان سے لگا کر دیکھا کہ اب بھی بند ہے یا دھکم پیل سے چل پڑی۔ اس سے فراغت پائی تو

حاضرین کو مخاطب فرمایا، حضرات! آپ کے چیخنے سے تو میرے گلے میں خراش پڑ گئی!

ان صاحب نے صدر اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں ایک خاص وجہ سے غیر طرحی غزل پڑھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ مگر بوجوہ وہ وجہ بتانا نہیں چاہتا! اس پر حاضرین نے شور مچایا، وجہ بتاؤ، وجہ بتاؤ، نہیں تو بدھو گھر کو جاؤ! اصرار بڑھا تو ان صاحب نے اپنی اچکن کے بٹن کھولتے ہوئے غیر طرحی غزل پڑھنے کی یہ وجہ بتائی کہ جو مصرعِ طرح دیا گیا، اس میں سکتہ پڑتا ہے۔ ثبوت میں انہوں نے تقطیع کر کے دکھادی۔ مرض کو بروزن فرض باندھا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ مشاعرہ یادگار رہے گا کہ آج کی رات شعرائے کانپور نے غلط العام تلفّظ کو شہرتِ عام اور بقائے دوام بخش دی۔ سامعین کی آخری صف سے ایک باریش بزرگ نے اٹھ کر نہ صرف اس کی تائید کی بلکہ یہ مزید چنگاری چھوڑی کہ الف بھی گرتا ہے!

یہ سننا تھا کہ شاعروں پر الف ایسے گرا جیسے فالج گرتا ہے۔ سکتے میں آ گئے۔ سامعین نے آسمان، مصرعِ طرح اور شاعروں کو اپنے سینگوں پر اٹھالیا۔ مولی مجّن نے انگلی کے اشارے سے مولوی بادل (فارسی ٹیچر) کو بلا کر کان میں پوچھا

کہ الف کیسے گرتا ہے؟ وہ پہلے تو چکرائے، پھر مثال میں مصرعِ طرح پڑھ کر سنا دیا کہ یوں! ایک ہلڑ مچا ہوا تھا۔ جوہر الٰہ آبادی کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر شاعروں کے کہنے کی باری اب ختم ہو چکی تھی۔ پھبتیوں، ٹھٹھوں اور گالیوں کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا عالم تھا کہ اگر اس وقت زمین پھٹ جاتی تو بشارت خود کو مع شعرائے دبستانِ کانپور اور مولی مجّن گاؤ تکیے سمیت اس میں سما جانے کے لیے بخوشی آفر کر دیتے۔ اس شاعر اور معترض نے اپنا تخلص ساغر جالونوی بتایا۔

مشاعرہ کیسے لُوٹا گیا

لوگ بڑی دیر سے اُکتائے بیٹھے تھے۔ ساغر جالونوی کے دھماکا خیز اعتراض سے اونگھتے مشاعرے میں جان ہی نہیں، ہیجان آگیا۔ اس وقت کسے ہوش تھا کہ اعتراض کی صحت پر غور کرتا۔ ہمارے ہاں ناچ گانا، حکمرانی اور مشاعرہ اکل کھرے فن ہیں۔ انکا سارا مزہ اور بنیاد ہی solo performance پر ہے۔ اسی لیے سیاست میں نعرے اور جلوس اور مشاعرے میں داد اور ہوٹنگ ہماری ضرورت، روایت اور سیفٹی والو بن گئے۔ ہمارے ہاں شرکتِ سامعین)

(audience participation کی لے دے کے یہی ایک قابلِ قبول صورت ہے جس پر قدغن نہیں۔

دو ہنڈوں کا تیل پندرہ منٹ پہلے ختم ہو چکا تھا۔ کچھ ہنڈوں میں وقت پر ہوا نہیں بھری گئی۔ وہ پھُس کر کے بُجھ گئے۔ ساغر جالونوی کے اعتراض کے بعد کسی شرارتی نے باقی ماندہ ہنڈوں کو جھڑ جھڑایا۔ ان کے مینٹل جھڑتے ہی اندھیرا ہو گیا۔ اب مار پیٹ شروع ہوئی۔ لیکن ایسا گھپ اندھیرا کہ ہاتھ کو شاعر سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ بے قصور سامعین پٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ نام بلکہ تخلص لے لے کر گالیاں دے رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے صدا لگائی، بھائیو! ہٹو! بھاگو! بچو! رنڈیوں والے حکیم صاحب کی بھینس رسّی تڑا گئی ہے! یہ سنتے ہی گھمسان کی بھگدڑ پڑی۔ اندھیری رات میں کالی بھینس تو کسی کو دکھائی نہیں دی، لیکن لاٹھیوں سے مسلح مگر دہشت زدہ دیہاتی سامعین نے ایک دوسرے کو بھینس سمجھ کر خوب دُھنائی کی۔ لیکن یہ آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ چرانے والوں نے ایسے گھپ اندھیرے میں تمام نئے جوتے تلاش کیسے کر لیے۔۔ اور جوتوں پر ہی موقوف نہیں، ہر چیز جو چُرائی جا سکتی تھی چُرا لی گئی۔۔۔۔ پانوں کی چاندی کی تھالی، درجنوں انگوچھے، ساغر جالونوی کی دُگنے سائز کی اچکن جس کے نیچے کرتا یا بنیان نہیں تھا، ایک جازم، تمام چاندنیاں، یتیم خانے کے چندے کی چوبی

صندوقچی مع قفلِ فولادی، یتیم خانے کا سیاہ پرچم، صدرِ مشاعرہ کا مخملی گاؤ تکیہ اور آنکھوں پر لگی عینک، ایک پٹواری کے گلے میں لٹکی ہوئی چاندی کی خلال اور کان کا میل نکالنے کی منی ڈوئی، خواجہ قمرالدین کی جیب میں پڑے ہوئے آٹھ روپے، عطر میں بسا ریشمی رومال اور پڑوسی کی بیوی کے نام مہکتا خط[1]۔۔۔۔۔ حد یہ کہ کوئی گستاخ ان کی ٹانگوں سے پیوست چوڑی دار کا ریشمی ازار بند ایک ہی جھٹکے میں کھینچ کر لے گیا۔ ایک شخص بجھا ہوا ہنڈا سر پر اٹھا کے لے گیا۔ مانا کہ اندھیرے میں کسی نے سر پر لے جاتے ہوئے تو نہیں دیکھا، مگر ہنڈا لے جانے کا صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ بیمار مرغیوں کے صرف چند پر پڑے رہ گئے۔ ساغر جالونوی کا بیان تھا کہ کسی نابکار نے اس کی مونچھ تک اکھاڑ کر لے جانے کی کوشش کی جسے اس نے اپنی بروقت چیخ سے ناکام بنا دیا۔ غرض کہ قطعہ نظر اس کے کہ کار آمد ہے یا نہیں، جس کا جس چیز پر ہاتھ پڑا، اسے اُٹھا کے، اُتار کے، نوچ کے، پھاڑ کے، اُکھاڑ کے لے گیا۔ حد یہ کہ تحصیل دار کے پیش کار منشی بنواری لال ماتھر کے زیرِ استعمال ڈینچر ز بھی! فقط ایک چیز ایسی تھی کہ جس کو

---

[1] چھینی اور چُرائی ہوئی اشیا میں فقط یہی چیز تھی جو دوسرے دن برآمد ہوئی۔ یہی نہیں، اس کی نقول قصبے میں گھر گھر تقسیم ہوئیں۔

کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ شاعر اپنی بیاضیں جس جگہ چھوڑ کر بھاگے تھے، وہ دوسرے دن تک وہیں پڑی رہیں۔

باہر سے آئے ہوئے دیہاتیوں نے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ بھی مشاعرے کے اختتامیہ آداب میں داخل ہے، مار پیٹ اور لوٹ کھسوٹ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور بعد کو بہت دن تک ہر آئے گئے سے بڑے اشتیاق سے پوچھتے رہے کہ اب دوسرا مشاعرہ کب ہو گا۔

کئی پشتوں کی نالائقی کا نچوڑ

یہ شاعر جو بھونچال لایا، بلکہ جس نے سارا مشاعرہ اپنی مونچھوں پر اٹھالیا، بشارت کا خانساماں نکلا پرانی ٹوپی اور اُترن کی اچکن کا خلعت اسے گزشتہ عید پر ملا تھا۔ راہ

---

[1] ممکن ہے ہمارے بعض قارئین کو اس میں غلو کا شائبہ نظر آئے کہ اس کتاب کا ہر تیسرا کردار شاعر ہے یا کم از کم تخلص کا دُم چھلا ضرور لگائے پھرتا ہے۔ اس کی وضاحت اور دفاع میں ہم حضرت رئیس امروہی کا قولِ فیصل نقل کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں "ہمارے معاشرے میں تخلص رکھنا اور تک بندی کرنا لازمہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بے تخلص کے خاندانی شخص کو دُم کٹا بھینسا یا بے سینگوں کے بیل تصوّر کیا جاتا تھا۔ امارت، فارغ البالی اور اقبال مندی کا دور کبھی کا ختم ہو چکا

چلتوں کو پکڑ پکڑ کر اپنا کلام سناتا۔ سننے والا داد دیتا تو اسے کھینچ کر لپٹا لیتا۔ داد نہ دیتا تو خود آگے بڑھ کر لپٹ جاتا۔ اپنے کلام کے الہامی ہونے میں اسے کوئی شبہ نہ تھا۔ شبہ اوروں کو بھی نہیں تھا، کیوں کہ محض عقل یا خالی خولی علم کے زور سے کوئی شخص ایسے تمام و کمال خراب شعر نہیں کہہ سکتا تھا۔ دو مصرعوں میں اتنے سارے فنّی نقائص و اسقام کو اتنی آسانی سے سمو دینا تائیدِ غیبی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ فکرِ سخن میں اکثر یہ بھی ہوا کہ ابھی مصرعے پر ٹھیک سے گرہ بھی نہیں لگی تھی کہ ہنڈیا دھواں دینے لگی۔ سالن کے بھٹّے لگ گئے۔ پانچویں جماعت تک تعلیم پائی تھی، جو اس کی ذاتی ضروریات اور سہار سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ اپنی مختصر سی انگریزی لفظیات اور تازہ شعر کو ضبط نہیں کر سکتا تھا۔ اگر آپ اس سے دس منٹ بھی بات کریں تو اسے انگریزی کے جتنے بھی الفاظ آتے تھے وہ سب آپ پر داغ دیتا۔ باہر اپنے تئیں ساغر صاحب کہلواتا، لیکن گھر میں جب خانساماں کے فرائض انجام دے رہا ہوتا تو اپنے نام عبدالقیوم سے پکارا جانا پسند کرتا۔ ساغر کہہ کر بلائیں تو بہت برا مانتا تھا۔ کہتا تھا، نوکری میں ہاتھ بیچا ہے،

تھا۔ اب ہمارے بزرگوں کے لیے لطیف معاشرت اور لطافتِ معاشرہ صرف شطرنج بازی اور شعر طرازی میں رہ گئی تھی"۔

تخلص نہیں بیچا۔ خانساماں گیری میں بھی تعلّیٰ شاعرانہ سے باز نہ آتا۔ خود کو واجد علی شاہ، تاجدارِ اودھ، کا خاندانی رکاب دار بتاتا تھا۔ کہتا تھا کہ فارسی میں لکھی ڈیڑھ سو سالہ پرانی خاندانی بیاض دیکھ دیکھ کر کھانا پکاتا ہوں۔ اسی کے ہاتھ کا بد مزہ سالن در حقیقت کئی پشتوں کی جمع شدہ نالائقی کا نچوڑ ہوتا تھا۔

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اس کا دعویٰ تھا کہ ایک سو ایک قسم کے پلاؤ پکا سکتا ہوں۔ اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ بشارت ہر اتوار کو پلاؤ پکواتے تھے۔ سال بھر میں کم از کم باون مرتبہ تو ضرور پکایا ہوگا۔ ہر دفعہ ایک مختلف طریقے سے خراب کرتا تھا۔ صرف وہ کھانے ٹھیک پکاتا تھا جن کو مزید خراب کرنا معمولی قابلیت رکھنے آدمی کے بس کا کام نہیں۔ یا ایسے کھانے جو پہلے ہی کسی کھانے کی بگڑی ہوئی شکل ہیں۔ مثلاً کھچڑی، آلو کا بھرُتا، لگی ہوئی فیرنی، شب دیگ، کھچڑا، ارہر کی دال، اور تنجن جس میں میٹھے چاولوں کے ساتھ گوشت اور نیبو کی ترشی ڈالی جاتی ہے۔ پھوہڑ عورتوں کی طرح کھانے کی تمام خرابیوں کو مرچ سے اور کلام کی جملہ خامیوں کو ترنم سے دور کر دیتا تھا۔ میٹھا بالکل نہیں پکا سکتا تھا، اس لیے کہ اس میں مرچ ڈالنے کا رواج نہیں۔ اکثر چاندنی راتوں میں جغرافیہ ٹیچر کو اسی کے بنیجو پر اپنی

غزلیں گا کے سناتا، جنھیں سن کر وہ اپنی محبوبہ کو جس کی شادی مراد آباد کے ایک پیتل کے اگالدان بنانے والے سے ہو گئی تھی، یاد کر کے کھرج میں روتا تھا۔ گانے کی جو طرز ساغر نے بغیر کسی کاوش کے ایجاد کی تھی، اس سے گریہ کرنے میں بہت مدد ملتی تھی۔

بشارت نے ایک دن چھیڑا کہ بھئی، تم ایسی مشکل زمینوں میں ایسے اچھے شعر نکالتے ہو۔ پھر خانساماں گیری کاہے کو کرتے ہو؟ کہنے لگا، آپ نے میرے دل کی بات پوچھ لی۔ اچھا کھانا پکانے کے بعد جو روحانی انشراح ہوتا ہے وہ شعر کے بعد نہیں ہوتا۔ کس واسطے کہ کھانا پکانے میں اوزان کا کہیں زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کھانے والا جسے برا کہدے اسے برا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کھانا پکانے میں محنت بھی زیادہ پڑتی ہے۔ اسی لیے تو آج تک کسی شاعر نے باورچی کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔

شاعری کو ساغر جالونوی نے کبھی ذریعہ عزّت نہیں سمجھا، جس کی ایک وجہ تو غالباً یہ تھی کہ شاعری کی وجہ سے اکثر اس کی بے عزّتی ہوتی رہتی تھی۔ فنِ طبّاخی میں جتنا دماغ دار تھا، شاعری کے باب میں اتنی ہی کسرِ نفسی سے کام لیتا تھا۔ اکثر بڑے کھلے دل سے اعتراف کرتا کہ غالب اُردُو میں فارسی شعر مجھ سے

بہتر کہہ لیتا تھا۔ میر کو مجھ سے کہیں زیادہ تنخواہ اور داد ملی۔ دیانت داری سے اتنا تسلیم کرنے کے بعد یہ اضافہ ضرور کرتا، حضور! وہ زمانے اور تھے۔ اساتذہ صرف شعر کہتے اور شاگردوں کی غزلیں بناتے تھے، کوئی ان سے چپاتی نہیں بنواتا تھا۔

یہ کون حضرتِ آتش کا ہم زبان نکلا

اس میں شک نہیں کہ بعضا بعضا شعر بڑا دَم پُخت نکالتا تھا۔ کچھ شعر تو واقعی ایسے تھے کہ میر و آتش بھی ان پر ناز کرتے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہی انھیں کے تھے! خود کو یکے از تلامیذ الرحمان اور اپنے کلام کو الہامی بتاتا تھا۔ چنانچہ ایک عرصے تک اس کے نیازمند اسی خوش گمانی میں رہے کہ سرقہ نہیں الہام میں توارد ہو جاتا ہے۔ ردولی میں ایک دفعہ اپنی تازہ غزل پڑھ رہا تھا کہ کسی گستاخ نے بھرے مشاعرے میں ٹوک دیا کہ یہ شعر تو ناسخ کا ہے۔ سرقہ ہے، سرقہ! ذرا جو گھبرایا ہو۔ اُلٹا مسکرایا۔ کہنے لگا "غلط! بالکل غلط! آتش کا ہے"!

پھر اپنی بیاض صدرِ مشاعرہ کی ناک کے نیچے بڑھاتے ہوئے بولا "حضور! ملاحظہ فرمالیجیے۔ یہ شعر بیاض میں inverted commas (الٹے واوین) میں

لکھا ہے۔ اور آگے آتش کا نام بھی دیا ہے" صدرِ مشاعرہ نے اس کی تصدیق کی اور اعتراض کرنے والا اپنا سا منھ لے کے رہ گیا۔

ساغر اپنے وطنِ مالوف جالون خورد کی نسبت پیار میں ساغرِ خورد کہلاتا تھا۔ مگر وہ خود اپنا رشتہ لکھنؤ کے دبستان سے جوڑتا اور زبان کے معاملے میں دِلّی والوں اور اہلِ پنجاب سے انتہائی تعصب برتتا تھا۔ چنانچہ صرف شعرائے لکھنؤ کے کلام سے سرقہ کرتا تھا۔

ترے کوچے سے ہم نکلے

ہنگامے کے بعد کسی کو مہمان شاعروں کا ہوش نہ رہا۔ جس کے جہاں سینگ سمائے وہیں چلا گیا۔ اور جو خود اس لائق نہ تھا اسے دوسرے سینگوں پر اُٹھا کے لے گئے۔ کچھ رات کی ہڑبونگ کی خفت، کچھ روپیہ نہ ہونے کے سبب بدانتظامی، بشارت اس لائق نہ رہے کہ صبح شاعروں کو منھ دکھا سکیں۔ مولی مجّن کے "علی الحساب" دیے گئے دس روپے کبھی کے چٹنی ہو چکے تھے۔ بلکہ وہ اپنی گرہ سے بہتر روپے خرچ کر چکے تھے اور اب اتنی استطاعت نہیں رہی تھی کہ شاعروں کو واپسی کے ٹکٹ دلوا سکیں۔ منھ پر انگوچھا ڈال کر چھُپتے چھُپاتے دینیات ٹیچر کے

خالی گھر گئے۔ ولزلی ان کے دَم کے ساتھ لگا تھا۔ تالا توڑ کر گھر میں داخل ہوئے اور دن بھر منھ چھپائے پڑے رہے۔ سہ پہر کو ولزلی کو زنجیر اُتار کر باہر کر دیا کہ بیٹا جا۔ آج خود ہی جہاں جی چاہے فراغت کر آ۔ بپھرے ہوئے شعرائے کانپور کا غول پہلے تو ان کی تلاش میں گھر گھر جھانکتا پھرا۔ آخر تھک ہار کر پا پیادہ اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔ سو دو سو قدم چلے ہوں گے کہ لوگ ساتھ آتے گئے اور باقاعدہ جلوس بن گیا۔ قصبے کے تمام نیم برہنہ بچّے، ایک مکمل برہنہ پاگل (جسے زمانے کے عام عقیدے کے مطابق لوگ مجذوب سمجھ کر سٹے کا نمبر اور قسمت کا حال پوچھتے تھے) اور میونسپل حدود میں کاٹنے والے تمام کتّے انھیں اسٹیشن چھوڑنے گئے۔ جلوس کے آخر میں ایک سادھو بھبوت رَمائے، بھنگ پیے اور تین کٹ کھنی بطخیں بھی اکڑے ہوئے فوجیوں کی cermonial چال یعنی اپنی ہی چال ---------- goose step ---------- چلتی شریکِ ہنگامہ تھیں۔ راستے میں گھروں میں آٹا گوندھتی، سانی بناتی، روتے ہوئے بچّے کا منھ غزائی غدود سے بند کرتی ہوئی عورتیں اپنا اپنا کام چھوڑ کر، سَنے ہوئے ہاتھوں کے طوطے بنائے جلوس دیکھنے کھڑی ہو گئیں۔ ایک بندر والا بھی اپنے بندر اور بندریا کی رسّی پکڑے یہ تماشا دیکھنے کھڑا ہو گیا۔ بندر اور لڑکے بار بار طرح طرح

کے منھ بنا کر ایک دوسرے پر خوخیاتے ہوئے لپکتے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کی نقل اُتار رہا ہے۔

آتے وقت جن نازک مزاجوں نے اس پر ناک بھوں چڑھائی تھی کہ ہمیں بیل گاڑیوں میں لاد کر لایا گیا، انہیں اب جاتے وقت یہ شکایت تھی کہ پیدل کھدیڑے گئے۔ چلتی ٹرین میں چڑھتے چڑھتے حیرت کانپوری ایک قلی سے یہ کہہ گئے کہ اس نابکار، ناہنجار (بشارت) سے یہ کہہ دینا کہ ذرا دھیرج گنج سے باہر نکل۔ تجھ سے کانپور میں نمٹ لیں گے۔ سب شاعروں نے اپنی جیب سے واپسی کے ٹکٹ خریدے، سوائے اس شاعر کے جو اپنے ساتھ پانچ مصرع اٹھانے والا لایا تھا۔ یہ صاحب اپنے مصرعہ برداروں سمیت آدھے راستے ہی میں بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں اتار لیے گئے۔ پلیٹ فارم پر چند درد مند مسلمانوں نے چندہ کر کے ٹکٹ چیکر کو رشوت دی، تب کہیں ان کو رہائی ملی۔ ٹکٹ چیکر مسلمان تھا، ورنہ کوئی اور ہوتا تو چھؤں کے ہتھکڑی ڈلوا دیتا۔

بات اک رات کی

صرف بے "عزّت شدہ" شعرا ہی نہیں، کانپور کی ساری شاعر برادری بشارت کے خون کی پیاسی تھی۔ ان شاعروں نے ان کے خلاف اتنا پروپیگنڈا کیا کہ چند ایک نثر نگار بھی ان کو کچا چبا جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ کانپور میں ہر جگہ اس مشاعرے کے چرچے تھے۔ دھیرج گنج جانے والے شاعروں نے اپنی ذلّت و خواری کی جو داستانیں بڑھا چڑھا کر بیان کیں وہ اسی سلوک کے مستحق تھے۔ لوگ کُرید کُرید کر تفصیلات سنتے۔ ایک شکایت ہو تو بیان کریں۔ اب کھانے ہی کو لیجیے۔ ہر شاعر کو شکایت تھی کہ رات کا کھانا ہمیں دن دھاڑے چار بجے اسی کاشتکار کے ہاں کھلوایا گیا جس کے ہاں سُلوایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہر کاشتکار نے مختلف قسم کا کھانا کھلایا۔ چنانچہ جتنی اقسام کے کھانے تھے اتنی ہی قسم کے امراضِ معدہ میں شاعروں نے خود کو مبتلا بتلایا۔

حیرت کانپوری نے شکایت کی کہ میں نے غسل کے لیے گرم پانی مانگا تو چودھرائن نے گھونگٹ اٹھا کے مجھے نزدیک ترین کنویں کا راستہ بتا دیا۔ اس یقین دہانی کے ساتھ کہ اس میں سے گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم پانی نکلتا ہے! چودھری نے میری گود میں اپنا ننگ دھڑنگ فرزند دے کر زبردستی

تصدیق چاہی کہ نومولود اپنے باپ پر پڑا ہے۔ میرا کیا جاتا تھا۔ میں نے کہہ دیا، ہاں! اور بڑی شفقت سے بچّے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار کیا، جس سے مشتعل ہو کر اس نے میری اچکن پر پیشاب کر دیا۔ اسی اچکن کو پہنے پہنے میں نے مقامی شعرا کو گلے لگایا۔

پھر فرمایا کہ بندہ آبرو ہتھیلی پہ رکھے، ایک بجے مشاعرے سے لوٹا۔ تین بجے تک چارپائی کے اوپر کھٹمل اور نیچے چوہے کلیلیں کرتے رہے۔ تین بجتے ہی گھر میں "صبح ہو گئی! صبح ہو گئی!" کا شور مچ گیا۔ اور شکایت تو سب نے کی کہ صبح چار بجے ہی ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا اور ایک ایک لوٹا ہاتھ میں پکڑا کے جھڑ بیری کی جھاڑیوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔ حیرت کانپوری نے پروٹسٹ کیا تو انھیں نومولود کے پوتڑے کے نیچے سے ایک چادر گھسیٹ کر پکڑا دی گئی کہ ایسا ہی ہے تو یہ اوڑھ لینا شاعروں کا دعویٰ تھا کہ اس دن ہم نے گاؤں کے مرغوں کو کچی نیند اُٹھا کر اذانیں دلوائیں!

کچھ نے شکایت کی کہ ہمیں "ٹھوس ناشتہ" نہیں دیا گیا۔ نہار منھ فٹ بھر لمبے گلاس میں نمکین چھاچھ پلا کر رخصت کر دیا۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ ان کی کھاٹ کے پائے سے بندھی ہوئی ایک بکری ساری رات مینگنی کرتی رہی۔ منھ

اندھیرے اسی کا دودھ دوہ کر انہیں پیش کر دیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سلوک تو کوئی بکرا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ خروش شاہجہاں پوری نے کہا کہ ان کے سرھانے رات کے ڈھائی بجے سے چکّی چلنی شروع ہوئی۔ چکّی پیسنے والی دونوں لڑکیاں ہنس ہنس کے جو گیت گا رہی تھیں وہ دیور بھاوج اور نندوئی اور سلہج کی چھیڑ چھاڑ سے متعلق تھا، جس سے ان کی نیند اور نیت میں خلل واقع ہوا۔ اعجاز امروہی نے کہا کہ بھانت بھانت کے پرندوں نے صبح چار بجے سے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ ایسے میں کوئی شریف آدمی سو ہی نہیں سکتا۔

مجذوب متھراوی کو شکایت تھی کہ انھیں کچے صحن میں جامن کے پیڑ تلے مچھروں کی چھاؤں میں سُلا دیا۔ پُروا کے ہر فرحت بخش جھونکے کے ساتھ رات بھر ان کے سر پر جامنیں ٹپکتیں رہیں۔ صبح اٹھ کر انھوں نے شکایت کی تو صاحبِ خانہ کے میٹرک فیل لونڈے نے کہا، غلط! جامنیں نہیں۔ پھلیندے تھے۔ میں نے خود لکھنؤ والوں کو پھلیندے کہتے سنا ہے۔ مجذوب متھراوی کے بیان کے مطابق ان کی چارپائی کے پاس کھونٹے سے بندھی ہوئی بھینس رات بھر ڈکراتی رہی۔ گجر دَم ایک بچّہ دیا جو سیدھا ان کی چھاتی پر آن کر گرتا اگر وہ کمالِ چابکدستی سے بیچ میں ہی کیچ نہ لے لیتے۔ شیدا جارچوی نے اپنی بے عزّتی میں بھی یکتائی اور فخر و مباہات کا پہلو نکال لیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ جیسی بمثال بے

عزّتی ان کی ہوئی ایسی تو ایشیا بھر میں کبھی کسی شاعر کی نہیں ہوئی۔ رعنا سیتا پوری ثم کاکوروی نے شگوفہ چھوڑا کہ جس گھر میں مجھے سُلایا گیا، بلکہ یوں کہیے کہ رات بھر جگایا گیا، اس میں ایک ضدی بچّہ ساری رات شیر مادر کے لیے اور اس کا باپ موخر الذکر کے لیے مچلتا رہا۔ اخگر کانپوری جانشین مائل دہلوی بولے ان کا کاشتکار میزبان ہر آدھے گھنٹے بعد اُٹھ اُٹھ کر ان سے یہ پوچھتا رہا کہ "جنابِ عالی، کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ نیند تو ٹھیک آرہی ہے نا؟"

غرض کہ جتنے منھ ان سے دُگنی تگنی شکائتیں۔ ہر شاعر اس طرح شکایت کر رہا تھا گویا اس کے ساتھ کسی منظّم سازش کے تحت ذاتی ظلم ہوا ہے۔ حالانکہ ہوا ہوایا کچھ نہیں۔ ہوا صرف یہ کہ ان شہری تلامیذ الرحمٰن نے دیہات کی زندگی کو پہلی مرتبہ ------۔ اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے ------۔ ذرا قریب سے دیکھ لیا اور بلبلا اُٹھے۔ ان پر پہلی مرتبہ یہ کھُلا کہ شہر سے صرف چند میل کی اوٹ میں انسان کیوں کر جیتے ہیں۔ اور اب ان کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ یہی کچھ ہے تو کاہے کو جیتے ہیں۔

سکتے نکلوالو!

کچھ دن بعد یہ سننے میں آیا کہ جن طرحی غزل پڑھنے والوں کی بے عزّتی تھی انھوں نے تہیّہ کیا ہے کہ آئندہ جب تک کسی استاد کے دیوان میں خود اپنی آنکھ سے مصرع نہ دیکھ لیں، ہرگز ہرگز اس زمین میں شعر نہیں نکالیں گے۔ ان میں سے دو شاعروں نے ساغر جالونوی سے اصلاح لینی اور غزلیں بنوانیں شروع کردیں۔ ادھر استاد اخگر کانپوری جانشین مائل دہلوی کی دکان خوب چمکی۔ ان کے سامنے اب روزانہ درجنوں نئے شاگرد زانوے تلمذ تہ کرنے لگے کہ انھوں نے اصلاح کی ایک مخصوص صنف میں اسپیشلائز کرلیا تھا۔ وہ صرف سکتے نکالتے تھے اور اسطرح نکالتے تھے جیسے پہلوان لات مارکر کمر کی چُک نکال دیتے ہیں۔ یا جس طرح بارش میں بھیگنے سے بان کی اکڑی ہوئی چارپائی پر محلّے بھر کے لونڈوں کو کدوا کر اس کی کان نکالی جاتی ہے۔ اِس طرح کان تو نکل جاتی ہے، لیکن لونڈوں کو پرائی چارپائی پر کودنے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔

مائی ڈیر مولوی مجّن!

دن تو جوں توں کاٹا، لیکن شام پڑتے ہی بشارت ایک قریبی گاؤں سٹک گئے۔ وہاں اپنے ایک واقف کار کے ہاں (جس چند ماہ بیشتر ایک یتیم تلاش کرنے میں مدد دی تھی) انڈر گراؤنڈ چلے گئے۔ ابھی جوتوں کے تسمے بھی نہیں کھولے تھے کہ اپنے ہر جاننے والے کو مختلف ذرائع سے اپنے انتہائی خفیہ زیرِ زمین محلِ وقوع سے آگاہ کرنے کا انتظام کیا۔ انھوں نے دھیرج گنج میں سوا سال رو رو کے گزارا تھا۔ دیہات میں وقت بھی بیل گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ انھیں اپنی قوتِ برداشت پر تعجب ہونے لگا۔ رزق کی سب راہیں مسدود نظر آئیں تو ناگوارا رفتہ رفتہ گوارا ہو جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان کا کوئی اسکول ایسا نہیں بچا جس کا نام انھیں معلوم ہو اور جہاں انھوں نے درخواست نہ دی ہو۔ آسام کے ایک مسلم اسکول میں انھیں جمناسٹک ماسٹر تک کی ملازمت نہ ملی۔ چار پانچ جگہ اپنے خرچ پر جا کر انٹرویو میں بھی ناکام ہو چکے تھے۔ ہر ناکامی کے بعد انھیں معاشرے میں ایک نئی خرابی نظر آنے لگی جسے صرف خونیں انقلاب سے دور کیا جا سکتا تھا، لیکن جب کچھ دن بعد ایک دوست کے توسّط سے سندیلہ کے ہائی اسکول میں تقرر کا خط ملا تو دل نے بے اختیار کہا کہ میاں!

دس بارہ مرتبہ خط پڑھنے اور ہر بار نئی مسّرت کشید کرنے کے بعد انھوں نے چار لائن والے کاغذ پر خطِ شکست میں استعفٰی لکھ کر مولوی مجّن کو بھجوادیا۔ ایک ہی جھٹکے میں بیڑی اتار پھینکی۔ اسے رقم کرتے ہوئے وہ آزادی کے ایک بھک سے اُڑادینے والے نشے سے سرشار ہوگئے۔ چنانچہ ”عرض“ کی ’ر‘ کی دُم رعونت سے بل کھا کر ’ض‘ کی آنکھ میں گھس گئی اور ”استعفٰی“ کی ’ی‘ نے ہیکڑی سے پیر پسار دیے۔ بی اے کا نتیجہ نکلنے کے بعد وہ انگریزی میں اپنے دستخط کی جلیبی سی بنانے لگے تھی۔ آج بفضلِ مولا سے وہ جلیبی، امرتی بن گئی مولی مجّن کو خط کا مضمون پڑھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ سوادِ خط کے ہر شوشے سے سرکشی، ہر مرکز سے تکبّر اور ایک ایک دائرے سے استعفٰی ٹپک رہا تھا۔ بشارت نے لفافے کو حقارت میں لعابِ دہن ملا کر اس طرح بند کیا گویا مولوی مجّن کے منھ پر تھوک رہے ہوں۔ دستخط کرنے کے بعد سرکاری ہولڈر کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اپنے آقائے ولی نعمت مولوی سید محمد مظفّر کو حضور فیض گنجور یا مکرمی معظمی لکھنے کے بجائے جب انھوں نے اُردو خط میں مائی ڈیر مولوی مجّن لکھا تو وہ کانٹا جو سوا سال میں ان کے تلوے کو چھیدتا ہوا تالو تک پہنچ چکا تھا، یکلخت نکل گیا۔ اور اب انھیں اس پر تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے پھٹیچر آدمی سے وہ سوا سال

تک اس طرح اپنی اوقات خراب کرواتے رہے انھیں ہو کیا گیا تھا؟ خود مولوی مجّن کو بھی غالباً اس کا احساس تھا۔ اسلئے کہ جب بشارت انھیں خدا کے حوالے کرنے گئے، مطلب یہ کہ خدا حافظ کہنے گئے تو موصوف نے ہاتھ تو ملایا، آنکھیں نہ ملا سکے، جب کہ بشارت کا ی حال تھا کہ "آداب عرض" بھی اس طرح کہا کہ لہجے میں ہزار گالیوں کا غبار بھرا تھا۔

بشارت نے بہت سوچا۔ نازو کو تحفے میں دینے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وقتِ رخصت اپنی سونے کی انگوٹھی اُتار کر اسے دے دی۔ اس نے کہا، اللہ میں اس کا کیا کروں گی؟ پھر وہ اپنی کوٹھری میں گئی اور چند منٹ بعد واپس آئی۔ اس نے انگوٹھی میں اپنی گھنگرالے بالوں کی ایک لٹ باندھ کر انھیں لوٹا دی۔ وہ دبی دبی سسکیوں سے رو رہی تھی۔

تم تو اتنے بھی نہیں جتنا ہے قد تلوار کا!

سندیلہ ہائی اسکول میں تو سب کچھ ٹھیک تھا، لیکن میٹرک میں تین چار پرابلم لڑکے عمر میں ان سے بھی تین چار برس بڑے نکلے۔ یہ لڑکے جو ہر کلاس میں دو دو تین تین سال دَم لیتے میٹرک تک پہنچے تھے، اپنی عمر سے اتنے محجوب نہیں

تھے جتنے خود بشارت۔ جیسے ہی وہ گولا جو اس کلاس میں قدم رکھتے ہی ان کے حلق میں پھنس جاتا تھا، تحلیل ہوا اور اسکول میں ان کے پیر جمے، انھوں نے اپنے ایک دوست سے جو لکھنؤ سے تازہ تازہ ایل ایل بی کر کے آیا تھا، مولوی مظفّر کو ایک قانونی نوٹس بھجوایا کہ میرے موکل کی دس مہینے کی چڑھی ہوئی تنخواہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دیجیے، ورنہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی جس سے اسکول کی جملہ بے ضابطگیوں اور بدعنوانیوں کا طشت از بام ہونا ناگزیر ہو جائے گا۔

اس کے جواب میں دو ہفتے بعد مولوی مظفّر کی جانب سے ان کے وکیل کا رجسٹرڈ نوٹس آیا کہ مشاعرے کے سلسلے میں جو "رقومات" آپ کو وقتاً فوقتاً علی الحساب دست گرداں دی گئیں، ان کا حساب دیے بغیر آپ فرار ہو گئے۔ آپ اس واجب الادا رقم میں سے اپنے واجبات وضع کر کے، بقیہ رقم فوراً بذریعہ منی آرڈر میرے موکل کو بھیج دیجیے۔ مشاعرے کے اخراجات کا گوشوارہ مع اصل رسیدات بواپسی ڈاک ارسال کریں۔ شاعروں کو جو معاوضہ، بھتّا اور سفر خرچ دیا گیا اس کی رسیدات منسلک کریں۔ بصورت دیگر وجہ ظاہر کریں کہ کیوں نہ آپ کے خلاف عدالتِ مجاز میں چارہ جوئی کی جائے۔ ہرجہ و خرچہ اپ کے ذمے ہو گا۔ نیز شاعروں کے استقبال کے دوران آپ نے یتیم خانے کے بینڈ سے اپنی

ایک غزل بجوائی جس کے ایک سے زائد اشعار فحش تھے۔ مزید بر آں، وزن سے گرے ہوئے مصرعے دینے سے اسکول کی تعلیمی شہرت اور اہلیانِ دھیرج گنج کی املاکِ منقولہ کو جو نقصان پہنچا اس کا ہرجانہ قرار واقعی وصول کرنے کا حق مجلسِ منتظمہ محفوظ رکھتی ہے۔ نوٹس میں دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر رقم واپس نہ کی گئی تو بدرجہ مجبوری خیانتِ مجرمانہ کے کیس کی پوری تفصیلات سے سندیلہ اسکول کے منتظمین اور گورنمنٹ کے محکمہ تعلیمات کو آگاہ کر دیا جائے گا۔

نوٹس سے تین دن پہلے مولی مجّن نے ایک ٹیچر کی زبانی بشارت کو کہلا بھیجا کہ برخودار! تم ابھی بچّے ہو۔ گرو گھنٹال سے کاہے کو الجھتے ہو۔ ابھی تو نامِ خدا تمہارے گولیاں اور گلی ڈنڈا کھیلنے اور ہماری گود میں بیٹھ کر عیدی مانگنے کے دن ہیں۔ اگر ٹکر لی تو پرخچے اڑادوں گا۔

سگِ مردم گزیدہ

بشارت کی رہی سہی مدافعت کا لڑکھڑاتا قلعہ ڈھانے کے لیے مولی مجّن نے نوٹس کے آخری پیراگراف میں ایک ٹائم بم رکھوا دیا۔ لکھا تھا کہ جہاں آپ نے محکمہ تعلیمات کو اپنے خط کی نقل ارسال کی، وہاں اس کے علم میں یہ بات بھی

لانی چاہیے تھی کہ آپ نے اپنے کتّے کا نام سرکارِ برطانیہ کے گورنر جنرل کی تذلیل کے لیے لارڈ ولزلی رکھا۔ آپ کو بارہا وارننگ دی گئی مگر آپ حکومت کے خلاف ایک لینڈی کتّے کے ذریعے نفرت اور بغاوت کے جزبات کو ہوا دینے پر مُصر رہے جس کی شہادت قصبے کا بچّہ بچّہ دینے کو تیار ہے۔ نیز بغاوت اور انگریز دشمنی کے جنون میں آپ اپنے تئیں فخریہ اور اعلانیہ ٹیپو کہلواتے تھے!

بشارت سکتے میں آگئے۔ یا اللہ! اب کیا ہو گا؟

وہ دیر تک اداس اور فکر مند بیٹھے رہے۔ وِلزلی ان کے پیروں پر اپنا سر رکھے آنکھیں موندے پڑا تھا۔ وقفے وقفے سے آنکھ کھول کر انھیں دیکھ لیتا تھا۔ ان کا جی ذرا ہلکا ہوا تو وہ دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پیار سے زیادہ احساسِ تشکر کے ساتھ۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پتھر کی چوٹ کا نشان نہ ہو۔

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے"!

مولی مجّن نے اس نوٹس کی کاپی اطلاعاً ان تمام شعرا کو بھیجی جنھوں نے اس یادگار مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ تین چار کو چھوڑ کر سب کے سب شاعر بشارت کے پیچھے پڑ گئے کہ لاؤ ہمارے حصّے کی رقم۔ ایک خستہ حال شاعر تو

کوسنوں پر اُتر آیا۔ کہنے لگا جو دوسرے شاعر بھائیوں کے گلے پہ چھری پھیر کے معاوضہ ہڑپ کر جائے، اللہ کرے اس کی قبر میں کیڑے اور شعر میں سکتے پڑیں۔ اب وہ کس کس کو سمجھانے جاتے کہ مشاعرے کی مد میں انھیں کل دس روپے دیے گئے تھے۔ ایک دل جلے نے تو حد کر دی۔ اسی زمین میں ان کی ہجو لکھ کر ان کے سابق خانساماں ساغر جالونوی کے پاس بغرضِ اصلاح بھیجی، جو اس نمک حلال نے یہ کہہ کر لوٹا دی کہ ہم تاجدارِ اودھ جانِ عالم شاہ پیا کے خاندانی رکاب دار ہیں۔ ہمارا اصول ہے ایک دفعہ جس کا نمک کھالیا، اس کے خلاف کبھی ہماری زبان اور قلم سے ایک لفظ نہیں نکل سکتا، خواہ وہ کتنا بڑا غبن کیوں نہ کر لے۔

تپش ڈبائیوی نے اُڑا دیا کہ بشارت کے والد نے اسی پیسے سے نیا ہارمونیم خریدا ہے، جس کی آواز دوسرے محلّے تک سنائی دیتی ہے۔ اسی ساز کے پردے میں غبن بول رہا ہے! بشارت کے استاد حضرت جوہر الہ آبادی نے کھل کر خیانتِ مجرمانہ کا الزام تو نہیں لگایا، لیکن انھیں ایک گھنٹے تک ایمان داری کے فضائل پر لیکچر دیتے رہے۔

نصیحت میں فضیحت!

سچ پوچھیے تو انھیں ایمان داری کا پہلا سبق، لغوی اور معنوی دونوں اعتبار سے، جوہر الہ آبادی نے ہی پڑھایا تھا۔ ہمارا اشارہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی نظم "ایمان دار لڑکا" کی طرف ہے۔ یہ نظم دراصل ایک ایمان دار لڑکے کا قصیدہ ہے جو ہمیں بھی پڑھایا گیا تھا۔ اس کا قصّہ یہ ہے کہ ایک دن اس لڑکے نے پڑوسی کے خالی گھر میں تازہ تازہ بیر ڈلیا میں رکھے دیکھے۔ کھانے کو بے تحاشا جی چاہا لیکن بڑوں کی نصیحت اور ایمان داری کا جزبہ بیر چُرا کر کھانے کی خواہش پر غالب آیا۔ بہادر لڑکے نے بیروں کو چھوا تک نہیں۔ نظم کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے:

واہ وا شاباش لڑکے واہ وا!

تو جواں مَردوں سے بازی لے گیا!

ہائے! کیسے اچھے زمانے اور کیسے بھلے اور بھولے لوگ تھے کہ چوری بدنیتی کی مثال دینے کے لیے بیروں کی ڈلیا سے زیادہ قیمتی اور لذیذ شے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے! کھٹ مٹھے بیروں سے زیادہ بڑی اور بُری Temptation

ہماری دُکھیاری نسل کے لڑکوں کو اس زمانے میں دستیاب بھی نہ تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے ہمیں یوں ہی خیال آیا کہ اگر اب ہمیں نئی پود کے لڑکوں کو نیک چلنی کی تلقین کرنی ہو تو چوری اور بدنیتی کی کونسی مثال دیں گے جس سے بات ان کے دل میں اُتر جائے۔ معاً ایک ماڈرن مثال ذہن میں آئی جس پر ہم یہ داستان ختم کرتے ہیں:

مثال: ایمان دار لڑکے نے ایک الماری میں بلو فلم اور Cannabis کے سگریٹ رکھے دیکھے۔ وہ انہیں اچھی طرح پہنچانتا تھا۔ اس لیے کہ کئی مرتبہ گرئمر اسکول میں اپنی کلاس کے لڑکوں کے بستوں میں دیکھ چکا تھا۔ ان کی لذّت کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ مگر وہ اس وقت نشہ نصیحتِ پدری سے سرشار تھا۔ سونگھ کر چھوڑ دیے۔

وضاحت: درحقیقت اس کی تین وجہیں تھیں۔ اوّل، اس کے ڈیڈی کی نصیحت تھی کہ کبھی چوری نہ کرنا۔ دوم، ڈیڈی نے یہ بھی نصیحت کی تھی کہ بیٹا فسق و فضور کے قریب نہ جانا۔ نظر ہمیشہ نیچی رکھنا۔ سب سے باؤلا نشہ آنکھ کا نشہ ہوتا ہے۔ اور سب سے گندہ گناہ آنکھ کا گناہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ واحد گناہ ہے جس میں بزدلی اور نامَردی بھی شامل ہوتی ہے۔ کبھی کوئی برا خیال دل میں آ بھی

جائے تو فوراً اپنے پیر و مرشد کا اور اگر تم بے پیرے ہو تو خاندان کے کسی بزرگ کی صورت کا تصّور باندھ لینا؛ چنانچہ ایمان دار لڑکے کی چشمِ تصّور کے سامنے اس وقت اپنے ڈیڈی کی شبیہ تھی۔

اور تیسری وجہ یہ کہ مزکورہ بالا دونوں ممنوعہ اشیا اس کے ڈیڈی کی الماری میں رکھی تھیں!

واہ وا شاباش لڑکے واہ وا!

تو بزرگوں سے بھی بازی لے گیا!

خستم شد